

سنگرم و تسخیر 2

گرگ ہر روز گئے

پاکیزہ

مئی 2015

عمران علی
معراج رحمان

MAY PRICE RS. 60/=

REGD. NO. SS-12

Monthly PAKEEZAH

نگہت سیمّا اور رفاقت جاوید کے ناگلوں کی پہلے لطف اقساط
”شادی مبارک“ دیشان رسالہ کی شادی کا احوال
ممتا کے آفاقی جذبے کو موثر انداز میں بیان کرتی چشم کشا تحریریں

المبارک سلسلہ

اداریہ

مجھے کچھ کہنا ہے

مدیرہ 15

مکمل ناول

خصوصی مضمون

228 زمر نعیم

رہبر و قبا

منی ناول

شاہد میسرے کی عذرا رسول 43

88 زاہدہ پروین

خبریں کا بیوی

سلسلے وار ناول

افسانے

16 نگہت سیما

ایک بار و قبا

142 رفاقت جاوید

بہارِ گلشن

51 تنزیلہ زاہرہ

ایک بار اور میں

75 ناہید فاطمہ حسنین

قرض

ناولت

107 عقیلہ حق

دیوار

54 نبیلہ ابراراجا

مترجہ دل

135 رفعت شبانہ

تال

116 صائمہ اکرم

چلو ہم سب ساتھ چلتے ہیں

163 فرح طاہر

پرنڈو

176 ام ایمان

نارنگائی

197 نیلم احمد بشیر

خوار و کو

205 سعدیہ رئیس

محبت رنگ ہے آہ

223 ارجمند عقیل

ای جہان

پبلشر پروپرائٹر: نیشنل رسول • مقام: اشاعت: گراؤنڈ فلور 63 فیروز ایکس نیشنل، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



خصوصی مضامین

- 261 پاکیزہ بہنیں برائے مبارک
267 شائستہ زریں برائے

مستقل عنوانات

- 274 مدیرہ بہنوں کی محفل
286 عظمیٰ آفاق سعید پاکیزہ ڈائری
290 اتجم انصار جلت رنگ
294 صفری زیدی میں اکثر نگیناں ہیں
296 پاکیزہ بہنیں خوش فاقہ
298 پاکیزہ بہنیں سندیے
300 ادارہ روحانی مشورے
302 ہومیوکلینک

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi

Postal Address: Box No. 662, G.P.O., Karachi-74250

Phone (021)35865313, Fax: 35802551, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

کرسٹین کے لئے
اولترا فیری لوشن ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ

Dr. Martell's
Ultra Fery Lotion

میں لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ

1- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ

2- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ

3- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ

4- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ

5- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ

6- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ

7- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ

8- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ

9- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ

10- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ

11- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ

12- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ

13- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ

14- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ

15- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ

16- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ

17- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ

18- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ

19- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ

20- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ

ولیمینگ بیوٹی کریم WHITENING BEAUTY CREAM Olinza



RS. 295

کریم کا استعمال روکنے کے بعد بھی اثر پائے

0333-5203553

MelaFittere
CREAM



کریم کا استعمال روکنے کے بعد بھی اثر پائے

1- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ
2- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ
3- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ
4- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ
5- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ
6- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ
7- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ
8- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ
9- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ
10- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ
11- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ
12- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ
13- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ
14- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ
15- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ
16- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ
17- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ
18- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ
19- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ
20- لوشن کے لئے ایک جڑ تھیراپی ایجنٹ



ایسا اکثر ہوتا ہے کہ جب سیر و تفریح کا دورانیہ طویل ہو جائے یا کہیں گھومتے ہوئے دیر ہو جائے تو بالآخر ہم تھکن سی محسوس کرنے لگتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اب ہماری ہمت جواب دے گئی ہے اس لیے آگے نہیں جاسکتے۔ اسی طرح ہم عمر کے ایک حصے پر پہنچ کر یہی سب کچھ سوچنے لگتے ہیں۔ یہ احساسات کسی فرد واحد کے نہیں ہیں، عمر کے ایک حصے میں ہم سب اس مقام کو پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن جو چیز ایک فرد کو دوسرے سے ممتاز کرتی ہے وہ اس مقام پر پہنچنے کے بعد کاروبار عمل ہے۔

کچھ لوگ اس لیے بیٹھ جاتے ہیں کہ دم لے کر آگے چلیں گے اور پھر تازہ دم ہو کر نئے ولولے کے ساتھ سفر کا آغاز کرتے ہیں اور کچھ لوگ بالکل ہی تھک جاتے ہیں اور ہمت ہار بیٹھتے ہیں کہ بس بہت ہو چکا۔ اب تو آرام کا وقت ہے۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جو مکان کے احساس کے باوجود بس چلتے رہتے ہیں اور آج آپ سے یہی پوچھنا ہے کہ آپ کا شمار کس میں ہے۔ یاد رکھیں آپ زندگی کو جتنا زیادہ بوجھ محسوس کریں گے اتنی ہی زیادہ مکان کا احساس ہوگا۔

جب آپ زندگی کو بوجھ محسوس کرنے لگیں، ہمت ہارنے لگیں تو نئے سیارے تلاش کیجیے جو ہر موڑ پر آپ کے منتظر ہیں۔ کسی دوست، کسی نغمے، کسی پھول، کسی بچے کی پیاری مسکراہٹ کی شکل میں آپ ساری مکان بھول کر ایک نئے ولولے کے ساتھ تازہ دم ہو سکتے ہیں۔ آزمائش شرط ہے۔ اور آپ نے ابھی بہت کچھ کرنا ہے اپنے لیے اور دوسروں کے لیے بھی۔ جی ہاں! اپنے آپ کو بیکار یا فارغ نہ سمجھیں۔

مدیر
انجم انصار

اعتبار و وفا

گہمت سیا

یہ سچ ہے کہ محبت میں وقت کا وزن نہیں ہوتا۔۔۔ گنگو کا وزن نہیں ہوتا، ہر طرف تو کیا دل و دماغ تک ہر ایک سے وزن کی کیفیت محسوس ہو کر رہی ہے۔۔۔ کہ دل و دماغ کو کوئی دوسری بات سمجھانی تک نہیں دے گی۔ اس سے حالات میں کسی بھی انسان کے پاؤں جیسے نہیں رہے اور وہ ہر وقت تو ہلکا رہتا ہے۔

مگر خون کو سنبھال کر سواران رکھنا ہی محبت کا اصل ہفت فارم ہے۔۔۔ لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس سے وزنی کی اصول کو بھی محسوس کر لیا جائے۔۔۔ اور بن لیا جائے۔۔۔ کہ محبت کا اولیٰ ذمہ افسار ہے۔۔۔ اور وفا کے غم سے وہیں کھیلے ہیں۔۔۔ جس گلشن میں افسار ک بیج بویا جاتا ہے۔

گلاب چہروں پہ دھول کتنی مسافتوں کی جھی ہوئی ہے
چراغ آگھوں میں جانے کتنے سفر کے جالے تھے ہوئے ہیں
نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جیتی دھوپوں کا کوئی حصہ
کہان کا ذکر سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تو رکے ہوئے ہیں

.....

.....





تب ہی فون کی بیل دوبارہ ہوئی رواد جو متوحش سا کھڑا تھا ایک دم اچھل پڑا۔ اسکرین پر وہی نمبر تھا۔ فون آن کرتے ہی اس کے لبوں سے نکلا۔

”کیا..... کیا کہہ رہے ہو تم ظفیری؟“ غیر ارادی طور پر اس کی آواز بلند ہوئی۔

دوسری طرف ظفیری ہولے سے ہنسا تھا۔

”وہی جو تم نے سنا میری جان کہو تو پھر دُہرا دوں۔ عظام تمہارا بھائی نہ کسی کزن تو ہے نا۔ اب یہ نہ کہنا کہ تمہارا کزن بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں تم دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہو اور یہ بھی کہ وہ تمہیں بہت پیارا ہے تو تم یقیناً نہیں پا ہو گے کہ اسے کوئی نقصان پہنچے۔ اب اگر میری بات سمجھ میں آگئی ہے تو۔“

”عظام تمہارے گھر میں ہے؟“ اس نے جیسے یقین دہانی چاہی۔

”کہو تو بات کروادوں؟“ دوسری طرف سے ظفیری نے کہا تو اس نے مڑ کر بابا کی طرف دیکھا جو پریشانی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”لیکن وہ تمہارے گھر کیوں اور کیسے ہے؟“ اس نے اپنی آواز اتنی آہستہ کرنی کہ بابا نہ سن سکیں۔

”کیوں اور کیسے کا جواب تو یہاں آؤ گے تو مل جائے گا بس یوں سمجھ لو کہ جی چاہا کہل بیٹھ کر گپ لگائیں۔ کچھ تم ہمیں جانو کچھ ہم تمہیں جانیں۔“

”لیکن اگر مجھے یہ جاننے میں دلچسپی نہ ہو تو؟“ اس کی آواز ہنوز آہستہ تھی۔

”تمہیں نہ ہو تو مجھے تو دلچسپی ہے ناں کہ تم مجھے اچھی طرح جان لو یقیناً تمہیں میرے گھر کا ایڈریس معلوم نہیں ہوگا۔ ایڈریس سمجھ لو۔ میں عظام کے ساتھ تمہارا منتظر ہوں۔“

اس نے ایڈریس بتا کر فون بند کر دیا۔ وہ چند لمحے یونہی ریسیور ہاتھ میں تھا اسے الجھا، الجھا سا بیٹھا رہا۔ وہ ظفیری کی اس ساری گفتگو کا مطلب ابھی تک سمجھ نہیں پایا تھا۔ ظفیری کیوں چاہتا تھا کہ وہ اس کے گھر آئے اور عظام کہاں لگا اسے اور وہ اس کے گھر کیوں گیا۔

”کیا بات ہے رواد کس کا فون ہے؟ عظام تو ٹھیک ہے ناں..... جو ادکی طبیعت کہیں پھر خراب تو نہیں ہوگئی؟“ انہوں نے بے چینی سے پوچھا تو اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور ریسیور کریڈل پر ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”جی بابا عظام ٹھیک ہے۔“ بابا کو جواب دے کر وہ پھر سوچ میں کھو گیا۔

عظام بھلا خود اس کے گھر کیوں جائے گا اور اگر ظفیری اسے خود کسی بہانے اپنے گھر لے گیا ہے تو کیوں..... کیا مسئلہ ہے آخر..... وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ظفیری کے ساتھ نہ اس کی دشمنی تھی نہ دوستی۔ بس سلام دعا کی حد تک ہی واقفیت تھی۔ ایک لمحے کو اس کا جی چاہا کہ وہ بابا کو ساری بات بتا دے۔ ظفیری کی باتوں نے اسے بہت الجھا دیا تھا لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اس نے ارادہ منطوی کر دیا۔ وہ پہلے ہی بہت تھکے ہوئے اور اپ سیٹ لگ رہے تھے۔

”رواد تم کچھ پریشان لگ رہے ہو کچھ چھپا رہے ہو مجھ سے؟“ بابا کی نظریں اسی پر تھیں۔

”نہیں بابا..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ زبردستی مسکرایا۔

”میں بس کچھ حیران ہو رہا ہوں۔ عظام، جو اد کے پاس سے ہو کر ایک اور یونیورسٹی فیلو کے ہاں چلا گیا ہے اور وہ مجھے بھی بلارہا ہے کہ کچھ دیر اکٹھے بیٹھتے ہیں۔ ہماری اس سے کوئی دوستی ہی نہیں بس کبھی کبھار سلام دعا ہو جاتی ہے۔“ انہوں نے اطمینان کی سانس لی۔

”کبھی انسان مجبور ہو جاتا ہے۔ عظام بھی مجبور ہو گیا ہوگا۔ انکار نہیں کر پایا ہوگا۔ تم بھی پئے جاؤ، جلدی آ جانا۔“

”جی بابا۔“ اس نے جھک کر بیڈ کی سائڈ ٹیبل سے گاڑی کی چابی اٹھائی۔ ”میں جلدی آ جاؤں گا انشاء اللہ۔“
 ”یہ یونیورسٹی فیلو کون ہے، کیا نام ہے اس کا؟“ کسی خیال کے تحت انہوں نے پوچھا۔
 ”ظفری نام ہے اس کا اور ام سے ایک سال سینئر ہے۔“

”کیسا لڑکا ہے؟“ وہ پھر پریشان ہونے لگے تھے۔
 ”بابا، آپ تو ایسے سوال کر رہے ہیں جیسے میں کوئی اسکول جانے والا بچہ ہوں اور مجھے کوئی انعام کر لے گا۔“
 ”اٹا پتا تو ہونا چاہیے ناں بیٹا۔ کوئی مسئلہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ مجھے بھی تو تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے۔“ انہوں نے اس کی بات کاٹی۔

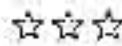
”کوئی مسئلہ نہیں ہوگا بابا آپ ریلیکس رہیں۔“ اس نے انہیں تسلی دی اور ان کے مزید سوالوں سے بچنے کے لیے تیزی سے کمرے سے باہر نکلا۔

”کیا خبر ظفری جھوٹ بول رہا ہو۔ یونہی بے وقوف بنا رہا ہو۔ جسٹ فار ایڈ ونجر۔ اس طرح کی حرکتیں تو وہ کرتا ہی رہتا ہے۔“ پورچ کی سیڑھیاں اترتے اترتے وہ آخری سیڑھی پر رک گیا اور پاکٹ سے فون نکال کر اس نے جواد کا نمبر ملا یا۔
 ”ہیلو جواد، عظام کا کیا پروگرام ہے؟“

”عظام تو کافی پہلے چلا گیا تھا۔ ابھی تک گھر نہیں پہنچا کیا؟ شاید راستے میں شاپنگ وغیرہ کے لیے رک گیا ہو۔“
 ”نھیک ہے آنے ہی والا ہوگا میں فون کر لیتا ہوں اسے۔“ اس نے مزید بات کیے بغیر فون بند کر دیا وہ جواد کو پریشان نہیں کرتا چاہتا تھا کیونکہ عظام آج اپنا فون گھر پر ہی بھول گیا تھا۔

”اس وقت کہاں جا رہے ہیں آپ؟“ خدا بخش نے گیٹ کھولتے ہوئے پوچھا۔
 ”ایک دوست کی طرف جا رہا ہوں چاچا۔ ہو سکتا ہے دیر ہو جائے بابا کا خیال رکھیے گا وہ مجھے کچھ اپ سیٹ سے لگ رہے ہیں۔“ خدا بخش کو تاکید کرتا ہوا وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

”وہ کب اپ سیٹ نہیں رہتے۔ انہیں تو شوق ہے اپ سیٹ رہنے کا۔“ خدا بخش بڑبڑایا لیکن رواد نے اس کی بڑبڑاہٹ نہیں سنی اور گیٹ سے گاڑی باہر نکال لے گیا۔



ظفری کا گھر ڈھونڈنے میں اسے وقت نہیں ہوئی تھی۔ گاڑی گیٹ کے باہر ہی ایک طرف پارک کر کے اس نے نکل دی۔ انٹرکام پر اس کا نام پوچھ کر گیٹ کھول دیا گیا تھا۔ ڈرائیو سے پر تین گاڑیاں کھڑی تھیں جن میں عظام کی گاڑی بھی تھی یعنی ظفری نے جھوٹ نہیں بولا تھا اور عظام یہاں ہی تھا۔

”آؤ..... آؤ رواد حسن۔“ ظفری نے گیٹ کے قریب آتے ہوئے اس کا پورا نام لے کر استقبال کیا۔
 ”زہے نصیب۔“ اس نے ہاتھ سے پاس آنے کا اشارہ کیا۔

”میں اس کا مطلب نہیں سمجھا ظفری؟“ آگے چلا ہوا وہ ظفری کے قریب آیا۔

”مطلب بھی سمجھا دیں گے میری جان اندر تو آؤ۔“

ظفری نے مصافحہ کرنے کے بجائے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا اور پھر بند کر لیا اور اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ لان کے پاس سے گزر کر لمبی ڈرائیو دے میں ہی چلتے ہوئے کارز تک آئے تھے جہاں ایک اور دروازہ تھا۔ ظفری کا گھر کافی بڑا تھا۔ لان بھی وسیع تھا۔ ظفری نے دروازہ دھکیلتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”آؤ..... آ جاؤ۔“ وہ اس کے پیچھے ہی اندر داخل ہوا سامنے ہی صوفے پر عظام بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر

بھی اکٹھن اور بیزار سی تھی اور وہ کچھ ترانہ سناستہ دیکھ رہا تھا۔
 ”عظام۔“ وہ تیر کی طرح اس کی طرف بڑھا۔

”تم ٹھیک ہونا؟“

”اچھی طرح ٹوٹ کر دیکھ لو۔ ہم نے تو اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا سب ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔“ ظفری بائیں
 آنکھ کا کونارا ہا کر مسکرایا۔

اس نے عظام کو ٹھیک دیکھ کر اطمینان بھری سانس لی۔ ”یہ کیسے وہ ہم راستے بھر ستاتے آئے تھے۔ کبھی سوچتا
 واپس چڑ جائے اور بابا کو بھی ساتھ لے آئے۔“ بھی پاپس کے متعلق سوچنے لگا۔

”بھئیو یار۔“ ظفری کا انداز بے تکلف تھا۔ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ ڈرائنگ روم کے گھر کے
 اندر کھٹنے والے دروازے سے اندر چلا گیا تو اس نے عظام کے قریب بیٹھتے ہوئے بے یقینی سے پوچھا۔

”یہ سب کیا ہے عظمیٰ؟ تم یہاں کیسے آئے اور یہ ظفری کیا باتیں کر رہا ہے کچھ عجیب سی۔ کیا اس نے تم سے
 بھی کچھ کہا؟“

”نہیں۔“ عظام نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں تو خود الجھا ہوا ہوں۔ ظفری مجھے بائیں میں ملا تھا۔ شاید وہ بھی کسی
 دوست سے ملنے گیا تھا وہاں کہہ رہا تھا کہ وہ کسی دوست کے ساتھ آیا تھا۔ دوست کو اچانک جانا پڑ گیا۔ اگر میں اسے
 اس کے گھر ڈراپ کر دوں تو وہ شکر گزار ہوگا۔ میں تو اسے گھر کے باہر ہی اتار کر جا رہا تھا لیکن اس نے اندر آنے اور
 چائے پینے کے لیے اتنا اصرار کیا کہ میں مجبور ہو گیا بلکہ شرمندہ ہوا اس کے اتنے اصرار پر کہ وہ اتنے خلوص سے کہہ
 رہا ہے اور میں انکار کر رہا ہوں۔ بس تب سے اب تک بٹھا رکھا ہے۔ انھیں ہی نہیں دے رہا۔ پہلے کھانے کے لیے
 اصرار کرتا رہا جب میں نے بتایا کہ جواد کے پاس کھانا ہے تو پھر چائے کے لیے روک لیا لیکن تم یہاں کیسے؟“

”مجھے ظفری نے فون کر کے بلایا ہے کہ عظام بھی اوھر ہے تم بھی آ جاؤ کچھ دیر مل کر کپ لگائیں گے۔ میں
 تو پریشان ہو گیا تھا ظفری۔“ اس نے بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔ وہ عظام کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا
 ظفری کا جو بھی مقصد تھا سانسے آ ہی جاتا تھا کچھ دیر بعد۔ ظاہر ہے اس نے صرف گنٹ شپ کے لیے تو دھمکی دے
 کر نہیں بلایا تھا۔

”مجھے کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے رومی۔ آخر ظفری کو اچانک ہم دونوں پر کسے پیارا آ گیا۔ وال میں ضرور کچھ
 کالا ہے۔“

”ہم کوئی لڑکیاں نہیں ہیں یار۔“ رواد نے عظام کو تسلی دی۔ ”یونہی اس کا دماغ خراب لگتا ہے مجھے۔ اینڈ ونچر
 کا شوقین امیر زادہ ہے۔ کوئی اینڈ ونچر ہوگا اس کے ذہن میں۔ ویسے تم پریشان مت ہو۔ میں بابا کو بتا کر آیا تھا کہ میں
 کہاں جا رہا ہوں۔“

تب ہی ایک ملازم نرے میں جوس کے دو گلاس رکھے اندر آیا۔

رواد نے گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر ٹیبل پر رکھ دیا جبکہ عظام نے نفی میں سر ہلادیا۔ ملازم نے گلاس ٹیبل
 پر رکھ دیا اور خود باہر چلا گیا۔

”میں کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا ہوں عظمیٰ؟“ چند لمحوں خاموش رہنے کے بعد رواد نے پھر عظام کی طرف دیکھا۔

”میرا خیال ہے ہمیں چننا چاہیے۔“ عظام نے کہا۔

”ارے، ارے ایسے ایسے کچھ کھائے یہ بغیر چلے جائیں گے آپ دونوں۔“ ظفری نے اندر قدم رکھتے

اعتبار و غا

ہوئے عظام اور رواداح کی طرف باری باری دیکھا۔ اس کے پیچھے ایک ملازم ٹرائی دکھاتا ہوا آ رہا تھا۔
 ”سوری دوستو! وہ ماں جی نے کچھ دیر کے لیے اندر روک لیا تھا۔ کوئی ضروری بات تھی۔“ اس نے سینئر نیبل کے پاس رک کر جوس کے بھرے ہوئے گلاسوں پر نظر ڈالی۔

”ارے بھئی یہ جوس ایسے ہی پڑا ہے۔ زہر تو نہیں ملایا میں نے۔“

”میں پہلے ہی پی چکا ہوں۔ مزید کوئی خواہش نہیں۔“

”اوہ ہاں۔“ ظفیری نے جوس کا ایک گلاس خود اٹھا لیا اور رواداح کو اشارہ کیا۔ رواداح نے بے دلی سے گلاس اٹھا کر چند گھونٹ لیے اور پھر نیبل پر رکھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے ظفیری کی طرف دیکھا۔

”ظفیری پلیز۔۔۔ اب اصل بات بتاؤ اس سب سے تمہارا کیا مقصد ہے؟“

”اتنی بے صبری بھی کیا۔۔۔ پہلے کچھ کھانی تو لو۔“

اس نے سودب کھڑے ملازم کو اشارہ کیا تو اس نے ٹرائی سے پلیٹیں اٹھا کر ان کی طرف بڑھا کیں۔

”پلیز ظفیری میں ابھی کھانا کھا کر گھر سے نکلا ہوں۔ مطلب کی بات کرو۔“ رواداح بہت بے چین اور مضطرب تھا۔

”خیر تمہاری مرضی، ویسے مجھے افسوس ہوگا کہ تم پہلی بار میری گھر آئے اور بغیر کچھ کھائے پیے چلے جاؤ گے۔“ اس نے کندھے اچکائے اور عظام کی طرف دیکھا۔

”تم تو کچھ لو عظام۔“

”نہیں شکریہ۔“ عظام نے بھی نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نے بھی جواد کے ساتھ کھانا کھایا تھا بتایا تو تمہیں مزید کی گنجائش نہیں ہے۔“

ظفیری نے ملازم کو ٹرائی واپس لے جانے کا اشارہ کیا اور رواداح کی طرف کچھ دیر گہری نظروں سے دیکھتا رہا۔
 ”میں جانتا ہوں کہ تم یہ جاننے کے لیے بے چین ہو رہے ہو کہ میں نے اس طرح تمہیں کیوں بلایا ہے تو پہلو تمہاری بے چینی دور کیے دیتا ہوں۔۔۔ ویسے ایک سب چائے کی گنجائش تو ہوگی نا؟“ وہ ایک دم اٹھا اور تھوڑا سا دروازہ کھول کر ملازم کو آواز دے کر چائے لانے کے لیے کہا اور پھر مڑتے ہوئے کارز نیبل پر پڑی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ میرے فادر ہیں ممتاز سومرو۔ ایم این اے ہیں۔“

”تو کیا صرف یہ بتانے کے لیے بلایا ہے تم نے؟“ رواداح کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

”نہیں۔“ ظفیری اس کے لہجے میں ہلکے سے طنز کو محسوس کر کے مسکرایا۔ ”ہوسکتا ہے تمہیں پہلے سے اس کا علم ہو

ممتاز سومرو کوئی معمولی نام تو نہیں ہے۔ بس تم سے ایک گزارش تھی۔“

وہ ہونے، ہولے چلتا ہوا صوفے پر آ کر بیٹھ گیا رواداح نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”تم۔“ ظفیری نے اس کی طرف انگلی اٹھائی اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ ”آئندہ

میرے یا میرے دوستوں کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرو گے۔ ہم یونیورسٹی میں کیا کرتے ہیں، کیسے رہتے ہیں تمہارا اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے اور دوسری بات آئندہ تم مجھے رتی کے آس پاس دکھائی نہیں دو گے۔“

”کیا مطلب؟“ رواداح نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”میں نے کوئی مشکل بات نہیں کی ہے جس کا مطلب تمہاری سمجھ میں نہ آئے پھر بھی سمجھائے دیتا ہوں۔ میں

ہرگز برداشت نہیں کروں گا آئندہ اگر تم مجھے رتی سے بات کرتے نظر آئے۔ اس لیے کہ رتی، ظفیری سومرد کے دل کو بھاگتی ہے اور کوئی دوسرا اس سے بات کرے یہ مجھے قبول نہیں ہے۔“ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔
 ”نہیں باتیں کر رہے ہو ظفیری وہ ہماری کھاس فینو ہے۔ آئنا سنا، بات چیت تو ہوتی رہتی ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ کبھی اس سے بات ہی نہ ہو۔“

ظفیری نے عظام کی طرف توجہ ہی نہیں دی اور رواجہ کی طرف تیز نظروں سے دیکھتا ہوا جیسے غرایا۔
 ”تم نے میری بات سمجھ لی ہے ناں رواجہ؟“
 ”اگر تمہاری بات سمجھ میں نہ آئی ہو تو کیا کرو گے تم مار دو گے مجھے؟“ رواجہ کی نظریں ظفیری پر تھیں۔
 ”نہیں۔“ ظفیری مسکرایا۔ ”تمہیں نہیں..... تمہارے پیروں کو۔ تمہارا یہ کزن، تمہارا باپ اور.....“
 ظفیری نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ رواجہ کا دل ایک لمحے کو ڈوب سا گیا تھا۔ ظفیری اس کی سوچ سے زیادہ مکار تھا۔

”تم ایک دفعہ مر کر آزاد ہو جاؤ گے ہر فکر سے جبکہ ظفیری اپنے دشمنوں کو پل، پل مار کر.....“
 ”ظفیری پلیز کیسی باتیں کر رہے ہو؟“ عظام نے گھبرا کر اسے ٹوکا۔
 ”دھمکی دے رہے ہو ظفیری؟“ رواجہ کی نظریں ابھی تک اس کے چہرے پر جمی تھیں۔
 ”صرف دھمکی نہیں۔“ وہ کھڑا ہو گیا اور ہولے، ہولے چلتا ہوا کارنر ٹیبل کے پاس رک گیا اور ممتا ز سومرد کی تصویر والا فریم اٹھا کر انگلیوں سے اس کی نامعلوم گرد و صاف کی اور مسکرایا۔ ”میں جو کہتا ہوں اس پر عمل بھی کرتا ہوں۔“ اس نے تصویر واپس ٹیبل پر رکھ دی۔ رواجہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔
 ”تم نے اپنی بات کر لی اب ہم چلیں؟“

”ارے چائے تو پیو، بیٹھو یا رہو۔“ اس نے بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن عظام بھی کھڑا ہو گیا اور اس کی طرف دیکھا۔
 ”یہ بات تم یونیورسٹی میں بھی کہہ سکتے تھے اس ڈرا سے کی ضرورت نہ تھی۔“
 ”ہوں..... کہہ تو سکتا تھا۔“ اس کے لبوں پر پھر دل جلانے والی مسکراہٹ ابھری۔ ”لیکن ہاسٹل میں تمہیں دیکھ کر اچانک خیال آیا کہ چلو تمہیں اپنا گھر دکھا دوں اور تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ تم آئے تو اپنی مرضی سے ہو لیکن میری مرضی کے بغیر جانیس سکتے۔ چاہو تو کوشش کر کے دیکھ لو۔“
 تب ہی اندرونی دروازے پر ایک ملازم کا چہرہ نمودار ہوا۔
 ”سائیں۔“

”کیا ہے؟“ ظفیری نے ناگواری سے اسے دیکھا۔
 ”مٹھا سائیں آئے ہیں۔ بڑی بی بی جی آپ کو اندر بلارہی ہیں۔“
 ”اوہ۔“ ظفیری نے ہونٹ سکپڑے۔ ”اچھا مہمانوں کو خدا حافظ کہہ کر آتا ہوں۔“
 ”مٹھا سائیں صرف تھوڑی دیر کے لیے آئے ہیں۔“ ملازم نے مزید کہا اور سر جھکا کر دروازے سے ہی واپس چلا گیا۔

”میرے ماموں ہیں۔ سکندر سومرو ایم پی اسے ہیں۔ مٹھا سائیں کے نام سے مشہور ہیں۔ ملتان سے آئے ہیں۔ لاہور کے اطراف بھی ان کی کافی زمینیں ہیں۔ ان کا قیام زیادہ تر لاہور میں ہوتا ہے۔ کبھی کبھار کراچی بھی آجاتے ہیں۔“ اس نے غائبانہ تعارف کروایا اور باہر کھٹنے والے دروازے کی طرف بڑھا۔ رواجہ اور عظام اس

کے ساتھ ہی باہر نکلے۔ برآمدے میں کھڑے، کھڑے اس نے چوکیدار کو گیت کھولنے کا اشارہ کیا اور باری، باری دونوں سے ہاتھ ملایا۔

”ظفری یہ روں کا یار ہے۔ دوستی کرو گے تو فائدے میں رہو گے۔“

دونوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ عظام اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔

”اگر عظام کے ساتھ جانا چاہو تو میرا ڈرائیور تمہاری گاڑی گھر پہنچا دے گا۔“

”نوتھینکس۔“ رواد کا لہجہ سپاٹ تھا اور چہرے سے سنجیدگی پھلکتی تھی۔

”میری بات یاد رکھنا رواد، میں دوبارہ بات دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔“

اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ رواد کو اس کی انگلیاں اپنے کندھے میں چبھتی ہوئی سی محسوس ہوئیں۔

”اوکے ہائے۔“ اس نے رواد کے کندھے سے ہاتھ اٹھایا اور واپس مڑ گیا۔ رواد نے برآمدے کی

سیرھیاں اترتے ہوئے عظام کو جانے کا اشارہ کیا۔ عظام کی گاڑی گیت سے باہر نکل گئی تو وہ بھی گیت سے باہر نکل

کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھا اور ایک سرسری سی نظر اپنی گاڑی کے ساتھ پارک بی ایم ڈبلیو پر ڈالی۔ گاڑی کے

ساتھ ہی ایک شخص کلاشکوف اٹھائے کھڑا تھا۔ یقیناً وہ ظفری کے ناموں کا گارڈ ہوگا اور یہ گاڑی بھی یقیناً انہی کی

ہوگی۔ اس نے گاڑی کا لاک کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ایک بار پھر غیر ارادی طور پر گارڈ کی طرف

دیکھا۔ گارڈ اسے ہی دیکھ رہا تھا اس کے اندر ایک خوف کی لہری دوڑ گئی۔ وہ شخص شکل سے اتنا خوف ناک نہیں لگ

رہا تھا اس کی مونچھیں قدرے گھنی تھیں اور وائیں رخسار پر ایک بڑا سیاہ مسہ تھا۔ گارڈ نے اس کے چہرے سے

نظریں ہٹائی تھیں۔ اور اب دوسری طرف دیکھ رہا تھا اس نے خوف سے جھرجھری سی لی اور بہت تیزی سے گاڑی

روڈ تک لایا۔ اس کے اندر کوئی انجانا سا خوف جاگ اٹھا تھا۔ بار بار آنکھوں کے سامنے سیاہ مسہ والا چہرہ آ رہا تھا۔

غیر ارادی طور پر اس نے ایکسی لیرینر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ پیچھے سڑک خالی تھی لیکن وہ گاڑی اس طرح بھگ رہا

تھا جیسے کوئی اس کے تعاقب میں ہو۔

☆☆☆☆

”تھا یقین کہ آئیں گی یہ راتاں کبھی“

سنہری ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی بال بناتے ہوئے ہوئے، ہولے گنگنا رہی تھی۔ گنگنا تے ہوئے اس

نے مڑ کر بجل کی طرف دیکھا جو اپنے بند پر کروٹ کے بل لیٹی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”بہت خوش ہو سنہری؟“ بجل نے اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں۔“ سنہری نے امیگر برش ٹیبل پر رکھا۔ ”بہت خوش ہوں۔ بہت امیر لوگ ہیں کیا بتاؤں جو، کل ڈھونڈ

کے فٹشن میں کس بے دردی سے پیسہ لٹایا انہوں نے۔ بیچارہ ظہور تو نوٹ سینٹے، سینٹے تھک گیا تھا اور اماں کی تو

باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ چچا بات ہے جو جب سے لاہور سے آئے ہیں پہلی بار ایسے دل والے لوگوں کے ہاں محفل

ہئی۔“ اس نے آئینے پر تنقیدی نظر ڈالی اور اسٹول پر بیٹھ کر اسے تفصیل بتانے لگی۔

انہیں گلشن اقبال کے اس گھر میں شفقت ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ دس مرے کا یہ ڈبل اسٹوری گھر

اس فلیٹ سے ہزار ہا درجے اچھا تھا اور سنہری تو بہت خوش تھی۔ بجل بھی خوش تھی کہ یہاں اسے اپنا ایک الگ بندروم

مل گیا تھا۔ گراؤنڈ فلور پر دو بندروم تھے ایک تو شاہجہان بیگم نے سنبھال لیا تھا کہ گھنٹوں کی تکلیف کی وجہ سے ان کے

لیے سیرھیاں اترنا چڑھنا عذاب تھا۔ موراں ہمیشہ ہی ان کے کمرے میں سوتی تھی۔ دوسرے بندروم میں ظہور سے

کے ساتھ شیدا لبا بھی سیٹ ہو گیا تھا۔ شاہجہان کے باقی بندوں نے سرونت کو اور ٹرسنبال لیا تھا۔ شاہجہان نے کارپٹ ڈلو کر زمینی بستر لگوا دیے تھے یوں الگ جگہ کے کرایے سے بچت ہو گئی تھی۔ فرسٹ فلور پر تین بیڈروم تھے۔ سب سے چھوٹا بیڈروم بجل نے لے لیا تھا جبکہ باسٹر بیڈروم میں چینیلی اور کرن تھیں۔ شاہجہان کی بات چیت لاہور میں کسی سے چل رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید کچھ دنوں میں ایک دولڑکیاں اور آجائیں تو وہ بھی باسٹر بیڈروم میں چینیلی اور کرن کے ساتھ ہی کھپ جائیں گی سو سنہری کے اصرار کے باوجود شاہجہان نے سنہری اور موتیا کو بجل کے بیڈروم کے ساتھ والا بیڈروم دیا تھا۔ دو دن تک سنہری کا منہ پھولا رہا تھا۔

”یہ اماں بھی بس سب سے زیادہ ہماری دشمن ہیں۔“ سنہری کو گلے کرنے کی عادت تھی۔ اب بھی وہ موتیا سے نہ جانے کس بات پر نفخا ہو کر بجل کے کمرے میں تیار ہونے آگئی تھی۔

”کیا تم واقعی خوش ہو سنہری؟“ بجل اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”ہاں مجھے ہمیشہ سے ایسے ہی اسی طرح کے جگمگے میں رہنے کا شوق تھا۔ فلیٹ میں میرا دل نہیں لگتا تھا اور وہاں لاہور میں تنگ گلیوں، بوسیدہ بالکونیاں، ایک جیسے گھر، پرانے سالخورہ..... دل ادب گیا تھا میرا۔“

”نہیں، میرا مطلب گھر سے نہیں تھا میں۔“ بجل کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اپنی بات اسے سمجھائے۔ ”دراصل تم اس روز کہہ رہی تھیں ہاں کہ تم اس زندگی سے خوش نہیں ہو۔ تبدیلی چاہتی ہو کسی فیکٹری میں مزدوری کر لو گی اور۔“

”مزدوری..... تو بہ، تو بہ۔“ سنہری نے کانوں کو ہاتھ لگا گئے۔ ”ہم سے نہ ہوئی مزدوری۔“ پھر وہ ہولے سے اٹھی۔ ”لو بھلا کہاں سنہری اور کہاں مزدوری؟“ وہ اٹھی اور دونوں ہاتھ پھیلا کر نزاکت سے گھومی اس کا ٹخنوں تک لبا فراک گھومنے سے پھیلا تو وہ کسی تھلی کی طرح گئی اسے۔ یوں ہی ہاتھ پھیلائے گھومتے، گھومتے وہ پھر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور خود کو آئینے میں تنقیدی نظروں سے دیکھنے لگی۔ بجل کے سپاٹ چہرے پر نہ بھر کے لیے نا قابل فہم سا تاثر ابھرا۔

”موتیا صحیح ہی کہتی۔۔۔ اسے ایسے دور سے پڑتے رہتے ہیں جتنا آج وہ بیزاری کا اظہار کر رہی ہے کل اسنے ہی شوق سے محفل میں گا اور ناچ رہی ہوگی۔“

”سنہری اپنی زندگی سے مطمئن ہے۔ سب ہی مطمئن ہیں۔ سنہری، اماں، ظہور، چینیلی، کرن، موتیا بس ایک میں ہی بے سکون ہوں لیکن پہلے تو ایسی بے سکونی نہ تھی پھر اب کیوں..... کیا اس روز جو سنہری نے کہا تھا اس کی باتوں نے مجھے بے سکون کر دیا ہے یا کوئی اور وجہ ہے۔“ شاید اندر کہیں گھرائیوں میں کسی خواہش کی کوئیل چتریلی زمین سے سر نکالنے اور صوبائے کو بے تاب ہو رہی تھی۔

”آج مہندی کا ٹنکشن ہے۔“ سنہری نے اسے اطلاع دی۔ ”آج تو کئی بڑے منکر بھی آرہے ہیں۔ وہاں میں نے کسی کو کہتے سنا تھا۔“

”اچھا۔“ بجل نے اس کے پر جوش سچے کو نظر انداز کرتے ہوئے پھر سے بات کا سراو ہاں سے ہی جوڑا۔ ”لیکن سنہری تم تم تو کسی باعزت ذریعے سے روزی کمانا چاہتی تھیں۔ تاہنہ گانے کے علاوہ کچھ اور کرنا چاہتی تھیں۔“

”ارے جو تم ابھی تک اس کی باتوں کو یاد رکھے ہو۔“ موتیا نے اندر داخل ہو کر کہا۔ ”یہ تو اس طرح کی باتیں سیکڑوں بار کرتی ہے اور بھول جاتی ہے۔“

لیکن وہ تو نہیں بھولی تھی وہ تو اس روز سے جب سے سنہری نے زندگی تبدیل کرنے کی بات کی تھی مسلسل سوچ رہی تھی کیسے، کس طرح زندگی میں کوئی مثبت تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ سیکڑوں بار اس نے اپنے آپ کو ملامت بھی کی تھی اگر سنہری ایسا سوچ سکتی ہے تو اس نے ایسا کیوں نہیں سوچا اب تک۔ وہ تو سنہری کے مقابلے میں زیادہ باشعور تھی۔ اس نے تعلیم حاصل کی تھی مگر معمولی ایسی لیکن اس تعلیم نے اسے شعور دیا تھا پھر بھی اس کے دل میں یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ زندگی کا یہ رنگ ذہنگ جسے معاشرے میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ بدنام بھی جاسکتا ہے۔

”جو تم اس کی باتوں پر وہیان مت دیا کرو۔ یہ تو رات کی کہی بات صبح تک بھول چکی ہوتی ہے۔“ موتیا نے اسے سوچوں میں گم دیکھ کر کہا اور اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئی اور سنہری کی طرف دیکھا۔

”تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟ اماں تمہیں نیچے بلا رہی ہیں۔ اپنے کمرے سے تو یوں شوں شالں کرتی ہوئی نکلی تھیں جیسے منٹوں میں تیار ہو جاؤ گی حالانکہ میں نے کہا بھی تھا کہ بس دو منٹ کی بات ہے۔ ہاں ہی رہ گئے تھے بنائے۔“

”میں تو تیار ہوں بس یونہی ذرا دیکھ رہی تھی۔“ اس نے ٹیبل سے پرفیوم کی بوتل اٹھا کر خود پر اسپرے کیا اور ٹاک چیزھا کر خوشبو منکھی۔

”اللہ جو تم کتنی مری، مری سی خوشبو خریدتی ہو۔“

”مجھے لاسٹ خوشبو ہی پسند ہے۔“ جل نے آہستگی سے کہا۔ وہ جانتی تھی کہ سنہری کو بہت تیز خوشبو پسند تھی اتنی تیز کہ بعض اوقات اس کے سر میں درد ہونے لگتا تھا۔

”چلو۔“ ایک بار پھر پرفیوم چھڑک کر اس نے موتیا کی طرف دیکھا۔

”نہیں، مجھے نہیں جانا تم جاؤ۔ تمہارے ساتھ جنیلی اور کرن جائیں گی۔“

”تو تم پھر اتنی تیار کیوں ہوتی ہو؟“ سنہری نے سر سے لے کر پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔ وہ سنہری سے بارڈر والی جامنی سازی میں قیامت ڈھا رہی تھی۔

”مجھے بھی کہیں جانا ہے کسی کے ساتھ۔“ اس نے معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

”کہاں.....؟“ کبھی کبھی سنہری بالکل انجان بن جاتی تھی۔ جیسے ننھی ”چو پتی“ ہو ہر بات سے بے خبر۔

”تم تو جیسے جانتی نہیں ہو۔“ موتیا ہمیشہ ہی اس کے انجان بن جانے پر جل جاتی تھی۔

”اوہ۔ اچھا۔“ پھر جیسے کچھ سمجھنے کے سے انداز میں اس نے ایک مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ جل کے دل میں جیسے کسی نے کوئی سوئی چھو کر نکالی تھی۔ اس نے بہت تکلیف محسوس کی اور اذیت سے اس کا رنگ بدلا حالانکہ یہ سب نیا تو نہیں تھا۔ موتیا اور سنہری، جنیلی اور کرن کو سیکڑوں بار ہی اس نے تیار ہو کر کسی کے ساتھ جاتے دیکھا تھا لیکن آج سے پہلے اس نے ایسی تکلیف محسوس نہیں کی تھی۔ آج تو ایسی اذیت ہو رہی تھی جو رگوں کو کاٹتی تھی۔ کیا سنہری جس تبدیلی کی خواہاں تھی وہ بدلاؤ اس کے اندر ہو رہا تھا۔

”کیا ہوا جو تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ موتیا نے پریشانی سے اس کی پیشانی کو چھوا۔

”ہاں ٹھیک ہوں۔“ وہ زبردستی مسکرائی۔

”کہاں ٹھیک ہو؟ کیسا پیلا رنگ ہو رہا ہے۔“ موتیا کی نظریں اسی پر تھیں۔

”سر میں ذرا درد ہے اور کچھ نہیں۔“

”پتا نہیں کیوں ہر وقت اتنا پڑھتی رہتی ہو۔ درد تو ہوتا ہی ہے ناں حالانکہ اب نہ کوئی امتحان دینا ہے تم نے نہ اسکول کالج جاتا ہے کہ استادوں کے ذرے پڑھنا پڑے..... کیہ ہے ان کتابوں میں آخر؟“ موتیا نے بیڈ پر بھری

کتابوں کی طرف اشارہ کیا۔

”موتیا!“ بھل نے ایک دم موتیا کے ہاتھ تھام لیے۔ ”سنو تم اماں سے کہو ناں مجھے کالج میں داخل کروادیں۔

مجھے بی اے کرنا ہے۔“

”اماں ہم سے زیادہ تو تمہاری مانتی ہیں جو... کیا تم نے خود اماں سے نہیں کہا؟“ موتیا کو بھل سے بہت محبت تھی۔

”نہیں۔“ بھل نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اماں نے ادھر لاہور میں ہی کہہ دیا تھا کہ بس جتنا پڑھ لیا کافی ہے۔“

”دراصل اماں نے تمہارے لیے کچھ اور سوچ رکھا ہے۔“ موتیا مسکرائی۔

”کیا...؟“ اس کا دل لمحہ بھر کو کانپ سا گیا۔ کانٹوں میں سنہری کی باتیں گونجنے لگیں کہیں اماں نے اس کا

سودا کسی بہت بڑے رئیس سے تو نہیں کر دیا۔

”اماں تمہیں ایکسٹریس بنانا چاہتی ہیں اور انہوں نے یہ سب ہی سوچ لیا تھا جب تم چھوٹی سی تھیں۔ سب ہی تو

چار چار جماعتیں بھی پڑھاتی ہیں اور تیری ہی خاطر تو اماں نے لاہور چھوڑا ہے ورنہ اماں کو اپنا چوبارہ چھوڑتے بڑا دکھ

ہوا تھا۔ دراصل ادھر کراچی میں ذرا سے بہت بستے ہیں ناں... فلمیں تو اب زیادہ نہیں بنتیں پر پھر بھی اماں کہہ رہی

تھیں نلہوڑے سے کہ پہلے ذرا مومن میں چاس مل جائے تو پھر فلم میں بھی مل ہی جائے گا۔“

”لیکن موتیا مجھے اداکاری کہاں آتی ہے؟“ وہ روہاںسی ہوئی۔

”اداکاری کون سا مشکل کام ہے جو، اماں کہتی ہیں عورت سے بڑا اداکار کوئی نہیں ہوتا۔ چاہے ہماری طرح

بازار میں بیٹھنے والی عورت ہو چاہے گھر میں رہنے والی شریف زادی۔ سب ہی اداکار ہوتی ہیں۔“

”نہیں موتیا، اداکاری آسان کام نہیں ہے۔ بہت مشکل کام ہے۔“

”کتنا مشکل جو؟ کیا اس سے بھی مشکل کام جو ہم کرتے ہیں اپنے وجود کی نفی کرنا اور اپنے عورت پن کی تحقیر

خود کرنا۔“

موتیا کے لہجے میں کچھ ایسا تھا جس نے بھل کو چونکا دیا۔ موتیا نے کبھی سنہری کی طرح جھگڑنے کیے تھے اور نہ ہی

کبھی کسی بیزاری کا اظہار کیا تھا وہ ہمیشہ اپنی زندگی سے بہت مطمئن اور خوش لگتی تھی لیکن آج اس کے لہجے سے کیسا

درد جھلکتا تھا جو دل پگھلاتا تھا بھل نے اس کے چہرے کی طرف کھوجتی نظروں سے دیکھا لیکن وہ لہجے بھر پہلے والا اثر

اب اس کے چہرے پر نہیں تھا اور وہ مسکراتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میرے خیال میں اماں نے تمہارے لیے بہت اچھا سوچا ہے جو۔ تم بہت لگی ہو۔۔۔ اماں تمہاری اس موٹائی

صورت کی وجہ سے ہمیشہ سے ہی تم پر مہربان تھیں، تم کو شش کرنا کہ اداکاری سیکھ لو اور یہ روح و جسم کے سودا کرنے

سے اچھا ہے۔“ موتیا کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کر گزر گیا۔ بھل کی اذیت میں جیسے اضافہ ہوا تھا اس نے انگوٹھے

اور شہادت کی انگلیوں سے اپنی کنپٹیوں کو دبا دیا۔

”کیا بہت درد ہو رہا ہے جو؟“ موتیا نے ہمدردی سے اسے دیکھا تو اس نے سر ہلادیا۔

”میرے پاس سردی کی گولیاں ہیں۔ میں لاتی ہوں تمہارے لیے۔ تم موراں سے کہو تمہارے لیے چائے

بنادے۔ گولی لے کر گرم، گرم چائے پینا سرد دھکیک ہو جائے گا۔“ موتیا اٹھی تو وہ بھی اٹھ کر باہر آگئی اور سینیٹرھیوں پر

سے نیچے لاؤنج میں جھانکا۔ لاؤنج خالی پڑا تھا بس ایک لائٹ جل رہی تھی۔ غالباً سنہری اور چینیلی جا بچی تھیں اور چتا

نہیں موراں کہاں تھی۔

”موراں!“ اس نے موراں کو آواز دی اور جب کوئی جواب نہ ملا تو نیچے اترنے لگی تاکہ خود ہی چائے بنا لے،

چائے کی عادت اسے کانچ میں پڑی تھی۔ آٹھ ہر فری پیریدہ اور بریک میں چائے پینے کی عین پہنچ جاتی اور ساتھ اسے بھی تحسین ملتی تھی۔

آج شام اس نے چائے نہیں پی تھی شاید اس لیے بھی سر درد زیادہ ہو رہا تھا۔ شاہجہاں کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے موراس کی آواز سنائی دی۔ ہمیشہ کی طرح وہ بلند آواز میں بول رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے دروازے کو دھکیلا۔ سامنے بی بند پر شاہجہاں لیٹی ہوئی تھی اور موراس پائنتی کی طرف مٹھی اس کے پاؤں دبا رہی تھی۔

”آؤ..... آؤ سوجو۔“ شاہجہاں کی نظر اس پر پڑی اور وہ پاؤں کھینچتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”آ جاؤ بیٹی۔“ بھل کے لیے اس کی آواز میں یوں ہی متحاسن لگ جاتی تھی۔

”نہیں اماں، سر میں درد ہو رہا تھا چائے پینے چاہیے تھی۔ باتوں کی آواز سن کر ادھر آگئی آپ بھی نہیں سنہری وغیرہ کے ساتھ؟“

”نہیں، یہ آج صبح سے ہی گھٹنے اور پاؤں سو جے ہوئے ہیں، بہت درد ہو رہا تھا..... تو بیٹھو اور موراس چائے بنا کر لے آئی ہے تیرے لیے۔“

”ارے یہ موراس درد تو تیرا پیچھا ہی نہیں چھوڑتا ابھی ہی تو کبیر رہی تھی میں تیری اماں سے کہ ہر وقت کتابوں میں گھسی رہتی ہے۔ اللہ نہ کر۔ رینک لگ جائے۔“ موراس بند سے اتر کر چپل پہننے لگی۔

”ایک کپ چائے میرے لیے بھی بنا۔“ میرا سر بھی بہت بھاری ہو رہا ہے۔“ شاہجہاں نے موراس سے کہا اور بھل کی طرف دیکھا۔

”آ اور میرے پاس آ جا میں تیرا سرد داتی ہوں۔“ بھل سے بات کرتے ہوئے ہمیشہ ہی اس کے چہرے پر ماتا بکھر جاتی تھی اور ایسے میں بھل کو وہ ایک عام ماں لگتی۔۔۔ مٹا سے بھر پور اس شاہجہاں سے بالکل مختلف جو محفل میں بیٹھ کر ہاتھ رہا تھا، مار کر اونچے قہقہے لگاتی تھی۔ اسے لاہور والے چوہارے میں سجنے والی کئی نمفلیس یاد آ گئیں۔ موتیا، سنہری، چینی کی کار قس کران کا گانا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر شاہجہاں کی طرف دیکھا۔

”نہیں اماں، میں کمرے میں جا کر لیٹوں گی۔ موتیا میرے لیے اپنے کمرے سے سر درد کی گولی لینے گئی تھی۔“ اس نے موراس کی طرف دیکھا جو ابھی تک کھڑی تھی۔

”اور موراس پلیز تم میری چائے اوپر ہی دے جانا میرے کمرے میں۔“ موراس سر ہلا کر باہر نکل گئی۔

”جو میری گزیا موراس صبح بھتی ہے ہر وقت کتابوں میں گھسی رہتی ہو سر درد تو ہو گا ناں۔“ وہ محبت اور تشویش سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ”کہو تو ڈاکٹر کے پاس لے چلوں؟“

”نہیں اماں گولی کھا کر اور چائے پی کر سو جاؤں گی تو آرام آ جائے گا اور موراس سے کہنا مجھے کھانے کے لیے نہ چگائے۔“

شاہجہاں نے سر ہلایا۔

”اچھا جیسے تیری مرضی۔“

جونکی وہ واپس مڑی شاہجہاں نے کچھ یاد کرتے ہوئے اسے آواز دی۔

”سنو جو، موتیا سے کہنا دو گھڑی کو کمر ٹیک لے اکڑ کے بیٹھی نہ رہے۔ صاحبزادہ صاحب کا فون آیا تھا گیارہ

بجے تک گاڑی بھیجیں گے۔“

اس کی پیشانی پر شکن سی نمودار ہوئی اور بنا کچھ کہے اس نے دروازہ کھولا اور باہر دروازے پر دستک دینے کے لیے اٹھے ظہور سے کہہ باجھہ بچے گر گئے۔ ہمیشہ کی طرح ظہور سے کی نظریں اس کے پاؤں پر سے ہوتیں اس کے چہرے پر تک گئیں۔ ایک ناگواری نظر ظہور سے پر ڈالتی وہ ساندے سے نکل کر تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ ظہور پورے کا پورا اس کی طرف گھوم گیا تھا۔

”اب مر بھی چیک ظہور سے۔“ شاہجہان کی تیز آواز پر وہ چونکا اور اندر قدم رکھتے ہوئے دروازہ بند کیا۔ شاہجہان اسے صو رہی تھی۔ ”تیری نظروں کی بددلتی نہیں جاتی ظہور سے۔ اس کاغذی رشتے کا ہی لحاظ کر لیا کر۔“

”کاغذ پر لکھنے سے میں اس کا باپ تو نہیں بن گیا تاں۔ کتنی بار کہا ہے مجھ سے نکاح پڑھا لے، کاغذی رشتہ بچ بچ کا رشتہ بن جائے گا۔ تمہاری بیٹیاں میری بیٹیاں۔ ویسے میں بددلتی سے نہیں دیکھتا اسے۔۔۔ اللہ کی منائی کو سراہتا ہوں کیا ہیرا تیری گود میں ڈالا ہے اس نے۔“

”اچھا بک بک نہ کر۔“ شاہجہان نے اسے گھر کا۔ ”پل بتا چھوڑ آیا لڑکیوں کو اچھی طرح اطمینان کر لیا تھا کسی بھڑی تھی سب لوگ ٹھیک تھے ناں۔ کسی گڑ بڑ کا ڈر تو نہیں؟“

”ارے کیسی گڑ بڑ شاہجہان بیگم۔ کل تم بھی تو نئی تھیں سب شریف، معزز لوگ تھے۔“

”ہاں کل تو گھر پر ہی فنکشن تھا تھوڑے سے لوگ تھے آج بڑا فنکشن ہے ہال میں تو پوچھ رہی تھی۔ آخر اپنی عزت کا خیال بھی تو رکھنا پڑتا ہے ناں۔“

”ہماری عزت؟“ ظہور رازور سے ہنسا۔

”چل دانت اندر کر۔“ شاہجہان برا مانا گئی۔ ”تو کیا ہماری عزت نہیں ہے۔ ہم کیا ملکی بازاروں میں پڑے ہیں۔ سو متیں کروا کے کہیں جاتے ہیں۔“

”برامان گئی ہو۔“ ظہور سے اسے دیکھ۔

”ہاں تو برامانے کی بات ہی کی تم نے۔ اپنے حساب سے سب کی عزت ہوتی ہے بھلے عزت کے معیار الگ، الگ کیوں نہ ہوں۔ سچ تیرا ہنسنا تیر کی طرح لگا ہے مجھے۔“

”اچھا پل صاف کر دے۔ سازندوں کے ساتھ شیدے لیے کو بھی چھوڑ آیا ہوں۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو لمبا لٹا دیتا ہے اگلے کو۔۔۔ واپسی کے لیے بھی راجا صاحب نے کہا ہے کہ گاڑی پر بھجوا دیں گے سب کو تم بھی چلی چلیں۔ سنا ہے بڑے، بڑے سکر آئیں گے آج۔“

”میرے گھنٹوں میں بہت درد تھا۔“

”شوگر کی گولیاں کھانی چھوڑ دی ہوں گی تم نے اور میں دیکھ رہا تھا کہ کل کس طرح حلوے سے پلیٹ بھری ہوئی تھی تم نے۔“

”تیری نظریں مجھ پر ہی رہتی ہیں کیا؟“ شاہجہان مسکرائی۔

”دیکھ لے ایک بار نظر اٹھی تھی تیری طرف پھر گری ہی نہیں۔“

”پھر شروع ہو گئی تیری بک، بک۔ چل بیٹھ ادھر اور بتا کچھ خیر خبر ملی۔ کہہ رہا تھا ناں کہ شام تک کچھ خبر مل جائے گی۔“ شاہجہان نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ موز سے کوٹھیت کر بند کے سامنے لایا اور بیٹھ گیا۔

”نہیں کسی کے متعلق کچھ نہیں پتا چلا۔ نہ حیاتی دادا کے متعلق نہ خانو استاد کے بارے میں۔۔۔ ان کے ٹھکانوں پر بندہ گیا تھا ایک اپنا لیکن وہ تو پرانے ٹھکانے چھوڑ چکا ہے کہاں اڑنچھو ہو گئے پر یہ بتا مجھے اتنی اڑیک کیوں

ہے تجھے ان کی۔ بیٹھے بٹھائے اٹھارہ انیس سال بعد تجھے کیا ضرورت آپڑی ہے ان کی؟

”ہاں آپڑی ہے ضرورت..... تجھے کیوں خفتان ہو رہا ہے؟“

”لے مجھے کیوں خفتان ہونا ہے بس ہنسی آتی ہے مجھے کہ اٹھارہ سال بعد پرانا عشق جاگ اٹھا ہے۔ کیا پتا مر

کھپ گئے ہوں۔ ایسے لوگوں کے ہزار دشمن، بچن ہوتے ہیں۔ سائیں منہ سے بھی تو اس نے پنگا لے لیا تھا۔“

”زیادہ بک، بک نہ کیا کر ظہور ہے، کسی روز ہاتھ پکڑ کر دروازے سے باہر نکال دوں گی۔“

”ارے ایسا غضب نہ کرنا شاہجہان بیگم۔“ اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ”اس عمر میں اب کہاں ذلیل و خوار

ہوؤں گا مرتے دم تک تیرا درد نہ چھوڑنے کا عہد باندھ کر بیٹھا تھا ادھر۔“

”اچھا زیادہ ادا کار نہ بن اور اپنے کام سے کام رکھا کر، میں تو بس کسی وعدے کے بندھن میں بندھی ہوں۔

کسی سے کوئی وعدہ کر رکھا تھا وہی نبھاتا ہے۔“

”کیا حیاتی دادا سے وعدہ کر رکھا ہے کوئی؟“ ظہور اچھر متحس ہوا تو شاہجہان نے آنکھیں نکالیں۔

”تو باز نہیں آئے گا ظہور بھلا حیاتی دادا نے مجھ سے کیا وعدہ لیتا تھا وہ تو.....“

”ایک بات بتاؤں شاہجہان بیگم۔“ ظہور اچھے کچھ یاد کرتا ہوا بولا تھا۔ ”یہ جو ہمارا بنگلا ہے ہاں اس کے

سامنے والی لائن میں سڑک پار کر کے دائیں طرف سے پانچویں نمبر پر جو بنگلا ہے ہاں اس کے باہر گیٹ کے پاس

شیدے نے دیکھا تھا حیاتی دادا کو اور تم جانوشیدے کی نظر بڑی تیز ہے۔“

”اچھا“ شاہجہان بیگم کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ ”دکھانا مجھے وہ بنگلا کسی دن۔“

”دکھا دوں گا۔“ پر ادھر کوئی پروتیسر رہتا ہے۔ کہہ رہا تھا اس نام کے بندے کو نہیں جانتا۔ بتایا تو تھا تجھے۔“

”ہوں۔“ شاہجہان نے پُرسوج انداز میں سر ہلایا۔ ”کسی روز میں بھی اُدھر جا کر دیکھوں گی۔ کیا پتا نام شام

بدل لیا ہو..... مرد چلا لاک ہوتے ہیں گھر کی عورتوں سے بات کروں گی۔“

”ارے ہاں۔“ ظہور نے سر پر ہاتھ مارا۔ اس کی عادت تھی جب کوئی بھولی ہوئی بات اسے یاد آتی تو

یوں ہی سر پر ہاتھ مارتا تھا۔ ”ایک تو تم ہوش بھٹا دیتی ہو شاہجہان بیگم لاہور سے نور بھی بڑی خبریں آئی ہیں۔ اُدھر

تجھے بھی کوئی ڈھونڈنا پھر رہا ہے۔“

”کون؟“ شاہجہان چونکی۔

”پتا نہیں..... دو تین چکر لگائے اس نے تیرے چوہارے کے۔ سب سے تیرا پتا پوچھتا پھرا۔ ایک روز

راہا کے چوہارے پر چلا گیا تو راہا کے اسے بتا دیا کہ تم کبھی چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہو۔“

”نام پتا نہیں بتایا اس نے اپنا راہا کو؟“

”نہیں بس پوچھ کر چلا گیا۔“

”ہوگا کوئی۔“ شاہجہان نے کندھے اچکائے۔

”کوئی پرانا طلبہ گریا پھر کیا پتا حیاتی دادا کا ہی دل گر لایا ہو تیرے لیے۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے اُدھر تو

اسے ڈھونڈ رہی ہے اُدھر وہ۔“ ظہور نے کی زبان پھر کھلی لیکن اس بار شاہجہان نے غصے کا اظہار نہیں کیا بس اتنا

ہی کہا۔

”جیسے راہا تو نہیں جانتی حیاتی دادا کو۔“ علی کا کون سا مہر ہے جو حیاتی دادا کا احسان مند نہ ہو اور بتا کیا

خبریں ہیں؟“

”وہ نہیں تھی رادھا کے چوبارے پر ہنسنے، رخسانہ وہ بن گئی ہے اداکارہ۔ ڈراموں میں کام مل گیا ہے اسے۔“
 ”لو... وہ سوٹو اسے کیسے کام مل گیا؟“ شاہجہان کی آنکھیں مارے حیرت کے پھٹ گئیں۔
 ”لو تو کیا مونیوں کی ضرورت نہیں ہوتی ڈراموں میں۔“ ظہور اہنسا۔ ”یہ دھڑا دھڑا نوٹ چھاپ رہی ہے رادھا، اس کی تو بڑی ٹورنار بن گئی ہے۔“

”اچھا۔“ شاہجہان کا دل جیسے بیٹھ گیا تھا۔
 ”ہاں تو اور کیا آج کل تو مجھ جیسے بھی چل جاتے ہیں۔ کل دیکھا نہیں تھا وہ ڈراما اس میں جو لون تھا مجھ سے بھی گیا گزرا تھا۔“ اس نے اپنی راکمیں موٹھ مروڑی۔
 ”تو بھی کوشش کر لے۔“ شاہجہان مسکرائی لیکن اس کی مسکراہٹ بھی، جی بھی سی تھی۔ ہنسنے کے ڈراموں میں کام کرنے کا سن کر دل پر بوجھ سا آ پڑا تھا۔

”ہاں اور ایک اور خبر بھی ہے بڑی زبردست..... رادھا کے چوبارے پر ایک نئی لڑکی ہے سنا ہے چاند کا ٹکڑا ہے..... چاند کا۔“ شاہجہان کے دل پر بڑا بوجھ بڑھ گیا۔

”ہاں سے آئی ہے؟“

”یہ تو پتا نہیں۔“

”تو پتا چلاتاں بلکہ ایسا کر ایک دو دن کے لیے لاہور چلا جا بلکہ کل ہی نکل جا۔“
 ”کل تو وہ انصاری صاحب کی طرف جانا ہے جو کو لے کر۔“ تجھے بتانا یاد ہی نہیں رہا۔ صبح صبح گیا تھا ان کے پاس دو گھنٹے بٹھانے کے بعد بلایا اور کہہ دیا کہ کل لے آؤں جو کو آڈیشن کے لیے۔ کل تین بجے جانا ہے جو کو کہہ دینا تیار ہو جائے۔“

”اچھا۔“ شاہجہان خوش ہو گئی۔ ”دیکھ لینا وہ ضرور اپنی جو کو ڈراموں میں کام دے دیں گے ظہور ہے۔“
 ”ہر جگہ سفارش چلتی ہے شاہجہان بیگم۔ موتیا سے کہو ناں کہ صاحبزادہ صاحب سے بات کرے بڑے تعلق ہیں ان کے لوگوں سے۔ یہ سہیل انصاری تو مجھے ایویں ہی لگ رہا ہے۔ خواہ خواہ میں ہی دوڑیں لگواتا رہے گا۔ کام کرنے والا بندہ نہیں لگتا۔“

”تو پھر دفع کر اسے میں موتیا سے کہتی ہوں وہ صاحبزادہ صاحب سے بات کر لے۔“

”ہاں، بڑی دور تک پہنچ ہے صاحبزادہ صاحب کی اور اپنی موتیا کی بات نہیں نالنے والے وہ..... دیکھا نہیں تھا کل نظریں کیسے موتیا پر جمائے بیٹھے تھے۔ آج تم گھنٹوں کا درد لے کر بیٹھ گئیں، جاتیں تو چار اور لوگوں سے میل ملاپ ہوتا ہے۔ یہاں کراچی میں ابھی نئے ہیں تو تعلق اور جان پہچان تو ایسے ہی ہو گئی ناں۔“ ظہور نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور منہ پر ہاتھ رکھ کر جھانکی روکی۔

”سگریٹ کی طلب ہو رہی ہے ذرا ایک کش لگا کر آتا ہوں۔“

شاہجہان نے سر ہلایا وہ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”اگر خانو استاد اور حیاتی دادا کا پتا نہیں چل رہا تو میرا کیا تصور میں نے تو اپنی ہی کوشش کر ڈالی ڈھونڈنے کی۔ ایک سال سے تو تلاشتی پھر رہی ہوں۔ اس لیے اب تک کوئی قدم نہیں اٹھایا اور اب دیکھو اس رادھا کی، وہ موٹی ہنسنے بھی ڈرامے کرنے لگی۔ بس رہ گئی میری جگہ، ایک دفعہ جائے میدان میں تو سب کے چھٹے چھڑا رہے گی اور کیا پتا انڈیا والے دیکھ کر اپنی فلموں کی ہیروئن بنائیں۔ کیا کریںہ کپور اور رینا ایٹوریا رائے سب اس کے سامنے پانی بھرتی

ہیں اور شیٹو..... بوزھی اور موٹی پرست۔ ” ایک منڈی سانس لے کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تاکہ بوتا کو بھی طرح سمجھا سکے۔ کب سے دل میں خواہش چھپائے بیٹھی تھی کہ بوتا کو اکارہ بنائے گی۔ ” اور یہ رادھا کتنی تھنی بوشیارنگی اپنی لڑکی کو ڈراموں میں کھایا دیا اور ہوا تک نہ گنے دی ہمیں اور میں گھریا مچوڑا دھرا بیٹھی اور اس نے وہاں بیٹھے ہی کام دکھا دیا، دفعہ۔ ” اس نے ہاتھ اٹھا کر جیسے کچھ اڑایا۔ ” میں خواہ مخواہ ایک بات کو لیے بیٹھی تھی۔ کیسا دھڑکنا، کہاں کا دھڑکنا ایک بات تھی رات گئی بات گئی۔ ” اس نے دائیں پاؤں کی ایڑی کو یوں دبایا جیسے اس رات کی بات کو اس نے ایڑی کے نیچے مل دیا ہو اور پھر گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر میز پر جھکی بیٹھی۔

ہملا بہا بہا

ڈی ون کے ٹوٹے روم میں وہ بے چینی سے ٹپ رہا تھا۔ اسے پاکستان واپس آئے چند دن ہو گئے تھے لیکن اس کا قیام ڈی ون میں ہی تھا ابھی تک وہ گھر نہیں گیا تھا۔ ممتاز خان سے فون پر بات ہو گئی تھی۔ ممتاز خان نے اسے بتایا تھا کہ اس کے جانے کے بعد ایک بار بھی عظام گھر نہیں آیا۔ عظام جب ہاسٹل میں تھا تو کبھی گھر نہیں آتا تھا چھوٹا تھا تب تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیلے گھر آنے کا جب تک وہ خود اسے نہ لے کر آتا لیکن جب کانٹا میں چلا گیا تب بھی وہ کبھی گھر نہیں آیا تھا حالانکہ اسے پتا تھا کہ ٹر حیات کے جانے کے بعد بھی گھر میں ملازم ہوتے ہیں لیکن وہ جب فون کر کے بلاتا تب ہی گھر آتا لیکن اب وہ رواد کے گھر تھا اور ہو سکتا ہے کہ کسی روز وہ یونی کوئی کتاب یا اپنی ضرورت کی کوئی چیز لینے گھر چلا آئے۔ پتا نہیں یہ خیال کیسے اس کے ذہن میں آیا تھا لیکن یہ خیال آنے کے بعد وہ ہر گاہ سے واپس آ کر گھر جانے کے بجائے ڈی ون میں ہی میٹم ہو گیا تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ عظام کو پتا چلے کہ وہ پاکستان میں ہے۔ بگ بانے اس کے ذہن بہت سے کام لگا رکھے تھے، عظام کے ساتھ رہ کر جنہیں وہ نہیں کر سکتا تھا۔ پاکستان آنے سے پہلے ایک دن اس نے عظام سے بہت لمبی بات کی تھی اور اسے بتایا تھا کہ آئندہ چند ہفتے وہ بہت مصروف رہے گا اس لیے کال نہیں کر سکے گا۔ عظام، رواد کے گھر بہت خوش اور مطمئن تھا اور اپنی تعلیم کے ختم ہونے کا انتظار بے چینی سے کر رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ رہ سکے لیکن اسے لگتا تھا جیسے وہ اگلے کئی سال تک اس دلدل سے نہیں نکل سکے گا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر بھجوادے گا۔ یو کے، امریکا، آسٹریلیا کہیں بھی اور اس دوران خود کو اس جال سے باہر نکالنے کی کوشش کرے گا۔ بگ با سے اس سلسلے میں اس نے تفصیلی بات کی تھی۔ بگ با ہمیشہ سے ہی اس کے سپرد دل میں ایک نرم گوشہ رکھتا تھا۔ اس نے بہت درد مندی سے اس کی بات سنی تھی لیکن اب وہ ایک عام معمولی سا فنڈایا اسٹنگر نہیں تھا۔ وہ بین الاقوامی گروپوں سے تعلق کا گنہ بیٹھ تھا۔ اب وہ بھی کسی کو جواب دہ تھا اور پتا نہیں کبھی وہ عظام کی خواہش پوری کر سکے گا یا نہیں۔ بگ بانے کہا تھا یہ اتنا آسان نہیں ہے پھر بھی وہ سوچے گا اس کے متعلق۔ پاکستان آنے کے بعد اس کی اس موضوع پر بگ با سے بات نہیں ہو سکی تھی حالانکہ وہ ڈی ون میں ہی مقیم تھا اور بہت مصروف تھا لیکن ٹر حیات نے اس کی مصروفیات کے متعلق جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یکا یک ہی ہر شے سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا اب تو ایک ہی خواہش رہ رہ کر دل میں چٹکیاں بھرتی تھی کہ عظام کی شادی ہو، اس کے بچے ہوں وہ عظام اور اس کے بیوی بچوں کے ساتھ ایک مارل زندگی گزارے۔ پر سکون ہر خوف سے آزاد۔

ٹھیلے ٹھیلے وہ کھڑکی کے پاس رکا اور پردہ ہٹا کر باہر دیکھا اور کچھ دیر تک وہ یونی باہر دیکھتا رہا تب ہی بگ با کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ بگ با کی گاڑی اندر آ رہی تھی۔ وہ پردہ برابر کر کے کھڑکی کے پاس سے ہٹ آیا اور گہری سانس لے کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

”کیا ملا اس سب بھاگ دوڑ اور جنگ و دو سے؟“ اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے صوفے کی پشت سے سر ٹیک لیا۔

کیا خبر تھی کہ زندگی اس سے ایسا اس طرح کا امتحان لے گی۔ جب سمجھی وہ اپنے بائیں پر نظر ڈالتا تو اسے لگتا وہ بالکل خالی ہاتھ اور خالی دامن ہے۔ ساری زندگی کی بھاگ دوڑ کا حاصل کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ اسے اپنا حال اس فقیر کی بوسیدہ چادر کی طرح لگتا جو اپنی عمر بھر کی کمائی اپنی تار تار چادر میں اکٹھی کرتا رہا ہو اور پھٹی ہوئی چادر سے سب گرتا رہا ہو۔ بس اتنی کسی کو نے میں کوئی سکھانکارہ گیا ہو اور اب وہ اسے مضبوطی سے منگھلی میں صلیے بیٹھا ہو کہ وہ اپنے اس آخری سرمائے کو بھی کھوندے۔ اس کے پاس بھی تو کچھ نہ تھا سوائے عظام کے۔ یکا یک اس کا جی چاہا وہ یہاں ایک منٹ نہ رکے، بھاگتا ہوا جائے اور عظام کو اپنی بانہوں میں چھپالے۔ تار تار چادر میں انکا سکھ اس کا آخری سرمایہ تھا اور وہ اسے کھوتا نہیں چاہتا تھا۔ اس لمحے اسے عظام بہت شدت کے ساتھ پاؤا اور عظام کے ساتھ کوئی اور بھی اتنی ہی شدت سے پاؤا تھا، اس نے اس کی شبیہ کو تصور میں لانا چاہا لیکن اس کے تصور میں فری آگئی تھی۔ روٹی، گڑ، گڑائی، ہاتھ جوڑتی، میس کرتی ہوئی اور اس کے دونوں ماموں فرعون بنے ہوئے تھے اور ارد گرد ہجوم تماشا شائی بنا کھڑا تھا۔ ان میں اکثر چہرے اس کے مشا ساتھ تھے لیکن اس وقت سب نے ہی اجنبیت کے نقاب چڑھا رکھے تھے۔

”خدا کے لیے اسے کچھ مت کہیں۔ ہم سچے جائیں گے، ہم یہاں نہیں رہیں گے۔“ تب ہی کھلے دروازے سے کوئی اندر آ کر دباڑا تھا۔

”کیا ہو رہا ہے یہ؟“ اس نے ناک سے بہتے خون کو پونچھتے ہوئے آنے والے کی طرف دیکھا۔ جلیل خان غضب ناک نظروں سے سب کی طرف دیکھ رہا تھا، اس کے پیچھے شیر خان بھی ہاتھ میں کچھ شاپر پکڑے اندر داخل ہوا تھا۔

”یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے تم لوگوں نے؟“ جلیل خان چند قدم آگے بڑھا تھا۔ ”تم لوگوں نے جرات کیسے کی ایک چادر دیواری کا تقدس مجروح کر کے اندر قدم رکھنے کی؟“ شیر خان نے شاپر برآمدے میں پڑے تخت پر رکھ کر ہوسٹر سے ریوالتور نکالا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ریوالتور دیکھتے ہی ہجوم تیزی سے منتشر ہوا تھا۔ وہ سب تقریباً ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے باہر نکلے تھے اور اب محن میں صرف اس کے دونوں ماموں کھڑے جلیل خان کو خوشخوار نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”فری..... بیٹی۔“ جلیل خان نے فری کے سر پر ہاتھ رکھا تو فری کا بچتی ہوئی زمین سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ جلیل خان نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ حضرات کون ہیں اور یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

”میں سوال آپ سے بھی کیا جا سکتا ہے سسر آپ کون ہیں اور یہاں کس مقصد سے آئے ہیں؟“ چھوٹے ماموں ہمیشہ سے ہی کچھ نڈر تھے سو انہوں نے وہی سوال جلیل خان سے کر ڈالا تھا۔

”میں اس بچی کا سر پرست ہوں۔ بیٹی ہے میری۔“ جلیل خان نے فری کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ”اور میں کسی کو اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ میری بیٹی کے گھر گھس کر غنہ اگری کرے۔“

”اچھا؟“ چھوٹے ماموں کے لبوں پر ایک مذاق اڑاتی ہوئی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

”یہ بڑا ہمارا بھانجا ہے جس کے ساتھ تمہاری لڑکی بھاگ کر۔“

”خبردار اس کے بعد ایک لفظ زبان سے مت نکالنا۔“ جلیل خان پھر دباڑا تھا۔

”شیر خان ان صاحبان کو باہر نکال کر دروازہ بند کر دو۔“ اس نے شیر خان کو اشارہ کیا۔
 دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر دروازے سے باہر نکل گئے لیکن ان کی باڈی لینگوئج بتا رہی
 تھی کہ اس وقت وہ مصلحتاً چلے تو گئے ہیں لیکن پھر آئیں گے اور شکر کو ہاں نہیں رہنے دیں گے۔
 شیر خان نے دروازہ بند کر دیا تھا اور جلیل خان تخت پر بیٹھا تاسف سے انہیں دیکھ رہا تھا۔
 ”تم میری عدم موجودگی میں چلے آئے جبکہ میں نے کچھ اور سوچ رکھا تھا اور اب میں فرجی بیٹی کو لینے آیا تھا
 دراصل میں چاہ رہا تھا کہ فرجی بیٹی کو میں روایتی طریقے سے بیٹیوں کی طرح رخصت کروں۔ تم اپنے عزیزوں اور
 دوست احباب کے ساتھ بارات لے کر آؤ اور اسے عزت کے ساتھ رخصت کروا کے گھر لاؤ تاکہ کوئی تمہاری اور
 فرجی کی طرف انگلی نہ اٹھائے اور تمہارے رشتے پر شک نہ کرے لیکن یہاں یہ کیا تماشا دکھا ہوا تھا اور تمہارے اہل
 محلہ تمہارے گھر میں کیوں اکٹھے تھے اور تمہارے ناموں کیا چاہتے تھے؟“
 تب اس نے جلیل خان کو تفصیل بتا دی تھی اور جلیل خان نے اس سے پوچھا تھا۔
 ”پھر اب تمہارا کیا ارادہ ہے شمر..... کیا کرو گے تم؟ ان حالات میں کیا یہاں ہی رہو گے؟“
 اور اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ ماموں کے کڑے تئو اسے نظر آ رہے تھے اہل محلہ کا رویہ بھی
 اس نے دیکھ لیا تھا پھر بھی اس نے یہاں ہی رہنے کا فیصلہ کیا تھا یہ اس کا اپنا گھر تھا وہ کیوں خوفزدہ ہو کر یا تو رکر اپنا گھر
 چھوڑ دیتا۔

”شمر یہ میرا گھر ہے میں اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟“
 ”اوکے ریٹیکس شمر حیات..... فی الحال میرے ساتھ چلو پھر سوچتے ہیں کیا کرنا ہے۔“
 ”شمر پلیز چلو۔“ فرجی نے التجا کی تھی۔
 ”سراپ فرجی کو ساتھ لے جائیں۔ حالات بہتر ہوتے ہی میں چند دوستوں کو لے کر آؤں گا اور باقاعدہ
 رخصتی کروا کے لے آؤں گا۔ کیا خبر تب تک اماں کا بھی پتا چل جائے۔“ دل خوش فہم نے امید دلائی تھی تو وہ کچھ
 پُر اعتماد نظر آنے لگا تھا۔
 ”میں خانہ وال سے ایک خاتون کو لایا ہوں۔ میری جاننے والی ہیں بیوہ ہیں۔ خیال تھا کہ وہ فرجی کی رخصتی
 کے لیے خریداری وغیرہ میں مدد کریں گی۔ میں بہت دھوم دھام سے رخصت کرنا چاہ رہا تھا اپنی بیٹی کو۔“
 فرجی کی آنکھیں برسنے لگی تھیں۔
 ”سراپ کے احسانات میں سے یہ ایک اور احسان ہے ہم پر۔ ہم کبھی بھی آپ کے احسانات کا بدلہ نہیں چکا
 سکتے۔ میں بھی فرجی کو چوروں کی طرح نہیں عزت و احترام سے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔“
 ”بے وقوف لڑکے میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ جب میں نے فرجی کو بیٹی کہا ہے تو مجھے اس رشتے کی
 نوج بھی رکھنی ہے۔ ہم جیسے لوگ بھی بیٹیوں اور بہنوں کے لیے جانیں دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔“ جلیل خان نے
 کھڑے ہوتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔
 ”میری خواہش ہے کہ تم بھی میرے ساتھ ہی چلو لیکن میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔“
 ”شمر تم بھی ساتھ چلو۔ تم یہاں اکیلے کیسے رہو گے؟“ فرجی نے اسرار کیا تھا لیکن اب وہ اپنا گھر خالی نہیں
 چھوڑنا چاہتا تھا۔

”یہ میں کچھ کھانے پینے کا سامان لایا تھا۔ سوچا تھا پہلی بار بیٹی کے گھر جا رہا ہوں خالی ہاتھ نہ جاؤں۔“ جلیل

خان نے شاپر کی طرف اشارہ کیا اور فرحی کی طرف دیکھا۔

”تم نے کیا سوچا ہے چلوگی میرے ساتھ؟“ فرحی زار و قطار رونے لگی تھی۔

”فرحی پلیز تم چلی جاؤ سر کے ساتھ..... میں آتا رہوں گا تمہاری خبر لیتا رہوں گا لیکن یہاں یہ لوگ..... پھرتے

آجائیں جگ کرنے تم چلی جاؤ پلیز.....“

”تم کہو تو شیر خان کو یہاں ہی چھوڑ جاتا ہوں۔“ لیکن اس نے انکار کر دیا تھا اور جلیل خان، فرحی کو لے کر چلا

گیا تھا۔ فرحی دروازے سے نکلتے ہوئے بھی رو رہی تھی۔ وہ جلیل خان کے خلوص سے بہت متاثر ہوا تھا وہ اس کا کوئی

شخص تھا لیکن اس نے انہیں پناہ دی تھی۔ ان کے لیے سوچا تھا ان کی بات پر یقین کیا تھا لیکن وہ جو اس کے اپنے تھے

انہوں نے اس کے ساتھ کیا، کیا تھا پوری رات وہ جاگتا رہا کبھی اماں کے کمرے میں جاتا، کبھی اپنے کمرے میں کبھی

برآمدے میں آکر بیٹھ جاتا۔ ایک بار تخت پر بیٹھے دیوار سے ٹیک لگائے، لگائے اس کی آنکھ لگ گئی تو اس نے دیکھا

لباس کے سر پر ہاتھ پھیر رہے ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھ رہے ہیں۔ اسے دلا سادے رہے ہیں۔

وہ چاروں طرف اماں کو دیکھ رہا ہے اور اماں اسے کہیں نظر نہیں آئیں۔

”اماں کہاں ہیں؟“ وہ صبح مار کراٹھ بیٹھا تھا۔

صبح وہ گھر سے باہر نکلا اور اگلے کئی دن تک اماں کو ڈھونڈتا رہا۔ محلے واسلے اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتے۔ لڑکے

آوازیں کتے اور محلہ چھوڑ دینے کی بات کرتے۔ اس نے کچھ نہیں کیا تھا اس کے ساتھ تو ظلم ہوا تھا۔ ابا دیا سے ہی

چنے گئے تھے اور اماں پتا نہیں کہاں گئیں، یہ لوگ اس سے ہمدردی کرنے کے بجائے اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔

اسے برا بھلا کہہ رہے تھے۔ کس نے ان کے کان بھرے تھے، اس کے بارے میں کیا کہا تھا وہ نہیں جانتا تھا۔ ایک دو

میں کی پیچھا ترقی و ترقی

جاسوسی شہر میں کی جا رہا تھا

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

ورڈل کے اسٹے پیڈ یہ انسان کو روکنا عات سے لیے کچھ منہ تھے وہاں

● مسیحا ● محی الدین نواب کے شہر قلم سے دور مسیحائی کا انوال

● آوارہ گرد ● دکھ سکھ کے شہر کہہ تھیں کی ایک زلی اور انوکھی دنیا کی جھلک... ہر ایک

کو اپنی تلاش کا سفر ریش تھا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی شمولیت

● مغرب کے نوالے انداز ● مغربی دنیا کی تہذیب و ثقافت کی عکاسی اور بحیثیت کی پردہ و نقاب فراموش کہانیوں

سرورق کی کہانیاں

● بطنی کہانی ● محبت اور جنگ میں سوچ اور ارادے کی کشمکش کی کہانی

● دوسری کہانی ● عوامی ترقی کے نام پر محنت کا نونوں کی جڑیں کاوش

کاشف زبیر کاوش



پ کے قلم سے

مضمون، محنتیں... کی جڑیں

اور ان کی دلچسپ باتیں... کچھ نہیں

اعتبار و وفا

سے کچھ رقم ادھار نہ مانگ لوں۔ اس وقت جب اس کا کاروبار عروج پر تھا اس نے بھی سن لیا ہوگا کہ ماموں نے ابا کا سارا روپیہ، اپنی کا زینر، دکان، گھر سب قبضے میں کر لیا ہے تو اسے ڈر ہوگا کہ اس سے مدد نہ مانگ لوں تب ہی تو ہاں تب ہی تو حالانکہ اسے تو صرف اس کے کندھے کا آسرا چاہیے تھا۔

اسے لگا جیسے زندگی اس کے اندر مرتی جا رہی ہو۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ اپنے کسی دوست کے پاس چلا جائے گا۔ اس کی مدد سے کوئی چھوٹا سا گھر کرایے پر لے گا اور پھر فرجی کو لے آئے گا چند دوستوں کے ساتھ رخصت کروا کے کوئی جاب کر لے گا جب تک جاب نہ ملے ٹیوشن پڑھالے گا کچھ نہ کچھ کر ہی لے گا۔ زندگی کو بہر حال شروع تو کرنا ہی تھا لیکن اس کے سوا کت وجود میں جنبش ہوئی۔

جب صفدر جیسا دوست جو جب بھی ملتا اس کا شکر گزار ہوتا کہ اگر وہ اپنے ابا سے رقم ادھار نہ دلاتا تو باپ سے ناراض ہو کر جب وہ گھر سے نکلتا تھا تو جانے کتنا خوار ہوتا جب اس نے ہی آنکھیں پھیر لیں تو وہ کسی اور سے کیا امید کر سکتا تھا۔ اس نے بہ مشکل قدم اٹھایا۔ پاؤں من، من بھر کے ہو رہے تھے۔ وہ اپنا اپنی گھسینا جانے کیسے روڈ تک آیا تھا اور کیسے ٹیکسی میں بیٹھا تھا اور جب سوچے ہوئے ہونٹوں اور ڈنچی پیشانی کے ساتھ وہ جلیل خان کے پاس پہنچا تو اس کا اندر بالکل خالی ہو چکا تھا۔

”میں جینا نہیں چاہتا سر لیکن فرجی مجھے اس کا خیال مرنے بھی نہیں دے رہا۔ میز ایک آخری احسان اور مجھ پر کر دیں۔ ایک بار پھر فرجی کے ذمے سے نہیں انہیں آپ قائل کر لیں کسی بھی طرح اور فرجی کو اس کے اپنوں میں پہنچا دیں۔ میں جینا نہیں چاہتا سر ایک لمحہ بھی نہیں۔“ وہ ہلک، ہلک کر رہ رہا تھا۔

”میرے پاس تمہارے لیے ایک اور آپشن بھی ہے۔ تم میرے ساتھ رہو۔ میرے لیے کام کرو اس چینیج کو قبول کر لو۔ خود کشی بزدل لوگ کرتے ہیں شرم حیات۔ اس دروازے پر جا کر فریاد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے جس سے بار بار دھتکار دیے گئے ہوں۔ یوں بھی اب فرجی ان کی نہیں تمہارے ذمے داری ہے۔ وہ تمہاری بیوی ہے۔ نکاح جن حالات میں بھی ہوا شادی کے بعد بیوی کی ذمے داری اس کے شوہر پر ہوتی ہے۔ بار بار پیچھے مڑ کر مت دیکھو شرم حیات، آگے بڑھو۔“ اور اس کے پاس تو کوئی دوسرا آپشن تھا ہی نہیں اس نے سر جھکا دیا۔

”میں نے اپنا آپ، آپ کے حوالے کیا۔ آپ جو چاہیں سلوک کریں۔ یہ زندگی آپ کی ہے۔“ تب جلیل خان مسکرایا تھا۔

”میں چاہتا ہوں فی الحال تم اپنی شادی شدہ زندگی کو انجوائے کرو۔ جو ہوتا تھا وہ ہو چکا۔ گزرا ہوا وقت واپس نہیں لایا جاسکتا لیکن حال کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ چند دن تک فرجی کو باقاعدہ رخصت کروں گا۔ اس کا ویدنگ ڈریس آج مل جائے گا۔ میں اس کے اپنوں کو تو نہیں لاسکتا لیکن جو کر سکتا ہوں وہ کروں گا پھر دلیسے کی دعوت کے بعد تم دونوں خانبوال چلے جانا۔ وہاں میرا ایک چھوٹا سا گھر ہے فرشتہ ہے۔ وہ میری طرف سے میری بیٹی کی شادی کا تحفہ سمجھ لو۔ ایک ماہ تک تم وہاں ہی ہر فکر سے آزاد ہو کر رہو۔ میرے خیال میں تمہیں اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے ایک ماہ کافی ہوگا۔“

اس نے جلیل خان کی کسی بات کی نفی نہیں کی تھی۔ اس کے پاس کچھ کہنے کے لیے تھا ہی نہیں۔ اسے کیا کرتا تھا وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ کیا کر سکتا تھا یہ بھی نہیں جانتا تھا اسے وہی کرتا تھا جو جلیل خان نے کہا تھا۔ اس ظالم دنیہ میں صرف وہی تھا جس نے انہیں اپنی پناہ میں لیا تھا اور جو ان کی بہتری کے لیے سوچ رہا تھا۔

”کن سوچوں میں گم ہو شرم جاناں؟“ شرم حیات نے چونک کر دروازے میں کھڑے ہلکے ہلکے دیکھا۔

کبھی کبھی بگ باؤڈ میں آکر اسے یوں ہی جلاتا تھا۔ اس وقت جب وہ بہت خوش ہوتا یا بہت اداس ہوتا۔ بچائیں اس وقت وہ خوش تھا یا اداس، شرم حیات نے سوچا اور احتراماً کھڑے ہوتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں انوکھی چمک تھی۔ ایسی چمک جو کسی بڑے سودے پر اس کی آنکھوں میں آتی تھی۔ یقیناً وہ خوش تھا۔

”کچھ نہیں بگ باؤڈی ماضی کی بھول بھلیوں میں کھویا ہوا تھا۔“ اس نے سر جھکا لیا۔

”تم آج کل ماضی کو بہت یاد کرتے ہو شرم؟“ بگ باؤڈ نے، ہولے چتا ہوا اس کے قریب آیا اور اس کے کندھے پر ہلکا سا باؤڈال کر اسے ہنسنے کے لیے کہا اور خود بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

”ہاں، آج کل ماضی بہت سنا تا ہے بگ باؤڈی۔ سنا ہے آدمی جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اپنے حال کے بجائے ماضی میں جیتا ہے اسے ماضی کی وہ باتیں بھی یاد آتی ہیں جو بہت معمولی اور چھوٹی، چھوٹی ہوتی ہیں جنہیں کبھی اس نے یاد نہیں کیا ہوتا جیسے کل رات میں سونے کے لیے لیٹا تو مجھے چڑیا کا وہ زخمی بچہ یاد آیا جسے چڑیا نے اپنے گھونسلے سے گرا دیا تھا۔ چڑیا نے یہ گھونسلہ ہمارے گھر کے اسنور کے ایک روشن دان میں بنا رکھا تھا جسے اندر سے تو بند کر دیا گیا تھا لیکن باہر چڑیا نے اپنی جگہ بنالی تھی۔ میں نے اس بچے کو اٹھا کر گھونسلے میں رکھا تھا لیکن جتنی بار میں اسے گھونسلے میں رکھتا چڑیا اسے پھر گرا دیتی۔ ایک صبح میں نے اسے فرش پر مردہ پڑے دیکھا تو مجھے بہت دکھ ہوا تھا اور کل رات بھی میرا دل اس چڑیا کے بچے کے لیے دکھی ہوا اور پھر مجھے اپنا طوطا یاد آیا۔ جو بہت بولتا تھا لیکن ایک دن چنجرے کا دروازہ کھلا رہ گیا تو وہ اڑ گیا اور تو اور مجھے اپنے کچے بھی یاد آئے جو میں نے ذیروں ڈھیر اکٹھے کیے ہوئے تھے لیکن ہاتھیں کون میرا وہ کچوں والا ڈبا اٹھا کر لے گیا تھا۔“ وہ ہولے سے ہنسا۔

”ایسی ہی معمولی باتیں یاد آتی ہیں۔“

”ہاں شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ آج کل کبھی کبھار مجھے بھی چھوٹی، چھوٹی باتیں اچانک یاد آ جاتی ہیں۔ جیسے اپنے گھر کی پرچھتی میں چھپ کر سگریٹ کی ڈبیوں سے تاش کا کھیل کھیلنا۔ کئی ہوئی پتنگ پکڑنے کے لیے چھتیں پھلانگنا اور اپنے گھر کی مٹی پر چڑھ کر گالی ذال کر اڑتی ہوئی پتنگ کھینچنا اور پھر لڑائیاں۔ میں تو شاید پیدا ہونے ہی سے عجیب کا رہا تھا۔“ وہ ہنسا۔ ”لیکن شرم حیات تم اتنے بوڑھے نہیں ہوئے کہ حال کے بجائے ماضی میں جیو۔“ بگ باؤڈ نے بغور اسے دیکھا۔ ”کچھ اور بھی ہے جو تمہیں پریشان کر رہا ہے شرم حیات مجھ سے محل کر بات کرو۔“

”بس تھک سا گیا ہوں بگ باؤڈی۔ آپ کو بتایا تو تھا کہ اس زندگی کو خیر یاد کہتا چاہتا ہوں۔ عظام کے ساتھ ایک سیدھی ساوی زندگی گزارنا چاہتا ہوں بس کبھی، کبھی جی چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر کسی چھوٹے سے گاؤں میں ایک چھوٹے سے گھر میں رہوں۔ مجھے توں میں کام کر کے رزق حلال کماؤں اور رات کو تھک کر پرسیون نیند سو جاؤں۔“

”بعض باتیں سوچنے میں بہت آسان لگتی ہیں لیکن وہ اتنی آسان نہیں ہوتیں۔ خیر اس موضوع پر پھر بات کریں گے، میں تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ ایرک کے ساتھ میری ملاقات بہت خوشگوار اور کامیاب رہی۔ میں نے اس کے ساتھ کام کرنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ بہت بڑی پیشکش کی ہے اس نے۔“

”کیا آپ کو نہیں لگا بگ باؤڈی کہ وہ جو کہہ رہے ہیں ایسا نہیں ہے۔ اصل کہانی کچھ اور ہے؟“ وہ مضطرب ہوا تھا۔

”کیا کہانی ہونی ہے شرم حیات۔ یہ تم پر ہے کچھ لوگ بھی بال کی کھال نکالتے ہو۔ جانتے ہو کتنے ہزار ڈالر پیشگی ملے ہیں اس کام کے اور کام کے بعد جو ملے گا تم اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔“

”ڈالر.....؟“ شرم حیات نے ڈھلایا۔ ”آپ اتنی دولت کا کیا کریں گے بگ باؤڈی نہ کوئی آگے نہ کوئی پیچھے۔ جتنا ہے کیا وہ بہت نہیں ہے؟“

اعتبار وفا

”ہاں بہت ہے لیکن یا یہ جو دولت کی حُب ہوتی ہے ناں یہ مرتے دم تک ختم نہیں ہوتی۔ دل اور۔۔۔ اور کی تکرار کرتا رہتا ہے۔ جانتا ہوں کہ اگر آج مر گیا تو سب دولت بینکوں میں ہی رہ جائے گی پر دولت کی ہوس ایسی جان سے لپٹی ہے کہ جدھر سے ذرا بھی اشارہ ملتا ہے فوراً ادھر پکتا ہوں۔ شاید اس ہوس کے پیچھے میرے بچپن کے کچھ تنگ دن بھی ہوں۔ باپ کے مرنے کے بعد کئی بار فاقہ بھی کیا۔ ماں کہتی تھی میں ناشکرا ہوں اگر ایک وقت کی روٹی کبھی نہیں ملتی تھی تو دوسرے وقت کی تول ہی جاتی تھی برمجھے تو روٹی کے علاوہ اور بھی کئی لالچ تھے، میں بچپن میں بڑا اندیدہ ہوتا تھا شمر حیات..... قلفی والا گلی سے گزرتا تو میں گھر کے دروازے سے نیک نگائے بچوں کو قلفی خریدتے اور کھاتے دیکھتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتے اور تھوک نکلتے ہوئے قلفی کے ذائقے کو تصور میں محسوس کرتے لیکن ایسا صرف چند دن ہوا تھا پھر میں نے چھوٹے بچوں کے ہاتھوں سے قلفی اور دوسری چیزیں چھیننا شروع کر دیں۔ ان کی مائیں شکایت لے کر آئیں تو ماں مجھے پیٹ ڈالتی۔ ماں کیا مار مجھے کبھی بری نہ لگی۔ میں ہنستا رہتا اور اماں کہتیں غلٹا بنے گا۔ دراصل خرابی میرے خون میں ہی تھی۔ میرا باپ بھی ایسا ہی تھا چھین جھپٹ کر لینے والا۔ دودھ نے اثر نہیں کیا تھا لیکن خون اچھلتا تھا میں تو کم عمری میں ہی اپنی کلی کا چھوٹا موٹا مد معاش بن گیا تھا۔“ وہ ہولے سے ہنسا لیکن شمر حیات کو لگا اس کی ہنسی میں کہیں ٹوٹے کا لچ کی کھنک بھی تھی۔

”جلو تم نے کہا ہے تو سوچتا ہوں میرے بعد اس دولت کا مصروف کیا ہوگا۔ ویسے اپنے پاکستان پر اللہ کا بڑا کرم ہے شمر جاناں یہاں کوئی بھوک سے نہیں مر سکتا۔ دو وقت کی روٹی نہ ملے تو تیسرے نام تو مل ہی جاتی ہے۔ لوگ بڑے نخی ہیں۔“

”اپنا پاکستان۔ آپ نے اپنا پاکستان کہا ہے لیکن آپ نے ایرک سے ڈیل کر کے اس اپنے پاکستان کے لیے اچھا نہیں کیا بگ با۔“ بے اختیار ہی شمر حیات کے لبوں سے نکلا۔

”کیا مطلب؟“ بگ با نے اسے گھورا اس کے چہرے پر چند لمحے پہلے نظر آنے والے نرم تاثرات غائب ہو گئے تھے۔ ”کیا اچھا نہیں ہوا بے روزگاروں کو روزگار ملے گا۔ جانتے ہونا اس ملک میں کتنی بے روزگاری اور غربت ہے۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”کل کے تمام اخبارات میں اشتہار چھپ جائے گا اور اتوار کو انٹرویو ہوگا۔ انٹرویو پانی میں ہوگا ایک کمرہ بک کروالیا جائے گا۔ انٹرویو تم اور وٹسن لوگے۔“

”بس بگ با۔“ وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ جاتے، جاتے بگ با نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔

”ایرک کے ساتھ ڈیل کے آرڈر اوپر سے آئے ہیں شمر حیات۔“ بگ با بات کر کے رک نہیں تھا اور میز سے باہر نکل گیا تھا۔ شمر حیات سر جھکا کے نادم کھڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

ایمل سر می کس گردن تک تانے آنکھیں موندے لینی ہوئی تھی۔ می بیڈ کے پاس کرسی بچھائے پریشانی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا، دو دن میں اس کی رنگت خیر کر رہی تھی۔

”ایسا بیٹی کیا سوچ رہی ہو؟“

”کچھ نہیں می۔“ اس نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا اور انھد کر بیٹھ گئی۔

”کتنا عرصہ ہو گیا تھا مجھے ڈیڈی سے ملے، انہیں دیکھے۔ میں نے کبھی باہر سے کہا ہی نہیں۔ کبھی اپنی بات نہیں منوائی۔ اگر میں باہر سے کہتی تو کیا وہ انکار کرتا، نہیں ناں۔ وہ میری بات ضرور مانتا لیکن میں نے ان سارے

بیچے سالوں میں ایک بار بھی باہر سے نہیں کہا کہ مجھے آپ کے اور ڈیڈی کے قریب رہنا ہے۔ مجھے ڈیڈی سے ملنے جانا ہے حالانکہ میرا دل آپ کے اور ڈیڈی کے لیے اداس رہتا تھا۔ میں تو بس شرمندہ ہی رہی ڈیڈی سے آپ سے کہ میں نے غلط صدمہ کیا۔ میں نے ڈیڈی کو دکھ دیا اور انہیں خود سے دور کر دیا۔ مجھے لگتا تھا جیسے ڈیڈی مجھ سے ایسے محبت نہیں کرتے جیسے پہلے کرتے تھے۔ ان کے دل میں میرا وہ مقام نہیں رہا۔

”ایسا نہیں تھا ایسا بالکل نہیں تھا میری جان، وہ تم سے بہت محبت کرتے تھے بہت چاہتے تھے تمہیں۔ انہیں تمہارا بہت خیال تھا۔“ مکی نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر تسکین دہانہ کیا۔

”میں جب چھوٹی تھی تو دادا چان اور دادی چان کو پچھو کے لیے روٹے تراپے دیکھ کر سوچتی تھی کہ میں پچھو کی طرح آپ کو اور ڈیڈی کو کوئی دکھ نہیں پہنچاؤں گی۔ میں آپ کی پسند پر سر جھکا دوں گی لیکن جب میں بڑی ہوئی تو میں نے آپ کی پسند کو رد کر دیا بالکل پچھو کی طرح حالانکہ آپ نے میرے لیے بہترین شخص کو منتخب کیا۔“

آنسو اس کی آنکھوں میں چمکنے لگے۔ وہ ہولے ہولے ہوتی ہوئی چپ کر گئی تھی اسے یاد آیا جب اس نے ڈیڈی کو مدر کے متعلق بتایا تھا تو ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا وہ بہت بے یقینی سے اسے دیکھ رہے تھے اور پھر جب مدر حسن کے والد ان کے گھر آئے تو ڈیڈی بہت باؤس ہوئے تھے اور ان کے جانے کے بعد انہوں نے اسے بلایا تھا۔

”سوری اینا میں نے مدر کے والد سے معذرت کر لی ہے۔ یہ رشتہ مجھے سوروں نہیں لگا۔ ان کے پاس تو اپنا ذالی گھر بھی نہیں ہے۔ مدر کی اپنی تعلیم بھی ابھی ختم نہیں ہوئی کب جا بے گی کیسی ملے گی کچھ پتا نہیں اور پھر جب اسٹینس میں اتنا فرق ہو تو بعد میں بہت پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لازمی بات ہے اس کی نظر تمہاری جائداد پر ہوگی یا پھر خود کو تمہاری سطح پر لانے کے لیے وہ کچھ ایسا کرے گا جس سے تمہاری زندگی مشکل ہو جائے گی۔“

”مدر ایسا نہیں ہے اسے میری جائداد کا لالچ نہیں ہے، وہ تو کچھ بننے کے بعد ہی آنا چاہتا تھا یہ تو میں نے اسے مجبور کیا تھا۔“ وہ کہنا چاہتی تھی لیکن ایک دم اڑانے والے آنسوؤں نے اس کا مطلق ہی لیا تھا۔ وہ ڈیڈی سے مزید کچھ نہیں کہہ سکتی تھی اس نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ اگر انہیں مدر کا رشتہ پسند نہ آیا تو وہ ان کی بات مان لے گی۔ آنسو اس کے رخساروں پر بہنے لگے تھے۔ مکی نے اس کے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھے۔

”جو مزر گیا سو مزر گیا۔ اب کیوں سوچ سوچ کر کڑھتی رہتی ہو؟“

”مکی!“ اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ”ڈیڈی نے مدر کے والد اور پچھو کو انکار تو کر دیا تھا لیکن وہ ساری رات نہیں سوئے تھے۔ ساری رات ان کی اسٹڈی کی لائٹ جلتی رہی تھی۔ وہ میرے لیے پریشان تھے میں اچھی بیٹی نہیں تھی۔ میں نے انہیں دکھ دیا۔“

”تم بہت اچھی بیٹی ہو اینا۔ مجھے یا تمہارے ڈیڈی کو کبھی تم سے شکایت نہیں ہوئی۔ اپنی حالت دیکھو ذرا۔“ وہ پریشان ہوئی تھیں۔ ابھی آج ہی تو وہ اسپتال سے آئی تھیں۔

”سوری مکی، میں نے آپ کو پریشان کر دیا۔“ اس نے ہاتھوں کی پشت سے اپنے آنسو پونچھے۔

”تم خواہ مخواہ خود کو ہلکان کر رہی ہو اینا۔“ اس نے تمہیں خرسکون اور خوش رہنے کے لیے کہا ہے لیکن تم نے اپنا کیا حال کر لیا۔ زندگی اور موت انسان کے اختیار میں نہیں ہوتی۔ تمہارے ڈیڈی کی زندگی بھی اتنی ہی تھی۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔ باہر اور بچے بھی کتنے پریشان ہوئے تھے اور جب ڈاکٹر نے بتایا کہ انہما کا ایک ہے تو افاقہ اتنا پریشان ہو گیا تھا کہ اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ تمہیں اپنے خود خیال رکھنا ہے ہر وقت باہر تمہارے پاس نہیں

ہوتا۔ بچوں کا سوچا نہیں تھا کہ ضرورت ہے۔ اپنے آپ کو سنبھالو میری جان۔“
”جی مئی۔“ اس نے سر ہلایا۔

قرآن خوانی کے بعد کھانا۔ میم خانے اور مدارس میں بھجوا کر وہ بے حد تھکی تھکی سی ڈیڈی کی اسٹڈی میں آئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے ڈیڈی ابھی نہیں کسی سائنڈ سے نکل آئیں گے اور اس کے سر پر چپتہ مارتے ہوئے کہیں گے۔
”میری کتابوں کو مست چھیڑنا نا ٹی ٹرل۔“

صبح سے وہ خود کو سنبھالے مصروف سی سب کام کر رہی تھی لیکن ڈیڈی کی اسٹڈی میں آ کر اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ وہ بولے، بولے چلتی ہوئی ان کی رائٹنگ ٹیبل کے پاس آئی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ ٹیبل پر ہلکی گرد پڑی تھی۔ اس نے یونہی انگلی رتے ہوئے ٹیبل کی دراز کھینچی۔ ڈیڈی کے قلم اور ڈائری کے ساتھ اس کی پسندیدہ گریڈ پڑی تھی۔ چھوٹی سی بارلی ڈول جس کے بال کب کے اکھڑ چکے تھے لیکن پھر بھی اسے پسند تھی پھر اسے اپنی کتنی ہی چیزیں دراز میں پڑی نظر آئیں۔ اس کی پونیاں، پکیزر، ڈیڈی نے کیا، کیا سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔
”بیٹیاں بہت پیاری ہوتی ہیں۔ آئینہ خالی کر جاتی ہیں لیکن دلوں میں بسی رہتی ہیں۔ ان کے دکھ باپوں کو ڈھکا دیتے ہیں۔“ ایک بار ڈیڈی نے کہا تھا ایک دم ہی دل میں درواں تھا۔ اس نے سر ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ سانس رکھنے ہی تھی۔
”مئی!“

اس کے منہ سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی تھی۔ تب ہی ارتقا دروازہ کھول کر اندر آئی تو اس نے چونک کر ارتقا کی طرف دیکھا۔
”آؤ آ جاؤ گریڈ!“

ارتقا کا موڈ کافی خراب تھا۔ وہ اندر آ کر مئی کے قریب ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے اہل کے نئے ہوئے چہرے کو دیکھا اور نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔
”ہم واپس کب جائیں گے صرف دو دن کے لیے آئے تھے اور....“
”سوری ارنی بنی میری طبیعت خراب ہو گئی اور تمہارے پاپا کو رکنا پڑا۔ میں نے تو کہا بھی تھا کہ وہ چلے جائیں تمہیں اور افغان کو لے کر۔ میری طبیعت بہتر ہوئی تو میں آ جاؤں گی۔“
”میری پڑھائی کا خرچ ہو رہا ہے۔“

”پڑھائی ماں سے زیادہ اہم ہے تمہارے لیے؟“ مئی کو اچھا نہیں لگا تھا وہ نوٹ کر رہی تھیں کہ ارتقا کو اہل کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ اس روز جب اہل اسٹڈی میں نیم بے ہوش ہو گئی تھی تو سب ہی پریشان ہو گئے تھے اور فوراً ہی اسپتال لے گئے تھے وہ دو دن اسپتال رہی تھی اور ارتقا صرف ایک ہاں اہل کو دیکھنے کے لیے اسپتال آئی تھی۔ ارتقا نے مئی کی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا اور ہاتھ میں پکڑے فون کو دیکھنے لگی جو واہریت کر رہا تھا اور روشن اسکرین پر ظفیری کا تہ آ رہا تھا اس نے کال ریجیکٹ کر دی۔ رات بھی ظفیری کا فون آیا تھا اور وہ رو میٹک ہو رہا تھا۔ ظفیری کی گفتگو یاد کر کے اس کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔

”اگر ایسا ہی تمہاری پڑھائی کا خرچ ہو رہا ہے تو ارنی مئی اپنے پاپا سے کہو اور تمہیں واپس چلے جاؤ۔ ایسا کو ابھی دو تین دن سفر نہیں کرنا چاہیے۔ احتیاط اچھی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا خدا نخواستہ بے احتیاطی سے کہیں پھر ایک نہ ہو جائے۔“

”ٹھیک ہے، میں پاپا سے بات کرتی ہوں، کہاں ہیں وہ؟“ ارتقا مئی کے لہجے پر غور کیے بغیر کھڑی ہو گئی۔

”اپنے کمرے میں ہوں گے۔“ می نے بغور اسے دیکھا اور بڑبڑائیں۔ ”پتا نہیں اس لڑکی کو کیا ہو گیا ہے۔“ لیکن وہ ان کی بڑبڑاہٹ سنی ان سنی کرتے ہوئے باہر چلی گئی۔ باہر نوید اپنے کمرے میں کہیں جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ وہ دستک دے کر اندر آئی تو باہر نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”ارے کیا ہوا میری گڑیا کو، سوڈ کچھ خراب لگ رہا ہے تمہارا۔“

”ایک پاپا ہیں جنہیں فوراً پتا چل گیا کہ میرا سوڈ خراب ہے اور ماما انہیں کبھی میرے دل کا حال معلوم نہیں ہوتا۔ کبھی ماں کی نظر سے دیکھا ہو تو شب ناں۔“

”ہم واپس کب جائیں گے پاپا؟ بہت بور ہو رہی ہوں میں اور میری پڑھائی کا بھی حرج ہو رہا ہے اس لیے تو میں آنہیں رہی تھی۔ اب دو دن کے بجائے چار دن ہو گئے ہیں ہمیں آئے۔“

”رتی۔۔۔۔۔ تمہاری ماما کی طبیعت جو اچانک خراب ہو گئی تھی تو۔۔۔۔۔“ باہر کا انداز سمجھانے والا تھا۔

”لیکن اب تو وہ ٹھیک ہیں ناں۔ آپ نے اگر نہیں جانا تو مجھے اورانی کو بھجوا دیں۔“

”لیکن جانا تو تمہارا رکن بھی بہت ضروری ہے۔ صمدانی صاحب کہہ رہے تھے کہ کرل صاحب کے وکیل جو اپنا چیک اپ کروانے کے لیے لندن گئے ہوئے تھے کسی وجہ سے لیٹ ہو گئے۔ اب کل شام کی فائنل سے آجائیں گے تب تک تم لوگوں کا رکن بھی ضروری ہے۔“ باہر نے نرمی سے کہا۔

”لیکن ہم نے رک کر کیا کرنا ہے؟“

”اٹھوں نے کہا تھا کہ بچوں کا ہونا بھی ضروری ہے ہو سکتا ہے دستخط وغیرہ کی ضرورت ہو۔“

”افغان کی ضرورت تو پڑ سکتی ہے کہ ان کا نوٹا سا ہے میرا بھلا کیا بنتا ہے رکنا؟“ وہ بڑبڑاتی باہر جو اس کی طرف دیکھ رہا تھا ایک کسی خیال سے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔

”پراس وکیل صاحب سے ملاقات کے فوراً بعد ہم کراچی روانہ ہو جائیں گے۔“ وہ مسکرایا۔

”اس وقت میں ایک دوست کی طرف جا رہا ہوں چلو گی تمہاری پوریٹ دور ہو جائے گی۔“

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تو قیامت تیار ہو کر آ جاؤ۔ میں پورج میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

”میں تیار ہی ہوں پاپا۔“ اس نے ماتھے پر ہنسرے بالوں کو ہاتھوں سے پیچھے کیا اور پوتی اتار کر دوبارہ لگائی۔

”او کے تو پھر آ جاؤ۔“

اور تھوڑی دیر بعد وہ باہر کے ساتھ عنبرین کے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ عنبرین کے فلیٹ کے دروازے پر رک کر باہر نے ہیل دی۔ اندر سے عنبرین کی آواز آئی۔

”دروازہ کھلا ہے آ جاؤ۔“

باہر نے آنے سے پہلے اسے فون کیا تھا اور وہ باہر کے فون کے بعد دروازہ کھول کر کچن میں ٹھس گئی تھی کہ باہر نے کہا تھا وہ بیچ اس کے ساتھ ہی کرے گا۔ لاؤنج میں رک کر باہر نے عنبرین کو آواز دی۔

”عنبرین دیکھو تو میرے ساتھ کون آیا ہے؟“

”کون ہے؟“ عنبرین کفگیر ہاتھ میں لیے کچن سے نکلی اور اس کی نظر ارتفاع پر پڑی۔

”میری بیٹی۔“ کفگیر اس کے ہاتھ سے گر پڑی اور وہ دونوں ہاتھ پھیلائے والہانہ اس کی طرف بڑھی۔

جاری ہے



ذیشان رسول نے ابھی تعلیم مکمل بھی نہیں کی تھی کہ ہمارے خاندان کو اس کی شادی کی فکر لاحق ہو گئی۔ تمام رشتے داروں اور ملنے والوں کو یہ اپنا فرض لگنے لگا کہ اس کے لیے لڑکیاں بتائیں۔ سب ہی نے یہ فرض بخوبی انجام دینا شروع کیا۔ میں نے صرف ایک ہی بات مد نظر رکھنی تھی کہ لڑکی اور فیملی دین دار ہو، پاہرہ ہو، چھ عی فیملی سے ملی ہوں گی تو اندازہ ہوا کہ جو میں چاہتی ہوں، وہ نہیں مل پاتا ہے۔ یہاں ایک بات کا ذکر کروں گی کہ ایک دوست کے بتانے پر جب لڑکی دیکھنے گئی تو اس کی امی اور بہنوں سے ملنے کے بعد

کمل ہو جائے گی۔ اس کی امی اگلے ہفتے دو تین دن کے لیے کراچی آ رہی ہیں کچھ فلمیں سے ملنے کے لیے تو آپ بھی مل لیں۔ فاطمہ کا حجاب اور انداز آپ کے اور میرے معیار کے عین مطابق ہے۔ فاطمہ کو میں نے دیکھا نہیں تھا لیکن ذیشان پر کمل بھروسہ تھا۔ ان لوگوں سے ملاقات ہوئی موبائل پر فاطمہ کو دیکھا۔ امی، ابا کا رکھ رکھاؤ، تعلیم، اعلیٰ خاندان سب کچھ ایسا تھا کہ میں نے اسی وقت اپنے مالک کا ڈیروں شکر ادا کیا کہ کس طرح اس نے میری دعا کو مستجاب کیا۔ سچ ہے کہ میں صرف دین دار گھرانہ طلب کر رہی تھی اور میرے مالک نے تعلیم یافتہ اور وہیل آف گھرانہ عطا کیا۔ امی، ابا تو ڈاکٹر ہیں لیکن لڑکی کے چچا، پھولی، بھائی سب ہی ڈاکٹر ہیں۔ نرم گفتار، منسلک اور سکیل لوگ ہیں۔ تمام خاندان کے لوگ لندن میں رہتے ہیں۔

میں نے یہ طے کیا ہوا تھا کہ شادی پر کسی سے کوئی تحفہ یا کیش نہیں لیا جائے گا۔ رشتے داروں سمیت ملنے والوں اور دوستوں جس سے بھی بات ہوتی اس کے کان میں یہ اندیش دیا جاتا کہ کچھ دینے کے بجائے صرف دعا میں سے رہیں۔ چند فرمانبرداروں کے علاوہ سب نے ہی سنا اور نکال دیا۔ جس قدر میں نہ لینے کے لیے کہہ رہی تھی سب اسی قدر دینے کے لیے تیار تھے۔ میں منع کر کے تھک رہی تھی اور دینے والے کچھ بچنے کو تیار نہیں تھے۔ جس کا اندازہ گھر میں پہلی تقریب پر ہوا۔ مجھے مہندی، مایوں گانے بجائے نہیں کرنے تھے۔ گھر پر مختصر میلاد اور ذکر کا اہتمام تھا۔ سجاوٹ میں بھی فضول خرچی سے اجتناب کیا تھا کہ یہ پیسے ضرورت مندوں کو دے کر امداد اس کے رسول کو خوش کیا جاسکتا ہے۔ وہ چند دنوں کی سجاوٹ پر نہ لگا دیے جائیں۔ لوگوں کی آمد شروع ہوئی تمام رشتے دار لدے پھندے آ رہے تھے۔ ذیشان اور فاطمہ کے تحفوں کے ساتھ ساتھ میرے اور روشن (ذیشان کی میز) کے جوتے، مٹھائی، پھل نوکروں میں آئے تھے۔ رشتے داروں کا مان جانا آسان نہ تھا مگر مجھے اپنی دوستوں اور راکٹر

یہ تو ملے تھا کہ لڑکی خوب صورت ہوگی لیکن پردہ؟ وہ تو صرف ہار یک دوپٹے کو سر پر ڈالنے کی حد تک تھا۔ بڑی کوفت ہوئی کہ یہاں کیوں بھیجا گیا۔ ابھی افسوس کر رہی تھی کہ اس لڑکی کو آواز دی گئی وہ جیسے ہی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو ایسا لگا روشنی ایک دم سے تیز ہو گئی ہو۔ مجھے بھر کو تو واقعی ایسا لگتا تھا کہ چکا چند میں بیٹھے ہیں پھر میں نے پہلے ذیشان پر نظر ڈالی کہ اس کے کیا تاثرات ہیں وہ دوسری بہن کے شوہر کے ساتھ (جو کہ لندن کا پڑھا ہوا بہت اچھی شخصیت کا مالک تھا) باتوں میں مصروف تھا لیکن لڑکی کو ایک نظر دیکھ لیا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ ذیشان یہیں شادی پر اصرار کرے گا اور وہ پردہ جو میں سوچے بیٹھی تھی ہوا میں اڑ جائے گا۔ بہ مشکل چائے، ناشتا کر کے گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے پہلا سوال کیا۔ "بہن کیا خیال ہے؟ فوٹہ کہنے لگے۔ آپ بتائیں کیا آپ کے معیار کا خاندان ہے؟

میں نے کہا لڑکی کی امی تو کہہ رہی تھیں آپ جیسے چاہیں گی ہماری لڑکی ایسے حجاب لے گی۔ (اگرچہ پورا گھرانہ خوب فیشن ایبل تھا) مگر مجھے اس طرح منظور نہیں تھا۔ ذیشان نے اتنی سمجھداری سے کہا کہ ماما آپ کو تو دین دار گھرانہ چاہیے جو کہ میری بھی پسند ہے۔ تو یہاں بھوں جائیں کہ لڑکی دیکھی ہے۔ بہنوں آپ لوگ یقین کریں مجھے ایسا لگا کہ ذیشان صرف میرا دل رکھنے کو کہہ رہا ہے ورنہ اس قدر حسین اور معصوم لڑکی کو انکار کرتا آسان نہیں تھا۔ جس نے بھی نہ یہی مشورہ دیا کہ منع نہ کرو، وہ لوگ تیر تو ہیں حجاب کروانے پر۔ مگر مجھے اور ذیشان کو پورے گھروالوں کی دین داری دیکھنی تھی۔ اب میں نے دعا میں شروع کیس اور صرف اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا کہ وہ ہی ایسے گھرانے کو موانے کے اسباب پیدا کرے۔ ابھی ایک مہینہ ہی ہوا تھا کہ ایک دن لندن سے ذیشان کا فون آیا کہ ماما میرے ساتھ ایک لڑکی فاطمہ جو کہ ڈاکٹر ہے اور اسپیشلائز کر رہی ہے میرے ساتھ ہی اگلے مہینے اس کی ڈگری

سے امید تھی کہ وہ مان لیں گی، آفس کے لوگوں سے بھی
 یہی امید تھی مگر چند لوگوں کے علاوہ کوئی اس امید پر پورا
 نہ اترتا۔ شائستہ اور یاسمین (جو کہ میری بچپن کی سہیلیاں
 ہیں) اس قدر تھکے منھائیاں اور پھل لائیں کہ مجھے شبہ
 ہوا۔ کہیں میرے منہ سے یہ تو نہیں نکلا تھا کہ خوب تھکے
 لے کر آتا۔ شائستہ تو تمام لوازمات کے ساتھ گولڈ سینٹ
 بھی لائی تھیں۔ رضوانہ پر نہیں نے بہت خوب صورت
 ڈیزائن کا جیولری سینٹ دیا۔ نسیم ماہ پارہ میرا جوڑا ہر
 اپنے ہاتھ سے بنا ہوا چمکیٹ ایک خوب صورتی سے سجایا
 کر لائیں۔ حمیرا طارق نے ڈرتے، ڈرتے بڑی رقم کا
 نقاق پیش کیا۔ اس کو ڈانٹ پڑنے کی قوی امید تھی مگر موقع
 نہ تھا ورنہ خیر اللہ تعالیٰ سب کو ان کے بچوں کی
 خوشیاں دکھائے۔ آفس کے کچھ لوگوں نے مل کر تھکا دینے
 کا فیصلہ کیا اور ایڈیٹر جاسوسی ڈاکٹریکٹ بھی خیال، رمضان،
 شہزاد صاحب، عرفان، آمنہ حماد اور ڈاکٹر نسیم وغیرہ نے
 مل کر نہایت خوب صورت دو بڑے پینل کے منتقش
 گلہ ان دیے۔ نسیم کی ایڈیٹر یعنی احمد نے گولڈ
 کے ٹاپس دیے۔ سب کا بے حد شکریہ کہنا نہ مانتے
 کا۔ سب کو منع کیا تھا کہ کچھ دینے کی ضرورت نہیں ہے
 مگر ان لوگوں کا کہنا تھا کہ خان ہاتھ نہیں آئیں گے۔
 تابید فاطمہ حسین نے کچھ دن پہلے ہی میڈیٹر تتریر کر کے
 لغافہ دینے کی اجازت لے لی تھی۔ انجم انصار اور عظمیٰ
 آفاق بھی کہنا نہ ماننے والوں میں شامل رہیں۔ یہ سب
 ان لوگوں کی محبت تھی جو دیے بغیر ہاتھ نہیں آتیں۔
 رفاقت جاوید کو ڈیڑھ سو روپے پیار کہ وہ طبیعت خراب ہونے
 کے باوجود اسلام آباد سے ویسے میں شرکت کے لیے
 آئیں۔ وہ مجھے کچھ عرصے پہلے بھی نہایت خوب صورت
 ایمر ایڈیٹر شیلٹن سوٹ دے چکی تھیں مگر منع کرنے کے
 باوجود بڑی رقم کا لغافہ ذیشان کو دیے۔

تمام رات رات کی شرکت کا شکر اور جوت آئیں وہ
 عظمیٰ کی تحریر کے ساتھ شرکت کر لیں گی۔ عظمیٰ آفاق
 جرنل کو ترجیح کرتی ہیں (ماشاء اللہ) عقید حق کا خصوصی
 شکر یہ وہ امر کا کافی ہوئی تھیں اور صرف ویسے میں

شرکت کرنے کے لیے جلدی واپس آئیں۔ عظمیٰ بتا میں
 گئی کہ عقید نے کتنے زیورات پہنے ہوئے تھے (بھئی
 دولہا کی خاصہ جو ہوگی) احتجاج کرتی تھی کہ عقید نے
 بسن کپڑے تو حق بھی اور کرنی میں خوش رہیں

عام طور پر میرے بے حد فخر، نیردار ہر بات
 سننے والے بھائی، بھائیوں کچھ سننے کو تیار نہیں تھے اور
 ماشاء اللہ خوب بھرپور تیاریوں کے ساتھ آئے۔ سب
 ہی نے فاطمہ کے لیے گولڈ کے تھکے اور میرے اور
 ذیشان کے لیے جوتے دیے۔ (خدا سب کو
 سلامت رکھے اور ان کو ان کے بچوں کی خوشیاں
 دکھائے) ذیشان کی بسن سین تو جس دن سے ذیشان
 لندن سے آیا تھا اسی دن سے اس کی پسند کی چیزیں بنا
 بنا کر نکلتا رہی تھی لیکن کو باقاعدہ کافی ٹینل کو گنگ آتی
 ہے) ہر قسم کے ایلین کھانے بہترین ٹینگ کی چیزیں
 وہ اتنی مقدار میں بنا کر لاتی تھی کہ سارا گھر کھانا پھر بھی
 ختم نہ ہوتی۔ دو جب تقریب میں آئی تو کئی لوگ اس
 کے سامان کو اٹھائے ہوئے تھے (چیزیں ہی اتنی زیادہ
 تھیں) خدا اس کو خوش رکھے۔ فرحان رسول اور اس
 کی بیوی عالیہ بھی ہر موقع پر پیش پیش تھے۔ عالیہ اور
 سین دونوں نے فاطمہ کے لیے گولڈ جیولری دی اور
 جوتے تو ہم سب کے اور روشن کے بھی تھے۔ میری
 بیٹیوں نے بھی خوب صورت گولڈ جیولری اور سب کے
 جوتے منھائی میوٹ، پھل خوب دیے ایک کمرہ جو کہ
 خاصا بڑا ہے پھل، پھول، منھائی جوتوں سے بھرا ہوا
 تھا۔ میری نندہ اور ایدرانی نے تمام لوگوں کے جوتوں
 منھائی کے علاوہ بھاری جیوٹری دی۔ دیوہ رانی پروین
 ایچ ڈی اپنے ہاتھ سے بنا کر ڈیڑھ مارے منھائی بہت خوب
 صورتی سے تیار کر لائی تھیں۔ انڈیا سے میری خالہ زاد
 بسن ایڈیٹر جو اپنی طبیعت خاصی ناساز ہونے کے باوجود
 آئیں۔ خالہ زاد بھائی مسکری اپنی بیوی مدھو اور بیٹے
 میر کے ساتھ آئے۔ بڑے خان زاد حیدر بھائی نے
 بہتر خوب روٹ بھٹی۔ وہ بڑی باخوب و برہنہ طبیعت کے
 مالک ہیں۔ ایڈیٹر نے تھا فہ سے بھرا سوٹ کس

کھولا تو ہوا چار تمام لوگوں کے لیے کچھ نہ کچھ لائی ہیں۔ (جیسے شکر یہ ادا کروں) ان سب کی شرکت ہی بہت قیمتی تھی۔ صغریٰ زیدی میری بہن کینیڈا سے طویل سفر کر کے اتنی چیزیں لے کر آئی کہ اکیلے میں خوب ڈانٹ سنی جو اس نے دوسرے کان سے نکال دی۔ اس کے شوہر فرخ زیدی جو میرے خالہ زاد بھائی بھی ہیں۔ بڑی مصروف زندگی میں سے وقت نکال کر شادی کو رونق بخشنے آئے۔ سب رشتے داروں اور احبابوں نے مجھ پر حصہ دیا۔ شادی کا احوال فصلی آفاق کے قلم سے اور سب کی تصویریں اگلے شمارے میں آپ دیکھ لیں گی۔ ابھی تو میری بیٹی نین کے گھر سے سی ٹی ٹی چند تصویریں شام کی گئی ہیں۔ انی تقریب میں ٹیگہ ہانسنے کی رسم بھی رکھی تھی جو کہ ڈر کے بعد صرف رشتے داروں کے ساتھ ہوئی۔ سینی اکلوتی بہن ہیں سہا ان کو گولڈ کاٹز اور اس کی بیٹی کو گولڈ کا سیٹ دیا اور جوڑوں کے لیے پیس ہزار نقد دیے گئے۔ عالیہ فرحان کو بھی ایک سونے کا کڑا اور لاکٹ سیٹ اور جوڑوں کے لیے پچاس ہزار نقد بھی دیے۔ سینی کو ہارات والے دن دلہن اتارنے کا ٹیگہ روٹی اور گولڈ کا ایک کڑا ملا۔ ان کے شوہر طیب کو صاف ہندی کی رسم کا ٹیگہ ایک لاکھ دیا اور بھائی فرحان کو ہار پہنانے کا ٹیگہ ایک لاکھ دیا۔ بقی ساری کڑیاں سونے کو انگوٹھیاں، بھابیوں کو نقد لٹافے دیے۔ روشن کو جوڑوں کے علاوہ گولڈ سیٹ مل۔ سب ہی بے حد خوش تھے۔ میری نند ہا بہن کو گولڈ اڑ رنگہ جوڑے اور ان کی انٹیوں اور بہو کو نقد ٹیگہ دیا۔ اسی موقع پر میری چھوٹی ممانی نے کہا کہ یہ پہلی شادی ہے جس میں بچے، بچے کو چھتہ، کچھ ملا اور سب کو وہ پانچ اور خوب صورت لٹافے بے حد پسند آئے جو بطور خاص ٹیگہ اپنے کے مقصد کے لیے خریدے گئے تھے۔

اب اگر کسی کا تذکرہ روٹیا ہے تو میں قسط نمبر دو لکھنے کو تیار ہوں لیکن شاید اس کی ضرورت نہ پڑے۔ کیا خیال ہے بہنوں! ہاں جن بہنوں نے گھر کا نمبر حاصل کر کے خصوصی مبارکبادی ان کا ہے حد

شمر یہ سب کے نام لکھے نہیں جاسکتے۔ اس کو جگہ کی تنگی جانتے اور پینس یہ بھی اب پوچھتی ہیں کہ بہو کے ساتھ کسی گزری ہے تو آپ لوگوں کو بتا دوں گے میرے بیٹا اب تو شادی کے ایک ہفتے بعد ہی ندان چلے گئے تھے کیونکہ وہاں کوئی اپنی یونیورسٹی سے متعلق کچھ امور نمٹانے تھے تو فی الحال بہو کے ساتھ رہنے کا کوئی تجربہ نہیں بنا سکتی۔ ایسے قافلہ بہت پیاری بچی ہے، اللہ اس کے ساتھ زندگی اچھی گزرے گی۔

پیاری بہن! آپ آئندہ ماہ شادی کا آنکھوں دیکھا حال تو پڑھیں گی ہی مگر اس ماہ کی بڑی ساگرہ نمبر 2 میں غلطی آفاق کے قلم سے چند مینی جھلکیاں ضرور پڑھ لیں تاکہ آپ کو کچھ اندازہ ہو جائے کہ آئندہ یہ شادی کا احوال اتنی تفصیل سے رہا ہے اور کتنے مزے کا بھی تو اب آپ پڑھیے مزید اربھندیاں۔

چند مینی جھلکیاں

بھارو لہا فیشن رسول کی اکلوتی بہن سینی کے چہرے پر وہی تازگی، وہی معصومیت اور وہی خوب صورتی دکھائی دی جو ان کی شخصیت میں رہی ہوئی ہے۔ اس تقریب میں انہوں نے بے حد خوب صورت جیوٹری پہنی جس کی داؤد بٹا زیادتی ہوئی۔

بھارو لہا فیشن کی چھوٹی بہن صغریٰ زیدی جو کینیڈا سے آئی تھیں ان کے ہارے میں بتایا گیا کہ وہ ساس بھی بن گئی ہیں مگر ہمیں تو وہ خود ہی پھوٹی سی نظر آ رہی تھیں۔ بھارو لہا فیشن اور اکا روٹری جعفری اسکرین پر تو بڑی بڑی اور قد سے بھری بھری سی گئی ہیں مگر حقیقت میں وہ اونچی سی ٹیبل پر سوارہ ترک سی بچی لگ رہی تھیں۔

بھارو لہا فیشن ۵۵ پارہ ہر ہر ہر صرف میلاو کے فنکشن میں آئی تھیں اور بے حد سادہ تھیں مگر ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ بہت اچھی منیجر بھی ہو سکتی ہیں۔

بھارو لہا فیشن ۵۵ پارہ ہر ہر ہر صرف میلاو کے فنکشن میں آئی تھیں اور بے حد سادہ تھیں مگر ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ بہت اچھی منیجر بھی ہو سکتی ہیں۔

شادی کا احوال

☆ فیس بک پر دولہا، دلہن کی تصویر سب سے پہلے گفتہ شفیق نے ڈالی اور ویسے کی تقریب میں سب سے زیادہ تصویریں بھی ہنسی مسکراتی گفتہ شفیق نے ہی بنائیں۔ (اپنے موبائل سے)

☆ مصنفہ عطیہ عمر تو ہیں ہی خوش اخلاق مگر ان کے شوہر عمر فاروق بھی ہمیں بے حد خوش اخلاق لگے بلکہ وہ بھی ہمیں اپنی سہیلی کی طرح لگے۔ (ماشاء اللہ)

☆ سونٹھ اسکاکی کی کونٹینٹ بیڈ عامرہ شاہد بہت محبت سے ملیں وہ بار بار کن انگلیوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں شاید میں انہیں بہت اچھی لگ رہی تھی (ماشاء اللہ)

☆ کم عمر ساس کا پہلا ایوارڈ اگر دیا جائے تو وہ سعد یہ رکس جیت لیں گی۔ کالی ساڑی میں وہ قیامت لگ رہی تھیں۔

☆ عرشہ جنید تبصرہ لکھ لائنس لگا کر آئی تھیں اور بہت پیاری لگ رہی تھیں۔

☆ ڈاکٹر ممتاز ضیا مستقل تبصرہ لکھ قدرے کمزور لگیں۔ ان کو میں نے ہمیشہ شلواری تھیں میں دیکھا ہے اگر وہ کبھی ساڑی پہنیں تو بہت گریس فل لگیں گی (گو اب بھی ہیں مگر مزید لگیں گی)

☆ مصنفہ اختر شجاعت بیٹی تو زمانے میں تھیں (یعنی خواتین کی نمیل پر) مگر ان کی نظریں مردانے میں اپنے میاں افتخار صاحب پر تھیں۔

☆ دولہا زیادہ تر ایجنج پر ہی پائے گئے۔ ظاہر ہے اتنی پیاری دلہن کو اکیلا چھوڑ کر جانے کو ان کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

☆ کھانے میں فراوانی مچلی بہت اچھی تھی، ہمیں بھی اس کو چھوڑنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

☆ کھانا کھانے کے بعد چند خواتین کی لب اسٹک ٹھوڑی تک آگئی تھی جن کے نام میں نہیں لکھ سکتی کہ میں دوستی میں کوئی دراز ڈالنے کے حق میں نہیں ہوں۔

☆ عظمیٰ آفاق کو اس دعا کے ساتھ اجازت دیجیے کہ خوشی کی تقاریب کی کوریج خوشیوں کے ساتھ لکھنے اور پڑھنے کی اللہ توفیق دے اور اللہ کا کرم ہمیشہ قائم رہے، آمین ثم آمین۔

☆☆☆

☆ رضوانہ پر لیں ایسی شخصیت کا نام ہے جو ہر محفل میں جان ڈال دیتی ہیں۔

☆ یاسمین رشید کے ہاتھوں کے زیورات ہر ایونٹ میں مختلف اور خوب صورت ہوتے ہیں۔

☆ مصنفہ یمنی احمد گلابی ساڑی میں تھیں۔ ساڑی شاید انہوں نے پہلی مرتبہ پہنی تھی۔ وہ اپنی ساڑی کی قال دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر چل رہی تھیں۔

☆ انڈیا سے آئی ہوئی ایک مہمان خاتون مدھوکی ہنسی مجھے کھن کھناتی سی بے حد پیاری لگی۔ ہاں ان کا ہنسر اسٹائل بھی۔

☆ پامست نرہت رضوی نے جب مجھ سے یہ پوچھا کہ کیا عظمیٰ آپ کی شادی ہوگئی ہے تو میں اسی وقت ان پر سو جان سے عاشق ہوگئی اور اب آپ کے پاس آکر اپنے ہاتھ تو ضرور دکھاؤں گی (بے حد سوٹ ہیں آپ)

☆ دوست محمد فیضی کی مقبولیت کے گراف میں بالکل کمی نہیں آئی ہے مگر کیا تھا کہ وہ اپنی خوب صورت سی بیگم کو بھی اپنے ساتھ لے آتے۔

☆ مہمان خواتین میں سب سے زیادہ خوب صورت، ہادقار، پُرکشش، خوش اخلاق (میری نظر میں) رضوانہ منظور ہیں۔ (ماشاء اللہ)

☆ اگر گا جری گلابی رنگ میں گولڈن رنگ ملا دیا جائے تو وہ خوب صورت رنگ تقریب کی میزبان عذرا آنٹی کا تھا۔ (آئی سب رنگ آپ کے لیے بنے ہیں..... ہر رنگ پہن سکتی ہیں آپ)

☆ مصنفہ رفاقت جاوید، اسلام آباد۔... دور انٹرز کو دیکھ کر شاکر رہ گئیں (بقول ان کے) پہلی رفعت سراج کہ ان کی سادہ اور دلچسپ گفتگو نے انہیں بہت متاثر کیا اور دوسرے عقیدہ حق کو سونے کے زیورات میں لدا پھندا اور سجا سنورا دیکھ کر انہیں بہت اچھا لگا بقول ان کے شادی کی تقریبات میں اسی طرح جانا چاہیے۔

☆ نرہت اصغر کو فل میک اپ میں پہلا دفعہ دیکھا جو ان پر بہت سوٹ بھی کر رہا تھا۔ (نرہت جی بھی، کبھی پارلر جانے میں واقعی کوئی حرج نہیں ہوا کرتا)

☆ رمضان الکل بہت بڑا گفٹ لائے تھے۔ ڈبے کا ساز جہازی ساز کا تھا..... چنانچہ اس میں کیا کیا تھا۔

جب بھی گھنگور گھنٹیں آسمان پر چھا کر آنے والی بارش کا پتا دیتی ہیں تو بہت سی بھولی بھری یادیں بھرے دل میں انگڑائی لینے لگتی ہیں۔
 داخل ہوتے، اماں مہیٹ چار پائی سے اٹھ بیٹھتیں۔
 جلدی سے بستر جھاڑتیں، نیچے المیے پلٹیں چادریں
 ٹھیک سے بچھاتیں۔ کبھی ایک کمرے سے نکل کر
 دوسرے میں گھس جاتیں، دوسرے سے نکلتیں تو پہلے
 مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابا جس دم گھر میں

ابا کا گھر اور میں؟

تنزیلہ زاہرہ



میں جاگھٹیں۔ گویا ہر طرح سے مصروف نظر آنے کی اپنی سی کوشش کرتیں۔ ابا سخت غصے والے تھے اور ان کا خیال تھا کہ عورتیں ہر دم کام کرتی اچھی لگتی ہیں۔

ابا کی شخصیت بھی تو بہت بارعب..... یہ بات تقریباً ہر کوئی جانتا تھا۔ اماں، عمیر، عبید اور عزیز..... بس ایک میں ہی تھی جو اس بات سے بخوبی آگاہ ہوتے ہوئے بھی نظر انداز کر دیا کرتی کیونکہ میرے خیال میں تو میرے ابا دنیا کی سب سے بہترین شخصیت تھے۔

☆☆☆

ابا نے گھر کی تعمیر کا آغاز کیا تو خیال تھا کہ یہ قصبے کا سب سے خوب صورت گھر ہوگا۔ لڑکیں تو تھا وہ میرا..... لہذا میں بھی بے حد خوش کہ ہمارا ایسا شاندار گھر تعمیر ہو رہا ہے۔

اس روز بھی اسی طرح سے بڑے گھر سے بادل چھائے رہے مگر جب بغیر برسے گزر گئے تو میں نے ابا کو ایک مشورہ دیا۔

”ابا برآمدے کے دائیں جانب کونے پر ستون کے بجائے ایک دیوار بنوائیں تاکہ یہاں گودام کا اناج رکھنے کی محفوظ جگہ بن جائے اور بارشوں میں اناج کے گھیلا ہونے کا خدشہ بھی نہ رہے۔ ورنہ جب بھی بادل پورب سے آئیں گے تو اس سمت کو گھیلا تو کریں گے ہی.....“ مگر نہ جانے کیوں میرے یوں کہنے پر ابا ایک دم پھر گئے تھے انہیں شاید یوں میرا مشورہ دینا ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔

”ارے لڑکی تو نے کون سا یہاں رہنا ہے بھلا؟ کہو رہنا ہے تم نے اس گھر میں؟ ارے تم تو بیاہ کر پرائے گھر چلی جاؤ گی اور ادھر تو بھی میرے رہے گا، عبید رہے گا اور عزیز رہے گا۔“ وہ نہایت غصے میں بولے تھے اور یوں لہک، لہک کر کہہ رہے تھے کہ گویا وہ ان کے لڑکے نہ ہوئے کسی غزل کے قافیے ہو گئے۔ میں تو بے حد سہم کر گم سم سی ایک طرف

ہو گئی۔

”اور ہم رہیں گے ہم.....“ کچھ توقف کے بعد ان کی آواز پھر سے گونجی تھی۔

پھر اس روز کے بعد تو میں نے ابا کو کسی بھی بات میں اپنی رائے دینے کی کوشش نہیں کی۔

☆☆☆

وقت گزرا..... مہینے اور سال بیتے۔ عمیر اور عبید تعلیم حاصل کرنے کے لیے شہر گئے تو پھر وہیں کے ہو رہے۔ اماں کے انتقال کے بعد میں بیاہ کر راشد کے گھر چلی گئی۔ عزیز بھی ملک سے باہر جا آباد ہوا مگر میں ابا کی خیریت دریافت کرنے اکثر میکے آ جایا کرتی..... مگر اب ابا کی آنکھوں کی چمک ان کے نئے گھر کی طرح مائل پڑنے لگی تھی۔ میں اکثر دیکھتی کہ ابا دوپہر کو سستانے لیٹتے تو چپلوں سمیت ہی بستر پر لیٹ جاتے۔ پھر میرے توجہ دلانے پر کھیا جاتے۔ یونہی ایک بار الماری میں اپنی عینک تلاش کرتے کرتے غلطی سے میری عینک نکال لائے جو میں اکثر اخبار کے مطالعے کے دوران استعمال کیا کرتی تھی۔

”ابا یہ تو آپ نے میری عینک پھین لی ہے۔“ میں نے ابا سے آہستگی سے کہا۔

”ارے ہاں معلوم ہے مجھے..... پتا ہے مجھے کہ تمہاری عینک ہے یہ۔“ انہوں نے جھٹ سے عینک اتار دی۔ ”پتا ہے مجھے یہ کہ یہ تمہاری دالی ہے..... پتا ہے مجھے۔“ وہ بار، بار ایک ہی جملے کی تکرار کرتے رہے..... غالباً وہ شرمندگی سے بچنے کے لیے یوں مجھ سے جھوٹ بول رہے تھے۔ مجھے ان کی حالت پر تھوڑا سا افسوس ہوا مگر میں خاموش رہی۔ ایک روز عزیز سے فون پر بات کرتے یونہی اس سے کہہ بیٹھے۔

”بنا تم تو خاصے مصروف رہتے ہو دل چاہتا ہے تمہیں دیکھنے کو..... ایسا کر دو کسی روز مجھے ہی اپنے پاس بلاؤ۔ میں کچھ دن کے لیے تمہارے بیوی،

غزل

اب تمنائے یار نہیں
کسی کا بھی انتظار نہیں
جو نگاہ سے اترے دل میں
ایسا کوئی سچا وقادار نہیں
ہوش سنبھالا تو یہ جانے
دنیا جھوٹی کوئی غنوار نہیں
اس کی یاد اور ہم سودا کی
دل نہ جانے کہ پیار نہیں
قانع ہوئے مقدر نہیں
زندگی مکمل و عجزار نہیں
نہ دیکھ پھر اپنی نظروں سے
خزاں رُت ہے بہار نہیں
نہ چڑھا غم کے چڑھاوے
دل ہے میرا، دربار نہیں
تو آئے اور ہم ہوں منتظر
ایسا ہوتا ہر بار نہیں
حیرت شب وصال اور میرے حوصلے
جیت تیری میری بار نہیں
کلام: فصیح آصف خان، ملتان

آواز کہیں دور سے میرے کانوں میں گونجتی ہے۔

”ارے لڑکی تو نے یہاں کون سا رہنا ہے
بھلا.....؟ کہو رہنا ہے تم نے اس گھر میں؟ ارے تم تو
بیابا کر پراسے گھر چلی جاؤ گی اور ادھر تو بھی عمیر رہے
گا۔ عبید رہے گا، عزیر رہے گا اور ہم رہیں گے ہم.....“
”نہیں اس گھر میں نہ عمیر رہا، نہ عبید نہ عزیر.....
اور نہ ہی آبا..... بس رہی تو نہ بہت..... جو کل بھی
اس گھر کے لیے پرانی تھی اور آج بھی پرانی
ہے..... شاید.....“

بچوں سے بھی مل جاؤں گا۔“

مگر عزیر کے پاس تو جواب پہلے سے موجود تھا۔
جھٹ سے کہنے لگا۔ ”ابا یہاں تو پالا پڑتا ہے پھر پالا پڑتا
ہے، تیسرا کوئی موسم نہیں ہوتا..... اور آپ سے تو ہلکی سی
ٹھنڈ بھی برداشت نہیں ہوتی۔ یہاں آ کر تو آپ بیمار
پڑ جائیں گے اس لیے بہتر ہے کہ آپ وہیں رہیں۔
میں بھی ٹائم نکال کر آ جاؤں گا.....“

عزیر کا عذر قبول ہوا مگر اگلے کئی روز اس کے
دیس کی ٹھنڈ آبا کی آہوں کی صورت ہمارے گھر کو سرد
کرتی رہی۔ عزیر کہتا بھی تو درست تھا اس کے سفید
بُراق ملک میں صرف پالا پڑتا تھا اور پھر پالا پڑتا
تھا..... تیسرا کوئی موسم نہیں تھا۔

☆☆☆

راشد کی وفات کے بعد میں اپنے دو بچوں کے
ساتھ یکے میں آگئی تو آبا کسی حد تک سرور نظر آ رہے
تھے کیونکہ اس طرح انہیں اپنی تنہائی فنی نظر آتی تھی۔
مجھے یاد ہے کہ جب سسرال کے بجائے میں نے یکے
میں رہنے کا فیصلہ آبا کو سنایا تو مجھ سے کہنے لگے۔

”ہاں نہ بہت، یہ تم نے بہترین فیصلہ کیا ہے۔
یہ گھر کل بھی تمہارا تھا اور آج بھی تمہارا ہے۔“ مگر
میں خاموش ہی رہی کیونکہ جانتی تھی کہ یہ گھر کس کا تھا
مجھ سے بہتر بھلا کون جانتا؟

خیر اب تو آبا کی وفات کو بھی کہتے ہی برس گزر
گئے ہیں..... میں اس گھر میں اپنے دو بچوں اور
بوزھے ملازم خیر دین اور اس کی بیوی کے ہمراہ رہتی
ہوں۔ عمیر اور عبید بھی کبھار چھٹیوں میں بچوں کو
گھمانے یہاں لے آتے ہیں۔ عزیر البتہ کئی برس
مے یہاں نہیں آیا۔

گو میں ان لوگوں میں سے نہیں جو پرانی یادیں
سینٹ، سینٹ کر رکھتے ہیں مگر اب بھی جب بھی ٹھنڈ
گھٹائیں اٹھ، اندھ کر آتی ہیں اور میں برآمدے کے اس
حصے میں ترپال ڈالنے کے لیے بھاگتی ہوں تو آبا کی



میرتاجِ دل

نبیلہ ابرار احسا

تیسرا حصہ

اگلے دن ویرہ تھا اور صبح ہی شیریں چھوٹی بیٹی کے ساتھ ماڑہ کے ہاشٹے کی رسم نبھانے پہنچ چکی تھیں مگر یہاں ڈانگن فیل کے گرد سب پہلے ہی سے موجود تھے۔ ڈریکٹا نے خالص طور پر ہاشٹے کا اہتمام کر دیا تھا اور اب اپنے ہاتھ سے عمر زیب ایب، ایب چنیز، اصرار سے ماڑہ کو پیش کر رہے تھے۔ ماں کو دیکھ کر وہ ہل اٹھی تھی۔ عمر زیب نے ان کا لایا ہوا ناشتا بھی میز پر لگا دیا۔ دوپہر چونکہ ہونے کو بھی تو ڈریکٹا پارٹر جانے

کے لیے مائہ کی چیزیں اکٹھا کرنے لگی۔ ناشتے کے بعد مائہ ماں اور بہن کے ساتھ باتوں میں لگ گئی، ادھر دُڑیکتا بھابی کے ساتھ پارٹر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ وہ تیار ہو کر اسے بتانے آئی تو مائہ اپنی پھوٹی بہن اور شیریں تاتی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔ سامان پہلے سے ہی رکھوایا جا چکا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے سامنے ہی گاڑی اب گیٹ سے نکل رہی تھی۔ وہ حیرت سے ادھر ہی دیکھے جا رہی تھی۔ مائہ بھابی کو اچھی طرح پتا تھا کہ وہ ان کے ساتھ جائے گی پھر بھی وہ بغیر بتائے اپنی ماں اور بہن کے ساتھ چلی گئیں۔ اسے عجیب سا دکھ ہوا کیونکہ پاپے بھی کہا تھا کہ تم اپنی بھابی کے ساتھ چلی جانا خیر اس کے پاس اس وقت اتنا غم نہیں تھا کہ وہ سوچ کے کڑھتی۔ شادی والا گھر تھا سو کام تھے اور اسے ہی سب کچھ دیکھنا تھا۔

☆☆☆

مائہ کل سے بڑھ کر آج حسین لگ رہی تھی۔ اس کے برابر بیٹھا شاہ زیب بار، بار اسی کو دیکھ رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ اس کا نقش، نقش دل میں اتار لے۔ وہ ایسا ہی پاگل، دیوانہ تھا۔ پوری تقریب کے دوران وہ ایک بار بھی اس کے پاس سے نہیں ہٹا۔ دوست احباب، ملنے جلنے والے خود ہی آکر مبارک باد دیتے رہے جنہیں وہ مسکرا، مسکرا کر خوشی سے وصول کرتا رہا۔ شیریں بڑی سرور تھیں۔ انہیں اب یقین ہو گیا تھا کہ مائہ ساری زندگی اپنے شوہر کے دل و دماغ پر چھرائی کرے گی۔ اسے ناز و انداز کے ایسے جال میں جکڑ کے رکھے گی کہ وہ کاتھ کا الو بہن کے ہر بات پر ہاں، ہاں ہی کرے گا۔

☆☆☆

"مائہ اٹھ بھی جاؤ ناں جان کافی غم ہو گیا ہے۔ اب تو پہا بھی آفس کے لیے جا چکے ہوں گے۔ مجھے بات کرنی تھی ان سے تم نے جگایا ہی نہیں مجھے۔" اس نے جھک کر مائہ کے ساتھ خوب صورت سی شرارت کر دی۔ وہ زلفیں سنہا لتی ایک جھٹکے سے ابھی اور اس سے قدرے دور ہوئی۔ اپنی خوشی میں وہ محسوس

ہی نہ کر سکا کہ مائہ کے چہرے پر بیزاری سی ہے۔ "کیسے جگاتی میں آپ کو؟ روز لیٹ سوتی ہوں، سکون کی غیند کو ترس گئی ہوں۔ آپ مجھے سونے ہی نہیں دیتے۔" اب کی بار اس نے غصہ نہیں چھپایا۔ "پورا دن ہوتا ہے تمہارے پاس آرام سے سویا کرو۔" وہ مزے سے بولا تو مائہ چیخ پکین کر ہاتھ روم چلی گئی دروازہ زور سے بند کیا جو اس کے غصے کا واضح اظہار تھا۔

مائہ ٹھیک کہہ رہی تھی شاہ زیب نے اس کی صورت میں نئی دنیا دریافت کی تھی۔ اپنے جذبات کے اظہار میں وہ کسی قسم کی کنجوشی نہیں کرتا تھا۔ دل یہی کرتا تھا کہ مائہ ہر وقت اس کے پاس رہے۔ دُڑیکتا کانچ اور عمر آفس چلے جاتے۔ وہ دونوں بہت دیر سے جا گئے۔ فی الحال کانچ سے بھی چھٹیاں لی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

مائہ، شاہ زیب کے ساتھ میکے آئی ہوئی تھی۔ دو دن وہ اس کے ساتھ گاؤں میں ہی رہا۔ عمر زیب کی کال آئی تو واپس گیا۔ انہیں کوئی کام تھا ورنہ وہ مائہ کے ساتھ ہی واپس آتا۔ باسط کے باہر جانے کے انتظامات مکمل ہو گئے تھے۔ وہ گاؤں شیریں خالہ سے ملنے آیا ہوا تھا، مائہ بھی ادھر ہی موجود تھی۔ وہ اس کا سامنا کرنے سے کترار ہا تھا پر ہونی ہو کر رہی وہ اس وقت اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ مشہور ڈیزائنر کا... سوٹ زیب تن کیے، خوب صورت جیولری سے آراستہ، ہلکا پھٹکا میک اپ کیے وہ روزِ اول کی طرح ہی اسے اپنی رسائی سے بہت دور لگ رہی تھی۔ باسط کو اندر کہیں زیاں کا شدید احساس ہوا۔ وہ اس سے تفصیلات پوچھ رہی تھی کہ کہاں جا رہا ہے، کیا جاب ہے وغیرہ وغیرہ۔ وہ ہوں ہاں کرتا رہا۔

"باسط تم ٹھیک طرح بات کیوں نہیں کر رہے۔"

کیا ہوا ہے؟

"نور کیسے بات کروں؟" اتنا اس نے مائہ سے سوال کر دیا۔

”تم کھوئے، کھوئے سے ہو جیسے تمہارا زمین کہیں اور ہو۔“

”جو شخص اپنی محبت کو کھودے وہ کھویا، کھویا سا نہ ہو تو کیا ہو؟“ باسط کا لہجہ بہت کاٹ دار تھا۔ ”تمہارا شوہر بہت خوش قسمت ہے مائرہ لیکن مجھے بتاؤ مجھ میں کیا کمی تھی جو شیریں خاںہ نے شاہ زیب کو مجھ پر فوقیت دی۔ اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق ہے بڑھ لکھ کر اپنا مستقبل بنا سکتا ہوں۔ صحت مند ہوں، اچھی شکل صورت ہے۔ کوئی تحصیل چھبیلہ کالج ہوائے نہیں ہوں۔“ آخر میں باسط کا لہجہ بہت عجیب سا ہو گیا۔ مائرہ اس کی بات کی تیر میں چھپے مفہوم تک پہنچ گئی تھی اور اس کے چہرے پر سرفی آگئی تھی۔ باسط ایک مہمل مرد نظر آ رہا تھا اور اس کی سوچ بھی مردوں والی تھی۔ ایک شاہ زیب تھا جسے سوچ مستی اور نلے گلے سے ہی فرصت نہیں تھی۔ رومانس کے سوا اسے کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ ہینے بھائے سب مل رہا تھا اسے ہاتھ چیر ہلانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ باسط کی نگاہوں میں یہی حسرت اور یاس تھی۔۔۔ جانے کیوں مائرہ کو وہ حسرت اور یاس سے بھری نظر بہت اچھی لگ رہی تھی۔ کہیں اندر تک پہنچے گا ڈر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

رات کے پڑھ سنانے میں وہ پوری طرح مائرہ کی طرف متوجہ تھا..... پر اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ وہ مائرہ کی چوڑیوں کے ساتھ پھینر چھاڑ کر رہا تھا جب اس نے اپنی کھائی پیچھے کی۔

”شاہ زیب آپ بچا کے ساتھ آفس جاتا شروع کر دیں وہ اب بوڑھے ہو رہے ہیں۔ آپ کا بھی فرض بنتا ہے کہ ان کا بوجھ بانٹیں۔ شادی شدہ ہیں آپ کب تک اخراجات کے لیے ان سے مانگتے رہیں گے۔ مجھے اچھا نہیں لگتا جب وہ ہر ماہ آپ کو چیک دیتے ہیں کہ کیش کروالو۔ کاروبار اور ہر چیز میں آپ بھی حصے دار ہیں، حق بنتا ہے آپ کا ہر چیز پر اور آپ ہیں کہ بھیک منگوں کی طرح ہر چیز ان سے مانگتے ہیں۔“ مائرہ جانے کیا باور کروانا چاہ رہی تھی اس کا آخری جملہ سن

کر شاہ زیب کو غصہ آ گیا۔

”میں بھیک منگا نہیں عمر زیب کا بیٹا ہوں۔“

”آپ بھیک منگے ہیں اگر مالک ہوتے تو ان کے محتاج نہ ہوتے۔ عمر بچی پوری جائداد، کاروبار اور بینک بیلنس کے مالک ہیں۔ انہوں نے ہر چیز کا اختیار اپنے پاس رکھا ہے۔ آپ کے پاس کیا ہے مجھے بتا سکتے ہیں؟“

وہ طنز بہ انداز میں ایک، ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ شاہ زیب کا رد ہانوی موڈ غارت ہو چکا تھا۔

”میں مالک ہوں ہر چیز کا۔“

”کیسے؟“ جواباً وہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”ہاں، ہاں بولیں ناں کس طرح مالک ہیں آپ؟“

مائرہ کی نگاہیں اسے برے کی طرح چھید رہی تھیں۔

”بس میں مالک ہوں! بیٹا ہوں پاپا کا۔“ وہ جھنجھلا سا گیا۔ مائرہ ہنسنے لگی۔ کاٹ دار بنی۔

”آپ بیٹے ہیں مالک نہیں ہیں۔ ٹھیک ہے بچا نے آپ کو ہر قسم کی سہولت دی ہے۔ شادی پر جی بھر کے فضول خرچی کی ہے پر مالک بچا ہی ہیں سب جائداد کے کیونکہ وہ با اختیار ہیں آپ کو دیتے ہیں آپ سے لیتے نہیں ہیں۔“

”میں پھر کیا کروں، مائرہ؟“ وہ مدد طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مائرہ کے لبوں پر پراسرار مسکراہٹ آگئی۔ اتنے عرصے میں پہلی بار اس نے عقل مندی کی بات کی تھی۔

”آپ اس طرح کریں کہ صبح سے آفس جانا شروع کر دیں۔ بچا کو دیکھیں اور سمجھیں کہ وہ کس طرح کام کرتے ہیں۔ جب آپ نے آفس ورک اور اسٹاف کے مزاج کو جان لیا تو باقی پھر سوچیں گے کہ کیا کرتا ہے فی الحال آپ سوچاں کیونکہ آفس بھی جانا ہے۔“ سچ شاہ زیب بڑی سعادت مندی سے ہنسی ٹھیک کرتے ہوئے لیٹ گیا۔

مائرہ نے اس کے سونے کے بعد اس کی طرف سے کروٹ بدل لی۔ شیریں نے یہی کہا تھا کہ شاہ زیب کو آفس جوائن کرنے کے لیے کہو۔ انہوں نے

اسے آنے والے وقت سے ڈرا دیا تھا۔ سب کچھ عمر کے ہاتھ میں تھا۔ شاہ زیب کو بھی با اختیار ہونا چاہیے۔ ایسا بھی ممکن تھا اگر وہ آفس جانا شروع کر دیتا اور کام کو سمجھتا پھر باقی کے مراحل بھی آسان ہو جاتے تھے۔

مارہ بھی آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی لیکن خیالوں کی رو بہک کر باسط کی طرف چلی گئی۔ وہ پاکستان سے جا چکا تھا پر اس کے خیالوں سے نہیں جا پا رہا تھا۔ اسے باسط سے آخری ملاقات اور اس کی یاس بھری گہری نگاہیں اور ان میں اس کے حصول کی طلب سب اچھی طرح یاد تھا۔ اس کا مطلب ہے وہ اسے نہیں بھولا تھا۔ کیسا چھپا جانے والا اور اپنی منوانے والا مرد لگ رہا تھا وہ اور ایک یہ شاہ زیب۔ اس نے اپنے پہلو میں بے سدھ سوئے ہوئے شاہ زیب کو دیکھا۔ اس کی انگلی پکڑ کے چپنے والوں میں سے تھا۔ کوئی انا، کوئی خود داری، کوئی عزت نفس ہی نہیں تھی اس میں۔ بس پیوی کی جوتیاں سیدھی کرنے میں سکون ملتا تھا اسے۔ شاہ زیب کا بس چہتا تو ساری عمر مارہ کے گھٹنے سے لگ کے بیٹھا رہتا۔

”ہونہ۔“ مارہ نے سر جھٹکتے ہوئے اس کی طرف سے نظر ہٹائی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

طاہر لغاری کے سینے میں ہلکا سا درد اٹھا پر انہوں نے نظر انداز کر دیا اور یوں آئندہ آنے والے دنوں میں ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ ہنگامی حالت میں انہیں اسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹرز نے انجانا بتایا۔ اشعر لغاری تک فوراً یہ اطلاع پہنچی تھی۔ اس نے اسی میں عاقبت جانی کہ پیار کے پاس فوراً لوٹ آئے۔

ہفتہ دس دن میں طاہر لغاری صحت یاب ہو کر گھر آ گئے۔ ان کے ڈسچارج ہونے کے کچھ دن بعد اشعر بھی پاکستان پہنچ گیا۔ جب اس نے یہ بتایا کہ وہ پکا، پکا ان کے پاس آ گیا ہے تو انہوں نے اپنے اندر نئی توانائی رگ دے میں دوڑتی محسوس کی۔ یوں لگتا تھا وہ کبھی بیمار ہوئے ہی نہیں تھے۔ اشعر نے واپس آ کر مستقبل کی

منصوبہ بندی کا آغاز کر دیا تھا۔ کمرنا لوجی کی اعلیٰ ڈگری اور اس فیلڈ میں کچھ تجربہ بھی اس کے پاس موجود تھا سو اسٹیشن کرائم برانچ میں جاب ملنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ وہ جوان کر چکا تھا۔ طاہر لغاری نے کہا کہ کسی دن وقت ملے تو عمر انکل سے مل آؤ اس نے غائب دماغی سے سر ہل دیا تھا۔

☆☆☆

شاہ زیب نے عمر کے ساتھ آفس جانا شروع کر دیا تھا۔ انہیں بہت اچھا لگا تھا کہ وہ اپنی ذمے داریوں سے آگاہ ہو رہا ہے۔ وہ اسے اپنے پاس بٹھا کر کاروباری اسرار و رموز کی بابت بتاتے۔ اسی طرح کرتے کرتے اس نے پہلا ماہ بڑے آرام سے گزار لیا تھا۔ آفس آؤ جاتا تھا پر تھوڑی، تھوڑی دیر بعد مارہ کو فون کیا کرتا۔

”کیا کر رہی ہو؟ کیا سوچ رہی ہو؟ کچھ کھایا ہے؟“ کہ نہیں؟ مجھے کس کیا کہ نہیں اور اپنا خیال رکھنا میں شام کو جلدی آؤں گا پھر باہر چلیں گے۔“ اس کی گفتگو روزانہ اسی قسم کی ہوتی۔ گھر واپسی پر تو وہ جیسے پھر مارہ کا سایہ ہی بن جاتا۔ اسے ایک بل کے لیے بھی دور نہ ہونے دیتا وہ روتھتی، نخرے کرتی اور وہ ہاتھ جوڑ کر مناتا۔

☆☆☆

باسط اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ اس کے دوست نے روانگی سے قبل ایک ہند پکٹ میں کچھ سامان اس کے سپرد کیا تھا کہ ”یہ اتر پورٹ پر اترتے ہی تم نے ایک شخص کے حوالے کرنا ہے۔“ اس شخص کا حلیہ، عمر، نام وغیرہ اور اس طرح کی دیگر معلومات اسے مل گئی تھیں۔ وہ شخص اسے اتر پورٹ سے باہر نکلتے ہی مل گیا تھا۔ وہی شخص باسط کو اس کی رہائش گاہ تک اپنی گاڑی میں بٹھا کے لایا تھا۔ وہاں باسط جیسے تین اور نو جوان بھی تھے۔ باسط کو اب ان کے ساتھ ہی رہنا تھا۔ اتر پورٹ پہ جو شخص باسط کو ملا تھا اس کا نام اسد گردیزی تھا۔ اسے رہائش گاہ تک پہنچا کر جانے سے قبل اس نے پھولا ہوا ایک خاک کی لفافہ باسط کے سپرد کیا۔

”پھر جب کام ہوگا تمہارے پاس آؤں گا فی الحال

میں ہی اس نے خوشحال ہو جانا تھا۔ دنیا کی ہر آسائش اس کے قدموں تلے ہوئے کونھی۔

باسط نے وہاں کے طور طریقے جان کر بہت جلد ہی پیسے پاکستان بھیجے تھے۔ بیٹا کے ہاتھ میں جب پیسے آئے تو اس نے سوالیہ نگاہوں سے اپنے مجازی خدا حمزہ احمد کی طرف دیکھا۔

”اپنے باسط نے نیچے ہیں پورے ایک لاکھ بیس ہزار ہیں گن لو۔ رات اس کا فون آیا تھا کہ کھلی بار اس سے بھی زیادہ بھجواؤں گا۔“

”کیا اتنے زیادہ پیسے؟“ بیٹا کے ہاتھ لرزے لگے۔

”ہاں اسے بہت اچھی نوکری مل گئی ہے۔

ہمارے تو نصیب کھل گئے ہیں۔ اس کے دوست نے

کافی اس کا ساتھ دیا دیکھو کتنی اچھی نوکری دلائی ہے۔“

”میرا بیٹا چھوٹی عمر سے ہی روزگار اور نوکری کے

چکر میں پڑ گیا ہے، اس کی عمر کے باقی لڑکے بے فکری سے

گھومتے پھرتے ہیں۔ ایک میرا باسط ہے پر دینس کی

خاک چھان رہا ہے۔“ بیٹا کے آنسو نکل آئے تھے ان

آنسوؤں میں ممتا اور پیار تھا اور باسط کی جدائی کا ملم بھی۔

”ارے نیک بخت کیوں روتی ہو شکر کرو کہ بیٹا سادہ

پوست ہو گیا ہے۔ ہمارا بھی خاندان میں نام ہو گا عزت

ہوگی۔ یہاں تو جس کے پاس ڈھیر دلوں روپے ہو۔ اسی کی

ڈھیر دلوں عزت ہوتی ہے۔“ ان کی بات پر بیٹا سر ہلا کر رہ

گئی اور آنسوؤں کی نمی دوپٹے میں ہی جذب کر لی۔

☆ ☆ ☆

”جان۔“ مارہ کا لہجہ مخصوص لگاؤٹ میں ڈوبا ہوا

تھا۔ شاہ زیب ہزار جان سے فدا ہو گیا اور بڑے پیار

ساتھ بیٹے لگا۔

”کیا بات ہے سوٹ ہارت؟“

”میں کچھ سوچ رہی تھی۔“

”کی؟“

”میں آپ کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ کتنی

محنت کر رہے ہیں میرے لیے۔“ مارہ نے اپنا سر اس

کے سینے پر رکھ دیا۔ وہ اس کے پیار کے نشے میں سرشار

ہو رہا تھا۔ سکون و صمیمیت انگ، انگ میں دوز رہی

لائف انجوائے کرو۔“ اس نے باسط کے کندھے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھا۔ باسط کی نگاہ پھولے ہوئے خاک کی لفافے پر تھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا جانے اس خاک کی لفافے میں کیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نکلا سوال اسد گردیزی نے بھی پڑھ لیا۔

”یہ تمہاری خدمت کا معاوضہ ہے جو تم نے

ہمارے لیے سرانجام دی ہے۔“

”مگر میں نے تو کوئی کام نہیں کیا۔“ وہ الجھن

بھرے انداز میں اسے اب بھی دیکھ رہا تھا۔

”کام تو تم نے کیا ہے اور اتنی خوبی سے کیا ہے کہ

میں بھی داد دینے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ جو ٹکٹ تم نے

مجھے دیا ہے وہی تو تمہاری خدمت ہے اور جو میں نے

اس کے عوض تمہیں دیا وہ تمہارا حق۔ اب چلتا ہوں

پریشان مت ہو۔ باقی باتیں تمہیں تمہارے ساتھ رہائش

پزیر لڑکے بتا دیں گے پھر بھی کوئی مشکل یا پریشانی ہو

تو مجھے کال کر لینا یہ میرا نمبر ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔“

حیران پریشان کھڑے باسط کے ہاتھ پر اسد نے ایک

کارڈ رکھا اور پھر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ باسط نے ہاتھ میں

پکڑا کارڈ غور سے دیکھا۔ اس میں اسد کا نام اور دو سیل

نمبر درج تھے۔ اس نے کارڈ اپنی پیٹ کی جیب میں

ٹھونس دیا۔ اسے خاک کی لفافے کو دیکھنے کی جلدی تھی مگر

کمرے میں موجود تینوں لڑکے اس سے تعارف کے

منتظر تھے۔ وہ ہادولہ یا خواستہ ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس

نے شکر کیا جب وہ سب ایک، ایک کر کے وہاں سے

اٹھے اور سونے کے لیے گئے۔ تنہائی پاتے ہی باسط نے

خاک کی لفافہ کھولا۔ اندر کرارے امرتین ڈالرز بھرے

ہوئے تھے۔ اس کی تو آنکھیں ایسے خیرہ ہوئیں جیسے کوئی

مخزانہ دیکھ لیا ہو۔ اس نے ایک، ایک کر کے تمام نوٹ

گنے۔ از سر نو اس نے یہی عمل پھر کر دیا۔ یہ رقم بہت

زیادہ تھی اس نے پاکستانی روپوں میں لفافے میں موجود

ڈالرز کا حساب لگایا تو خوشی سے چہرہ چمک اٹھا۔

اس کے خوابوں کے پہلے پڑاؤ میں ہی اسے

ناقابل یقین کامیابی ملی تھی۔ اس طرح تو محض چند ماہ

تھی۔ اپنی محبوب بیوی کی ذرا سی توجہ، محبت اور خیال اسے نہال کر دیتا تھا۔

”لو میں کون سی ایسی خاص محنت کر رہا ہوں تمہارے لیے۔“

”محنت ہی تو کر رہے ہیں، آپ نے آرام و آسائش میں زندگی گزاری ہے اور میں نے آپ کو اپنی ذمے داریوں کا احساس دلایا۔ آپ نے آتش جانا شروع کر دیا حالانکہ یہ آپ کے مزاج میں نہیں تھا۔“

”تو اچھا ہوتا ہے مجھے بھی زندگی کی مشکلات کا احساس ہوا ہے اور تم تو میرے ذمے داری ہو سوت ہارٹ تمہارے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں یہ تو عام سا کام ہے۔“

”شاہ زیب میں آپ کو تارے توڑ کے لانے کے لیے نہیں کہوں گی مگر آپ فیوجہ کی فکر بھی کریں ساری زندگی ہم نے دو تو نہیں رہنا، ہمارے بچے بھی ہوں گے ان کی سوز و ریات ہوں گی۔“ اب وہ مجھ پر کی جگہ تاحل لگ رہی تھی۔

”جب بچے ہوں گے تو دیکھا جائے گا ان کی ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں گی۔ تم فکر مت کرو۔“ اس نے پیار سے مارہ کے ماتھے پر آئے ہاتھ پیچھے کیے۔

”شاہ زیب میں اپنے ہونے والے بچوں کو دنیا کی ہر سہولت و آسائش دینا چاہتی ہوں۔“ وہ بولتے، بولتے اٹھ کر بیٹھ گئی اور ذرا دیر بعد پھر گویا ہوئی۔ ”ان آرام و آسائش کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے پاس بھی کچھ ہو میرا مطلب ہے کوئی پراپرٹی، بینک بیلنس تاکہ ہم اپنی مرضی سے سب کچھ استعمال کر سکیں تاکہ... کسی اور سے مانگیں۔“

”سب کچھ میرا ہی تو ہے اور جو چیز میری ہے وہ ظاہر ہے میرے بچوں کی بھی ہے۔“ شاہ زیب نے اس کی بات درمیان سے کاٹ دی مگر وہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھی۔

”شاہ زیب آپ جتنا دماغ میں سے اپنا حصہ طلب

کریں۔“ اس نے بہت درل انداز میں یہ بات کہی تھی جیسے اس کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو مگر شاہ زیب اپنے آپ میں بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ وہ بیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”ایک دن سب میرا ہی ہوگا۔“ اس نے کمزور سے لہجہ میں ہلکا سا سنجالا لینے کی کوشش کی تھی۔

”اب آپ شادی شدہ ہیں۔ عمر چچا کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ آپ کی ایک بیوی ہے، ایک لائف ہے۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میرا شوہر مالک و مختار ہو۔ اس جانداز میں آپ اپنا حصہ مانگیں اور جب مل جائے تو الگ سے اپنا کاروبار شروع کریں کیونکہ اب کہتے ہیں کہ عمر بچا وقت کے ساتھ بالکل بھی نہیں بدلے وہ ابھی تک فرسودہ طریقے سے کاروبار کر رہے ہیں لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں پر ان کا انداز نہیں بدلا۔ آپ جوان ہیں آپ کے پاس نئی سوچ اور نئے آئیڈیاز ہیں۔ دیکھیے گا آپ جب اپنا بزنس شروع کریں گے تو کیسے کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔ میرے سب خواب ایک ایک کر کے حقیقت بن جائیں گے۔ بس آپ ذرا اہمیت تو کریں۔“ وہ اسے جوش دلا رہی تھی۔ سہرے رو پہلے خوابوں کی واوی کی سیر پر مجبور کر رہی تھی۔ چچا نے شاہ زیب کو اپنے آپ میں تازگی و سرمستی محسوس ہونے لگی۔ اس کے الفاظ کی انگلی پکڑے، پکڑے وہ کہاں سے کہاں پہنچ چکا تھا۔ اپنا بزنس، اپنا آفس، اپنا اسٹاف، اپنی مرضی، اپنا حکم، ہر چیز پر اپنا اختیار، اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا گولڈن چانس۔

کتنا خوب صورت ہوتا ہے یہ سب کچھ اپنی مرضی اور اپنے اختیار کا تصور ہی کتنا سرور آگیا تھا۔ جو بات وہ پہلے سوچ بھی نہیں سکتا تھا اب بڑے آرام سے چٹان کر رہا تھا۔ درپردہ مارہ کا بڑھاوا اور مدد بھی شامل تھی۔ اس نے پیار سے بات کرنے کے لیے خود کو تیار کر لیا تھا۔ مارہ نے اس کے دماغ میں ڈال دیا تھا کہ سب کچھ تمہارا ہے جو چیز تمہاری ہے اس کا مطالبہ کرنے میں کوئی شرم کی بات نہیں ہے۔ اب تو اس کے ذہن نے کچھ عجیب، عجیب سی باتیں بھی سوچنا شروع کر دی

تھیں۔ جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

مارہ نے سوئے ہوئے شاہ زیب کے چہرے سے نگاہ ہٹائی۔ درحقیقت وہ دل میں بہت مسرور تھی۔ جو بات وہ شاہ زیب کے دماغ میں ڈالنا چاہ رہی تھی وہ اس نے ڈال دی تھی۔ اب اس نے اپنا کام بخوبی کر لیا تھا۔ بس وقت اور سامنے آنے والے نتائج کا انتظار کرنا تھا اور یہ انتظار زیادہ طویل نہیں تھا۔ شاہ زیب تو اس کے ہاتھ میں کچھ پتلی کی طرح تھا وہ جب چاہتی ڈور بٹاتی اور وہ اشارے پر حرکت شروع کر دیتا۔ یہ خوشی ہی کتنی بڑی تھی کہ اس کا شوہر اس کی ہر بات مانتا تھا، اس کی جی حضوری اور خوشنودی ہی اس کے لیے اہم تھی۔ پر جانے کیوں پھر بھی وہ دل سے خوش نہیں ہو پاتی تھی۔ یوں جیسے وہ اس کا شوہر نہیں بلکہ غلام ہے، بے دام کا غلام۔ اسے شاہ زیب کی شخصیت میں عجیب سا خلا محسوس ہوتا جیسے خود اس کی اپنی کوئی بھی انفرادی شخصیت و کردار نہ ہو۔

مارہ جو کہتی وہ وہی کرتا۔ اس کی کہی بات سے وہ انحراف کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ کتنی غلط باتیں بعض اوقات اسے ماننے پر مجبور کرتی اور وہ بلا چون و چرا امان لیتا ایسے جیسے یہ اس کا فرض ہو۔ وہ اگر کسی بھی فضول اور بے معنی بات پر ناراض ہو جاتی تو وہ متنب کر کر کے اسے مانتا۔ ہاتھ تک جوڑ دیتا، بچوں کی طرح کان پکڑتا۔ یہ سب دیکھ کر مارہ کو اور بھی آگ لگتی۔ تن من جھلنے لگتا۔ دور، دور تک پچھتاؤں کی خاک اڑتی اور اس گرد و غبار میں سے رفتہ، رفتہ ایک چہرہ نمایاں ہو کے سامنے آتا۔ یہ چہرہ یہ نقش اس کے جانے پہچانے تھے۔ یہ چہرہ یہ نقش باسط کے تھے۔ جس کے چہرے کے تاثرات میں ایک، ایک نقش میں مردانگی و کڑھکی تھی۔ اپنی منوا لینے کا عزم تھا، جنون تھا۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ میچورڈ اور باشعور تھا۔ اس کی شخصیت ایک مکمل اور بھرپور مرد کی عکاس تھی۔ مارہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے بارے میں سوچتی تھی۔

شاہ زیب سمجھی، سمجھی اسے کسی خوف زدہ بچے کے

مانند لگتا جو بھرے مینے میں اپنوں سے پھڑ گیا ہو اور اب تلاش کرتا پھر رہا ہو۔ اس تلاش میں ہر نظر آنے والے چہرے میں سہارا اور تحفظ ڈھونڈ رہا ہو، پناہ مانگ رہا ہو۔ شاہ زیب کی شخصیت کے اس رخ پر مارہ کو کبھی، کبھی بہت حیرت ہوتی تھی۔ اس کی ایک وجہ شاید عالمہ چچی کی وفات ہو۔ کیونکہ اس نے بڑوں سے سنا تھا کہ شاہ زیب چھوٹا سا تھا جب عالمہ چچی فوت ہوئیں۔ اس محرومی اور اس خلا کو وہ شاید آج تک پر نہیں کر پایا تھا حالانکہ مارہ نے یہ بھی سنا تھا کہ عمر چچا کی دوسری بیوی بھی بہت اچھی تھیں خیر اس نے سر جھٹک کر ان سوچوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی کیونکہ وہ اس بارے میں جتنا سوچتی اسے غصہ آتا اور اس غصے کا مرکز شاہ زیب کی ذات ہوتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس سے فی الحال کوئی لڑائی جھگڑا کرے کیونکہ اس نے خود ہی شاہ زیب کو مطلوبہ نتائج کے لیے طاقت اور ہمت فراہم کرنا تھی۔

☆ ☆ ☆

سب خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے۔ شاہ زیب نے ایک، ایک چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ خود برائے نام کھا رہا تھا۔ اسے پپا سے بات کرنی تھی۔ آفس میں تو بات کرنا نا مناسب تھا۔ اس نے یہی سوچا تھا کہ گھر میں آرام سے پپا سے بات کرنا مناسب ہوگا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ کس وقت بات کی جائے۔ وہ گھر آتے، کھانا کھاتے تھوڑی دیر مطالعہ کرتے اور پھر سونے کے لیے چلے جاتے۔ اتنا وقت ہوتا ہی نہیں تھا ان کے پاس سو شاہ زیب سے صبر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جلد از جلد کھانا ختم ہونے کے انتظار میں تھا تا کہ بات کر سکے۔ عمر نے جو نیکی پانی کا گھاس لیوں سے ہٹا کر رکھا شاہ زیب نے اپنی پوری طاقت جمع کی اور ان کی طرف دیکھا۔

”پپا آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“ وہ چونک سے گئے۔ کچھ عرصے پہلے کی بات یاد آگئی جب وہ اسی طرح اسی ٹون میں ان کے پاس آیا تھا کہ پپا آپ سے ایک بات کرنی ہے۔ ان کی پھٹی حسن نے انہیں خبردار کیا۔ شاہ زیب کا لہجہ، انداز اور چہرے پر کھرا

دنیا کی ہر سہولت و آرام دینا چاہتا ہوں۔ اس لیے پلیز
پاپا مجھے میرا حق دے دیں جو بھی بنتا ہے۔ "شاہ زیب
نے اپنی بات کر دی تھی۔ عمر مگر مکر اسے دیکھ رہے تھے۔
وہ تو کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔ شاہ زیب نے کتنے
نا قابل یقین جملے بولے تھے۔ ان کی ساتوں نے یقیناً
دھوکا نہیں کھایا تھا لفظ بہ لفظ ٹھیک نہ تھا اپنے سیاق و
سباق کے ساتھ۔ وہ دھوکا نہیں کھا سکتے تھے۔
"تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" عمر کا
لہجہ اب بھی ٹھنڈا ہی تھا۔

"جی مجھے پتا ہے۔" "دُرِ یکتا ان دونوں کو پریشانی
سے دیکھ رہی تھی۔ اسے کسی خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔
مارہ بظاہر یہاں سے اٹھ گئی تھی پر ڈانٹنگ روم
سے باہر دروازے کے پاس ہی کھڑی تھی۔ اندر سے
آتی آوازیں بخوبی اس کے کانوں میں پہنچ رہی تھیں۔
رگ و پے میں بیجان سا رہا تھا۔

"پاپا میں نے اپنا حق مانگا ہے۔ آخر کب تک
چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کے لیے بھی مجھے آپ کی مدد
کی ضرورت پڑتی رہے گی اور میں آپ کے ہاتھوں کی
طرف دیکھتا رہوں گا۔ پاپا اب میری ایک فیملی لائف
ہے، میں اکیلا نہیں ہوں۔ میری بیوی ہے اس کی بھی سو
ضروریات ہیں جن کو پورا کرتا میری ذمہ داری ہے
اور میں نہ صرف اپنے بلکہ اس کے لیے بھی آپ کا محتاج
ہوں۔ پاپا مجھے اچھا نہیں لگتا ذرا سی ضرورت کے
لیے آپ کی طرف دیکھنا۔ اس لیے مجھے میرا حصہ دے
دیں۔" وہ بڑے سکون سے بولا۔ عمر زیب چند ٹائپ
آنکھیں بند کیے کرسی کے ساتھ ٹیک لگائے وہیں بیٹھے
رہے پھر کچھ کہے بغیر اٹھے اور اپنے تلے قدم اٹھاتے
باہر نکل گئے۔ ان کے قدموں کی مخصوص چاپ پچھانتے
ہی مارہ نے وہاں سے ہنسنے میں دیر نہیں لگائی تھی جب
تک وہ باہر آتے تب تک وہ راہ واری سے غائب
ہو چکی تھی۔

مارہ، شاہ زیب کی کارکردگی سے خوش تھی اس نے
جس طرح بات کی تھی عمر چچی یقیناً اس کے سرکش تیوروں

اضطراب کسی خاص بات کی گواہی دے رہا تھا۔ عمر
زیب نے اپنے تاثرات کمال مہارت سے چھپا لیے
اور بظاہر بڑے ہشاش بشاش لہجے میں بولے۔

"کیا بات ہے جو اس طرح ذرہ ذرہ کے بول
رہے ہو؟" انہوں نے شاید اس کے دل کا چور پکڑ لیا
تھا۔ مارہ تو اسی وقت برتن اٹھانے کے بہانے منظر
سے ہٹ گئی اب وہاں ان دونوں کے علاوہ دُرِ یکتا بھی
تھی۔ اسے بھی کسی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا کیونکہ شاہ
زیب کا چہرہ پریشانیوں کی آماجگاہ لگ رہا تھا۔ وہ اٹھتے
اٹھتے وہیں بیٹھ گئی۔

"پاپا بات دراصل یہ ہے کہ میں اپنا کاروبار کرنا
چاہتا ہوں الگ سے۔" بالآخر اس نے دل کی بات
گوش گزار کر دی۔ عمر زیب کے چہرے پر معنی خیزی
مسکراہٹ آگئی جسے شاہ زیب کوئی معنی پہنانے سے
قاصر تھا۔

"الگ کاروبار کرنے کے لیے تجربہ اور مہارت
درکار ہوتی ہے، وہ تمہارے پاس ہے؟"
"پاپا تجربہ اور مہارت بھی وقت کے ساتھ،
ساتھ آ جاتی ہے۔ آپ کا بیٹا ہوں اس لیے تو آفس جاتا
ہوں کہ آپ کے کام کرنے کے طریقہ کار سے واقف
ہو جاؤں۔" وہ مارہ کے یاد کروائے گئے سبق کو بخوبی
توہر رہا تھا۔

"مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ ابھی تم اس قابل نہیں
ہوئے کہ الگ سے کاروبار کر سکو۔ ابھی تمہیں کافی کچھ
سمجھنے کی سیکھنے کی ضرورت ہے۔ تاہم لگے گا اس کے بعد
میں نے مناسب تصور کیا تو تم بے شک اپنا الگ بزنس کا
سیٹ اپ بنالینا مگر ابھی نہیں۔" عمر زیب نے بڑے
سکون سے اپنی بات مکمل کی تھی پر شاہ زیب کا فطری
غصہ نمود آیا۔

"پاپا میں سب کچھ کر سکتا ہوں شادی شدہ ہوں
خود مختار ہوں۔ مجھے میرا حق ملنا چاہیے اتنی بڑی دولت و
جائیداد کا وارث ہوں اور آپ ہیں کہ مجھے اس قابل ہی
تصور نہیں کرتے۔ کل کو میرے بچے ہوں گے انہیں میں

کی ذرا، ذرا سی تکلیف پر پریشان ہو اٹھتی۔ اس نے کبھی کبھی انہیں پریشان نہیں کیا تھا۔ جانے شاہ زیب کو خود غرضی کی ہوا کیوں لگ گئی تھی۔

انہوں نے الیم بند کیا اور آرام سے کھڑے ہوئے۔ اسے اپنی جگہ پر رکھا اور دوبارہ صوفے پر آ بیٹھے۔ کچھ دیر بعد وہ پھر اٹھے اور دیوار میں نصب سیف کا لاک کھولا۔ اندر بہت سے کاغذات اور کچھ ضروری فائلز رکھی تھیں۔ عمر نے ایک، ایک کر کے سب کاغذات باہر نکال لیے۔ وہ انہیں غور سے دیکھ رہے تھے۔ یہ ان کی زمینوں، جائیدادوں کے کاغذات تھے۔ شاہ زیب نے انہیں دورا ہے پہلا کھڑا کیا تھا۔ اس مشکل سے نکلتا اگرچہ ان کے اختیار میں تھا۔ اور انہیں اپنے گھر کے سکون اور دل سکون کی خاطر کچھ فیصلے کرنے ہی تھے۔

☆☆☆

تین چار روز سے عمر آفس نہیں جا رہے تھے۔ روزانہ شاہ زیب کی آفس روانگی کے بعد وہ تیار ہو کر ڈرائیور کے ساتھ نکل جاتے۔ وہ کہاں اور کیوں جاتے تھے اس کا علم گھر کے کسی فرد کو نہیں تھا۔ ڈریکٹر پریشان تھی ہی پر مارہ کو بھی کھد بھد لگی ہوئی تھی۔

اسی بنا پر اس نے میسجے جانے کا پروگرام فی الحال ملتوی کر دیا تھا۔ شاہ زیب بھی کچھ بتانے سے قاصر تھا کہ وہ کہاں جاتے ہیں۔ ہفتہ دس دن سے ان کی یہی روٹین تھی۔

شاہ زیب صبر سے انتظار کر رہا تھا کہ کب اس کی کئی بات پر وہ عمل کرتے ہیں۔ مارہ بھی خاموش تھی۔

☆☆☆

شاہ زیب تیار ہو کے ناشتا کرنے ڈانٹنگ ہال میں پہنچا تو عمر زیب اسی کے انتظار میں تھے۔ ڈریکٹر بھی وہیں موجود تھی۔ مارہ البتہ موجود نہیں تھی وہ شاید کچن میں کچھ لینے گئی تھی۔

”آج آفس سے چھٹی کرلو۔“ عمر کسی طرف دیکھے بغیر شاہ زیب سے بولے۔

سے واقف تھے تب ہی تو ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا دل ہی دل میں ہار مان چکے تھے۔ جو ان اولاد کے سامنے کوئی منہ زوری نہیں دکھا سکتا۔ یہ مارہ کا اپنا نظریہ تھا۔

☆☆☆

عمر زیب کے سامنے گھنٹوں پر فوٹو البم کھلا پڑا تھا یہ بہت پرانی تصاویر تھیں۔ عمر کی، عائلہ کی، شاہ زیب اور موٹر یکتا کے بچپن کی۔ ایک فوٹو میں عائلہ، شاہ زیب کو گود میں اٹھائے بیٹھی تھی۔ ننھا شاہ زیب یہ مشکل ایک سال کا تھا۔ عائلہ کی گود میں بیٹا انگوٹھا چوستا۔ سرے کی طرف حیران نگاہوں سے تکتا جب عمر نے وہ لمحہ تصویر میں قید کیا تھا عمر ایک، ایک تصویر کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں اپنا سنہرا ماضی ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہیں خبر ہی نہیں ہوئی کہ ان کی آنکھوں کے گوشے نم ہوئے جا رہے ہیں۔ عائلہ کی گود میں بیٹھے شاہ زیب کے نقش و خندلا رہے تھے۔ عائلہ کے بعد انہوں نے اس کی وی گئی۔ جھوڑی گئی نشانیوں کی کتنے پیار سے پرورش کی تھی۔ شاہ زیب کی ہر جائزہ جائزہ ضد پوری کی، وہ مارہ کے معاملے میں ان سے مقابلے پر اتر آتو انہوں نے شکست مان لی۔ اس کی ضد پوری کر دی۔ مارہ کو عزت و مان سے بہو بنا کر لے آئے۔ شاہ زیب نے ان کے ساتھ آفس جانا شروع کیا تو وہ خوش ہو گئے کہ جو ان بیٹے کو اپنے فرائض کا احساس ہو گیا ہے۔ آہ ہا یہ فرائض کا احساس تو نہیں بلکہ خود غرضی کی مفاد کی جنگ تھی۔ اختیار و طاقت کے تاج کے حصول کی جنگ تھی۔ طاقت اور اختیار کی جنگ کا یہ تاج جس کے سر پر بچتا ہی فاتح قرار پاتا۔ ان سب کے پس منظر میں کسی اور کی سوچ کار فرما تھی۔ یہ شاہ زیب کی اپنی سوچ اور فیصلہ نہیں تھا۔ شادی سے پہلے تک اس کا ذہن کبھی کاروبار، دولت کی ملکیت کی طرف گیا ہی نہیں تھا۔ اب یکا یک اپنے حصے کا مطالبہ مالک بنائے جانے کی ضد..... ان کی ساری عمر کی کمائی زبان کے درپے تھی۔

موٹر یکتا اس کے مقابلے میں خاصی کم گوا اور اپنے آپ میں گمن رہنے والی حساس اور خوددار بچی تھی جو باپ

”کیوں پاپا.....؟“ لی پاٹ کی طرف بڑھتے
اس کے ہاتھ لکھ بھر کے لیے رک گئے۔

”میں نے وکیل کو بلوایا ہے کچھ معاملات طے
کرنے ہیں..... سو تمہارا موجود ہونا ضروری ہے۔ میں
نے انہیں فون کر دیا ہے۔ وہ گیارہ بجے تک آجائیں
گے۔“ عمر زب صرف چائے پی کے اٹھ گئے۔

”پاپا اتنے سنجیدہ سے کیوں ہیں اور وکیل کو کیوں
بلوایا ہے؟“ شاہ زب نے دُوریکتا سے پوچھا۔

”بھائی مجھے نہیں پتا۔“ اس نے بھی چائے کا
کپ رکھ دیا۔ کھانے پینے سے دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ عمر
بظاہر بہت خاموش اور پرسکون تھے پر ان کی رنجش کی
گواہ لال آنکھیں اضطراب اور کرب کی آئینہ دار لگ
رہی تھیں۔

مارہ اپنے لیے آلیٹ ہوا کے پانی تھی۔ دُوریکتا
اور شاہ زب دونوں ہی خاموش بیٹھے تھے۔ اس نے
کچھ پوچھا تک نہیں اور ناشتا کرنے لگی۔ دُوریکتا کو اس
کے سکون پر رشک سا آیا۔ آلیٹ ختم کر کے جب وہ
چائے پینے لگی تو اسے احساس ہوا کہ بڑی خاموشی ہے
پر اس نے پھر بھی پوچھا نہیں۔ دُوریکتا کا کالج جانے
کا موڈ نہیں تھا سو ڈرائیور کو منع کر دیا۔ وکیل عدنان ہاشمی
بتائے گئے وقت کے مطابق آگیا تھا۔

عمر زب نے شاہ زب کو اس کے حصے اور
کاروبار کا مالک بنا دیا تھا۔ وکیل وہی کاغذات لایا تھا۔
گزشتہ کچھ دنوں سے عمر اسی لیے آفس بھی نہیں جا پا
رہے تھے کہ زمینوں کی ملکیت کے اور اسی نوعیت کے
دیگر کام کرنے تھے۔ شاہ زب کے ساتھ ساتھ دُوریکتا
بھی تو ان کی جائداد کی وارث تھی۔ شاہ زب کے
مطالبے سے وہ خائف سے تھے۔ اسی لیے دُوریکتا کا
حصہ بھی الگ کر دیا تھا۔ جس طرح کے حالات و
واقعات رونما ہو رہے تھے۔ ایسی صورت میں یہ اچھا تھا
کہ دُوریکتا کو کل کھان کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا
پڑے۔ انہوں نے انصاف پر مبنی فیصلہ کیا تھا۔

مارہ نے اندرونی خوشی کو ظاہر نہیں ہونے دیا

تھا۔ خاموشی کے پردے میں چھپا لیا۔ وکیل عدنان
ہاشمی نے شاہ زب کو اس کے حصے کی جائداد کی تفصیل
بینک بیننس اور اسی نوعیت کی دیگر چیزوں کے متعلق
بہت تفصیل سے بتایا تھا اور آخر میں جائداد کے
کاغذات اس کے سپرد کیے۔ مارہ کا بس نہیں چل رہا
تھا ورنہ ان کے سامنے ہی بھگڑا ڈالنا شروع
کر دیتی۔ شاہ زب بیٹھے بٹھے آرام سے مالک
بن گیا تھا۔ جو چاہتا تصرف میں لاتا، کوئی پوچھ کچھ
کرنے والا نہیں تھا۔ مگر ایک بات اسے حیران کر رہی
تھی کہ وکیل نے دُوریکتا یا اس کے حصے کی جائداد کے
بارے میں ایک لفظ تک نہیں کہا تھا۔ وہ وکیل صاحب
کے جانے تک ادھر ہی بیٹھی رہی پر یہ موضوع چھیڑا ہی
نہیں گیا اور عدنان ہاشمی کھانا کھا کے رخصت بھی
ہو گئے۔ عمر زب بھی عدنان ہاشمی کے جانے کے بعد
چلے گئے۔ اب کمرے میں صرف مارہ اور شاہ زب
ہی تھے۔ تنہائی پاتے ہی مارہ شاہ زب کی بانہوں
میں سما گئی۔

”میں آج بہت خوش ہوں۔“ وہ اپنا منہ اس کے
کان کے قریب لا کر بولی۔

”میں بھی بہت خوش ہوں۔“

”آج ہم مالک بن گئے ہیں۔ اب ہمیں عمر بیچا
سے کچھ بھی مانگنا نہیں پڑے گا۔ شاہ زب ہم دونوں
درلڈ نور پر بھی جائیں گے، ٹھیک ہے ناں۔“

”ہاں، ہاں کیوں نہیں، میں تمہیں ہر اس جگہ لے
جاؤں گا۔ جہاں تم جانا چاہو گی۔ میں تمہیں ہانی کے
جزائر سے لے کر افریقہ کے صحرائ تک لے جاسکتا ہوں
مگر تم پسند کرو تو۔“ شاہ زب کی آواز جذبات سے
بو جھل ہو رہی تھی۔

”آپ کے ساتھ میں پاتال تک جاسکتی ہوں۔
آپ افریقہ کے صحرائ کی بات کرتے ہیں۔“ مارہ کے
الفاظ سرگوشی بن رہے تھے۔

”میں تمہیں سب سے پہلے پورا پاکستان دکھاؤں
گا اس کے بعد درلڈ نور پر جائیں گے۔“ شاہ زب

غزل

فسوں غمری کی نئی رسم پھر سے چلنے دو
شعور ذات آزمائشوں میں ڈھلنے دو
آئے گی باؤ صبا خود ہی پتے نو میں گے
بند کلیوں میں اب نئے گلاب کھلنے دو
درد کی شکل کوئی ہو جنوں کے عالم میں
درد جن کو ملا ہے اس میں ان کو پہننے دو
اب کے طوقان جو پچا ہے خانہ دہن میں
حشر کو باؤ بیماری کے ساتھ چلنے دو
نزدی ہم پایہ تکمیل تک بھی پہنچیں گے
گداز دل میں محبت کی شمع چلنے دو
شاعرہ نازیہ نازکی، نوشہرہ

سے بڑھی ہوئی تھی۔ اس کا باس یا انچارج جو کوئی بھی تھا اس نے باسط کی اس خوبی کو بہت جلد ڈھکیا۔ اسے اچھی طرح پتا تھا کہ باسط کی یہ خوبی آگے بچل کر اس کے لیے بہت فائدہ مند اور معاون ثابت ہوگی۔ ویسے بھی اپنے کاروبار کی روز افزوں ترقی کے لیے اسے باسط جیسے تیز لڑکے کی ہی ضرورت تھی۔ کمپیوٹر کا بزنس شروع کیا باس نے۔ کمپیوٹر کی ضرورت تھی۔ اس کا نیا پروجیکٹ تھا جو اس نے صرف چھ ماہ پہلے ہی شروع کیا تھا۔ اس کمپنی کے لیے اس نے لیبر پاکستان سے بھی بھرتی کی تھی جن میں سے ایک باسط بھی تھا۔

کمپنی کا دفتر لائشیا کے مینے ترین علاقے میں تھا۔ باسط بھی اسی آفس میں تھا۔ آفس میں اس کی جاب کچھ ایسی بھی خاص نوعیت کی نہیں تھی ہاں جب سامان کہیں لے جاتا ہوتا تو پھر باس کی توجہ اسی پر فوکس ہوتی۔ اس کے ساتھ کے باقی تین چار لڑکے اس کی طرح اتنے ہوشیار نہیں تھے۔ ان میں سے دو تو اس وقت وہاں کی ایک جیل میں سڑ رہے تھے۔ باسط اپنے ساتھ اس قسم کے حادثے سے بچنا چاہتا تھا۔ وہ بالکل ہی اپنے ہاتھ پاؤں کو اس کے نہیں بیٹھا تھا۔ باس کی غیر

اسے اپنے حصار میں لیے لیے خوابوں میں گم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

بہت دن بعد عمر زیب اس کی طرف آئے تھے۔ ظاہر لغاری بہت خوشی ہوئے اور اسی وقت اپنے ملازم کو آواز دے کر زبردست سی خاطر مدارات کی ہدایت کی۔ ”اس بار کافی دن بعد ہماری ملاقات ہو رہی ہے۔ گھر میں سب خیریت ہے ناں۔ میری بیٹی ڈیڑھ مہینہ کی ہے اور جناب کے بہو، بیٹے کا کیا حال ہے؟“ ظاہر لغاری نے ایک سانس میں سب کا حال احوال پوچھ لیا۔

”کرم ہے رب کا۔۔۔ خیریت سے ہیں سب اور چکر بہت دن بعد اس لیے لگایا ہے کہ میں کچھ کاموں میں مصروف تھا۔ آج بوجھ ہلکا ہوا تو فرصت ملے ہی تمہاری طرف آ گیا ہوں۔“ وہ دھیمی سی مسکراہٹ لبوں پر لانے میں کامیاب ہو ہی گئے۔

”ایسے کون سے کام تھے؟“

”بس یار شاہ زیب کے حصے کی جائداد کی منتظمی کا کام تھا۔ وکیل آج ہی کاغذات بنوا کے لایا۔“ سب کچھ شاہ زیب کے سپرد کر کے میں تمہاری طرف آ گیا ہوں۔“ عمر کا بیچہ بہت زخمی سا تھا۔ ظاہر کو تاسف اور گہرا رنج سا ہوا۔ وہ مزید کچھ پوچھ کے اسے اور دھیمی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ سو موضوع ہی بدل دیا۔

☆☆☆

چھ ماہ گزر گئے تھے۔ باسط کام کی نوعیت کو اچھی طرح جان گیا تھا۔ شروع میں وہ بھی حیران ہوا کہ ایسا کون سا کام ہے جس میں اتنے پیسے ملتے ہیں ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلانے پڑتے۔ خاص محنت بھی نہیں کرنی پڑتی۔ بس سامان ایک اتر پورٹ سے دوسرے اتر پورٹ تک کسی خاص شخص کے حوالے کرنا پڑتا ہے اور پھر ڈھیروں ڈھیر پیسے ملتے ہیں۔

باسط مزاجاً بہت تیز اور سمجھدار تھا۔۔۔ اور بات جہاں پیسے اور مستقبل کی ہو تو وہاں ہر شخص میں عقل خود بخود ہی آ جاتی ہے اور باسط میں یہ صفت اوسط درجے

رشتے داروں کے لیے تحائف بھی لایا۔ وہ سامان سے لہرا پھندا تھا۔ بیٹا بطور خاص اسے اپنے ساتھ گاؤں کے لیے گئی کیونکہ باسط، شیریں خالہ اور اپنے کزنز کے لیے بھی بہت کچھ لایا تھا۔ ان سب کو تحائف بھی دینے تھے اور کچھ جتانہ بھی تھا۔ اتفاق سے مارہ بھی میکے آئی ہوئی تھی۔ باسط کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ وہ پہلے کے مقابلے میں کچھ موٹا اور پہلے سے بڑھ کر پھور لگ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا اس ایک ماہ میں اس کی عمر جیسے چھ سال بڑھ چکی ہو۔۔۔۔۔ وہ حد سے زیادہ ہنستے کار لگ رہا تھا۔

”لگ رہا ہے کہ تمہاری جاب اور کام بہت اچھا ہے۔“ وہ ہر سبیل تذکرہ بولی تھی۔

”ہاں تمہاری سوچ سے بھی زیادہ اچھا ہے میرا کام اور ہاں میں نے گھر بھی لے لیا ہے نر فرزند ہے۔ کبھی آؤناں ہمارے غریب خانے پر۔۔۔۔۔“ بولتے وقت وہ مارہ کے سر اپنے کو بھی تولتی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہنوز پہلے کی طرح اسارت اور دلکش لگ رہی تھی۔

”ایاں، خارہ نے بتایا ہے کہ تم نے گھر لیا ہے۔ آؤں گی کبھی تمہارے گھر بھی۔۔۔۔۔“ وہ خاص ادا سے بولی تو باسط اسے دیکھنے لگا۔

رات وہ گاؤں میں ہی رکا۔ مارہ رات گئے اس کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ ان باتوں کے دوران ایک بار بھی شاہ نزیب کا ذکر نہیں آیا۔

☆☆☆

باسط نے پاکستان میں اپنا کام مکمل کر لیا تھا اس نے واپسی کی سیٹ بک کروائی تھی۔ پہلے کی طرح اسے پھر کوئی سامان کسی مخصوص شخص کے سپرد کرنا تھا۔ اس بار مال کی مالیت زیادہ تھی سو وہ کچھ تروس اور پریشان بھی تھا۔ لیکن کوشش کر رہا تھا کہ اندرونی اضطراب اور کرب اس کے چہرے سے ظاہر نہیں ہونے پائے۔ سو چیکنگ کے مرحلے سے وہ بخوبی گزر گیا۔ اب دیکھنا تھا کہ وہاں انر پورٹ پر کیسے حالات سے واسطہ پڑتا تھا۔ یہاں سے تو سب آرام سے ہو گیا تھا۔ وہ جتنا ڈر رہا تھا کام اتنی ہی آسانی سے ہو گیا۔ اتنی اسکریننگ کے

موجودگی میں اس کا ایک ٹائپ تھا جو سارے معاملات کا نگران تھا۔ باسط نے اس سے کافی قربت پیدا کر لی تھی۔ وہ باسط کو پسند کرنے لگا تھا۔ کسی بھی قسم کی پریشانی کی صورت میں اس نے باسط کو مکمل مدد کی یقین دہانی کرائی تھی۔ ویسے بھی باسط اس کا خاص منظور نظر تھا۔ اسی نے باسط کو باس کے مختلف قسم کے بزنس کے بارے میں بتایا تھا۔ ہر کچھ عرصے بعد باس کوئی نہ کوئی نیا بزنس اسارت کر دیتا اس بزنس کی آڑ میں اس کا اصل بزنس پوشیدہ تھا اور یہی اس کی کامیابی کا نکتہ تھا۔

چھ ماہ کے دوران باسط کی وجہ سے باس کو بہت کامیابی ملی تھی سو کامیابی کے تر سب سے اس کا معاوضہ بھی دیگر کارکنوں کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ باسط نے اپنی ذاتی صلاحیت سے انگلش فر فر بونا سیکھ لی تھی اور دوسری زبانوں کی کچھ نہ کچھ شدد بدھ اسے ہوئی گئی تھی۔ یہ اس کا روبرو کے لیے بہت ضروری تھا۔

☆☆☆

بیٹا گھر کے ایک، ایک حصے کو حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ حمزہ احمد نے باسط کے بھیجے گئے پیسوں سے یہ گھر کل ہی خریدا تھا اور آج وہ سب اس گھر کو دیکھنے آئے تھے۔

گھران کے پاس پہلے سے بھی موجود تھا اور کافی کشادہ ہوا دار، خوب صورت بھی تھا۔ پر پوش علاقے میں بنے اس بنگلے کی کیا ہی شان تھی۔ فل فرزند بنگلا تھا۔ وال ٹوال دیز کارپٹ، وسیع و عریض لان، جدید فرنیچر سے آراستہ ایسا گھر ہی بیٹا کا خواب تھا۔

”میں سب کو بلا کے قرآن خوانی کرواؤں گی خاص طور پر شیریں آپا کو تو ضرور بلاؤں گی۔ انہیں جتا چلنا چاہیے کہ میرا باسط کتنا قابل ہے۔ ان کے داماد اور مارہ کے شوہر کو تو ورثے میں سب کچھ ملا ہے پر میرے بیٹے نے سب کچھ اپنی محنت سے حاصل کیا ہے۔ میرا باسط ان کے داماد سے کئی گنا زیادہ اچھا ہے۔“ وہ دل ہی دل میں خود سے بول رہی تھی۔

☆☆☆

باسط نے سان بعد پہلی بار پاکستان کا چکر لگایا تو

تھی۔ باقی بھٹ اس کے علاوہ تھے۔ عمر زب کے بھی
 کبھار شاہ زب کے آفس کا پکڑ لگاتے تو اورنگزیب
 بھائی ادھر ہی مل جاتے پر ان کے رویے میں بڑا فرق
 آ گیا تھا۔ زمین آسمان کا فرق۔ وہ بڑے غرور اور
 سرد مہری سے ملتے جیسے اس کا رو بار اور آفس کے وہی
 مالک ہوں۔ شاہ زب کی بیرونی اور گھریلو زندگی
 میں ان کا عمل دخل بڑھتا جا رہا تھا۔ عمر زب دیکھتے پر
 من سے بول نہ پاتے۔ شاہ زب کی ضد ماننے کا یہی
 انجام ہوتا تھا۔

ان کی دولت اور ترقی سے ان کے گئے خونی
 رشتے حسد کرتے تھے جو کام کوئی نہ کر سکا تھا وہ ایک
 کمزور سی لڑکی نے ان کی بہو بن کر دکھایا تھا۔ پسے ان
 کے گھر آئی پھر ان کے بیٹے کے دل میں اتری پھر اس
 کی زندگی پہ چھا گئی۔ شاہ زب اس کے پیچھے دم بناتا
 بندر تھا۔ مارہ ڈگڈگی بھائی اور وہ ناچنا شروع کر دیتا۔
 وہ پوری طرح اس کے بحر میں جکڑا ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

شاہ زب بہت خوش تھا۔ عمر زب کے توسط سے
 پہلی بار اسے بیرون ملک سے آرڈر ملا تھا۔ اس کی خوشی
 دیدنی تھی۔ اسے اس بات کا چنداں احساس نہیں تھا کہ
 اس آرڈر کی کامیابی سے تکمیل پر اس کے لیے ترقی و
 کامرانی کے نئے دروازے کھل جائے تھے۔ وہ تو بس
 آرڈر سامنے پر ہی خوشی سے پھولے نہیں سارہا تھا۔
 کاروباری حلقوں میں اسے ملنے والے اس آرڈر پر
 تبصرے ہو رہے تھے۔ کئی علی کمپنیوں کے چھوٹے
 موٹے آرڈر اس کے علاوہ تھے۔

تایا اورنگزیب کی ہدایت پہ وہ کسی کو بھی نہیں کر پاتا
 تھا۔ بس آرڈر لیتا جا رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا۔

مارہ نے اپنی دلچسپی کی نئی راہیں تلاش کر لی
 تھیں۔ اس نے بہت جلد ڈرائیونگ سیکھ لی تھی اور شاہ
 زب کی بیوی ہونے کے ناتے ایک لینڈ رولر کلب کی
 مستقل ممبر بھی بن گئی تھی۔ وہ دن بھر گاڑی اڑائے
 اڑائے پھرتی۔۔۔۔۔ ادھر شاہ زب کے ذہن پر آفس کے

معاملات بری طرح سوار تھے۔ اسنے سارے آرڈرز
 نے اس کی مت ہی مار دی تھی۔ تایا اورنگزیب کو ان
 معاملات کی کوئی خاص سوجھ بوجھ نہیں تھی۔ اپنی عقل
 سے کام کرتے جا رہے تھے۔ عمر زب کے ساتھ ان کا
 رویہ لیے دینے والا تھا سو انہوں نے شاہ زب کے
 آفس کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا۔ ان کا یہ رویہ مستقبل
 قریب میں شاہ زب کے لیے نقصان لانے والا ہے
 اگر انہیں علم ہوتا تو وہ شاید کبھی ایسا نہ کرتے۔

☆ ☆ ☆

آرڈر کی بروقت تکمیل کے لیے شاہ زب نے
 میٹرل کی خریداری تایا اورنگزیب اور اپنے سالے کے
 سپرد کی تھی۔ حالانکہ منیجر نے دے الفاظ میں کہا بھی کہ
 انہیں اس کا تجربہ نہیں ہے نہ ہی وہ کو اپنی کے معیار کا
 اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جواباً اس نے منیجر کو بری طرح
 جھڑا اور اپنی اوقات میں رہنے کو کہا۔ وہ بیچارہ اپنا سا
 منہ لے کر رہ گیا۔ اس فیلڈ میں اس کا تجربہ کافی زیادہ تھا
 پر شاہ زب کے رویے کو دیکھتے ہوئے ساکڑ پر ہو گیا۔
 اورنگزیب نے ایک فیکٹری سے کپڑا اور دیگر میٹرل
 خرید لیا۔ وہ اپنے اس کارنامے پہ خوش تھے کہ انہوں
 نے یہ سب بہت سستا خریدا ہے۔ شاہ زب کو بڑھا
 چڑھا کر انہوں نے بتایا۔ وہ پُر سکون ہو گیا۔۔۔۔۔ پر کو اپنی
 کنٹرول منیجر نے سامان دیکھتے ہی کو اپنی اور معیار کا
 اندازہ لگا لیا۔ وہ شاہ زب سے شکایت کرتا چاہتا تھا پر
 منیجر نے اسے اپنا واقعہ سنا کر خوفزدہ کر دیا۔ ویسے بھی
 نام گزرتا جا رہا تھا اور انہیں آرڈر مکمل کرنا تھا۔ اگر نام
 گزر جاتا تو ان کی کاروباری ساکھ کو شدید دھچکا لگتا۔

میٹرل ملتے ہی کام شروع کر دیا گیا۔ وقت بہت کم تھا۔
 ساری لیبر اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں لگی
 ہوئی تھی۔ ہونی ہو کر رہتی ہے۔ مقررہ معیار کے اندر
 کام مکمل نہیں ہو سکا۔ جتنا کام مکمل ہو سکا وہ کمپنی کو
 بھجوا دیا گیا۔ کچھ ہی دن کے اندر اندر تمام سامان
 شکایات کے ساتھ واپس بھجوا دیا گیا۔ شاہ زب سر پکڑ
 کر بیٹھ گیا۔ وہ تمام سرمایہ اس کاروبار میں جھونک چکا

ساتھ بیٹے سے معذرت کر لی تھی۔ وہ اکیلا ہی چلا آیا۔
 پاپا آفس جانے کی تیاری میں تھے اور در کینا کالج
 کے لیے روانہ ہو چکی تھی۔ وہ صبح، صبح اسے دیکھ کر پہلے
 حیران اور پھر سرور سے ہوئے۔ بڑی محبت سے گلے
 ملے۔ وہ دو دفعہ جانے کے لیے کھڑا ہوا اور انہوں نے
 دونوں ہی بار اسے تھوڑی دیر تو بیٹھو کہہ کر اپنے پاس
 سے اٹھنے ہی نہیں دیا۔ جب وہ آنے لگا تو اسے
 چھوڑنے گیت تک آئے۔ آخر میں اسے گلے لگا دیے
 ان کی گرفت میں بہت محبت بھری خست تھی۔ بے
 اختیار شاہ زیب نے کسی بچے کے مانند ان کی گردن
 میں ہاتھیں سما کر کے ان کے ماتھے پر اپنے لب رکھ
 دیے۔ عمر زیب کے اندر شفقت پوری کا طوفان
 ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ جانے کیا بات تھی ان کا دل چاہ رہا
 تھا کہ شاہ زیب اسی طرح ان کے گلے سے لپٹ رہے پر
 اسے جانا تو تھا۔ دوبار مارہ کی کال آ چکی تھی کہ کب تک
 آئیں گے۔ ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔ ناچار شاہ زیب
 ان سے مل کر واپس آ گیا۔ جب تک اس کی گاڑی نے
 موزئیس کا پارکرویں کھڑے دیکھتے رہے۔

☆ ☆ ☆

شاہ زیب گھر پہنچا تو شیریں تالی بیٹھی تھیں۔ وہ
 ابھی ابھی بچپنی تھیں۔ مارہ نے ہی انہیں بلوایا تھا
 حفاظت کے نکتہ نگاہ سے۔ گھر قیمتی چیزوں سے بھرا پڑا
 تھا۔ وہ دونوں چلے جاتے تو دن میں گھر میں کون ہوتا
 کیونکہ اورنگ زیب بیٹے کے ساتھ آفس میں ہوتے،
 کہیں شام ڈھلنے کے بعد لوٹتے۔ چوری کی وارداتیں
 عام تھیں کوئی بھی گھر میں کسی کو نہ پا کر نقب لگا سکتا تھا
 اس لیے مارہ نے اپنی والدہ محترمہ سے گزارش کی تھی
 کہ ان کی غیر موجودگی میں اگر گھر کی دیکھ بھال
 کریں۔ انہوں نے کل ہی آ جاتا تھا لیکن ہنگامی طور
 پر ایک فوجی میں جانے کی وجہ سے وہ نہ آ سکیں۔ صبح
 پو پھنتے ہی وہ ڈرائیور کے ساتھ چل پڑیں۔ ان کے
 ہمراہ مارہ کی چھوٹی بہن سائرہ بھی تھی۔

ان کا بدستہ ایبٹ آباد، وادی نیلم کشمیر جانے کا

تھا۔ دوسری کمپنیوں سے بھی یاد دہانی کروائی جا رہی تھی
 کہ سامان وقت پر پہنچانا ہے۔ اورنگ زیب تانیا نے بغیر
 سوچے سمجھے ہر چھوٹی بڑی کمپنی سے جو آرڈر لیے تھے وہ
 اب شاہ زیب کے گلے کا پھندا بننے جا رہے تھے۔ وہ
 کچھ دن کے لیے خود کو کاروباری معاملات سے الگ
 کرنا چاہ رہا تھا۔ تانیا اورنگ زیب نے کہا کہ کچھ دن کے
 لیے گھوم پھراؤ۔ پیچھے میں تمام کام دیکھ لوں گا۔ وہ خوش
 ہو گیا۔ بوجھ سر سے اترتا محسوس ہوا۔ اتنے دن بعد وہ
 کھل کے خوش ہوا تھا۔ گھر آیا تو مارہ غائب تھی وہ کلب
 گئی ہوئی تھی۔ اسے غصہ سا آ گیا۔ بڑے سکون سے
 اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

باہر پورج میں گاڑی رکھنے کی آواز آئی تو شاہ
 زیب نے بنڈروم کی کھڑکی سے پردہ اٹھا کے دیکھا۔
 مارہ چابی جھلاتی گاڑی سے اتری اور تک تک کرتی
 قدم اٹھانے لگی۔ شاہ زیب آ کر بیٹھ گیا۔ مارہ نے
 دروازہ کھولا اور اسے دیکھ کر چونک گئی۔

”آج آپ جلدی آ گئے۔“ وہ پرس
 صوفے پر پھینک کر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

”ہاں، آج ریلیس کرنے کا موڈ تھا سو آ گیا
 گھر۔۔۔ کچھ گھومنے پھرنے کا دل کر رہا ہے تم سے وعدہ
 کیا تھا پہلے تمہیں پورے پاکستان کے قابل دید
 مقامات دکھاؤں گا، شمالی علاقہ جات سے کر جاؤں گا
 اس کے بعد لاٹکیا اور اٹلی چلیں گے۔ میں نے تانیا سے
 کہہ دیا ہے۔“

”ہائے سچ شاہ زیب۔۔۔“ مارہ اٹھ کر اس کے
 گلے لگ گئی۔

”ہاں تم کل سے تیاریاں شروع کر دو، ہم جلد ہی
 جائیں گے۔“ شاہ زیب کے لبوں پر مسکراہٹ چمکنے
 لگی۔ وہ آرام سے پروگرام سینٹ کرنے لگی۔

☆ ☆ ☆

مارہ کپڑے اور دیگر تمام چیزیں رکھ چکی تھی۔
 شاہ زیب، پاپا کی طرف گیا تھا یہ بتاتے کہ ہم گھومنے
 پھرنے جا رہے ہیں۔ مارہ نے پکینگ کا کہہ کر اس کے

پر وگرام تھا۔ اگرچہ شاہ زیب اپنے دوستوں کے ساتھ پہلے بھی سیر کرنے آچکا تھا مگر اب مارہ کے ہمراہ سفر اسے بہت زیادہ دلکش لگ رہا تھا۔

☆☆☆

بنی داماد کی غیر موجودگی میں شیریں نے پورے گھر کا ناقدا نہ جائزہ لیا اور پھر راز دارانہ انداز میں اپنے شوہر اور نگزیب سے اس گھر کی مالیت کی بابت پوچھنے لگیں۔

”مجھے تو نہیں پتا کہ اس کی درست مالیت کتنی ہے مگر تین کروڑ سے زیادہ کا ہوگا۔“ انہوں نے اندازے سے بتایا تو شیریں کی آنکھیں چپکنے لگیں۔

”عمر بھائی نے شاہ زیب کا حصہ تو اسے دے دیا ہے مگر بنی کے معاملے میں پراسرار خاموشی اختیار کر رکھی ہے اس کا کیا مطلب ہے؟“

”مجھے کیا پتا..... یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ بتانا نہ چاہ رہا ہو۔“

”اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ عمر بھائی نے بنی کو بیٹے سے زیادہ حصہ دیا ہو اس لیے خاموش ہوں۔“ شیریں دور کی کوڑی لائی تھی۔ واقعی بات قابل غور تھی وہ اس طرف سوچنے پر مجبور ہو گئے۔

”اگر ایسی بات ہوئی تو اچھا نہ ہوگا۔“ شیریں جانے کیوں اس قدر اچھل رہی تھیں اور نگزیب بھی اس معاملے پر سوچ رہے تھے کہ عمر نے بیٹے کو جو دینا دلانا تھا دے دیا مگر وریکٹا کا حصہ کتنا تھا اس بارے میں ان کی خاموشی معنی خیز تھی۔ اس کے پیچھے جانے کیا مصلحت اور راز تھا۔ جس کا جاننا اب اور نگزیب کے لیے از حد ضروری تھا۔ عمر زیب سے مل کر پوچھا جاسکتا تھا کیونکہ وہ اب اس پوزیشن میں تھے کہ یہ سوال کر سکتے تھے۔

شاہ زیب نے اپنے کاروبار کے عملی معاملات ان کے حوالے کر دیے تھے اور اپنی اس کامیابی پر وہ پھولے نہیں مار رہے تھے۔ برسوں پہلے جب عمر اپنے دونوں بچوں کے ساتھ شہر شفٹ ہونے کی تیاری کر رہا تھا تو عائدہ کے چھوڑے گئے اثاثوں کی تفصیل جان کے ان

کے دل میں خواہش پیدا ہوئی تھی کہ کاش اس میں ان کا حصہ بھی ہو۔ اس وقت یہ ناممکن سی خواہش تھی پھر برسوں بعد یہ خواہش عجیب طرح پوری ہوئی۔ مارہ ان کی بیٹی عمر زیب کی بہو بنی اور اس نے اپنے بیٹے کو اس کا حصہ خوشی، خوشی جیتے دی دے دیا۔ اب یہ مارہ کے نام کیسے کروانا تھا انہیں سوچنا تھا۔ شاہ زیب ویسے بھی ان کی نگاہ میں جذباتی اور قدرے نان پر یکینکل نوجوان تھا۔ ایسے نوجوان پہ مالی معاملات میں زیادہ اعتبار نہیں کیا جاسکتا..... وہ سادہ دل تھا ہر ایک پہ اندھا اعتبار کرنے والا۔ میسرل کی خریداری کی ذمے داری ان کے حوالے کر کے اس نے روپے پیسے کی کوئی تفصیل ان سے نہیں مانگی تھی۔ یہ رویہ مستقبل میں بہت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا ان کی بیٹی کے حق میں..... اس طرح تو کوئی بھی اسے مالی خسارے سے دوچار کر سکتا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مارہ کو کل کھاں اس وجہ سے کوئی پریشانی ہو اس لیے شاہ زیب اپنی جاکماد میں سے کچھ بیوی کے نام کر دیتا تو اس کا مستقبل محفوظ رہ سکتا تھا۔ اپنے تئیں وہ بہت دور کی کوڑی لائے تھے۔

☆☆☆

وادئ میں موسم بہت ابراؤد تھا۔ وقفے وقفے سے بارش ہوتی رہی اس وجہ سے شاہ زیب اور مارہ زیادہ محوم پھر نہیں سکے۔ ہول تک ہی محدود رہے۔ سردی کی شدت بارش کی وجہ سے بڑھ گئی تھی۔ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں ویسے بھی سارا سال موسم بہت اچھا ہی رہتا اور زیادہ تر ٹھنڈ ہوتی۔ اسی وجہ سے شاہ زیب کو یہ جگہ بہت پسند تھی وہ کتنی بار یہاں آچکا تھا۔ مارہ کے ساتھ پہلی بار یہاں آیا تھا تو یہ وادی اس کے دل فریب نظارے، گنگنا شورشور مچاتا دریا، نیم آنکھوں کو تازگی بخشنا سبزہ، فلک بوس پہاڑ سب کچھ ہی تو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس جگہ کا اپنا حسن اور خوب صورتی تھی۔ اس کی رومانوی حس جاگ اُٹھی تھی۔ پر مارہ جانے کیوں جھنجھلائی ہوئی سی تھی۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر بیزاری ہی بیزاری تھی۔ شاہ زیب آتش دان کے پاس

سانگرہ میں اور تم

اس سانگرہ پر دل
بہت ادا ہے جاناں
کچھ اچھا نہیں لگتا تیرے بنا
آنکھوں میں کا جل لگاؤں کس کے لیے
بالوں میں گجرے سجاؤں کس کے لیے
نجی سنورتی تو تمہارے لیے ہوں
تم اس سانگرہ پر جو آ جاتے
اور ایک دم سے آ کر یہ کہہ دیتے
پتی برتھ ڈے ٹو یو
پتی برتھ ڈے ٹو یو

کلام: فریدہ قری، لاہور

اوصاف پائے جاتے ہیں بے شاہ زیب کی آنکھوں میں
اس وقت کیسا ملال تھا۔ جسے مارہ پڑھ ہی نہیں پائی۔
"بساط کو دیکھ لیں، وہ کیسا رعب دار، ایک مکمل
مرد ہے۔ خالہ میرا رشتہ ماگ رہی تھیں پر امی ابو عمر چچا کو
زبان دے چکے تھے ورنہ آج حالات کچھ اور
ہوتے۔۔۔۔۔" مارہ اس کی حالت سے بے خبر جانے کیا،
کیا بول رہی تھی۔ شاہ زیب پیچھے ہٹا بیڈ کے پاس
پڑے اپنے جوتے اٹھائے پہلے جرابیں پاؤں
میں چڑھا میں پھر جوتے پہنے۔۔۔۔۔ سائنڈ ٹیبل پر پڑی
گاڑی کی چابی اٹھائی۔ صرف ایک ٹاپے کے لیے مارہ
کی طرف دیکھا۔ اس کا ایک ہاتھ دروازے کے ہینڈل
پر تھا۔ اگلے ہی لمبے وہ نرم گرم کمرے کی پناہ سے باہر
تھا۔ ٹھنڈا دینے والی لہو کو سرد کر دینے والی ٹھنڈک تھی۔
ہوٹل کے ساتھ ہی ایک خالی قطعہ زمین کو پارکنگ کی
شکل دی گئی تھی۔ اس کی گاڑی ادھر ہی پارک تھی۔ شاہ
زیب کے ذہن میں اس وقت کچھ نہیں تھا۔ سمجھ ہی
نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ گاڑی نکال کر
ڈھولان سڑک پر لایا، اتنے میں پیچھے سے ہوٹل کے اسٹاف
میں سے ایک شخص نے دیکھا تو اس کے پیچھے بھاگا۔۔۔۔۔
اسے منع کرنے کے لیے اس وقت اس موسم میں ذرا سوج

بیٹھا تھا۔ مارہ کمبل اوڑھے بیڈ پر نیم دراز تھی۔ باہر پانچ
بجے ہی رات اتر آئی تھی اور بارش تو اتر سے ہو رہی تھی۔
شاہ زیب کی نگاہوں میں خمار اور مستی اتر آئی۔ وہ آتش
دان کے پاس سے اٹھ کے مارہ کے پاس آیا تو اس نے
شاہ زیب کا بازو جھٹک دیا۔ وہ اسے محبوب بیوی کا ادا
سمجھا اور پیار سے اس پہ جھکا تو اس نے اس بار شاہ زیب
کو پیچھے کی طرف ہٹا دیا۔

"سوٹ ہارٹ کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے
تاں تمہاری بے شاہ زیب کے لہجے میں محبت کی ساری
نرمانہیں بول رہی تھیں۔ مارہ کو اور بھی غصہ آ گیا۔ شاہ
زیب میں تو جیسے مردانہ اتنا موجود ہی نہیں تھی، کیسے وہ
اس کی انا کو اپنے پاؤں تلے روندتی اور وہ ہنستا چلا جاتا
اس کی منتیں کرتا، مناتا، بچوں کی طرح راضی کرتا۔

"میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے، مجھے کیا ہونا
ہے۔ میں اس وقت اکیلے رہنا چاہتی ہوں۔" جانے
کیوں آج کل اس پرستی اور بیزارگی طاری تھی۔ ٹھک
بھی جلدی جاتی۔ شاہ زیب کی جراثیم کا سامنا کرنا
اس کے لیے آسان نہیں رہا تھا۔ تب ہی اس وقت
اسے غصہ آ گیا تھا۔ جواباً شاہ زیب اسے منانے لگا۔
اسی حساب سے مارہ کا غصہ مزید بڑھنے لگا۔

"پلیز شاہ زیب مجھے عورتوں والی عادات لیے مرد
اچھے نہیں لگتے۔۔۔۔۔ پلیز اپنے اندر رعب و مردانگی پیدا
کریں۔ جیسے اور عورتوں کے شوہروں میں یہ وصف پایا
جاتا ہے۔" مارہ کے لہجے میں از حد حق اور درخشندگی تھی۔

"تو تمہارے خیال میں مجھ میں مردانگی نہیں
ہے؟" شاہ زیب کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔

"نہیں ہے، نہیں ہے مردانگی تب ہی تو کہا ہے
کہ خود میں پیدا کریں۔ مرد میں ایک انا، ایک رعب
اور عزت نفس ہونی چاہیے۔"

"تو مجھ میں مردانگی اور انا کے ساتھ، ساتھ عزت
نفس بھی نہیں ہے؟" شاہ زیب کو عجیب سا لگا۔

"ہاں نہیں۔" وہ لمبی نگاہ کی طرح رہی تھی۔
"تو بتاؤ مجھے بھلا کس طرح کے مردوں میں یہ

کرنا اپنی موت کو دعوت دینے کے برابر ہے۔ وہ تیزی سے بھاگا اپنی جھونک میں گرا تو درو سے کراہ کر رہ گیا۔ اب اسے اپنی فرتھی شاہ زیب کا خیال بھولی گیا تھا۔ اتنی دیر میں وہ کافی آگے آ گیا تھا۔ چلی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ گھپ اندھیرا تھا گاڑی کی ہینڈ لائٹس کی روشنی بھی اس موسم میں تا کافی ثابت ہو رہی تھی۔ شاہ زیب کی نگاہیں غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں اور کانوں میں مارہ کی آواز گونج رہی تھی۔

”پلیز اپنے اندر مردانگی پیدا کریں۔ باسط کو دیکھ لیں وہ ایک مکمل مرد ہے۔ مردانگی میں بھی بڑھ کر ہے۔ خالہ میرا رشتہ مانگ رہی تھیں پر امی، ابو عمر چچا کو زبان دے چکے تھے ورنہ آج حالات کچھ اور ہوتے۔“ ”اُف شاہ زیب کے لیے ان آوازوں سے چھپا چھڑانا ناممکن تھا۔ مارہ، باسط کو ایک مکمل مرد قرار دے رہی تھی۔ اس کی جرأت ایسے کیسے ہوئی۔ کیا وہ باسط کے ساتھ اپنے شوہر کا موازنہ کر رہی تھی؟ گویا باسط مردانگی میں شاہ زیب سے بازی لے گیا تھا۔ اس کی محبوب بیوی جسے شاہ زیب نے شادی کے بعد بھی محبوبہ کے رتبے پر فائز کر رکھا تھا اس باسط کے اپنے کزن کے اس کے سامنے یعنی اپنے شوہر کے سامنے مردانہ اوصاف گنوا رہی تھی۔ ”ایسا کیوں تھا، کیا مارہ اس سے ناخوش تھی؟“ یہ ایسا روح فرسا سوال تھا کہ شاہ زیب کا دماغ پھٹنے لگا تھا۔ وہ خود سے ایک ہی سوال کر رہا تھا۔

”کیا مجھ میں کوئی کمی ہے؟“ مارہ جس طرح لڑائی کے موڈ میں بھری بیٹھی تھی شاہ زیب اس سے بچنے اور دل و دماغ میں کمی آگ سرد کرنے کے لیے منظر سے ہٹا تھا۔ کیونکہ مارہ لڑائی کے موڈ میں ہوتی تو بات کو کہاں سے کہاں لے جاتی تھی۔ ہمیشہ وہ ہی خاموش ہوا تھا۔ اس بار بھی اس نے ہار مان لی تھی اور وہاں سے اٹھ آیا۔ مارہ تب بھی اونچا، اونچا بول رہی تھی۔ اس نے ایک بار بھی شاہ زیب سے نہیں پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو، مت جاؤ، موسم بہت خراب ہے، ایسے موسم میں یہاں خطرناک حادثے رونما ہونا عام سی بات تھی۔

پر مارہ کو شاہ زیب کی پروا ہوتی تو تب ناں۔۔۔۔۔ اس نے تو اپنی ساری نفرت اور کڑواہٹ اس پر انڈیل دی تھی۔ یہ خیال کیے بغیر کہ شاہ زیب یہ کیا کر رہی ہے یا اس پر آئندہ آنے والے وقت میں کیا کرے گی۔ بارش تیز ہو گئی تھی۔ شاہ زیب بغیر سوچے سمجھے گاڑی دوڑا رہا تھا۔ اسے اس وقت کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے۔

اس کا سارا وجود گویا سماعت بنا ہوا تھا۔ اور ایک ایک عضو مارہ کی آواز جیسے سن رہا تھا۔ اب تو بارش، پہاڑ اور ان پر چھایا اندھیرا شور بچا تا دریائے غلیم بھی اس سے یہی سرگوشیاں کر رہا تھا کہ ”پلیز خود میں مردانگی پیدا کرو۔ باسط تم سے مردانگی میں بڑھ کر ہے۔ تم میں مردانگی اور عزت نفس کی کمی ہے۔ باہا با۔۔۔۔۔ شاہ زیب تم میں مردانگی کی کمی ہے۔ مردانگی کی کمی ہے اور ساتھ غیرت کی بھی کمی ہے۔ اگر تم میں غیرت کی کمی نہ ہوتی تو آج تمہاری محبوب بیوی تمہارے سامنے یعنی اپنے شوہر کے سامنے ایک غیر مرد کی تعریف نہ کرتی اور تعریف کی بھی تو مردانگی کی۔“ شاہ زیب کو یوں لگ رہا تھا اس وادی کی ہر چیز اس کا مذاق اڑا رہی ہے اس پر طنز کر رہی ہے۔ اسے بے غیرتی کا طعنہ دے رہی ہے۔ ”میں بے غیرت نہیں ہوں۔ ہے۔ ہے مجھ میں غیرت۔“ اس کے ہاتھ سے اسٹیرنگ ویل پھسل گیا۔ اس کے ہاتھوں میں کمی آگئی تھی۔ سخت سردی میں شاہ زیب کا سارا وجود پسینہ اگل رہا تھا نمی تو اس کی آنکھوں میں بھی تھی۔

”میں بے غیرت نہیں ہوں، نہیں ہوں بے غیرت، میں مکمل مرد ہوں۔“ اس نے ہانکوں کی طرح چیخ کر پوری قوت سے کہا۔ غصے کے عالم میں اسٹیرنگ ویل اس کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ آنکھوں میں اچانک آنے والی نمی نے اسے عارضی طور پر سامنے کا منظر دیکھنے سے محروم کر دیا تھا۔

~~~~~

مارہ کبیل اوڑھے عرصے سے لیٹی ہوئی تھی۔ شاہ

گاڑی کو یہاں نہ پا کر..... پریشانی حد سے سوا ہو گئی۔ اب وہ کمرے کو آیا کرے۔

”میڈم آپ کچھ دیر اور دیکھ لیں ہو سکتا ہے آپ کے شوہر واپس آجائیں۔“ ہوٹل کے ادھیڑ عمر منیجر نے اسے تسلی دی۔ پر دوسرے مارہ کے دل و دماغ میں پہنچے گاڑھ کر بیٹھ چکے تھے۔ وہ جا کے ہوٹل کی لابی میں بیٹھ گئی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد رست و راج پر ٹائم دیکھتی کچھ اور لوگ بھی آ کر شاہ زیب کے بارے میں معلوم کر رہے تھے کہ آپ کے شوہر واپس آئے کہ نہیں ہوٹل میں مقیم اکثر مسافروں کو معلوم ہو چکا تھا۔ منیجر خود اسے کتنی بار تسلی دے چکا تھا۔ جوں جوں گھڑی کی سوئیاں آگے کی طرف جارہی تھیں۔ مارہ کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ آج تک شاہ زیب اس طرح ناراض نہیں ہوا تھا بلکہ وہ تو اس سے ناراض ہوتا ہی نہیں تھا۔ اپنی غلطی ہوتی یا نہ ہوتی ہمیشہ مارہ کو وہی راضی کرتا۔ لڑائی کی ابتدا ہمیشہ مارہ کی طرف سے ہوتی۔ وہ نہیں، نہیں کر اس کی کڑوی کسلی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتا۔ اور اس طرح ناراض ہو کر وہ کہیں جاتا بھی نہیں تھا۔ اور یہاں گھر سے دور ایک اجنبی جگہ پر وہ اسے اکیلا چھوڑ کر غائب تھا اس لیے وہ بہت پریشان تھی۔ دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ ہوٹل میں رات کا کھانا سرو ہو چکا تھا۔ مارہ سے مزید انتظار برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ پھر ریسپشن کی طرف چلی آئی۔

”میرے ہر مینڈ ابھی تک نہیں واپس نہیں آئے ہیں، منیجر سے کہیں کچھ کریں۔“ وہ رو بانسی ہو رہی تھی۔ کچھ مرد اسے ترس آمیز نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ سب کو پتا تھا کہ اس لڑکی کا شوہر دو گھنٹے سے گاڑی لے کر غائب ہے۔ وقتاً فوقتاً سب نے ہی ہمدردی جمائی تھی۔ منیجر پہ نفس نفیس اس کے پاس خود چل کر آیا۔

”میڈم مجھے لگتا ہے کہ خد انخواستہ آپ کے شوہر کسی حادثے کا شکار نہ ہو گئے ہوں۔ ہم کچھ لوگوں کو ان کی تلاش میں روانہ کر رہے ہیں۔ آپ فکر مت کریں۔ انشاء اللہ وہ واپس آجائیں گے۔“ منیجر نے

زیب کو گئے ایک گھنٹے سے زیادہ کا وقت ہو رہا تھا۔ اس کی واپسی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس نے کمبل پر سے پھینکا۔ جوتے پہنے اور کمرے سے باہر نکلی۔..... چاہے وہ کہاں تھا۔ مارہ کا خیال تھا شاید ہوٹل میں ہی کہیں بیٹھا ہو۔ چھوٹا سا ہوٹل تھا اس نے ممکنہ جگہوں پر دیکھ لیا۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ وہ ریسپشن کی طرف آگئی کہ شاید وہاں سے کچھ معلومات مل جائے۔ پریشانی اب اس کے چہرے سے ہو رہی تھی۔ ریسپشن پر موجود لڑکا فوراً بھانپ گیا کہ کوئی بات ہے۔

”میرے ہر مینڈ ایک گھنٹے سے غائب ہیں ان کا کچھ پتا نہیں ہے۔ میں نے ہوٹل میں بھی دیکھ لیا ہے۔ وہ یہاں نہیں ہیں۔“

”وہ کہاں گئے ہیں کچھ بتایا نہیں؟“

”نہیں، اصل میں وہ کچھ غصے میں تھے اس لیے کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔ میں نے یہی سوچا کہ جب ان کا غصہ ختم ہوگا تو آجائیں گے مگر.....“ مارہ بولتے، بولتے چپ ہو گئی۔ اسے میں کچھ اور لوگ بھی اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ ان میں ہوٹل کے اسٹاف کا وہ آدمی بھی تھا جس نے شاہ زیب کو گاڑی لے جاتے دیکھا تھا۔ وہ یہاں ٹھہرنے والے مسافروں کو جانتا تھا کیونکہ چھوٹا سا ہوٹل تھا۔

”میڈم آپ کے شوہر نے براؤن کھر کی جیکٹ تو نہیں پہنی تھی؟“

”ہاں، ہاں یہی کھر تھا۔“ مارہ بے قراری سے بولی۔

”میں نے انہیں پارکنگ سے گاڑی نکال کر سڑک پر لے جاتا دیکھا تھا اور ان کے پیچھے بھاگا بھی کہ صاحب اس موسم میں ڈرائیونگ مت کریں۔ مجھے پتھر سے چوٹ لگی میں وہیں گر گیا اتنے میں گاڑی دور جا چکی تھی۔“ اس آدمی نے تفصیل سے بتایا اور جا کے ہوٹل کے منیجر کو بھی بلا لایا۔ وہ خود مارہ کے ساتھ پارکنگ لاسٹ تک گیا کہ دیکھے آیا ان کی گاڑی یہاں موجود ہے کہ نہیں..... گاڑی یہاں ہوتی تو ملتی تاں.....

کسی اچھی خبر کے انتظار میں تھی۔  
 ”کچھ پتا چلا؟“ منیجر کو دیکھتے ہی وہ کھڑی ہو گئی۔

”نہیں ہمیں کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ لگتا ہے کہ شاہ زیب صاحب کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہیں۔“ صاف جواب سن کر مارہ کے چہرے کے تاثرات رونے والے ہو گئے۔  
 ”لیکن فکر نہ کریں ہم صبح ہوتے ہی پھر سے تلاش کا کام شروع کریں گے۔ ابھی یہ کام ناممکن ہیں۔“ مارہ نے مایوسی سے سر ہلایا۔

☆☆☆

عمر زیب بار بار دیوار گیر گھڑیال کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاہ زیب روزانہ ایک مخصوص وقت میں انہیں پل سی او سے فون کرتا تھا کیونکہ یہاں سگنلز نہیں ملتے تھے۔ مگر اس نے ٹوٹ کر وادیا تھا۔ انہوں نے دو بار خود کال کر کے شاہ زیب کا پوچھا مگر پل سی او کے مالک نے لاکھمی کا اظہار کیا۔ اس کے پاس روزانہ فون کرنے بہت سے لوگ آتے تھے وہ کس کس کو یاد رکھتا۔  
 دھلتی شام کے سائے اپنے پر پھیلا رہے تھے۔ عمر زیب انہ کے باہر کی طرف بڑھے تو ان کے سینے میں درد سا اٹھا۔ ایک عجیب سا کرب اور اضطراب ان کے پورے وجود پر طاری ہو چکا تھا۔ اپنی اس حالت کی سمجھ انہیں خود بھی نہیں آ رہی تھی۔ انہیں خود بخود ہی جیسے کسی غیر مرئی طاقت نے کسی انہونی کا احساس دلایا تھا۔ درد و کرب میں ڈوبی آواز میں انہوں نے ڈر بیکتا کو آواز دی۔ وہ دہل سی گئی۔ پپا نے بھی اسے اس طرح نہیں پکارا تھا۔

”جی پپا!“ وہ فوراً بھاگی بھاگی آئی۔ عمر زیب کا چہرہ تکلیف کی وجہ سے زرد سا ہو رہا تھا۔ جانے کیا بات تھی۔  
 ”پپا کیا ہوا ہے؟“ ڈر بیکتا نے انہیں دونوں کندھوں سے تھم کر پاس پڑی کرسی پر بٹھایا اور پانی گلاس میں ڈال کر لے آئی۔

(باقی آئندہ)

اسے کھوکھلی تسلی دی۔ اپنی کئی بات کا اسے خود بھی یقین نہیں تھا۔ کیونکہ ہوٹل کے جس آدمی نے شاہ زیب کو گاڑی لے جاتے دیکھا تھا اس نے کہا تھا کہ صاحب بہت تیزی سے گاڑی لے کر گیا ہے۔

کچھ تجربے کار لوگ جو ان علاقوں سے اچھی طرح واقف تھے وہ شاہ زیب کی تلاش میں روانہ ہو گئے تھے۔ مارہ دعا کر رہی تھی کہ شاہ زیب نچیک ٹھاک اور خیریت سے ہو۔ مگر سے دور اس انہنی جگہ پر اسے اپنے اکیلے پن سے ڈر لگ رہا تھا۔ شاہ زیب کے ساتھ اسے ڈر نہیں لگتا تھا۔ کچھ عورتیں بھی جو اس کی طرح گھومنے پھرنے کی غرض سے آئی ہوئی تھیں۔ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ اسے تسلی دلا سے دینے لگیں۔  
 شاہ زیب کی تلاش میں گئے لوگ ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔ کافی دیر ہو گئی تھی۔ اب تو منیجر خود بھی پریشان ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ کمرہ کے دروازے بند ہونے لگے۔ ہوٹل میں مقیم لوگ سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ مارہ کے ساتھ اب صرف ایک ہی عورت بھی باقی انہ کے چلی گئی تھیں۔

☆☆☆

امدادی پارٹی واپس آ چکی تھی۔ شاہ زیب کی تلاش میں انہیں ناکامی ہوئی تھی۔ ایک تو رات بھی اوپر سے بارش۔ پھر خراب راستہ۔ گاڑی تو گاڑی پیدل چلنے والوں کے لیے بھی اس وقت باہر بھٹنا خطرے سے خالی نہیں تھا جو لوگ شاہ زیب کو ڈھونڈنے ... گئے تھے وہ برسوں سے ان علاقوں میں آباد تھے۔ یہاں کے چپے چپے کے بارے میں جانتے تھے۔ انہوں نے ممکنہ جگہوں پر دیکھا تھا۔ نہ تو شاہ زیب اور نہ اس کی گاڑی کی جھلک نظر آئی تھی۔ سب کے ذہن میں ایک ہی بات آ رہی تھی کہ شاہ زیب یقیناً کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔

انہوں نے واپس آ کر ہوٹل کے منیجر کو اپنی ناکامی کی اطلاع دی۔ مایوسی ان سب کے چہرے پر صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ وہ مارہ کے پاس آیا جو پریشانی سے



## قرضی

ناہیدہ فاطمہ حسنین

جب پہلی بار اس نے اس سے اظہارِ عشق کیا  
وہ فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی۔ اس نے بتایا وہ اسے، اس  
وقت سے چاہتا چلا آ رہا ہے جب وہ کلاس سکسٹھ  
(6th) کا اسٹوڈنٹ تھا۔

یہ سن کر اس کی آنکھیں حیرت سے پٹ گئی  
تھیں۔ وہ ان کا ہمسایہ تھا۔ ”لوگ تو کہتے ہیں عشق  
اور مشک چھپائے نہیں چھپتے، اڑ کر پہنچتے ہیں پھر اس کی  
محبت کی خوشبو اس تک کیوں نہ پہنچی؟“ وہ سوچنے لگی۔



اس پوری رات وہ اس سے موبائل فون پر بات کرتا رہا۔ وہ سیل فون کان سے لگائے صرف سن رہی تھی۔ کبھی، کبھی وہ گنگنا اٹھتا اس کی آواز..... پس کچھ مت پوچھو۔ جادو تھا، ایک سحر تھا اس کی آواز میں جو اس کے وجود کو پورے کا پورا جکڑ چکا تھا۔ رات کی گہری تاریکی میں اس کے کانوں میں روش کی آواز شہد آگئیں رس نکا رہی تھی یا پھر اس سکوت کو گھڑی کی ہر دھڑکتی ٹکٹ ٹکٹ توڑ رہی تھی۔ اذان فجر تک وہ اس سے وعدہ لے چکا تھا کہ آج وہ کالج جانے کے بہانے کالج کے قریبی پارک میں بیٹھ کر رو رو گفتگو کریں گے۔

وہ کالج کے لیے تیار ہوئی، ماں کو خدا حافظ کہتے ہوئے زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ زندگی میں پہلی چوری پہلی خیانت بھی پھر ماں سے کیسے آنکھیں ملانی؟ ”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟“ جب معاملات گڑبڑ ہوں تو پہلی خبر ماؤں کو ہی ہوتی ہے۔ ماؤں کے والی فانی کے سنسٹر بہت پاورفل ہوتے ہیں۔ ماں کے پوچھنے پر وہ گڑبڑا گئی۔ ”آں... ہاں... کیوں میری طبیعت کو کیا ہوا؟“ نظریں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔ ”اچھا۔“ ماں نے مسلسل اسے اپنی نظروں کے حصار میں رکھا ہوا تھا۔ اچھا کو خوب سمجھ کر ادا کیا۔ کریدی نظروں سے اسے کتے گئیں سر ابھر بھی ان کے ہاتھ نہ آیا۔

☆☆☆

بہت دیر پارک میں دونوں پاس، پاس بیٹھے رہے۔ وہ سر اور نظریں دونوں جھکائے ہوئے تھی جبکہ روشناس سے بہت محویت اور وارفتگی سے دیکھ، دیکھ کر حال دل مختلف جملوں کے ذریعے ادا کر رہا تھا۔ ”یا خدا..... کتنے ان گنت، پیار بھرے جملے ہوتے ہیں ان لڑکوں کے پاس۔“ وہ سمجھی، سمجھی اس کی پُرشوق نگاہوں کی تپش پا کر اسے لمحے بھر کو تنک

لٹی اور کچھ دیر بعد واپس سر جھکا لیتی۔ ”تم مجھے دیکھ کیوں نہیں رہیں؟“ وہ ہلکا سا اس پر جھکا تو وہ گھبرا کر کھسک کر کچھ دور ہو گئی۔ پہلا، پہلا معاملہ تھا ناں۔

”چلو میں پیچھے ہٹ جاتا ہوں مگر خدا راقم مجھ سے دور مت ہو۔“ روش کی وارفتگی اندر ہی اندر اسے پھلار رہی تھی۔ لڑکیوں کے خمیر میں شاید موسم کا استعمال بھی کیا جاتا ہوگا بھی تو وہ لمحے بھر میں پھل جاتی ہیں۔ ”سارہ تم وعدہ کرؤ تم مجھے کبھی چھوڑ کر نہیں جاؤ گی۔“

”لڑکیاں تو کم ہی کسی کو چھوڑتی ہیں... البتہ لڑکے ہی چھوڑ جاتے ہیں۔“ یہ اس کا پہلا جملہ تھا جو اس کے لبوں سے ریشم کی طرح پھسل گیا تھا۔ ”نہیں نہیں...“ بخدا میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ زندگی کے آخری لمحوں تک تمہارے پاس رہوں گا۔ تمہیں اپنی ہر آتی جاتی سانس میں میرا وجود دھڑکتا ہوا محسوس ہوگا۔ تمہاری آنکھوں میں میرا عکس لہرائے گا۔ تمہارے دل میں دھڑکن کے ساتھ دھک دھک کی آواز سے میں خود کو پروف کروں گا۔ تم آنکھیں بند کر دو گی تو میرے لمس کو محسوس کر سکو گی۔“

اس نے لبوں کو بھیج کر سر اٹھا کر اسے ٹکا وہ کیسی افسانوی باتیں کر رہا تھا۔ شاید اس نے اس کے اندر چھلتے سوال پڑھ لیے تھے بھی تو وہ بول اٹھا۔ ”کیوں... تمہیں میرا یقین نہیں ہے؟“

”ایک افسانے میں پڑھا اقتباس یاد آ گیا تھا۔“ سارہ نے لمبی سانس کھینچی۔ ”کیا...؟“

وہ چپ رہی۔

”مجھے نہیں سناؤ گی؟“

”تم ناراض ہو جاؤ گے۔“

”نہیں نہیں... نہیں ہوتا ناراض۔ ہرگز بھی

”ایسے نہ تنکا کرو مجھے.... کسی دن یہ آنکھیں میرا قتل کر ڈالیں گی۔“ روشو مسکرایا تو اس نے پھر سر جھکا لیا۔

”چلیں اب۔“ اس نے موبائل میں وقت دیکھا تو جیسے گڑبڑائی۔ روشو نے اپنی رست واپس میں وقت دیکھا۔

”ابھی تو پون گھنٹا باقی ہے۔ چلو کچھ کھاتے پیتے ہیں۔“ وہ اٹھ کر بائیک تک آیا وہ اس کے پیچھے تنک آئی تو مگر بائیک تک پہنچ کر ٹھٹھک گئی۔

”بیٹھو بھی۔“ روشو نے بائیک اسٹارٹ کی۔ ”مم.... میں؟“ وہ گڑبڑائی۔ اصل میں تو وہ

پرائیویٹ کنوینس سے کالج تک آئی تھی پھر قریبی پارک کے گیٹ پر روشو مل گیا تھا سو وہ واک کر کے یہاں تک پہنچی تھی۔ اب ریٹورنٹ تک جانے کے

نہیں۔ جب روح، جسم سے ناراض ہو جاتی ہے تو اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے پھر وہ بے حس و حرکت وجود کسی کام کا نہیں رہتا۔ مٹی میں مل کر حشرات الارض کا رزق بن جاتا ہے اور میں تم سے ناراض ہو کر اپنا وجود نہیں کھوٹا چاہتا۔“

سارہ نے اسے پھر غیر یقینی انداز میں دیکھا۔ یہ بات ابھی اس کے تجربے میں نہیں آئی تھی کہ لڑکا عشق کے ابتدائی مراحل میں ناراض نہیں ہوتا بلکہ ناراض محبوبہ کو منانے کے تمام گر جانتا ہے۔ لڑکے کی ناراضی تو محبت کی ساری منازل طے کرینے کے بعد وجود میں آتی ہے۔

”بولو ناں.... تم نے کیا پڑھا تھا؟“  
”میں نے پڑھا تھا....“ اس نے ایک لمحے کو روشو کو تنکا پھر سر جھکا کر اپنی رنگ کو انگلی میں خواہ مخواہ گھمانے لگی۔ ”میں نے پڑھا تھا.... مرد کی محبت ساحل کی لہر جیسی ہوتی ہے جس تیزی سے بڑھتی ہے اسی تیزی سے واپس پیچھے بھی پلٹ جاتی ہے اور عورت کی محبت سمندر کے سینے کے تپوں بچا اٹھتا بھنور ہے جس میں دائرے بنتے رہتے ہیں۔ عورت اس بھنور سے کبھی باہر نہیں نکل پاتی۔“ اتنا کہہ کر وہ چپ ہو رہی۔

”ہونہ.... افسانوی باتیں۔“ اس کا منہ کڑوا ہو گیا تھا۔ ”ایسے افسانے لکھنے والی بھی عورتیں ہی ہوتی ہیں انہوں نے ہی عورت کا مقدمہ لڑتا ہے پھر خود ہی اسے جتوا بھی دینا ہے۔ نہ پڑھا کرو افسانے۔“ وہ لمحے بھر کو رکا۔ ”زندگی افسانوں سے بہت مختلف ہوتی ہے۔“

”مگر افسانوں میں وہی کچھ لکھا جاتا ہے جو زندگی میں ہو رہا ہو۔“

”ہاں۔“ اس نے ہاں کو خوب لمبا کھینچا۔ ”مگر اس میں کافی کچھ cosmic ہوتا ہے۔“ اس نے اپنی گھنیری پٹلیں جھپک، جھپک کر روشو کو تنکا۔

## سلامی اعوان

عراق کے حقیقت کا قلم لکھنے والے شاعر

## عراق اشک بار ہیں ہم

زندگی اور موت کے درمیان ایک ہولناک سفر

عراق کے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں،  
یونیورسٹی کے اساتذہ کے ساتھ قابل فخر  
اسلامی کرداروں کی درخشاں روداد

القاعدہ وہاں کیا کر رہی ہے

بغداد کی الف لیلوی کہانیاں اور بہت کچھ

الفیصل پبلی کیشنز لاہور

042-37230777 سے طلب کریں

لیے اس کی بایک پر جانا تھا۔ کہانی کے اس سین کا تو اس نے سوچا ہی نہ تھا۔

”مم..... میں..... نہیں تو کیا میں؟“ روشو نے اس کی نقل اتاری۔

”اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟“ وہ شش دہچ میں مبتلا تھی۔

”زیادہ دماغ پر بوجھ نہ ڈالا کرو مت اتنا سوچا کرو۔ سوچیں بھول بھلیوں میں الجھا کر منزل سے بھٹکا دیتی ہیں۔ چلو بیٹھو۔“ اس نے کھڑے، کھڑے بایک کو ریس دی۔ وہ گھبرا کر جلدی سے اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ بایک ہوا میں اڑ رہی تھی اس نے روشو کی پشت سے اپنا سر لگا کر خود کو چھپانے کی پوری سعی کی ہوئی تھی۔

یہ پوری زندگی کی پہلی چوری تھی۔ ایک چوری کے بعد قدم خود بخود بے پاک ہو جاتے ہیں پھر پوری زندگی چوری کرتے گزر جاتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس چوری پر ندامت نہیں رہتی۔ سر جھکا نہیں رہتا، نظریں شرمندہ نہیں ہوتیں۔ دل کی دھڑکنوں کا رد ہم بے ترتیب نہیں ہوتا۔ زبان اور ہونٹ بار بار خشک نہیں ہوتے، ماتھا عرق آلود نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہونے جا رہا تھا۔

☆☆☆

زندگی ریسٹورانوں اور فون کاز سے نکل کر مختلف پبلک پلیسز اور دوستوں کی شادیوں کے بہانوں تک پہنچ گئی مگر اس دوران روشو بے پاک نہیں ہوا۔ ”پاگل، تم بوڑھی بھی ہو جاؤ گی تو میں تمہیں اسی شدت سے پیار کرتا رہوں گا۔“ وہ اکثر کہتا۔

ایک بار اس نے ریسٹورنٹ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر دبا دیا تھا۔ وہ لرز گئی تھی۔ دنوں دل کی دھڑکن بے ترتیب رہی۔ وہ خفا ہو گئی مگر پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ روشو کا اس کے ہاتھ کو پکڑنا، بال سنوار دینا، کندھے پر سر رکھ لینا کچھ بھی برا نہیں لگا کرتا۔ یہ زندگی

کا اصول ہے کہ جب ہم زندگی کے زینے پر پہلا قدم رکھتے ہیں تو اگلا قدم اس سے اوپر رکھنا ہماری مجبوری ہماری خواہش، ہماری ضرورت بن جاتا ہے۔

سارہ بی ایس سی فائنل میں تھی اور روشو برسر روزگار۔ اس نے گھر والوں کو مجبور کر کے رشتہ بھجوا دیا۔ سارہ کے گھر والے بھی اس رشتے پر آمادہ نہ تھے روشو ان کی نظر میں محض ایک عام سا بڑی دی تھا جس کی کوئی قدر نہ تھی مگر جب ای نے سارہ کی آنکھوں میں روشو کے نام کے جگنو ٹمٹاتے دیکھے تو اس ہونے والی شادی کواریخ کرنے کا فیصلہ کر کے بابا کو راضی کر لیا۔ وہ بہت سبھی ہوئی دورانہ پیش خاتون تھیں۔

منگنی کر دی گئی۔ اب روشو دھڑلے سے ان کے گھر آنے جانے لگا۔ کسی نہ کسی ضروری چیز کی خریداری کے بہانے، گھومنے پھرنے بھی جانے لگا۔ ”دیکھو میرے آنچل اور بابا کی پکڑی کی لاج رکھنا۔“ ای اسے بہت سمجھا کر بچھتیں۔ وہ ای کو اس طرح بکتی کہ ای مطمئن ہو جاتیں۔ اس میں کوئی دو رائے بھی نہ تھی کہ اس نے روشو کو غلطی کرنے کی اجازت نہیں دی تھی، وہ جانتی تھی کہ زندگی کی بعض غلطیاں ایسی ہوتی ہیں جس میں کسی معافی نامے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ وہ ایسی غلطیاں ہوتی ہیں جو کبھی صحیح نہیں ہو سکتیں۔ تاہم آنچل کا داغ بن کر غلطی ہی رہتی ہیں۔

☆☆☆

”روشو اگر میری ای راضی نہ ہوتیں اور ہم کبھی ایک دوسرے کے نہیں ہو پاتے...؟“ ایک روز اس نے پوچھ ہی لیا۔

”تو کیا..... پھر بھی میں تمہیں چاہتا رہتا۔ یہاں تک کہ تم بوڑھی ہو جاتیں۔ میری چاہت میں کوئی کمی نہ آتی۔“ وہ اسے ایک تک دیکھے چلی گئی اس کی آنکھوں کی چمک اس کی صداقت کی گواہی تھی۔ ”ساحل کی لہر..... اور سمندر کے سینے کے

بانیک پر بیٹھ گئی۔ بانیک نے ابھی اسپینڈ بھی نہ پکڑی تھی کہ وہ دھواں دھار روئے بیٹھ گئی۔

”تم اتنے بے وفا ہو، اتنے ہرجائی۔۔۔ تم نے میرے پناہ زمانہ کیسے جی لیا؟“ وہ بس رورہی تھی۔

”کیا زمانہ۔۔۔ کتنے دن۔۔۔ کتنے برس گزر گئے؟“ وہ منے چلا گیا۔ ”میں سب کچھ ہو سکتا ہوں مگر بے وفا یا ہرجائی نہیں۔“ وہ شوخی میں بانیک کو زنگ زنگ چلانے لگا۔

”روشو کے بچے۔۔۔“ اس نے اس کی پیٹھ پر دھموکا لگا کر نوحہ۔ ”گر جاؤں گی میں۔“

”نہیں گرتیں۔“ وہ ہنسا۔ ”روشو کے بچے تو اب ہوں گے۔“ وہ ہنستا چلا گیا۔

”اتنے ناراض کیوں تھے؟“

”شی۔“ اس نے انگشت شہادت اپنے لبوں پر رکھی۔ ”تم جانتی ہوں ماں مجھے ایک ہی بات بار بار دہرائی کتنا برا لگتا ہے اور بحث کرتا۔۔۔ بحث تو میری جڑ ہے۔ سولیووس ٹاپک۔“ اور وہ اسی لمحے چپ ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

روشو کی فیملی شفٹ ہو گئی۔ اس کی روٹین نہ بدلی وہ روز گنڈ مارنگ نو گنڈ ٹائٹ درجتوں میسجز کرتی۔ روشو کا کبھی کبھار جواب آ جاتا ورنہ وہ بھی نہیں۔ رفتہ رفتہ روشو کی لمبی کالز مختصر ہوتے، ہوتے بالکل ہی ختم ہو گئیں۔ اب روشو کے بجائے وہ فون کرتی تو روشو آدھا گھنٹا بہ مشکل بات کرتا اس آدھے گھنٹے میں بھی کئی، کئی بار اسے ہولڈ کرواتا۔ وہ روہا کی ہو جاتی، شکایت کرتی تو وہ بہت تحمل سے کہتا۔

”سارہ یاد رکھو میں تمہارا ہی ہوں اپنی آخری سانس تک۔ میں کبھی کسی کا نہیں ہو سکتا۔ میں جاب میں کافی مصروف ہو گیا ہوں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میں تمہیں بھول گیا یا تم سے بے پروا ہو گیا ہوں۔ تمہارا خیال سایہ بنا مجھ سے جڑا ہوا ہے۔“ مرد کی سچی جھوٹی ہر سلی کو عورت سچ ہی مان لیتی ہے اس

بچوں بچ بھنور۔“ اسے یاد آ گیا مگر اب اس اقتباس کی اہمیت اس کی نظروں میں نہیں رہی تھی۔

”لکھا جانے والا ہر جملہ سچ نہیں ہوتا۔“ اس نے دل کو ہلکی، ہلکی تھپکی دی۔

☆ ☆ ☆

مستفی کا دورانیہ بڑھتا چلا گیا امی، بیٹی کی ماں تھیں سو فکر مند رہنے لگیں۔ اس نے روشو سے کہا تو روشو نے اسے اصل سبب بتایا کہ عنقریب وہ نوگ محلہ چھوڑ کر کسی اچھی جگہ شفٹ ہو رہے ہیں۔ اس کا دل ہولنے لگا۔ اس نے اپنی پریشانی سے آگاہ کیا تو روشو نے بہت مضبوط لہجے میں کہا۔

”مجھ پر بھروسہ رکھو۔“

”محبت کرنے والے بھروسے سے زیادہ دوسوں میں جتنا رہتے ہیں۔“ وہ رو پڑی۔

”پاگل ہو تم تو ہر وقت نیکیو ہی سوچتی ہو۔“ وہ پہلی بار غصہ ہوا تھا اور انھیں کر چلا بھی گیا تھا۔

پھر تین دن تک نہ اس نے اپنی شکل دکھائی نہ سبج نہ فون کیے۔ یہ تین بے چین دیے تاب دن جو اس کی زندگی کی کتاب میں پہلی بار رقم ہوئے تھے، اس نے انگڑوں پر لوٹ کر گزارے۔ وہ صرف روتی تھی میسجز کرتی جس کا کوئی رپلائی نہ آتا۔ فون کرتی جوائنڈ ہی نہ ہوتا۔ وہ جان گئی تھی یا تو روشو نے اپنا سیل فون سائلنٹ پر لگا دیا ہے یا اس کا نمبر اسکرینڈ مینج میں ڈال دیا ہے یا فون میں کوئی سسٹم لگا دیا ہے اور یہ کسی طور ممکن نہ تھا کہ وہ ہر تھوڑی دیر بعد دروازہ کھول کر اس سمت دیکھے جہاں روشو کا گھر تھا۔ ان تین دنوں میں وہ سیکڑوں فون کالز کر چکی تھی اور اتنے ہی میسجز اسے سینڈ کر چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

ایک روز وہ کالج سے نکلی تو سامنے روشو بانیک لیے کھڑا تھا۔ وہ تو چکرا اسی گئی۔ روشو نے آنکھوں کے اشاروں سے اسے بلایا وہ آنا فنا بھاگتی ہوئی آ کر



نے بھی اسے سچا جانا اور سر جھکا دیا۔

☆☆☆

”روشو کے گھر والے تو کوئی سن گن ہی نہیں لے رہے۔ ہم کب تک بیٹی کو بیٹھائیں اب اس کا فائل ایئر بھی آپہنچا ہے۔“ امی نے بابا پر اپنی تشویش ظاہر کی۔

”تم بات کرو۔“ بابا کے کہنے پر پہلے تو امی چپ ہو گئیں پھر بہت دھیرے سے بولیں۔

”یہ مجھ سے نہ ہوگا بیٹی کی ماں ہوں لاج آتی ہے۔“ اس نے روشو سے کہا تو روشو نے گھر والوں پر زور ڈالا۔ ان کا فون آیا کہ ہم اگلے ہفتے شادی کی تاریخ لینے آرہے ہیں۔ امی کو پتا ہی نہ چلا ان کی مشکل سارہ نے حل کی ہے۔ امی بہت خوش ہو گئیں حالانکہ سارہ اور روشو جانتے تھے یہ زبردستی کا سودا ہے۔

یعنی اس دن جب روشو کی فیملی کو تاریخ لینے آتا تھا روشو کی خالہ کا انتقال ہو گیا۔ یوں تاریخ پھر آگے چلی گئی۔ سعد صیانی کے تاتے سارہ کے والدین اور وہ بھی خالہ کے گھر تعزیت کو گئے۔ روشو کی فیملی کے ساتھ، ساتھ ان کے پورے خاندان نے سارہ کے والدین کو بہت عزت و احترام دیا لیکن سارہ کے آنے کو کسی نے پسند نہ کیا۔

اب ان کی شادی کا معاملہ پھر کھٹائی میں پڑتا نظر آ رہا تھا کم از کم چالیسویں تک تو۔

اب وہ جب بھی روشو کو فون کرتی وہ ہوں ہاں تک محدود رہتا۔ سارہ نے ڈرتے ڈرتے شکایت کی تو روشو نے تسلی دی۔

”دیکھو سارہ بچہ نہ بنو۔ میری اکلوتی خالہ تھیں خالو کا پہلے انتقال ہو چکا ہے اب ان کی اکلوتی جوان بیٹی ہے، اس کا مسئلہ ہے وہ اکیلی رہ گئی ہے اسے ہم گھر لے آئے ہیں۔“ اتنا سنتے ہی اس کا دل طلق میں آ رہا روشو پھر بولا۔

”اس کا نکاح ہو چکا ہے ہم پہلے اس کی رخصتی

کریں گے۔“ باقی کا جملہ سن کر اس کی جان میں جان آئی۔ ”اور بھی دوسرے مسائل ہیں۔ میں بہت الجھا ہوا ہوں ہمارا پورا گھر ڈسٹرب ہے تم زیادہ خود غرض نہ بنو اور اپنی امی کو بھی بولو۔۔۔۔۔ وہ چپ کر کے بیٹھیں۔“ روشو نے یہ سب باتیں اس طرح میں کہ وہ خود شرمندہ ہو گئی۔

☆☆☆

زندگی کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ کب کس طرح کروٹ بدل لے۔ کون سا رخ اختیار کر لے۔ کس سمت گھوم جائے۔ کون سا چہرہ دکھا دے کس کو داخل کرے، کس کو خارج کر دے۔ کسی کو کچھ نہیں پتا چلتا۔ وہ گھر بیٹھی فائل ایئر کے رزٹ کا انتظار کر رہی تھی۔ امی کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ روشو کی ماں اچانک بنا اطلاع آ گئیں۔ وہ سمجھ تو گئی کہ روشو نے بھیجا ہوگا مگر اسے حیرت تھی کہ روشو نے اسے قبل از وقت کیوں نہ بتایا حالانکہ تین دن قبل اس نے روشو کو فون کیا تو خیر خیریت کے فوراً بعد روشو نے کہا تھا تم فون رکھو میں آدھے گھنٹے بعد تمہیں کال بیک کرتا ہوں اور تین دن تک وہ کال بیک نہ کر سکا۔ وہ فون کرتی تو حسب معمول کال سسٹم پر ہوتی۔ ریکارڈ پر ایک دگش آواز اس کا مذاق اڑاتی۔ ”آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے براہ کرم کچھ دیر بعد رابطہ کیجیے۔“ وہ اپنی ہونے والی سہاس کی خدمت میں جست گئی۔ تاشتے کے لوازمات ٹیبل پر چھنے کے بعد وہ چائے لے کر دروازے تک پہنچی تو ان کی آواز پر وہیں ٹھک گئی۔

”ہم کیا کریں بہن۔۔۔۔۔ یہ ہماری مجبوری ہے۔ ہماری بہن کی بیٹی کا جس سے نکاح ہوا تھا وہ فراڈ نکلا۔ پہلے سے شادی شدہ اور بچوں والا تھا۔ خلاق بھی دینے پر آمادہ نہ تھا۔ اب بڑی مشکل سے خلع حاصل کر کے ہم نے اسے راشد کی بہو بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ بڑی زور کا دھماکا اسے اپنی سماعتوں

# سرسبز شہر

شمارہ کی 2015  
کی جھلکیاں

فلسفی

اس شخصیت کا زندگی نامہ جس نے زمانہ قدیم  
میں حکمرانی کے اصول مرتب کیے تھے

انگریز کے

ان شخصیات کا ذکر جن کی موت  
میں سانگرہ کے دن ہوئی

ایما مہی

اس مہینے میں پیدا اور وفات پانے  
والے اہم لوگوں کا تذکرہ

انسانی

جس کے خوف سے امریکن آئی اے  
لڑ چکی مگر وہ غریبوں کا سچا کہلایا

واٹس

قوت سماعت سے محروم ایک لڑکی کی  
جگہ یابی۔ اس نے اپنی محبت کو کیسے پایا

ایک ایسی

مغربی معروف فلمی شخصیت کا احوال زیست،  
طویل مگر ہلکے گرم کردینے والی سرگزشت "سراب" اور  
بھی بہت سی جگہ بیاں لکھنے والی واقعات دلچسپ قصے

کے آس پاس سنائی دیا۔ امی بھی گنگ رہ گئیں۔

"دیکھیں بہن۔" انہوں نے اسی نرم لہجے میں  
کہہ کر محبت سے امی کے ہاتھوں کو چھوا۔ "سارہ کی  
منگنی ہوئی ہے منگنی ٹوٹنا اتنا معیوب نہیں جتنا  
نکاح..... پھر اس بچی سے کوئی رشتہ کرنے کو تیار نہیں  
کہ ظلع یافتہ ہے حالانکہ وہ بالکل کنواری ہے سو ہم  
نے فیصلہ کیا کہ ہم ہی اسے اپنائیں۔ سارہ کو تو بہت  
سے مل جائیں گے مگر....." وہ دروازے سے ہٹ  
آئی۔ دل میں عجیب طوقان برپا تھا۔

وہ جان گئی تھی بے وفائی کے خاردار راستوں  
سے گزرتی جدائی کی منزل آنچلی ہے۔ عام لڑکوں کی  
طرح وہ بھی اس کے دل کو کھلونے کی طرح کھیل کر  
بازی پلیٹ کر جا چکا ہے۔ اسے دکھ صرف اس بات کا  
تھا کہ روشو بے وفائی کرنے کے بجائے فون کر کے  
خود اسے بتا دیتا۔ اس کے ساتھ بھوٹ موٹ کے  
آنسو بہا لیتا۔

اگر وہ با وفا ہوتا

تہ یوں دل توڑ کر جاتا

تہ مجھ کو چھوڑ کر جاتا

مگر وہ با وفا کب تھا؟

اس نے اپنی کنپٹی دبائی، چکراتے وجود کو سمیٹا۔  
اگر وہ مجھ سے منقص تھا تو گھر والوں سے بغاوت  
کر سکتا تھا نہیں تو مجھے اعتماد میں لے سکتا تھا۔ جی تو  
چاہا خوب زور، زور سے روئے..... چونکھٹ سے سر  
ٹکرا کر خود کو لہو لہان کر لے مگر وہ کچھ نہ کر سکی تو ضبط کا  
کڑوا گھونٹ حلق سے اتارا۔ گہری سانس بھر کر تازہ  
آکسیجن اپنے وجود کے اندر اتاری گویا نئی سارہ  
کو وجود بخشنا اس کا مقصد ہو۔ آنسو کے بس دو ہی  
قطرے نکلے۔

ساحل کی لہر..... اور سمندر کا بھنور..... مدتوں  
قبل پڑھا تھا اس کے دل و دماغ پر روایت ہو رہا  
تھا۔ اس نے چائے کی ٹرے کچن میں بیچ کر دیں

چو کھٹ سے سر ٹیک دیا۔

”کاش..... آسمان نہ کسی چھت ہی مجھ پر آگرے۔ زلزلے بھی تو آتے ہیں ناں۔ ایک زلزلہ زندگی میں آگیا تو ایک اس حصے میں کیوں نہیں آسکتا۔ جس میں، میں کھڑی ہوں۔“

”تمہارے دل میں دھڑکن بن کر جیوں گا۔ آنکھیں بند کر کے میرے لمس کو محسوس کرتا۔ میں تم سے ناراض ہو کر اپنا وجود نہیں کھوسکتا۔ میں پیچھے ہٹ جاتا ہوں..... خدا راقم مجھ سے دور مت ہو۔“ یہ اور اس جیسے ان گنت جملے جو روشو نے ابتدائی مراحل عشق میں کہے تھے..... معاذ خدے بچوں کی طرح آپس میں جھگڑ کر ایک میس کھڑا کر چکے تھے۔

”اوہ خدا.....!“ اس نے سسکی بھری اور کمرے میں آکر خود کو بستر پر گرالیا۔

☆☆☆

اگلے روز وہ بہت دیر سے جاگی۔ امی نے بھی اسے قصد نہیں جگایا تھا۔ اس نے بغور امی کو دیکھا ان کی آنکھیں متورم تھیں اس نے ان سے کچھ نہیں پوچھا باہر آئی بابا ایزی چیئر پر بھی اسے ایزی فیئنگر کے ساتھ نہیں نظر آئے۔ کمرے میں آکر اس نے موبائل فون نکالا ایک میسج ٹائپ کیا۔

”ہوں تو پہلی مگر تم مجھے اپنی زندگی کی دوسری عورت بھی بنا سکتے تھے۔“ اس نے روشو کو آخری میسج ٹائپ کیا اور سینڈ کر دیا۔ موبائل کو اٹھا کر بیڈ کی سائڈ ٹیبل کی دراز میں ڈال دیا۔ ڈھیر سارے دن گزر گئے روشو کا جواب آتا تھا نہ آیا۔

”آئی لو یوٹس مائی لاسٹ بر۔ جھ۔“ روشو کا کہا جملہ کہیں پاتال میں گم ہو گیا۔ زندگی کی کہانی کا درمیان آنے سے قبل ہی وہ در بدر ہو گئی تھی۔ زندگی کی رانگانی بڑی تلخ ہوتی ہے۔

ساحل اور سمندر..... سمندر اور ساحل

ساحل کی موج اور سمندر کے سینے کا بھنور۔ وہ

خود گرداب میں آ پھنسی تھی۔ آج اسے تمام حقائق سمجھ آ گئے تھے۔ تمام سوالوں کے جواب مل گئے تھے۔ آنکھیں موندیں تو روشو کا لمس محسوس کیا۔ کیا روشو نے بھی اسے اسی طرح لمس کیا ہوگا؟ وہ سوچے گئی..... اتنا کرتھک گئی۔

کبھی دل کہتا ”ہاں وہ مجبور ہوگا وہ بھی اسے لمس کرتا ہوگا۔“ اور کبھی دماغ اس خیال کی نفی کر دیتا۔ انسانی جسم بھی کتنا دلچسپ و عجیب ہے جس کے دو organ اپنی الگ، الگ رائے رکھتے ہیں۔

”بات دماغ بھی کہتا ہے اس کے باوجود حیات دل جاتا ہے، زندگی کی دوز دھوپ بہت کچھ دھندلا دیتی ہے۔ اس کے باوجود اس نے تا عمر شادی نہ کرنے کا فیصلہ سنا دیا۔ بابا کا انتقال ہو گیا، امی کو چپ لگ گئی بس اسے کمر، ٹکڑی راتیں۔ اس نے ملازمت کر لی تھی باقی وقت امی کی خدمت اور رب سے لوگالی تھی۔

اس نے آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا تھا، آئینہ دیکھنا چھوڑ دینا سچ سے گریز کا دوسرا نام ہے۔ آئینہ دیکھنا چھوڑ دینے سے حقائق نہیں بدل جاتے۔ ایک روز ماتھے پر کسی کینزے نے کاٹا تو جا کر آئینہ دیکھا۔ ماتھا تو کیا ہی دیکھ پانی خود کو دیکھ کر سسک اٹھی۔ بالوں کی ایک لٹ تو پوری دودھی چاندی تھی، چہرے پر زمانے بھر کی گرد، آنکھوں کے گہرے حلقوں میں بھی ہلکی، ہلکی جھریاں منہ چڑا رہی تھیں۔

محبت میں پڑتی نہیں جھریاں ”پاکل تم بوڑھی بھی ہو جاؤ گی تو میں تمہیں اتنا ہی چاہوں گا۔“ یہی ایک جملہ زندگی سے چمت کر رہ گیا تھا۔ دن میں اب تک کسک آباد بھی پھر اس دن سے نہ جانے زندگی میں کیسا انقلاب آیا۔ اس نے اپنا خیال رکھنا شروع کر دیا۔ ایک آس..... ایک موہوم سی امید پر۔

☆☆☆

بر آنے سے قبل ہی شکوہ دم توڑ گیا۔ بس وہ سوچے گئی۔ وہ بیٹھتے، بیٹھتے اسے تکتے ہوئے ٹھنکا۔

”جی فرما میں نے“ بیویوں سے پھسلا ہی تھا کہ اس نے پرچہ اس کی سمت بڑھایا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ روشو نے پرچہ اس کے ہاتھ سے لے لیا لیکن اس کی، اس پر ریزی نظر ایک لمحے کو بھی ادھر ادھر نہ ہو سکی کہ اچانک۔

”سارہ۔“ وہ اس کی سمت بڑھا لمحے بھر میں آنا فنا اس کے چہرے کا نقاب بچھینکا کہ اسے سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملا۔ ”تم لاکھ لاکھوں میں جھپ جھاؤ میں ان آنکھوں کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ جن سے میں قفل ہو چکا ہوں۔ جنہیں بڑی شدت سے میں نے چاہا تھا۔“ آتسو بھل، بھل اس کے گالوں پر بہنے لگے۔

”کیا تم مجھے اپنے گھر کے ایک کونے میں رکھ سکتے ہو؟“ پرچہ روشو کے ہاتھ سے گرچکا تھا تو اسے مدعا بیان ہی کرنا پڑا۔ ”میں بے سرو سامان، بے آسرا ہو چکی ہوں۔“ روشو نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

”گو زندگی اب تو انا نہیں رہی۔ جس وقت زندگی تو انا تھی، میں تم سے کیا عہد نبھانا سکا، مجھ میں والدین سے بغاوت کی ہمت نہ تھی۔ اب زندگی کمزور ہے لیکن بیوی کی موجودگی میں تمہیں اس گھر میں بسانے کی ہمت موجود ہے۔ تم نے اپنی زندگی کے تمام شب و روز میرے نام امتساب کر کے مجھے اپنا مقروض کر لیا ہے اور جو مقروض ہو جائے اس کے شانے تو ویسے ہی ڈھلک جاتے ہیں۔ میں یہ قرض چکانے کو تیار ہوں۔“

زندگی میں پہلی بار اس نے بہت شدت سے اسے خود سے لگا کر بھینچ لیا۔ وہ کسی کمزور چڑیا کی طرح اس کے سینے سے لگی کانپ رہی تھی۔ بھی روشو کی آنکھ سے نکلے اندامت کے دو قطرے اس کے بالوں میں کہیں گم ہو گئے تھے۔

پھر جب امی نے بھی زندگی سے ناتا توڑ لیا۔ اس نے چاروں سمت دیکھا کچھ نہ تھا ماسوائے گہرے خاموش سناٹے کے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی جانے کے لیے۔ اس منزل کی طرف جس کا اسے خود بھی یقین نہ تھا کہ وہ منزل اسے قبول کرے گی یا نہیں؟

اس نے خود کو بہت اچھے طریقے سے برقع سے کور کیا۔ اس کی صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ آنکھیں جن پر کبھی وہ مرتا تھا مگر آج ان آنکھوں کے دیے جلتے بجتے چراغ تھے۔

”ایسے نہ کھا کرو مجھے۔۔۔ کسی دن تمہاری آنکھیں میرا قتل کر بیٹھیں گی۔“ اس نے اپنے دل کی یاد دہانی کو سر جھٹک کر نظر انداز کیا۔

”کیا تم کو اپنا وعدہ یاد ہے؟ میں آج بوڑھی ہو چکی ہوں۔۔۔ تم مجھے قبول کرو گے؟ کیا تم نے میرے حصے کی بجاہت بچا کر رکھی ہے؟“ اس نے ایک پرچے پر لکھا اور مٹھی بے در کراس کے گھر جا پہنچی۔

”مجھے راشد جزہ سے ملنا ہے۔“ دروازے پر آنے والی ملازمہ تھی جس سے اس نے مدعا بیان کیا۔ ”کیا وہ ہیں؟“ بے چینی کے ساتھ ساتھ اسے گھبراہٹ نے بھی آن لیا تھا۔

”ہاں جی۔۔۔ آپ کون؟“

”میں ان کی پرانی شناسا ہوں۔“ ملازمہ نے اسے ڈرائنگ روم تک آنے میں مدد دی۔ وہ بیٹھ گئی۔ اس نے اپنی نظر کو محدور رکھا نہ ارد گرد دیکھا نہ اس کی خواہش ہوئی بس اس کی نظر ڈرائنگ روم میں کھٹنے والے دروازے پر مرکوز تھی اس نے طے کر لیا تھا کہ اپنی آواز نہیں سناے گی۔

سامنے آنے والا روشو ہی تھا وقت نے روشو کے سر میں بھی چاندی مل دی تھی مگر وہ کچھ اور سویر ہو گیا تھا۔

”اسنے ماہ و سال میرے بغیر گزار لیے۔ میری یاد کا کوئی جھونکا تک تمہیں مضطرب نہ کر سکا۔“ بیوی





منی ناول

## جنگل کی کاپی بھولائی

زاہدہ پروین



نواں اور آخری حصہ



بابر بہت دیر تک بے یقینی کے عالم میں بھائی کو  
گھورتے رہے، نکتے رہے، ذرا تنگ روم پر گہرا سکوت  
طاری رہا۔ خاور اس طرح ٹینشن میں بیٹھے تھے جیسے  
پوشیدہ شادی کا یہ جرم انہی سے سرزد ہوا ہو۔

”شادی.....؟ خرم نے شادی کر لی؟“ مارے  
حیرت کے بابر کی آواز پھٹ کر رہ گئی۔  
”جی بھائی جان۔“ خاور نے اتنا کہہ کر بے  
چارگی سے سر جھکا لیا۔

”تمہیں... کیا یقین ہے؟“ انہوں نے تھوڑی

دیر کے بعد پوچھا۔

”جی بھائی جان بالکل روز روشن کی طرح...“ خاور نے برکت جواب دیا۔ ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

”یا اللہ...! تو ہمارے گھرانے پر فضل فرما...“ کہتے کہتے باہر نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

اس وقت یہ دونوں ڈاکٹر خاور کے اسپتال والے بنگلے کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔

بہت دنوں کے غور و فکر کے بعد خاور نے فیصلہ کیا کہ اس راز میں باہر بھائی جان کو شریک کر لینا چاہیے۔ وہ اکیلے تو کچھ بھی کر سکنے کی پوزیشن میں نہیں تھے، خرم جس منجد ہار میں پھنس گیا تھا اس کی مشکلات کو محسوس کرتے ہوئے ان کا دل بہت درد مندی سے کوئی راہ تلاش کرنے کے لیے تڑپ اٹھتا تھا مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ آخر وہ بھائی کے کام آئیں تو کس طرح کام آئیں؟

بالآخر بات کے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے جس میں بڑے بھائی کی مدد ضروری ہے، لہذا باہر کو انہوں نے کسی نہ کسی طور یہاں آنے پر مجبور کیا تھا۔ کیونکہ اپنے گھر کی حدود میں یہ معاملہ زیر بحث لانا غیر ممکن تھا۔

خاور اٹھ کر گئے، فرنیچر سے ٹھنڈے پانی کی بوتل اور گلاس نکال لائے، پانی پی کر باہر کے گئے حواس قدرے بحال ہوئے تو انہوں نے ایک گہری سانس لی اور بڑبڑا کر بولے۔

”سوچ کیا رہے تھے، ہو کیا گیا... یہ وہی بات ہو گئی کہ ایک ہاتھ جوڑنے کی کر رہے تھے اور ستر ہاتھ مزید ٹوٹ گئے۔“

خاور نہ سمجھ میں آنے والے انداز میں ان کی طرف دیکھنے لگے مگر زبان سے کچھ بولے نہیں۔

”کب کی ہے خرم نے شادی اور کس سے کی

ہے؟“ باہر نے خود ہی دریافت کیا۔

”مدت کا تو نہیں معلوم کہ کب کی ہے مگر یہ معلوم ہے کہ کس سے کی ہے۔“ خاور نے سر جھکائے، جھکائے کہا اتنا کہہ کر ایک گہری سانس لی اور آہستگی سے پوچھا۔ ”آپ کو یاد ہے کہ ایک بار ہم خرم کے پاس شکار کی غرض سے گئے تھے؟“

”ہاں، بالکل یاد ہے۔“ انہوں نے فوراً جواب دیا۔

”بس یہ وہیں کا واقعہ ہے، وہاں ریسٹ ہاؤس کے قریب کی بستی میں آپ نے رحمت بابا کو دیکھ ہوگا۔ جن کے بازو سے ایک ریچھ حملہ آور ہو کر ان کے بالٹو، ہانوروں کو زخمی کر گیا تھا۔ خرم کی شادی انہی کی بیٹی سے ہوئی ہے۔“

”مزید تفصیل کیا ہے؟“ باہر دانت میچھ کر پوچھا۔ خرم نے جو تفصیل بتائی تھی، خاور نے وہ تمام باتیں رُہ بھائی کے سامنے بیان کر ڈالیں۔

باہر محل سے بیٹھے سنتے رہے اور دن ہی دن میں کسی نتیجے پر پہنچتے رہے۔ خرم کی دیدہ دلیری نے ان کو سخت دھچکا پہنچا یا تھا۔ اپنے کہنے کے مسائل حل کرنے کے لیے آج کل وہ جن الجھنوں میں گرفتار تھے، وہ کچھ ان کا جی ہی جانتا تھا۔ اب یہ درمیان میں خرم کا مسئلہ آن اٹکا تھا اور وہ بھی اس غیر معمولی انداز میں کہ اگر یہ خبر نامہ تکم تک پہنچ جاتی تو وہ ایک تہلکہ مچا ڈالتیں اور خرم کو کوٹھی میں گھسنے نہیں دیتیں۔

”تم میرے ساتھ چلو... ہمیں فوراً رحمت بابا سے ملنا چاہیے۔“ خاور خاموش ہوئے تو وہ فیصلہ کن انداز میں بولے۔

”لیکن... اب کیا، کیا جائے بھائی جان...“

رحمت بابا کا تو کب کا انتقال ہو چکا ہے۔“ خاور کچھ اور ہی سمجھے... افسوس کے لہجے میں بولے۔

”ایں... کیا مطلب...؟“ اپنی بیٹی خرم کے سر تھوپ کر خود مر گئے۔

”ان کی موت بھی بڑے المناک طریقے سے ہوئی ہے، کہتے ہیں کہ پچاروں کا جھونپڑا ان کے اوپر

میں پوچھا۔  
 ”بھائی جان! اب تو خرم شہر منتقل ہو چکا ہے۔“  
 ”تمہیں یہ سب اطلاعات کون پہنچاتا ہے؟“  
 اچانک ان کی ذہنی روئشکی انہوں نے تیوری چڑھا کر پوچھ لیا۔  
 ”مجھے.....“ خاور ہکا کر چپ ہو گئے۔ پھر سنبھل کر جواب دیا۔  
 ”دراصل ان کی وائف کا آپریشن میرے اسپتال میں ہوا ہے، میں نے وہیں ان کو پہچانا تھا۔“  
 باہر نے دھیمے سے لہجے میں پوچھا۔  
 ”اچھا..... تو کیا آپریشن تک نوبت پہنچی؟“  
 ایسے میں خرم کو بہت گھبراہٹ ہوئی ہوگی، کو با لائیڈز وغیرہ بھی اس کی بیوی کے ساتھ نہیں ہوں گی نسلی دلاسے کے لیے..... دیکھو..... چوری چھپے کا کام کس قدر غلط ہوتا ہے۔“  
 ”جی ہاں..... یہ تو آپ کا کہنا بالکل درست ہے، میں نے پہلے دن ان کی وائف کو رحمت بابا کی بیٹی کے لحاظ سے شناخت کیا تو وہ اکیلی کھڑی روئے جارہی تھیں۔“ خاور نے اعتراف کیا۔  
 پھر انہیں تفصیل کے ساتھ اپنی ملاقات اور تحقیق کے متعلق بتایا اور بولے۔  
 ”آپ کے ویسے سے فارغ ہو کر اسپتال گیا تو اسی روز ہر راز پر سے پردہ اٹھ گیا۔ خرم سے میری کھل کر گفتگو ہوئی جس سے میں نے آپ کو ابھی آگاہ کیا ہے۔ پھر..... پھر مجھے ان کے گھر جانے کا بھی اتفاق ہوا..... یہ دیکھ کر بہت اطمینان ہوا کہ ان کے مالک مکان اور ان کی بیوی بہت خیر خواہ لوگ ہیں۔“ خاور نے احتیاطاً بھائی کے سامنے شرمین کے گھرانے کا ذکر نہیں کیا۔  
 کل واقعات اور بطور خاص بچے کا سن کر باہر کا دل بہت تسکین چکا تھا۔ وہ کچھ دیر تک خاور سے اظہار خیال کرتے رہے۔ آخر میں بولے۔  
 ”بھئی خاور! پانی سر سے اونچا جا چکا ہے، خالی

ہی آگرا تھا۔“ خاور نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے جواب دیا۔  
 ”ہمارے گھر میں تو بھونچال آجائے گا خرم کی اس حرکت سے۔ اماں جان نصیحت کر ڈالیں گی، خرم نے ہم سب کو سخت کھٹکھٹ میں مبتلا کر ڈالا ہے۔“  
 خاور بالکل خاموش رہ کر ان کی لعن طعن سن رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اچھا ہے کہہ سن کر بھائی جان کے جی کی بھڑاس نکل جائے پھر ان سے اس معاملے میں تعاون کرنے کی درخواست کریں۔  
 ”وہ لڑکی..... جس سے خرم نے شادی کی ہے، وہاں اس کے کوئی عزیز رشتے دار بھی تو ہوں گے؟“ کچھ سوچ کر باہر اچانک غصیلے انداز میں بولے۔  
 ”ضرور ہوں گے۔“ خاور نے جواب دیا۔  
 ”تو بس ٹھیک ہے۔“ باہر پرجوش ہو کر بولے۔  
 ”کل اتوار ہے، تم کل ہی میرے ہمراہ چلو..... ہم اس لڑکی کو خرم سے علیحدگی دلوا کر اس کے رشتے داروں کے سپرد کر کے آئیں گے۔“ خاور ان کے عزائم سن کر بھونچکا رہ گئے۔  
 ”اور بچہ.....؟“ ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔  
 ”بچہ.....؟ کون سا بچہ.....؟“  
 ”خرم اور ریشم بھائی کا بچہ بھائی جان۔“ اب حیران ہونے کی باری باہر کی تھی۔  
 ”کیا..... ان کا بچہ..... بھی ہے؟“  
 ”جی ہاں..... آپ کے ویسے کے دوسرے دن تو ہوا ہے۔“  
 ”خدا کی پناہ۔“ باہر کے آئے حواس جاتے رہے، انہیں ایک دم چپ لگ گئی۔ خاور نے انہیں دوبارہ پانی پلایا۔  
 بہت دیر سکوت طاری رہا۔ اب باہر کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ بچے کا سن کر ان کا دل خود بخود نرم پڑنے لگا تھا۔  
 ”بھائی جان.....“ تھوڑی دیر کے بعد خاور نے ڈرتے ڈرتے انہیں پکارا۔  
 ”کیا بات ہے؟“ انہوں نے کھست خوردہ لہجے

ہم تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اس بے حد نازک معاملے میں کسی بڑے کا شامل ہونا از حد ضروری ہے، اس لیے میں چاہوں گا کہ ہم یہ قصہ پھوپھی جان اور پھوپھا جان سے بیان کر دیں۔ ظاہر ہے کہ اماں جان کو بتانے کی تو ہمت ہے نہ جرات۔“

ہلہ ہلہ

شرمین کی داوی اماں نے بھی ریشم کے بیٹے کے لیے عینک لگا کر کرتے، ٹوپی پہن تھے۔

دنیا میں ایسے خوش نصیب لوگ بھی کم، کم ہوتے ہیں جیسی کہ ریشم تھی۔ جس کا یہاں شہر میں کوئی نزدیکی سگا رشتہ نہ ہوتا ہوئے بھی اسپتال سے واپسی کے بعد ایسا والہانہ استقبال ہوا تھا کہ خرم بیچارہ تو حیران رہ گیا۔

خان صاحب، داوی اماں اور بسنتی کے گھروں میں اندر سے باہر تک خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ سب اسے اور اس کے بیٹے کو دیکھ، دیکھ کر اس قدر خوش ہو رہے تھے جیسے چھوٹے بچے بھی دیکھے نہ ہوں۔ خان صاحب کے آگن میں سب اکٹھے ہو گئے تھے۔ مبارک باد دینے والوں کا تانا باندھ گیا تھا۔

داوی اماں بذات خود شرمین کے ساتھ آئی تھیں۔ خان صاحب جھٹ .... بازار سے بہت سارے بتائے لے آئے تھے۔ دونوں میاں بیوی خوش، خوش بچے کے تانا، تانی بن بیٹھے تھے۔ ریشم اپنی ساری تکلیف بھول کر خوشیوں سے نہاں ہو گئی۔

ذکیہ خالہ اسپتال میں ایک، ایک پل ریشم کے ساتھ رہی تھیں۔ مگر چھٹی کے بعد بھی اسے اکیلا نہیں چھوڑا تھا۔ کبھی اس کے لیے اچھوانی میں رہی ہیں، کبھی بچے کو نہلا دھلا کر کپڑے پہنا رہی ہیں، اس کے کپڑے دھو رہی ہیں، ریشم کے بیسیوں کام اسے ہاتھ سے نمائیں، بسنتی آتی سارے گھر کی جھاڑو صفائی کر جاتی، کسی وقت داوی اماں اپنی ملازمہ کو بھیج کر برتن دھوا دیتیں۔ ریشم کے سارے کام ہاتھوں ہاتھ ہو جاتے۔

تیسرے دن ڈاکٹر خاور کو بھی آنے کا موقع مل گیا تھا جب بچے کو قدرے ٹھنڈا اثر ہو گیا تھا۔ انہوں نے اس کا معائنہ کر کے دوا دی اور کافی دیر بیٹھے رہے، جاتے وقت بھائی کو خوب ساری تسلی دے کر گئے تھے کہ جو ہوگا، اللہ بہتر کرے گا۔ جاتے، جاتے بھی خاور امید بھری نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے رہے مگر شرمین کہیں ہوتی تو دکھائی دیتی۔ دیواروں کے آر پار کس طرح دیکھ لیتے بیچارے۔

خاور کے چلے جانے کے بعد اس روز ریشم نے کھل کر خرم سے اصرار کیا اور اس قدر کیا کہ انہیں اقرار کرتے بنا کہ وہ فقط دوست نہیں بلکہ سگے بھائی ہیں۔ جب ساری بات کھل ہی چکی تھی تو مزید چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا لہذا خرم نے اسے اپنے بہن، بھائیوں اور والدین کے متعلق تفصیل سے بتا دیا۔

یہ ایک اتنا بڑا انکشاف تھا کہ ریشم سہارنہ سکی اور اس نے اگلے دن یہ بات ذکیہ خالہ کے گوش گزار کر دی۔

دو دوڑی، دوڑی گئیں، داوی اماں کے گھر یہ دھماکا خیز اطلاع پہنچا دی۔ لب و لہجہ ایسا پرجوش اور بڑبڑور تھا کہ کیا بسنتی اور شرمین، سب کے سب اس راز سے آگاہ ہو گئے۔

ریشم انجانے ہی انجانے میں شہر کی ایک اعلیٰ ترین خاندان کی بہو ثابت ہو چکی تھی۔ ان گھروں میں یہ خبر خوشخبری بن کر گھوم گئی۔ ذکیہ خالہ نے سب کے درمیان بیٹھ کر فخر یہ کہا۔

”بھئی شکر ہے ہم نے تو پہلے ہی تانا، تانی کا رشتہ جوڑ لیا تھا۔ ہمارے مکرم کا ودھیال تو بہت ہی چوٹی کا خاندان ہے۔“ انہوں نے اپنے اس نواسے کا نام مکرم رکھا تھا۔

سب تو ہر طرح کے تہرے کر کے خاموش ہو گئے تھے مگر اس انوکھے انکشاف کا سب سے بڑا اثر شرمین نے لیا تھا۔ وہ ساری رات اس نے سوچوں میں گزار دی۔ یہ بات سنتے ہی اس کی نگاہوں کے سامنے



سوچنے لگی۔

”بڑے آدمیوں کے بڑے کام..... بھلا ریشم غریب کو اتنی بڑی کوٹھی میں وہ کیوں گھسنے دیں گے۔ اگر اپنے دل سے مجبور ہو کر ان کے بیٹے نے ایک غریب لڑکی کو گلے لگانے کا جرم کر لیا ہے تو باقی سب لوگ اس جرم کو کیوں دہرائیں گے؟ میں بھی کیسی پاگل، دیوانی ہوں، مجھ سے زیادہ عقلمند تو ریشم ہے جو ایسی انہونی سوچ کر اپنا جی تو نہیں جلاتی۔“

☆ ☆ ☆

”ہم تو خاور کے لیے کیسے، کیسے پار پڑیل رہے تھے اور یہاں وہ خرم صاحب ایسے چھپے رستم نکلے کہ تمام میدان ہی پار کر گئے بلکہ..... کوہ ہمالیہ سر کر لیا انہوں نے۔“ باہر سارے دن سے اسی نوعیت کی بڑ بڑاہٹ میں جھلا تھے، جیسے ہی اپنے کمرے میں آتے، شروع ہو جاتے۔

اس وقت ایسا ہی ہوا۔ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر روٹی اپنے بال سلجھا رہی تھی ڈریسنگ کے سامنے کھڑی۔

باہر جملہ بڑ بڑا کر لینے اپنی پیشانی سہلا رہے تھے۔ روٹی نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ برش لیے لیے ان کے قریب آ کر بولی۔

”بیزار ہو چکی ہوں آپ کی لن ترانی سن کر.....“

آخر کر کیا دیا ہے خرم نے.....؟ کھل کر کیوں نہیں بتا ڈالتے؟“ انہوں نے سنجیدگی کے عالم میں جواب دیا۔

”جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں؟“ وہ ہنستی ہوئی ان کے قریب بیٹھ گئی اور شرارت سے بولی۔

”آنکھیں کھول کر دیکھیے سرتاج آپ ممانی جان سے نہیں بلکہ..... اپنی لائف پادشہ سے مخاطب ہیں، فرمائیں، فرمائیں.....“

”تو جگر کو تھام کر نہیں کہ آپ کے دیور صاحب خرم جہا ندار نے شادی رچائی ہے اور ایک عدد صاحبزادے کے والد بزرگوار بھی بن چکے ہیں۔“ انہوں نے ڈرامائی انداز میں انکشاف کر ڈالا۔

سب سے پہلے نامہ بیگم کا سراپا گھومنے لگا تھا۔ اور وہ سر سے ہر تنگ جھرجھری لے کر رہ گئی۔

کافی عرصے ان کے ہاں بطور نیوٹر جاتے رہنے کی وجہ سے وہ وہاں کے ماحول سے واقف ہو چکی تھی۔

سب کے اخلاق اور تہذیب کی دل سے معترف تھی۔ وہ روٹی اور معصومہ کا دوستانہ رویہ، شمس بیگم کا مشفقانہ سلوک، بچوں کی محبت اور انسیت..... مگر ان سب روتیوں کے ساتھ، ساتھ نامہ بیگم کے مزاج کی..... عجیب و غریب سی کچھ مخ مزاجی اور متکبرانہ انداز..... وہ آواز و

مزاج کے علاوہ ظاہری شکل صورت سے بھی حد درجہ مفرد اور حاکمانہ فطرت اور نفوذ والی شخصیت دکھائی دیتی تھیں۔

اور جو انہوں نے آخر میں شرمین کے ساتھ دل شکن اور دل آزار رویہ اختیار کیا تھا۔ وہ سب فراموش کر ڈالنے کے لائق ہرگز نہیں تھا۔ ان کی سوچ اور الفاظ کا زہر ناقابل یقین اور ناقابل برداشت تھا۔ اسی بنا پر شرمین کو یقین نہ تھا کہ وہ ریشم کو آسانی سے قبول کر سکیں گی۔

”یا اللہ! ریشم کے ساتھ ایسا کچھ بھی نہ ہو، وہ تو اب ان کے بیٹے کی بیوی اور اس کے بچے کی ماں تھی۔

خود بھی بہت معصوم اور ہر بات سے لاعلم تھی۔“ اس نے دل کی گہرائیوں سے دعا کی تھی۔

گو کہ ڈاکٹر خاور سے کچھ کہنے سننے کا موقع ملا تھا نہ وقت..... مگر اس کے باوجود شرمین کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ وہ اندر سے بہت ڈسٹرب اور پریشان ہیں، بھائی کے کام بھی آنا چاہ رہے ہیں مگر اس معاملے میں لاچار اور مجبور بھی ہیں، ظاہر ہے بڑوں کے سامنے چھوٹوں کی کیا اہمیت..... یہ سب سوچنے کے باوجود وہ

دل ہی دل میں اگلے چند دنوں تک بڑی شدت سے منتظر رہی کہ شاید اب ان کے ہاں سے کوئی ریشم اور اس کے بچے کو لینے آئے یا تب آئے مگر رفتہ رفتہ مکرم دس پندرہ دن کا ہو گیا۔ مگر لینے تو کون آتا، کوئی بچہ کو دیکھنے اور ملنے تک نہیں آیا۔ بالآخر وہ مایوس ہو کر رہ گئی۔ اور

”شادی کے بعد۔۔۔ یا۔۔۔ شادی سے پہلے؟“  
 روٹی محض مذاق سمجھی، برجستہ پوچھا۔  
 ”تصدیق کر لی گئی ہے، نکاح پہلے ہوا تھا، مینا  
 بعد میں۔“ باہر نے اسی سوڈ میں جواب دیا۔

”آپ کچھ کہہ رہے ہیں یا مذاق کر رہے  
 ہیں؟“ اب روٹی نے بغور ان کی صورت گئی اور گھبرا  
 کر پوچھا۔

”اگر جیتے جاگتے بیٹے مذاق میں ملتے ہوں تو  
 ایک ہمیں بھی عنایت کر دیجیے۔“ باہر نے اس کی طرف  
 ہاتھ پھیلا کر کہا۔

”آپ کو معلوم ہے ناں آپ کیا کہہ رہے  
 ہیں؟“ مارے پریشانی کے روٹی کے ہاتھ سے برش  
 چھوٹ گیا۔

”نہیں، ہم گھاس کھا گئے ہیں اور جھوٹ بول  
 رہے ہیں۔“

”ممائی جان کو یہ سب معلوم ہے؟“  
 ”ہم سب کی جانیں سلامت چاہتی ہیں یا  
 نہیں؟“ باہر نے طنزیہ پوچھا۔

”یا خدا۔۔۔ اب کیا ہوگا؟“ روٹی نے ان کا  
 انداز نظر انداز کر کے بدحواسی سے کہا۔

”یہ خرم کو کیا سوچھی بیٹھے بٹھائے؟ کیا ممائی جان  
 ان کی شادی نہ کرتیں؟ ظاہر ہے اب وقت آ رہا تھا۔“

جواب میں باہر خاموش رہے۔  
 ”آپ تو ایک شوٹا چھوڑ کر خاموش ہو گئے۔ خدا  
 کے لیے سب کچھ سچ، سچ بتا دیجیے کہ اصل واقعہ کیا  
 ہے؟“ روٹی بہت دیر کو گوگو کے عالم میں ان کا جائزہ لیتی  
 رہی بالآخر خوشامد اندہ بولی۔

باہر خود بھی کم پریشان نہیں تھے اس لیے زیادہ دیر  
 خاموش نہ رہ سکے اور پلاٹم وکاس تمام واقعہ روٹی کو سنا ڈالا۔  
 یہ سن کر کہ یہ قصہ خاور کی معرفت ان تک پہنچا  
 ہے، روٹی چوگی۔ رہا نہ گیا تو کہنے لگی۔

”کہیں خاور، ممائی جان کو نہ جانتائیں؟“  
 ”انہیں اپنی چند یا کے بال عزیز ہیں اور انہوں

نے تو مجھے ہی بہت جھجک، جھجک کر بتایا ہے اماں جان  
 کو کیا بتائیں گے۔ اب تم بھی دماغ لڑاؤ کہ کیا کرنا  
 چاہیے؟“ باہر نے طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ  
 جواب دیا۔

”میں کیا بتاؤں؟“ روٹی نے پریشانی سے  
 جواب دیا۔

”بات تو بہت بڑی ہے معمولی نہیں۔۔۔۔۔ ہم،  
 آپ کے بس کا روگ نہیں ہے، امی جان اور بابا جان  
 کے غم میں لائیں فوراً۔۔۔“

”میرا اپنا بھی یہی خیال اور ارادہ بھی تھا۔ ایسا نہ  
 ہو اماں جان کہیں خرم کی بات چیت چلا دیں یا رشتہ  
 وغیرہ ٹھہرا دیں۔۔۔۔۔ اس صورت میں معاملہ بہت تازک  
 رنگ اختیار کر جائے گا۔ خرم پھنس جائے گا۔“

”ایسا تو سو فیصد ممکن ہے، ویسے بھی ممائی جان،  
 امی جان کا ہی انتظار کر رہی ہیں، ان کے آتے ہی کوئی  
 سلسلہ چلانے والی ہیں۔“ روٹی نے مسکرا کر کہا۔

”کیا تم سے۔۔۔۔۔ کچھ کہہ رہی تھیں؟“ روٹی ان  
 کی گھبراہٹ دیکھ کر ہنس دی۔

”مجھ سے ایسے تعلقات کہاں ہیں ابھی۔“ جواباً  
 باہر نے بیوی کو خشکیوں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے  
 میزبانی سے کہا۔

”کب تک یہ تماشا طے گا ختم کرو بس سب۔۔۔۔۔“  
 ”ختم کر دیں گے، ختم کر دیں گے اب تو ہم ایک  
 چھوڑ دو، دو ہو گئے ہیں۔“ روٹی نے شوخی سے جواب دیا۔

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“  
 ”مطلب یہ کہ ہماری مددگار ہماری دیورانی بلکہ  
 ہندی لگی نہ پھٹکری ایک عدد ننھے سنے بیٹھے صاحب

بھی۔“ باہر کے چہرے پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ چمک گئی  
 مگر زبان سے کچھ نہ بولے۔ کروٹ سے چپ چاپ  
 لیٹ گئے۔

اب رات کافی بیت چکی تھی۔ کونہی کی ٹہنی منزل  
 گہرے سناٹوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ شاید سب لوگ  
 سو چکے تھے۔

## جنگل کا پتھول

بھیجے گی؟" خاور ٹھٹک گئے، چاروں طرف دیکھ کر پوچھا۔

"تو... آپ کو خبر ہوگئی؟"

"ایسی دھماکا خیز، تھلک آمیز خبر بھلا کہیں چھپ

سکتی ہے؟"

"لیکن! چھپائی تو چاہیے۔" انہوں نے

زور دیا، "جہاں معمولی ترین 'جسارت' معاف کرنے

کی رسم نہ ہو، وہاں اتنی بڑی گستاخی "کس طرح

معاف کی جاسکے گی؟"

"ابھی تک اس 'جسارت' کو بھولے نہیں؟"

"یہ بھی کوئی بھولنے والی بات ہے؟" انہوں

نے مہری سانس لی۔

"لیکن آخر کب تک چھپائی جاسکے گی جبکہ چھپنا

مستے کا حل نہیں۔"

"جب تک مناسب حل سامنے نہ آجائے،

چھپائی چاہیے۔"

"ہاں، یہی بہتر ہے۔" روہی نے اقرار کیا۔

تھوڑی دیر تک باتیں کرتے، کرتے سب کی طرح باہر بھی نیند کی وادیوں میں کھو گئے۔ روہی مہری سوچوں میں گھری ہوئی تھی۔ وہ بہت دیر تک جاگ کر تمام واقعات کے ہر پہلو پر غور کرتی رہی۔ سوچتی رہی، دل ہی دل میں کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتی رہی۔ پانا آخر کسی فیصلے پر پہنچ کر سو گئی۔

صبح جلدی اٹھ کر سب سے پہلے اس نے معصومہ کو ہدایت کی کہ وہ خاور سے کہہ دے کہ اسپتال جانے سے پہلے مل کر جائیں۔

باہر کالج جلدی جاتے تھے ان کے جانے کے بعد وہ دانستہ جاگ کر خاور کا انتظار کرتی رہی۔

"جی روہی بھابی، خیریت؟ ارے ہاں صبح بخیر....." خاور نے اس کے کمرے میں پہنچ کر کہا۔

"صبح بخیر....." روہی نے بغور اُن کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"جلی مبارک باد کس کی دوں..... بھابھو کی یا

**سینئر نسوانی حلقہ گارڈز**

**ہلرسم ہسٹڈ ولپنگ ایڈڈ ٹاٹو ٹیگ کریم (ہرمل)**

جھولی بریسٹ میں اضافہ کر کے بریسٹ کی نشوونما کو مکمل کرتی ہے

بریسٹ کی نئی فورم کر کے نئی لائی ہے۔ بریسٹ و سٹڈل اور ٹولسورت مانی ہے۔

**Rs.250/-**

**چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔**

**150/-**

**گلیسی**

یونانی کریم

تحتی چہرے پر لگوانا چہرہ کی تازگی اور چمک سے بھر دیتا ہے۔ بدقسمت و مسکینوں کو بھی صاف کر کے خوش کرتی ہے۔

اپنا راز لانا مارا دینے میں تو اہمیت پر SKYPE کن وین کرنا سہیہ کرنا سہیہ کرنا۔

اپنا محنت سے اسٹریٹ ٹیپنگ کرنا۔ 0345-7000088

کریم مگر مگر لائے کیلئے رقم بڑی لوڈ کروا کر اپنا ایڈریس SMS کریں۔

051-5502903-5533528

042-7666264

Cell: 0333-5203553. Website: www.devapk.com

”اب پورا قصہ اپنی زبانی سناؤ۔“

”بھائی جان نے سنایا تو ہوگا؟“

”مگر تم اپنی زبان سے سناؤ، شاید کوئی بات چھوٹ گئی ہو۔“

”جی ہاں، سو فیصد سچ ہے۔“

”یعنی؟ کوئی بات چھوٹ گئی ہے۔“

”جی ہاں..... مگر دانستہ چھوڑی ہے۔“

”سناؤ۔ پھر جلدی سناؤ۔“ روبی نے بے صبری سے اصرار کیا۔

”مگر وعدہ کیجئے اس چھوٹ کو میرا جرم قرار نہ دیا جائے گا۔“

”سناؤ کو آج نہیں ہوتی۔ تم بتاؤ..... فیصلہ از خود ہو جائے گا۔“

”نئی بھابی، شرمین کی پڑوسن ہیں، یہاں شہر میں۔“

”کیا؟“ روبی اچھل پڑی۔

”جی ہاں، یہ حقیقت ہے، ایک سادہ سی حقیقت.....“ خاور نے بالتفصیل پورا واقعہ سنا ڈالا۔

اڑوس پڑوس اور آپس کے برادرانہ تعلقات سن کر روبی دنگ رہ گئی۔

”اب میری خیر نہیں ہے، سر پر ویسے ہی چار بال ہیں۔“ وہ سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

”آپ کا انشاء اللہ بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ بس آپ یہ کیجئے کہ کسی طرح ان سب کا میل ملاپ کروا دیجئے آپس میں۔“

”ہاں میں یعنی خرم، ان کی بیوی اور مہم..... ممائی جان کا؟“ روبی نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

”ہاں تو اور کیا۔“ باقی کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔“

”پہلے میں اپنا ملاپ تو کرالوں۔“ وہ ہنسی۔

”کیا مطلب؟ آپ کے ملاپ کو کیا ہوا ہے؟“

”کچھ نہیں.....“ روبی نے جلدی سے بات چلی۔

”حالات بہت سیریس ہو چکے ہیں، امی جان کو اب فوراً کوٹھی واپس آ جانا چاہیے۔ کل ہی..... بلکہ آج

میں کچھ کرنا ہوگا۔“

”ہاں اچھی بھابی جان! کچھ تو کیجئے۔“ خاور درو مندی سے بولے۔

”ریشم بھابی بیچاری ادھر کی ہیں نہ ادھر کی۔ اپنے میکے سے بھی چھوٹیں اور سسرال بھی نہیں پوچھتی۔ اب تو

چھوٹا بچہ بھی ہے، خود خرم بیچارہ سخت شرمندہ اور رنجیدہ رہتا ہے۔“

خاور چلے گئے اور روبی پر سوچ کے نئے دروازے کھول گئے۔ رات بھی وہ دیر تک تمام

واقعات کی کڑیاں جوڑ، جوڑ کر کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ اب خاور سے چند اہم ترین

باتیں مزید سننے کو مل گئی تھیں۔

اتفاق سے اسی شام شرمہ بیگم واپس اپنی کوٹھی پر آ پہنچیں۔ سب تو خوش ہوئے ہی تھے مگر نائٹ بیگم کو بے حد خوشی اور اطمینان کا احساس ہوا تھا۔ اپنی ہزار

مصروفیات اور الجھنوں کے باوجود نمند کے بغیر انہیں دونوں گھر خالی، خالی لگتے تھے۔

خود شرمہ بیگم بھی واپس اپنے مقام پر آ کر بہت خوش دکھائی دیتی تھیں۔ شادی رخصتی کے بعد سے ابھی

تک انہوں نے اپنی بیٹی، داماد کو اپنے ہاں بلا کر رکھا تک نہیں تھا۔ اب سارے ارمان پورے کرنے کا

ارادہ تھا ان کا۔

مگر اگلے چند دن میں ایک نئی خبر دونوں گھروں میں گردش کرنے لگی تھی۔ روبی نے اعلان کر دیا تھا کہ

وہ کم از کم ایک ماہ کے لیے باہر کے ہمراہ شمالی علاقہ جات گھومنے جائے گی۔ نائٹ بیگم کچھ بھی نہ بول سکیں۔

☆☆☆☆

آواز رفت رفت تیز ہوتی جا رہی تھی۔ سہ پہر کا

سناٹا، ہر طرف پھیلی ہوئی خاموشی، کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے آواز میں کسی تکلیف کا اظہار ہو..... نیند تو تک

چڑھی بہو کے کمرے میں انہیں کیا آتی، البتہ جھکی سی آتی تھی۔ انہوں نے بے چینی سے لیٹے، لیٹے کروٹ بدلی۔ پھر آنکھیں کھول دیں۔ ماحول کا احساس ہوتے



## حکمل کا پھول

چینی اتنی بڑھی کہ وہ باہر نکل آئیں۔ گرمی کی سہ پہر اور لان کی ویرانی ہر طرف پھیلی پھیلی، پیلی دھوپ مگر سکوت میں ابھرتی آواز..... مزید واضح ہوتی گئی تھی۔

انہیں یوں لگا آواز شمس بیگم کے باغ کی طرف سے آرہی ہو، وہ ایک اضطرابی سی کیفیت میں ان کی طرف مڑ گئیں۔ شمس بیگم کی کونھی کا لان عبور کرتی ہوئی وہ چار میز پر چڑھ کر رہائشی عمارت میں آ گئیں۔ سخت حیرت اور جستجو کے عالم میں انہوں نے خود کو ان کے پچھلے برآمدے میں کھڑے پایا اور آنکھیں پھاڑ، پھاڑ کر سامنے کا منظر دیکھنے لگیں۔

گلابی رنگ کے جوڑے میں لمبوس ایک نوجوان لڑکی ایک چھوٹے سے بچے کو ناشی نہلا رہی تھی اور شمس بیگم پانی ڈال رہی تھیں۔ بچہ تھا کہ زور شور سے رو رہا تھا۔ ہاتھ پیر مار رہا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ان دونوں نے بچے کو نہلایا۔ شمس بیگم نے سفید تولیہ دیا اور لڑکی نے جلدی سے بچے کو تولیے میں لپیٹ لیا۔

”جی شمس بیگم کی نظر نامہ بیگم پر پڑی۔“  
”ارے نامہ آؤ، آؤ، کھڑی کیوں ہو؟“ انہوں نے کرسی آگے بڑھائی۔ ان کی نگاہیں اب تک لڑکی اور بچے پر لگی ہوئی تھیں۔ ہند کے گھر میں زندگی میں پہلی بار یہ نظارہ دیکھنے کو ملا تھا۔

”آیا! یہ کون ہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا؟“ منہنے کو تو بیٹھ گئیں مگر دہی زبان سے پوچھا۔ شمس بیگم مسکرائیں۔

”بتاتے ہیں، بتاتے ہیں، صبر کرو۔“ پھر وہ لڑکی کی طرف متوجہ ہو گئیں جو بچے کو تولیے میں لپیٹ بیٹھی تھی۔ دونوں نے مل کر اسے خشک کیا۔ ٹیلکم پاؤڈر لگایا، کپڑے پہنائے، شمس بیگم نے اس کے سر پر ہلکا سا تیل لگایا پھر بھاوج سے بولیں۔

”ابھی صاحبزادے کی ماش کی ہے تو خوب چلا، چلا کر رو رہے تھے اور اب نہا کر کیسے خوش ہو رہے ہیں۔“ کہتے، کہتے انہوں نے سفید کرتے پا جاسے

ہی وہ جلدی سے اٹھ بیٹھیں۔

کمرے میں ہر طرف خوشبو ہی خوشبو تھی۔ عطر کی خوشبو..... پھولوں، کلیوں کی خوشبو..... ٹیلکم پاؤڈر کی خوشبو..... کریم کی خوشبو، صابن کی خوشبو..... نئی نوپلی دہن کی خوشبو، مہندی کی خوشبو..... وہ بری طرح چونک پڑیں۔ سمجھتے ہوئے نرم و گداز بستر کے سرہانے باہی پھولوں کا گچھ اب تک ٹک رہا تھا۔ جس آواز کو سن کر نیند اچٹ گئی تھی وہ دوبارہ سماعت سے ٹکرائی۔ سر پہرے کے سائے ڈھنسنے شروع ہو گئے تھے، ہر طرف سکوت تھا، اوپر کی اس منزل اور کمرے میں سناٹا تھا۔ سڑکیں سنسان تھیں لان میں لائے، لائے درختوں کے سائے ساکت تھے۔ ہوانہ چلنے کی وجہ سے سخت گرمی اور ہوکا عالم طاری تھا۔

نامہ بیگم دو گھنٹے پہلے بلا ارادہ رولی کے کمرے میں چلی آئی تھیں۔ کافی دیر ادھر ادھر جھانکتی پھریں، بالکنی میں کھڑی ہو کر باہر دیکھتی رہیں۔ پھر بیڈ پر آ بیٹھیں۔ کمرے کا اے سی بند ہونے کے باوجود انہیں اس زور کی جھونک آئی کہ وہ وہیں لڑھک گئیں۔

پرسوں رولی اور باہر تفریحی دورے پر روانہ ہوئے تھے، ابھی سے اندر باہر کی فضا میں مزید خاموشیوں کی نذر ہو کر رہ گئی تھیں۔ شادی کے بعد سے مسلسل رولی کی فرمائشوں، شدوں اور چڑچڑے پن کے مظاہروں نے نامہ بیگم کو اس حد تک تھکا اور الجھا ڈالا تھا کہ اس کا گھومنے جانے والا مطالبہ اچھا نہ لگنے کے باوجود انہوں نے اس کی غیر موجودگی کو غنیمت جان کر سکھ کی سانس لی تھی۔ انہیں آزادی کا سا احساس ہوا،

ورنہ وہ اور رولی کے کمرے میں ان کا پایا جاتا..... چ معنی دارد؟ کھلی کھڑکی کی راہ آواز پھر ان کے کانوں سے ٹکرائی۔ کسی ننھے منے بچے کی آواز لگ رہی تھی۔

نامہ بیگم دہن کی خواب گاہ بند کرتی ہوئی دھیرے، دھیرے زینے اترتی ڈرائنگ روم میں آئیں۔ یہاں کے سائے میں آواز بھی تیز تھی..... انہیں قدرے بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ پھر یہ بے

میں ملبوس گل تھوٹنے سے صحت مند بچے کو اچانک نامہ  
بیگم کی گود میں لٹا دیا۔ اور لڑکی کی طرف اشارہ کر کے  
بولیں۔ ”یہ ریشم ہے۔“

ریشم نے ادب سے انہیں سلام کیا۔

”ریشم، جاؤ تم نہ! آؤ جینی بہت گرمی ہے، منے  
میاں کو ہم دیکھ لیں گے۔“

”جی بہت اچھا۔“ کہہ کر وہ سب سامان سمیٹتی  
ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

نامہ بیگم بغور انہیں دیکھتی رہ گئیں۔ ماں، بیٹے  
دونوں ہی بہت پُرکشش تھے۔

”ہات دراصل یہ ہے۔“ شمسہ بیگم نے بھانج  
کے قریب بیٹھتے ہوئے تسلی سے کہنا شروع کیا۔

”ان کے (متین احمد) کے ایک بہت پرانے اور  
قریبی دوست تھے رحمت علی خان، اب تو خیر بیچارے

مرحوم ہو چکے، یہ لڑکی ریشم انہی کی بیٹی ہے، بیچارے  
بہت ہی شریف مگر ایک غریب آدمی تھے، انتقال سے

پہلے اپنی بیٹی کی شادی جہاں کر گئے وہ لڑکا اپنے والدین  
کا اکلوتا بیٹا ہے، بیوہ ماں نے بہت ہی محنت اور محبت

سے اپنے بیٹے کی پرورش کی۔ پڑھایا لکھایا، برسرِ روزگار  
ہو گیا تو شادی کر دی۔ خود ذرا سخت مزاج سی نہ زیادہ

ہنسنے والی نہ بولنے والی خاتون ہیں، میں اچھی طرح  
واقف ہوں ان سے، دل کی ویسے بہت صاف شفاف

ہیں، ان کی حدودِ رنجیدگی کی وجہ سے بہو ذرا دبی کٹی سی  
رہتی ہے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اچانک ہی دونوں

ماں، بیٹے کالج پر جانا ہو گیا۔ ادھر بہو کا چھوٹا سا بچہ  
لڑکی جوان، تنہا، کہاں اور کس پر چھوڑ کر جائیں۔ جانا

بھی ضروری اپنے مقدس سفر پر۔ لہذا میں نے ہامی  
بھری۔ بس نامہ! میرا جی نہ مانا تم سے مشورہ کرنے کا

بھی موقع نہیں تھا۔ یہ (متین احمد) موجود تھے، انہیں تو  
اللہ ایسی نیکی کا موقع دے۔ مجھ سے بھی انکار نہ

ہو سکا۔ سو یہ ماں بیٹا میرے ہاں آ گئے۔“ شمسہ بیگم نے  
ایک گہری سانس لے کر پُر اعتماد انداز میں شروع کی مئی  
داستان ختم کر لی۔

نامہ بیگم نے بے خیالی میں بچے کے منے منے  
ہاتھوں کو پکڑتے ہوئے کہا۔

”آپ کب لائیں ان کو؟“

”ارے! نکل شام کو تو آئے ہیں دونوں۔“

جواب دیتے ہوئے وہ لپک کر گئیں اور کاجل کی ڈبیا  
اٹھالائیں اور کھول کر رکھ دی۔

”کو..... اپنے ہاتھ سے آنکھوں میں کاجل لگا دو  
منے کے۔ بھلا معلوم ہو گا۔“

نامہ بیگم نے جھٹ سے انگلی ڈبیز پر پھیری اور  
بچے کی آنکھوں میں کاجل لگا دیا پھر اسے کندھے پر لگا

کر تھپکنے لگیں۔  
پل کی پل میں ان کی بچے سے دوستی پکی ہو گئی۔

چہرے پر منوں ممتا پھوٹ پڑی، چہرے کی سنجیدگی میں  
دراثر پڑ گئی۔

جب تک ریشم نہا کر آئی دونوں بوڑھیاں.....  
مکرم کے سیکڑوں لڑا اٹھانے میں مصروف ہو چکی

تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے برسوں پرانی شناسائی  
ہو۔ اور پھر یہ شناسائی ماشاء اللہ بڑھتی ہی چلی گئی۔

نامہ بیگم ہر روز دوپہر کو خراماں، خراماں اپنی  
طرف سے نکلتیں اور شمسہ بیگم کے ہاں آ بیٹھتیں۔

گھنٹوں مکرم کو کھلاتی رہتیں۔ ریشم سے ادھر ادھر کی  
باتیں کرتی رہتیں۔ یہ پیاری سی لڑکی اور اس کی بھولی

بھالی غریبانہ باتیں انہیں بہت اچھی لگتیں۔ اکثر دل ہی  
دل میں اس کا موازنہ اپنی مغرور بہو سے کرنے لگتیں تو

ان کی اندر کی آنکھیں کھلتی چلی جاتیں..... سوچتیں۔  
”دونوں ہی اللہ کی مخلوق ہیں مگر دونوں میں کیسا

زمین آسمان کا سا تضاد ہے، ایک سادگی کا مرقع اور  
گلدڑی میں چھپا اعلیٰ ہے تو دوسری دکھاوت اور علالت

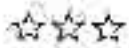
کی پوٹ۔ فقط اس لیے کہ ایک غربت کی گود میں  
پرورش پانے والا ہے اور دوسری منہ میں سونے کا چھپے لے

کر پیدا ہوئی ہے، وقت اور حالات کی گردش بھی کیا، کیا  
گل کھلاتی ہے۔“ غرض یہ کہ جوں، جوں دن گزرتے

جارے تھے، مکرم اور ریشم کی الفت ان کے دل و دماغ

منزلے گا۔“ متین احمد ہنس کر کہتے۔  
 ”اے ہائے ایسا غضب مت کر دیجیے گا۔“ وہ  
 دہن کر منع کرتیں۔ ”نامہ کا غصہ معلوم نہیں ہے کیا؟  
 لڑکے کو زندہ چھوڑ دیں گی بھلا؟“  
 ”اماں بس دیکھتی رہو، آگے، آگے ہوتا ہے کیا۔  
 یہ سب ایک ہی تھلی کے پٹے بٹے ہیں کیا ماں، بیٹا، کیا  
 دادی، پوتا اور کیا ساس، بہو۔ سب ایک ہو جائیں  
 گے اور ہم تم ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ جائیں  
 گے۔“ متین احمد ان کو تسلی دیتے۔  
 ”معلوم نہیں کیا، کیا گل کھلاتے رہتے ہیں۔“ وہ  
 براہمان کر کہتیں۔

”خود ہی ریشم کو یہاں بلوایا، ترکیبیں لڑائیں  
 ملوانے کی۔ اب خود ہی اس طرح کی باتیں بھی  
 کرتے رہتے ہیں ہم کیا کریں یہاں تو ڈرا سے پھڑکا  
 ہو رہا ہے۔“



شمسہ بیگم نے ایک بہت بڑی ذمہ داری اپنے  
 سر لے لی تھی مگر اب چاروں اطراف کے نظارے بھی  
 انہیں گھیر رکھا تھا۔  
 باہر اور روٹی بھی گھوم پھر کر واپس آتے والے  
 تھے۔ دوسری طرف انہیں شرمین اور اس کی دادی اماں  
 کا بھی خیال تھا۔ سوچتی تھیں کہ اگر نامہ مان گئیں اور  
 پھر شرمین کی دادی اماں نہ مانیں تو کیا ہوگا؟ خاور کی  
 مایوسی تو اسے جیتے جی مار ڈالے گی۔ اس لیے زیادہ بہتر  
 ہے کہ کسی صورت ان کا عندیہ بھی لے لیا جائے تاکہ  
 بات صاف ہو جائے۔

بہت غور و خوض کرنے کے بعد ایک دن انہوں  
 نے ریشم کو ڈاکٹر کو دکھانے کا بہانہ کیا اور دونوں ماں،  
 باپ بیٹے کو لے کر شرمین کے ہاں آئیں تاکہ سب  
 لوگوں سے ملاقات بھی ہو جائے۔

یہاں تو ریشم کی آمد خوشخبری کی طرح اندر باہر  
 گھوم گئی۔ آن کی آن میں ہر کوئی بھاگا چلا آیا۔ سب  
 نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا، ذکیہ خالہ دوڑی چلی آئیں۔

پر گہری ہوتی جا رہی تھی۔  
 ایک وہ ہی کیا۔ مکرم دیکھتے ہی دیکھتے گھر بھر  
 کی آنکھوں کا تار اہٹا جا رہا تھا۔ کوئی ایک ہل اسے  
 آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتا۔ ابھی اسے معصومہ  
 گدگداری ہی ہے تو ابھی کامی، جانی اور افشاں اسے  
 گودوں میں بھرے گھوم رہے ہیں، اسپتال سے آ کر  
 خاور اسے بلوایاتے اور تو اور کبھی کبھار ڈیوٹی سے گھر  
 آنے والا خسر بھی اس ننھی سی جان کا شہیدائی ہو چکا  
 تھا۔ گود سے چپکا تا تو واپس دینا بھول جاتا۔ ظاہر ہے  
 اولاد تو ایسی کمی تھی ناں وہ بھی سب سے خوب روز بروز  
 مانوس ہوتا جا رہا تھا۔

نامہ بیگم اس کا اس قدر خیال رکھتیں، لاڈ کرتیں،  
 چاؤ چوٹیلے اٹھاتیں جیسے وہ انہی کے گھر کا ایک فرد ہو۔  
 ایک سے ایک مارکیٹ سے جوڑے، کپڑے اور  
 کھلونے منگوا منگوا کر دے چکی تھیں۔

کچھ ہی عرصے کے بعد تو یہ حال ہو گیا کہ وہ شرم  
 بیگم کے بجائے نامہ بیگم کے گھر میں پایا جائے لگا۔ فقط  
 فیڈ کرانے کے لیے ریشم کے پاس بھیجا جاتا۔ متین احمد  
 جب بھی زمینوں سے واپس آتے، تمام داستانیں اور  
 کارروائیاں بیوی کی زبانی سنتے تو ان کے فنگ شکاف  
 قہقہوں سے ان کی کوٹھی گونج اٹھتی۔ بیوی کو جی بھر کے  
 شاباشی دیتے۔ ریشم کو خوب مبارک باد دیتے اور خرم  
 بروقت دستیاب ہو جاتا تو وھمو کے مار، مار کے اس کی  
 پیٹھ لال کر ڈالتے۔

”واہ میرے مٹی کے شیر.....!“ وہ اسے  
 چھیڑتے۔ ”خوب چھپے رہتے نکلے.....!“

”بس سمجھو پتھر میں جو تک لگ چکی ہے۔“ نامہ  
 بیگم کا حال دیکھ، دیکھ کر بیوی سے کہتے۔ لیکن کسی، کسی  
 دن شمسہ بیگم پریشان ہوا گھٹیں اور ہول ہول کر کہتیں۔  
 ”اجی میں کہتی ہوں یہ اونٹ آخر کس کروٹ  
 بیٹھے گا؟ جس روز بھی یہ ڈھول کا پول کھل گیا نامہ جتھے  
 سے اکھڑ جائیں گی۔ سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔“

”خرم کو آگے کر دیں گے۔ خود ہی پٹ پٹا کر





### سجانی

شہر نگاراں میں رہتا تھا  
شہر خوشاں جب پہنچا  
حدنگاہ تک دیکھا میں نے  
آبادی ہی آبادی تھی  
نہ کوئی خواب جاگ رہا تھا  
نہ کوئی خواہش بول رہی تھی  
خاموشی کی چادر اوڑھے  
ساری بستی سو رہی تھی  
درختوں پہ بیٹھے کچھ پرندے  
اپنی بولی میں کہہ رہے تھے  
تخت مٹی، تاج مٹی، سب مٹی ہو جاتا ہے  
مٹی کے بچھونے پر بندہ مٹی اوڑھ کے  
سو جاتا ہے

شاعرہ: نجمہ ناز اعظمی، کراچی

پیاری، پیاری حرکتوں سے لطف اندوز ہوتے گردہا  
تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے معصومہ کی سرگرمیوں پر  
زیادہ غور کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔

رولی کے جینز میں آرائش خانہ کا بہت سا سامان  
تھا جو ہنوز یک حالت میں ہی پڑا تھا۔ معصومہ نے بڑی  
ہمت اور جرأت سے کام لے کر یہ تمام پینٹنگ کھولی،  
ملازموں اور ریشم کی مدد سے ساری کو بھی کواڑ سر تو ترتیب  
دے ڈالا۔ ڈرائنگ روم میں رولی کے جینز کے نئے  
قالین، صوف، سیٹ، کچھ مختلف آرائش کے سامان کے  
ساتھ، ساتھ ہی پینٹنگز بھی نکلا کر سجائیں۔ ضروری  
اضافے کیے ڈرائنگ ہال اور لاونج میں چونکہ ٹائم بیگم  
زیادہ توجہ نہ اعتراض کیا اس لیے معصومہ کی بہت حوصلہ  
افزائی ہوتی رہی اور وہ مزید خوش ہو، ہو کر آرائش خانہ  
میں مصروف رہی اور ترامیم اضافے کرتی رہی۔ اسے  
اس خیال سے خاصی خوش ہو رہی تھی کہ بھائی اور بھالی

”اسے کہے گا کون، میں کیا خود کم ہوں ان کی  
پھولی.....“ وہ اقرار میں سر ہلا کر بولیں۔

”ہاں یہ تو آپ نے سچ کیا، کہاوت مشہور  
ہے۔“ ”ماں، بیٹی دو ذات، بھینٹی، بھینٹی ایک ذات،  
دیے میں کبھی ان کی والدہ وغیرہ نے کوئی بات کہلوائی  
ہے۔“ شمسہ بیگم ان کی سادگی پر مرئیں، محبت آمیز لہجے  
میں بولیں۔

”جب موقع ہوگا، انشاء اللہ وہ بھی ضرور آپ  
کے پاس حاضری دیں گی۔ سچی بات ہے مجھے تو آپ  
کی پولی دل و جان سے بہت پسند ہے اس لیے احتیاطاً  
آپ سے تذکرہ کر دیا۔“

”اللہ آپ کو سکھی رکھے، تندرستی قائم رکھے۔“ دادی  
اماں نے انہیں دل سے دعا دی۔ وہ متاثر ہو کر بولیں۔

”میرے کہہ دینے کا مقصد یہ ہے کہ اگر کہیں  
سے ذکر وغیرہ آئے تو آپ ذہن میں میری بات کو  
بھی رکھیے گا۔ اللہ اور اس کے حبیب نے چاہا تو جلد  
ہی کوئی سبیل نکلے گی اور ہم آپ کے پاس حاضر ہوں  
گے۔“ ان کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو جمع ہو گئے  
تھے مگر انہوں نے غیر معمولی ضبط سے کام لیا اور  
آہستہ سے بولیں۔

”بی بی یہ تمہاری قدر دانی اور محبت ہے، جب  
جی چاہے آؤ، تمہارا اپنا گھر ہے، ہمارے سر آنکھوں  
پر آؤ۔“

بات یہیں تک پہنچی تھی کہ ذکیہ خالہ، مکرم کو گود میں  
لیے لیے آگئیں۔ ان کے پیچھے ہنستی اور ریشم بھی تھیں۔  
”بھی پیاری بو اور شرمین نے مل کر سب کی خاطر  
تواضع کا بہت معقول انتظام کر لیا تھا۔ تھوڑی دیر کے  
بعد سب لوگ کھانے پینے میں مصروف ہو گئے۔“

☆☆☆

باہر اور رولی کے آنے میں چند روز باقی تھے، سبھی  
کو ان کے آنے کی خوشی اور چاہت تھی مگر سب سے  
زیادہ خوشی کا اظہار معصومہ کی طرف سے ہو رہا تھا۔  
ٹائم بیگم کا زیادہ وقت تو مکرم کی معصوم، معصوم

آکر دیکھیں گے تو بہت خوش ہوں گے اور اس کی تعریف کریں گے۔

خلاف معمول خاور بھی کہیں، کہیں اس کے مدد گار رہے اور مختلف معاملات میں اسے اپنے مشوروں سے نوازتے رہے۔ اتفاق سے دونوں گھروں کے بڑوں میں سے کسی نے اسے روکا اور نہ ٹوکا۔ وہ انہی خوشی اپنے کام میں مگن رہی۔ چنانچہ جب وہ ساری جہالت کر چکی تو کوٹھی اندر سے واقعی جھگڑا اٹھی۔

اپنی کارگزاریوں پر وہ اترا نہ گئی۔ ریشم کو بھی یہ سب تیاریاں دیکھ، دیکھ کر روٹی سے ملنے کا بے پناہ اشتیاق پیدا ہو گیا تھا۔

بالآخر وہ وقت بھی آ گیا اور وہ دونوں اپنے گھر اترے۔ دونوں تقریباً ڈیڑھ دو ماہ کی سیر و تفریح کے بعد آئے تھے اور اسے خوش و خرم اور اسے حسین و دلکش لگ رہے تھے کہ نامہ بیگم نے بے اختیار دونوں کی بلائیں لے ڈالیں۔ دوپہر کا وقت تھا، اچانک ہی آپہنچے تھے اس لیے شمسہ بیگم کے ہاں کسی کو خبر ہی نہیں تھی۔

نامہ بیگم بیٹے اور بہو کو بیار کر کے نماز ظہر کے لیے کھڑی ہو گئیں۔ معصومہ، روٹی کا ہاتھ پکڑ کر خوشی، خوشی ڈرائنگ روم میں لائی اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے تاکہ بھالوج سے داد وصول کر لے۔

روٹی کچھ دیر تک آنکھیں پھاڑ، پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتی رہی پھر اچانک ہی غم و غصے کی شدت سے اس کا بدن کاپٹنے لگا۔ برداشت نہ ہو سکا تو چلا کر بولی۔

”یہ میرے جہیز کا سامان کس بد بخت نے نکالا ہے؟ کس نے یہ جرات کی ہے؟ آج میں اس کا حشر بگاڑ دوں گی۔ کیا لاکھوں کا جہیز اس لیے لائی تھی کہ اس کی یہ گت بنائی جائے؟ کیا مجھے کسی ٹٹ پونجیے خاندان کی سمجھا ہے کہ میں کسی سے دب کر رہوں گی؟“ اس کی چیخ دھماکی آوازیں ہر جگہ گونج گئیں۔ اچانک اس پر مزید جنون طاری ہو گیا۔ اس نے ایک بھاری گھدانا اٹھالیا، وہ بالکل آپے سے باہر ہو چکی تھی۔ چیخ کر بولی۔

”تو میں خود ہی ختم کیے دیتی ہوں، نہ ہوگا بانس نہ بچے گی بانسری۔“ کہتے، کہتے اس نے گھدانا پوری قوت سے سامنے بچے ہوئے شوئیس پر دے مارا۔ ایک زوردار دھماکے کے ساتھ شوئیس کا شیشہ ٹوٹا اور نوٹیلی کر چیاں دور، دور تک بکھر گئیں۔ معصومہ چیخ مار کر باہر بھاگی۔

”اماں..... اماں..... دیکھیں بھابی جان کیا کر رہی ہیں؟“ نامہ بیگم اس کی چیخ پر ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے آئیں۔

مگر یہاں تو ایک طوفان بدتمیزی مچا ہوا تھا۔ ہر طرف ٹوٹے ہوئے ظروف، کاغذ، ریزوں اور ٹکڑوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

نامہ بیگم کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ان کی قوتِ گویائی جیسے سب ہو کر رہ گئی۔ اس المناک واقعے کے بعد انہیں صحیح معنوں میں چپ لگ گئی۔ معصومہ الگ الگ ہم کر رہ گئی۔ کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا تھا۔

نامہ بیگم جو اپنے کمرے میں تھیں تو باہر نکلتا ہی بھول گئیں۔ نئی، نئی سوچوں نے انہیں غڈ حال کر کے رکھ دیا۔ یوں تیسے لگا چند گھنٹوں کے اندر، اندر گویا کسی نے ان کا خون نچوڑ لیا ہو۔

روتے، روتے معصومہ نے کسی نہ کسی صورت ڈرائنگ روم کی صفائی تو کروادی تھی مگر اماں کی غیر معمولی خاموشی اور عجیب سے سکوت نے اسے اندر ہی اندر بری طرح سہاڑا لیا تھا۔ وہ کئی بار وقفے، وقفے سے ان کے کمرے میں جھانک آئی تھی مگر وہ چپ چاپ لیٹی رہیں۔ آج انہوں نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا نہ شمسہ بیگم کی طرف گئیں۔ مگر مگر کو بھی نہ بلوایا۔ معصومہ بہت خوف زدہ تھی ان کی طرف سے۔

شمسہ بیگم کو بھی روٹی کی حرکت کا علم ہو گیا تھا۔ وہ دانستہ اس طرف نہ آئیں۔ آخر کو بیٹی کا سسرانی معاملہ تھا۔

گرمی کی طویل دوپہر بیت گئی۔ شام جھک آئی۔ چائے کا وقت آ گیا مگر نامہ بیگم اپنے کمرے سے باہر نہ

## عزل

کرتی نہیں ہوں بات میں اس بات کے سوا  
چارہ نہیں ہے کوئی ملاقات کے سوا  
میں بن چہ مدہوش ہوں جب تک وہ ساتھ ہے  
پھر یاد کچھ رہتا نہیں اس ساتھ کے سوا  
ہوں کس بات کا لیے سرور کس قدر  
اب ہاتھ ملاتی نہیں اس ہاتھ کے سوا  
کل بھی ملے تھے دیکھا تھا پر بات نہ ہوئی  
کیسے ہو، ٹھیک ہوں شکر اس بات کے سوا  
مجبوریوں کی قید میں احساس کھوئے جو  
سب مل گئے مجھے تیرے جذبات کے سوا  
ان بے خواب آنکھوں میں سپنوں کو توڑ کر  
نصیری اداسیاں بھی ہیں برسات کے سوا  
از: خولہ عرفان، کراچی

”آج کتنا سوؤ گی؟ یہ دیکھو کون آیا ہے  
تمہیں جگانے کے لیے۔“ مگر انہوں نے آنکھ کھول بھی  
نہیں دیکھا۔

اتنے میں کرم نہیں سامنے دیکھ کر بچل اٹھا اور  
ان کے پاس جانے کے لیے ان کی طرف گرنے لگا۔  
شمسہ بیگم نے موقع غنیمت جان کر اسے بند پر  
بٹھایا۔ وہ دونوں ننھے منے ہاتھ ان کی کمر پر مارنے لگا۔  
”ہائے.....“ شمسہ بیگم نے ایک دفعہ پھر انہیں  
محبت سے پکارا۔

مگر وہ ان کی پکار سے زیادہ کرم کے ہاتھوں کے  
لمس سے اٹھ بیٹھیں پھر اچانک ہی معلوم نہیں کیا ہوا،  
انہوں نے دھمکتے ہوئے کرم کو اٹھا کر بازوؤں میں بھر لیا  
اور بچوں کی طرح پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگیں۔  
شمسہ بیگم بوکھلا اٹھیں، ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ  
وہ کیا کریں؟ انہوں نے اپنی آج تک کی زندگی میں جو  
نہیں دیکھا تھا، وہ آج دیکھ رہی تھیں۔ واقعی آج کا دن  
عجیب دن تھا۔

آئیں۔ ایک جاہل سناٹا ان کے جسم و جاں پر طاری تھا۔  
گہری خاموشی اور سکوت کا عالم تھا۔

آج کا دن اپنے دامن میں جانے کیا کچھ لیے  
ہوئے تھا۔ معصومہ نے ایک بار پھر ڈرتے، ڈرتے ان  
کے کمرے میں جھانکا مگر وہ دوپہر کی طرح ہی بے مدد  
پڑی تھیں۔

اس دفعہ اس سے رہا نہ گیا۔ وہ تیز قدموں سے  
پھولپی کی طرف آئی، وہ بیٹھی ہوئی کرم کو کپڑے  
پہنا رہی تھیں۔

”پھولپی جان.....!“ اس نے گھبرا کر  
انہیں پکارا۔ ”اماں جان کو دیکھیے چل کر۔ سارا دن گزر  
گیا ہے ایک کھیل اڑ کر ان کے منہ میں نہیں مٹی  
ہے، کمرے میں لیٹی ہیں۔“ شمسہ بیگم نے پریشانی کے  
عالم میں ماتھے پر ہاتھ مارا اور بولیں۔

”الٹی! اب کون سے کو تک ہاتی رہ گئے ہیں  
ہونے کو؟“ پھر معصومہ سے دریافت کیا۔ ”اور تم.....  
تمہاری بھانج کہیں گئیں ڈراما چاکر؟“

”اپنے کمرے میں سو رہی ہیں۔“ اس نے سہجہ  
کر جواب دیا۔

”اچھا تم یہیں رکو..... ہم دیکھتے ہیں۔“ شمسہ  
بیگم نے معصومہ کو ہدایت دی اور جلدی، جلدی کمرم کو  
تیار کرنے لگیں۔ آج کا دن انہیں بہت بھاری لگ  
رہا تھا۔ آٹھن میں خاور بھی اندر داخل ہوئے مگر پھولپی  
نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔ معصومہ کو بھی آنکھ کے  
اشارے سے منع کیا..... معلوم نہیں وہ کبھی یا نہیں

خاور، کرم کو گد گدائے گئے تو وہ ہنسنے لگا۔  
شمسہ بیگم اسے اٹھاتے ہوئے گویا ہو گئیں۔

”لاؤ، آج ان کی خاص ضرورت ہے.....“  
خاور کچھ نہ سمجھے، وہ کرم کو گود میں بھر کر چل دیں۔ ہائے  
بیگم کے کمرے میں آئیں تو دماغ میں سواندیشے رنگ  
رہے تھے۔

”اے ہائے.....“ انہوں نے اندر مچھتے ہی انہیں  
زور سے پکارا۔

کمرے میں نائمہ بیگم کے زور شور سے رونے کی آوازیں ابھر رہی تھیں اور مکرم ان کے گلے سے چپکا ہوا تھا۔

جوں، جوں وقت گزر رہا تھا، ان کے رونے میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، شدت بڑھتی جا رہی تھی، حتیٰ کہ شمس بیگم ڈر سی گئیں، وہ ان کے قریب مسمری پر ہی بیٹھ گئیں اور ان کا شانہ ہلا کر بولیں۔

”نائمہ.....! یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”تم تو بچوں سے بدتر ہو گئیں؟“

”یہ اس قدر شدت سے رو کیوں رہی ہو؟“

”کہیں ایسا بھی دنیا میں ہوتا ہے؟“

”کوئی دیکھ لے تو کیا کہے گا؟ خدا کے لیے چپ

ہو جاؤ۔“

”چپ ہو جاؤ نائمہ.....! دیکھو ہمارا بھی دل گھبرانے لگا ہے۔“ ان کی آخری بات سن کر نائمہ بیگم نے اپنی سرخ انگارہ آنکھیں ان پر گاڑ دیں اور پھر اُلٹی ہوئی آواز میں بولیں۔

”تپ نے بھلا کسی اور کو ہم سے زیادہ قسمت کا ہونا دیکھا ہے۔ شمسہ آیا! کوئی دوسرا ہوگا ہم جیسا کم نصیب.....؟“

”اے ہے۔ خدا کے خوف سے ڈرو نائمہ تم۔“ شمس بیگم نے دہل کر جواب دیا۔

”ایسا تمہارے ساتھ نصیبوں نے کیا ظلم کر دیا؟“ انہوں نے اچانک بڑی درومندی سے سوال کیا۔

”آپ کیا بتائیں، ہم نے اپنی اولاد جیسی بہو کے ساتھ کیا برا سلوک کیا ہے؟ وہ کیوں ہم سے برگشتہ رہتی ہے؟“ ان کے سوال سے شمس بیگم ٹھک کر رہ گئیں۔ انہیں اپنا آپ چور محسوس ہونے لگا۔ مگر نائمہ بیگم ان کے احساسات سے بے خبر بہتی چلی گئیں۔

”ضرور ہم سے کوئی بہت بڑی خطا ہوئی ہے شمسہ آپ..... ہم سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے جس کی سزا ہمیں اس شکل میں مل رہی ہے، خدا کے لیے ہمیں مشکل سے نجات دلائیں۔“ شمس بیگم نے ہمت کر

کے پوچھا۔

”آخر کیا ہے تمہارے دماغ میں؟ کھل کر بتاؤ تو سمجھ میں آئے؟“ وہ کسی سوچ سے ہلکا کر بولیں۔

”آپا! ہم نے ایک دن محصور سے پوچھا تھا وہ کہہ رہی تھیں کہ اپنی ڈاکٹر شاگرہ سے اس لڑکی کا پتا معلوم ہو سکتا ہے جو بچوں کو پڑھانے یہاں آیا کرتی تھی۔“ ان کے آنسو اب تک متواتر بہہ رہے تھے، خوشامد سے بولیں۔

”آپا! آپ اس سے ملوا دیں ہمیں، ہم نے اسے بہت بری طرح جھڑکا تھا بلکہ گائیاں بکی تھیں، ضرور اس محصور کا صبر پڑ رہا ہے ہم پر..... ہمارا صبر و قرار لٹ کر رہ گیا ہے۔“

شمس بیگم کے دل کی کلی کھل گئی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ انہوں نے دل کھول کر انہیں بولنے دیا۔ جب وہ بول، بول کر تھک گئیں تو انہوں نے کمال بے نیازی سے جواب دیا۔

”اگر تمہارے دکھوں کی درماں وہی لڑکی ہے تو اس سے مل لینا کوئی مشکل ہے؟ ہم اپنی سی کوشش کریں گے..... مگر.....“ انہوں نے بات کو دانستہ ادھوری چھوڑ دیا۔

”مگر.....؟ مگر کیا.....؟ کہیں اس لڑکی کی شادی تو نہیں ہو گئی؟“

شمس بیگم نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور دل میں سوچا۔

”تو یہ..... اس انداز سے سوچ رہی ہیں؟“ پھر لاطعلقی سے ہاں میں ہاں ملائی۔

”ہو سکتا ہے شادی ہو گئی ہو مگر تمہیں کیا فکر اس کی شادی کی.....؟“

”پھر..... ہمارے خاور کا کیا بنے گا؟“ نائمہ بیگم نے جیسے کسی چوٹ سے ہلکا کر بے اختیار کہا۔

تیر ٹھک نشانے پر لگا تھا۔ شمس بیگم پُر اسراریت سے مسکرائے لگیں۔

عین اسی وقت ریشم، مکرم کے لیے پانی کا فیڈر



1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

پھلپھری

قابل علاج مرض ہے

تمام جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

اجمل زیدی کے دور و دیبا کے طور پر مسٹر پیرونگ

ملٹی  
ایوارڈ  
بولڈر



ASIAN EXCELLENCE  
PERFORMANCE AWARD



AWARD OF  
BEST ACHIEVEMENT

اسلام آباد

9- اپریل 30ء مئی  
9- اگست 30ء ستمبر  
9- اکتوبر 30ء جنوری  
ملٹی ایوارڈ بولڈر  
0300-8566188  
2261836



AWARD  
PILLAR OF LEUCODERMA

لاہور

پشاور

گل ف سیٹر  
16 ستمبر  
14- فروری 27ء فروری  
14- جون 27ء جون  
14- اکتوبر 27ء اکتوبر  
0300-8566188

پیشانی لیسٹر  
14- فروری 27ء فروری  
14- جون 27ء جون  
14- اکتوبر 27ء اکتوبر  
0300-8566188

ملتان

کراچی

پیشانی لیسٹر  
12- مارچ 27ء مارچ  
28- جولائی 6ء اگست  
28- نومبر 7ء دسمبر  
0300-8566188

پیشانی لیسٹر  
13- مارچ 27ء مارچ  
13- جولائی 27ء جولائی  
13- نومبر 27ء نومبر  
0300-8566188

Email: syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

بھی چکی ہیں۔

اور اسی رات کو..... روٹی کے کمرے میں روٹی، معصومہ، باہر اور خاور کے قہقہے گونج رہے تھے۔  
"خاور..... پھولی جان نے بھی کیسے، کیسے پاؤں بیٹے ہیں تم لوگوں کے لیے..... ساری زندگی ان کے احسان مند رہنا۔" باہر بولے۔

"لیکن..... بھالی جان..... ایہ سب تو ٹھیک ہے مگر اب آپ اماں جان کو کس طرح منائیں گی؟ ان کا دل آپ کی طرف سے تو واقعی بہت ٹوٹ چکا ہے..... انہیں بھلا کیا معلوم..... آپ انہیں دولت مندوں سے متفر کرنے کے لیے کہیں، کیا اور کیسے، کیسے ڈھونڈ رہا رہی تھیں۔" معصومہ فکر مندی سے گویا ہوئی۔

"اس بات سے تم بے فکر رہو، خاور اور شرمین کا کل رشتہ پکا ہوتے ہی میں انہیں تمام حقیقت سے خود آگاہ کر دوں گی۔" روٹی نے شوخی سے جواب دیا۔ مسکراتے ہوئے خاور نے مارے خوشی کے آگے بڑھ کر روٹی کو شانوں سے پکڑ کر پورے کمرے میں ایک زور دار چکر دے ڈالا۔ اس وقت ان کا چہرہ اندرونی مسرتوں کا آئینہ دار ہو رہا تھا۔ دفعتاً باہر ان دونوں کے درمیان آتے ہوئے شرارت سے بولے۔

"ارے ڈاکٹر صاحب..... ذرا اپنی خوشیوں میں ہماری خوشی کا بھی خیال رکھیے..... احتیاط لازم ہے۔" سب لوگ حیرت سے انہیں دیکھنے لگے۔ وہ مسکرا کر بولے۔

"انری ڈاکٹر صاحب..... آپ جلد ہی چچا بننے والے ہیں، اور یہی خوشخبری سنا کر ہم اماں جان کو منائیں گے۔"

ان سب سے دور دروازے کے قریب خرم اور ریشم..... ہاتھوں میں ہاتھ لیے کھڑے سب کی شرارت دیکھ اور سن رہے تھے، مسکرا رہے تھے اور ان دونوں کا جنگل کا پھول اپنی داوی جان کی گود میں لینا کھلکھلا رہا تھا۔

ختم شد

لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔

اسے دیکھ کر نائٹ بیگم نے اپنے بچے آنسو پونچھ لیے اور نند سے سرکوشی میں بولیں۔

"آبا! یہ بھی کسی کی اولاد ہے اور اب کسی کی بہو بھی..... جس قدر خوش بخت ہے وہ ساس اور بیٹا، جس کی یہ بہو اور بیوی ہے۔" قریب آ کر اس نے دیکھا مکرم، نائٹ بیگم کے کندھے سے لگے، لگے سو گیا تھا۔ ریشم نے اسے سہولت سے وہیں مسمیٰ پر لٹا دیا۔

شمس بیگم نے ریشم کا ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا اور بولیں۔  
"آج تو ہماری آپا تمہاری بہت تعریف کر رہی ہیں۔" نائٹ بیگم نے برملا اقرار کیا۔

"ہاں یہ ہے ہی تعریف کے قابل، نہ میرا اس سے رشتہ تاتا۔ مگر روز میری خدمت پر کمر بستہ رہتی ہے، کبھی سر میں تیل ڈال رہی ہے، کبھی پٹیا گوندھ رہی ہے، سچ کہا ہے کسی نے گدڑی میں لعل ہوتے ہیں، یہ چلی جائے گی تو بہت یاد آئے گی۔"

شمس بیگم نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی۔ سر پر گویا کفن باندھ کر بولیں۔

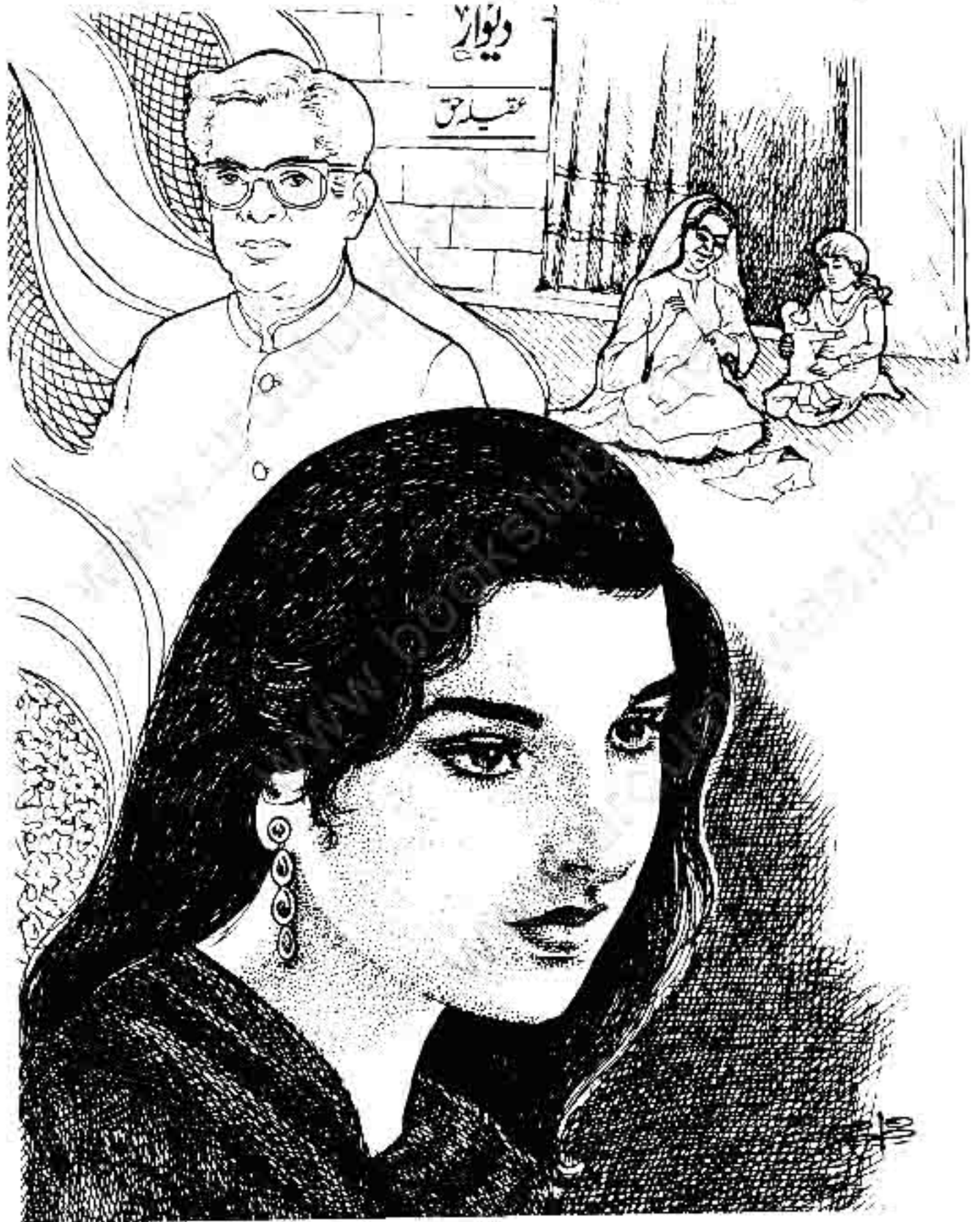
"چلی کیوں جائے گی۔ تمہاری اصلی بہو ہے تھی رکھوائے پاس..... اے بائے۔ یہ خرم کی دلہن ہے، رحمت علی خان دراصل متین احمد کے دوست تھے، مرتے دم اپنی بیٹی متین احمد کے سپرد کی اور خرم سے نکاح کر گئے تھے۔" شمس بیگم نے سچ جھوٹ ملا کر پوری کہانی سنا ڈالی۔ پھر منس کر اضافہ کیا۔

"اور تمہاری وہ ہونے والی بہو شرمین بھی کہیں نہیں گئی۔ انشاء اللہ کل ہی سب کے ساتھ خاور کا رشتہ لے کر جاؤں گی۔" نائٹ بیگم جو آنکھیں پھاڑے ریشم کو دیکھے جا رہی تھیں۔ بے اختیار ہانپیں پھیلا کر بڑھیں اور اسے گلے سے چمٹالیا۔ انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ کب اور کن حالات میں خرم نے بیاہ بھی رچا ڈالا تھا۔ شاید اس سے آگے انہوں نے کچھ نہیں سوچا کہ شمس بیگم کون، کون سی کہانیاں سنا

دروازے پر دستک مسلسل ہو رہی تھی.....  
 دستک کے دوران ٹھنڈائی ہوئی سرگوشی ابھرتی.....  
 اور سرگوشی کے ساتھ دستک تیز ہو جاتی..... دستک  
 دینے والا تھک نہیں رہا تھا۔ وہ واپس جانے کے لیے  
 نہیں آیا تھا۔ دستک اب دھڑ دھڑاہٹ میں اور  
 سرگوشی غراہٹ میں تبدیل ہو گئی تھی۔  
 بوسیدہ دیواروں والے اس کمرے میں، بچے  
 ہوئے دروازے کی کٹڑی لگائے، چٹنی چڑھائے،

دیوار

عقید حق



خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھتی..... دیوار سے لگی، اپنے آپ میں ٹکٹی، وہ کپکپا رہی تھی۔ کسی بھی لمحے دروازہ ٹوٹ سکتا تھا۔

بے بسی اور خوف اس کے کمزور وجود کے گرد اپنا گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ آنسو اس کے چہرے سے ہوتے ہوئے اس کے گریبان میں چھپ کر دبائیں مار رہے تھے۔

پناہ اور پناہ گاہ کا فرق اسے رُلا رہا تھا۔

اس کا دل چاہا اپنے سینے میں کوئی تنجر اتار لے ایک دم اس کی نظر کونے میں رکھے ہوئے عین کے صندوق پر پڑی۔ وہ ایک غیر مرئی قوت کے تحت اس صندوق کی طرف بڑھی اور بے تاب سے دھنسن کھولتے ہی۔ بے قراری سے صندوق کے اندر ہاتھ مارنے لگی جیسے کچھ دھونڈ رہی ہو اور پھر

☆ ☆ ☆

”تو کیوں اس قدر مار کھاتی ہے..... اس ہذا حرام اور ناشکی مرد کو ٹھوکر مارا اور میرے پاس آ جا.....“ مسز احمد نے بختاں کے جسم پر جہ بجانٹیل اور زخمیوں کے نشانات دیکھ کر ہمدردی اور غصے کے مے چلے جذبات کے ساتھ کہا۔

”میں نے حاجی صاحب کو بتایا تھا کہ تیرا میاں اس قدر ظلم کرتا ہے ان کو بھی بہت افسوس ہوا۔ کہنے لگے کہ اللہ رحم کرنے والوں کو، صلہ رحمی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اس بچی سے کہنا..... ہمارے گھر کے دروازے کسی مظلوم کو پناہ دیتے کے لیے ہر دقت کھلے ہیں۔“ مسز احمد نے اپنے شوہر حاجی احمد علی کے بارے میں بتایا جسے سن کر عقیدت و احترام سے اس کا سر جھٹکا چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

مسز احمد کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں، ان کے سب بچوں کی شادیاں ہو گئی تھیں اور وہ سب امریکا میں سیٹل تھے۔... برسوں اپنی مصروفیات کی

وجہ سے ماں، باپ سے ملنے نہ آتے تھے۔ مسز احمد اور حاجی احمد علی تنہا تھے۔ حاجی احمد علی کا زیادہ تر وقت مسجد اور رفاہی کاموں میں گزارتا۔... مسز احمد تنہائی کی ماری ہوئی عورت تھیں۔... اور بختاں ان کی قابل بھروسہ ملازمہ۔ ایک ایسی ملازمہ جس پر وہ آنکھ بند کر کے بھروسہ کرتی تھیں۔

آج کل کے دور میں با اعتماد ملازمہ اللہ کی نعمت ہوتے ہیں۔ اور مسز احمد دل سے چاہتی تھیں کہ بختاں رات دن کے لیے ان کے پاس رہ جائے تاکہ وہ گھر کی طرف سے بے فکر ہو کر..... اللہ کی طرف لگ جاویں۔ لیکن بختاں

☆ ☆ ☆

”تجھے آج پھر دیر ہو گئی۔ بتا کہاں رک گئی تھی۔“ اس نے شکی نظروں سے اسے دیکھا۔

”بتاناں چپ کیوں ہے؟“ شید سے نے اس کی لمبی چوٹی کو اپنے ہاتھ میں لپیٹ کر ایک زوردار جھٹکا دے کر پوچھا۔

بختاں علی الصبح جب شیدا گھری نیند میں مدہوش ہوا کام پر نکل جاتی۔ تسلیم کا لونی سے..... خیاں صابنک وہ پیدل ہی جاتی تھی..... اور پھر تین بنگلوں میں کام

بڑے گھر والوں کے چھوٹے پن کو سہتے، سہتے..... شام تک وہ نڈھال ہو جاتی۔ جو کبھی کوئی باجی بچا ہوا سالن، رات کی روٹی، بچا کھچا فروٹ دیتی تو ایک دو کام وہ ایکسٹرا کروا لیتیں..... اور بختاں سو گھی دو روٹیوں کے لیے مزید دو گھنٹے کام میں جُست جاتی۔

آج بھی شام والی باجی نے سارا کام منسوا کر اس سے کہا کہ وہ رات کی بچی ہوئی بریانی لے جائے لیکن ہاتھ کے ہاتھ ریفریجریٹر ضرور صاف کر دے..... ایک پلیٹ بغیر بوٹی کی بریانی اور تین باسی نان کے لیے اس نے بیگم ارشد کا ڈبل ڈور کا



لات مارتے ہوئے بولا۔۔۔ اور اس کی پھٹی چادر کے کونے میں بندھے نوٹ کھول کر گننے لگا۔

☆☆☆

بختاں کی شادی شیدے سے اپنے باپ کے وٹے پر ہوئی تھی۔ اس کے باپ کا دل گاؤں کی خوب صورت عورت پر آیا تو اس نے سولہ سالہ بختاں کو وٹے میں اس کے چالیس سالہ بھائی کو تھما دیا۔

باپ پر عشق سوار تھا۔ سو اس نے بختاں کی ماں کے مرنے کے صرف ایک ہفتے بعد ہی بختاں کو شیدے کے ساتھ بیاہ دیا اور خود اس عورت کو بیاہ لایا جس کے لیے اس نے اپنی بیوی کو انتہائی سختیوں سے مار ڈالا تھا۔ باپ اپنی من چاہی بیوی کے غرے اٹھانے میں مصروف ہو گیا اور وہ شیدے کی ماریں کھانے لگی۔

شیدائشی ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا حرام بھی تھا۔ لہذا پہلے زیور، برتن کے پھر نوبت فاقوں سے ہوتی ہوئی بھیک مانگنے تک آگئی۔۔۔۔۔ تو وہ کراچی چلی آئی۔ نہ جانے کتنے برس ہو گئے نہ وہ کبھی واپس گاؤں گئی نہ ہی کوئی کبھی گاؤں سے اس کی خبر گیری کو آیا۔ یوں وہ باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم ہو گئی۔ قسمت کی مار ایسی کہ اولاد بھی نہ ہوئی۔ لیکن ہاں یہ ضرور ہوا کہ شیدا چھوٹی موٹی برائیوں کو چھوڑ کر شہر کی بڑی لعنتوں میں گرفتار ہو گیا۔

☆☆☆

”اللہ کرے تو مر جائے شیدے۔۔۔۔۔ تجھے کوڑھ ٹپکے۔۔۔۔۔ تو بس کے نیچے آئے۔۔۔۔۔ تیرے ہاتھ پیر گل گل کر گریں۔۔۔۔۔ ارے اتنے ہم دھماکے ہوتے ہیں تو کبھی ہم دھماکے میں کیوں نہیں مر جاتا۔ روز لوگ سڑکوں پر مرتے ہیں تو کیوں کسی سڑک پر نہیں مر جاتا۔ نشہ، شراب، جوا اور اب طوائفوں کے گوشے پر بھی جانے لگا۔ اے میرے مالک۔۔۔۔۔! میں نے آج تک کوئی خوشی نہیں دیکھی تو مجھے زندگی میں ایک خوشی

ریفریکٹری جو اللہ کی نعمتوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے میں صاف کیا اور اس دوران وہ اللہ کی تقسیم پر حیران بھی ہوتی رہی اور صبر بھی کرتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ شیدا غصے میں پاگل ہو رہا ہوگا۔۔۔۔۔ اسے یقین تھا کہ آج وہ اس کو دھنک کر رکھ دے گا۔۔۔۔۔ لیکن وہ کیا کر سکتی تھی۔

کٹے بالوں اور گوری رنگت والی، پڑھی لکھی ماڈرن سی باجی اندر سے بہت سخت گیر تھی۔ ایک سیکنڈ میں کسی غریب کو کیسا بے مول کر دیتی ہیں۔۔۔۔۔ وہ جانتی بھی تھی اور سہتی بھی تھی۔

”باجی آپ مجھے میں روپے دے دیں۔“ بختاں نے نرم صوفے میں دھنسی، کاجو کھائی مسز ارشد سے منٹا تے ہوئے کہا۔

”کیوں۔۔۔۔۔؟“ مسز ارشد جو تھوڑی دیر پہلے غریب اور مظلوم عورتوں کے ایک ادارے کا افتتاح کر کے آئی تھیں۔۔۔۔۔ نے کھر درے لہجے میں پوچھا۔ ”باجی دیر بہت ہو گئی۔۔۔۔۔ شیدا مارے گا۔“ اس کی مجبوری نے الفاظ کا روپ دھارا۔

”ایک تو بھی تم لوگ اور تمہارے مسئلے۔۔۔۔۔ یہ تو کبھی ختم نہیں ہوتے۔۔۔۔۔ ہمارے پاس کون سے درخت لگے ہوئے ہیں۔ بہت محنت کرتے ہیں ہم لوگ بھی خیر۔۔۔۔۔“ مسز ارشد نے ایک طویل سانس لے کر اپنے پیر نرم و دبیز اٹالین قالین پر رکھے۔

”تم ذرا کولڈ کریم سے پہلے میرے پیروں کا مساج کر دو۔“ مسز ارشد نے اپنے ایمپورنڈ ہینڈ بیگ میں سے بیس کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے ایک کام اور بتایا۔

اور بختاں ذہنی طور پر شیدے کی لاتیں اور گھونٹے کھانے کے لیے تیار ہو گئی۔

”کھانا دے۔۔۔۔۔ یا اب گھٹنے پھرتا ہوں کرتی رہے گی۔“ شیدا جب مارتے، مارتے تھک گیا تو کونے میں گھڑی کی طرح پڑی بختاں کے پیٹ پر

جی کی بات کائی۔

”ہاں مرد جیسا بھی ہے..... اس کی قدر کرو۔“ ملائی جی نے جھنگا سی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بختاں کو سمجھایا۔

”ملائی جی آپ نہیں جانتیں۔ وہ مجھے مارتا ہے، پیٹتا ہے، گندی گندیاں گالیاں دیتا ہے..... میرے پیسے چھین لیتا ہے۔ میرے.....“ کہتے کہتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”میں سب جانتی ہوں دیوار سے دیوار ملی ہے..... میں سب سنتی ہوں بیٹا..... میں بیس سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی۔ مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے، وہ سائبان جس کا نام مرد ہے..... شوہر ہے۔ اس کے بغیر عورت کیسے کڑکتے موسم میں جلتی دھوپ میں ننگے سر اور ننگے پیر کھڑی رہ جاتی ہے۔ اس مرد کی گندی نگاہ کو بھی برداشت کرنی ہے جس کے بارے میں وہ تصور بھی نہیں کر سکتی..... ارے میری بیٹی..... اسے کونسنے کے بجائے اس کے راہ راست پر آنے کی دعا کیا کرو۔“

”آپ نہیں جانتیں ملائی جی..... وہ بہت بے غیرت ہے۔ وہ کبھی نہیں سدھرے گا..... وہ کیا میری حفاظت کرے گا۔ ارے وہ تو خود کسی دن مجھے جوئے میں ہار جائے گا۔ مجھے بچا ڈالے گا۔“ وہ سسک رہی تھی۔

”دنیا کا ہر مرد اس سے اچھا ہوگا..... بہتر ہوگا۔ ارے اس کبخت سے جان چھونے گی تو میں بھی چند دن خوشی اور عزت سے گزار لوں گی۔“ ملائی جی اسے کیا سمجھا رہی تھیں پر بختاں سن سب رہی تھی اس کی تو اپنی سوچوں کے گھوڑے دوڑ رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

بیس بائیس سال کا سن گندی رنگت..... پانچ فٹ سے ٹھکنا قد، متناسب بدن، کمر پر جھولتی لمبی ریشمی سیاہ چوٹی.....

”یہ کون ہے گدڑی میں لعل.....“ بچہ ارشد

دے، دے..... تو اس شیدے کو اٹھالے تو اس سے میرا بچھا چھڑا دے۔“ عورت جو نشی مرد کے جوتے کھا کر بھی سرتاج، سرتاج کی رٹ لگائے رکھتی ہے، آج اتنی بے کس و مجبور ہوئی کہ اس کے منہ سے اپنے ہی سرتاج کے لیے بددعا میں نکلنے لگیں۔

”بس کرو بختاں کتنی دیر سے تو اپنی زبان خراب کیے جا رہی ہے۔“ شیدا ابھی بختاں کو اچھی طرح مار پیٹ کر اس کی تنخواہ چھین کر یاہر گیا تھا اور اب محکم میں بیٹھی بختاں سینہ کو بلی کر رہی تھی۔ ملائی جی کی آواز پر وہ یک دم جیسے خاموش ہو گئی۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد جب اسے شیدے کی گالیاں یاد آئیں تو وہ پھر سے رونے لگی اور ہاتھ اٹھا کر اسے پھر کوسنے لگی۔

”پھر..... شروع ہو گئی تو..... میں منع کر رہی ہوں ہاں..... بختاں.....“ ملائی جی نے محبت سے اس کے بھرے بال سمیٹتے ہوئے اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ارے ملائی جی..... آپ اللہ کی نیک بندی ہو..... نماز پڑھتی ہو..... قرآن پڑھتی ہو..... آپ یہاں بیٹھو.....“ بختاں کو روتے، روتے خیال آیا کہ ملائی جی اپنے سفید براق کپڑوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ کچے فرش پر ہی آ بیٹھی ہیں..... اس نے جلدی سے انہیں موڑھا نکال کر دیا۔ اس کی محبت اور مصومیت پر ایک لمحے کے لیے ملائی جی کے چہرے پر ایک خوب صورت مسکراہٹ رہ گئی۔

”اتنی محبت کرنے والی بختاں کسی کو کوس بھی سکتی ہے؟“ ملائی جی نے اس سے محبت بھرے انداز میں سوال کیا۔

”بیٹا مرد جیسا بھی ہو..... عورت کے لیے سائبان ہوتا ہے۔ مجازی خدا ہوتا ہے۔ اس کی عزت و آبرو کا رکھوالا ہوتا ہے۔ اپنے مرد کی قدر کرو.....“

”ایسے مرد کی قدر کرو؟“ بختاں نے ملائی

آرام سے مان جائے گا یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

ارشاد صاحب کی حرکتیں اب اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ دو روٹیوں اور ایک جوڑے کپڑے کے لیے اپنی عزت کا سودا کرنے والوں میں سے نہیں تھی۔ وہ دل سے چاہتی

صاحب نے معمولی کپڑوں میں ملبوس ڈسٹنگ کرتی ملازمہ کو دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے سوال کیا۔

”بجٹاں صاحب کے لیے ناشتا لگاؤ۔۔۔۔۔“ مسز ارشد نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”بجٹاں، اچھا تو یہ بجٹاں ہے۔۔۔۔۔“ ارشد صاحب کی رال پگیا۔

غور سے اس نے ایک صفت اللہ نے ایسی رکھی ہے کہ ہزار کے مجمع میں بھی اگر کوئی شخص اس کی طرف دیکھ رہا ہو تو اس کی نظر جا کر اسی پر ٹھہرے گی۔ اور جس نظر سے دیکھ رہا ہے اس کے اندر آرام سا بچنے لگتا ہے۔ اور اس کے اندر بھی آرام سا بچ گیا۔ اس نے سینے پر اپنا پھنسا ہوا دوپٹا پھیلا لیا۔ اور پھر سارا دن وہ ارشد صاحب کے گھر میں ان کی ہوس بھری نظروں سے بچنے کی کوشش کرتی رہی۔

☆ ☆ ☆

”نہیں باجی اللہ کا شکر ہے۔ مجھے ضرورت نہیں ہے۔“ بجٹاں نے آرام سے کپڑوں کا شاپر واپس کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں تم رکھو۔۔۔ ارشد بہت صاف ستھری طبیعت کے مالک ہیں، انہیں گھن آتی ہے۔ گندئی۔۔۔۔۔ وہ تمہیں دیکھ کر ناراض ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ تم کپڑے رکھ لو اور کل سے نہ دھو کر صاف ستھرے کپڑے ہی پہن کر آنا۔“ مسز ارشد نے زبردستی اپنے پرانے سوٹ بجٹاں کو تھماتے ہوئے حتمی انداز میں کہا۔

مسز ارشد کافی کھلے گریبان اور تنگ فٹنگ کی کی قمیص پہنتی تھیں اور اس کی آرن میں بجٹاں کو اپنا آپ چھپانا مشکل ہو جاتا۔

☆ ☆ ☆

”شیدے تو کوئی کام کیوں نہیں کر لیتا۔“ آج جب بجٹاں کو شیدے کا موڈ روز کی نسبت قدرے بہتر لگا تو اس نے ڈرتے، ڈرتے اس سے کہا۔

”کام۔۔۔۔۔ چل کر لیتا ہوں۔۔۔۔۔“ شیدا اتنے

**قارئین متوجہ ہوں**



کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔

بجٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ **یک سال کا نام پتھان پتھان پتھان**

☆ **شہر اور علاقہ کا نام**

☆ **مکمل پتہ اور رابطہ کی معلومات کے لیے**

**رابطہ اور مزید معلومات کے لیے**

**فون نمبر**

**03012454188**

**جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز**

**سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگشت**

**ت-63 فیروز ٹرسٹیشن وینس اسٹریٹ، کراچی**

**35802552-35386783-35804200**

**ای میل: jdpgroup@hotmail.com**

تھی گو کہ اس کو یقین تھا کہ شیدائیں مانے گا لیکن پھر بھی، وہ چاہتی تھی کہ شیدا کوئی کام کر لے تو وہ پہلی فرصت میں مسز ارشد کے گھر کا کام چھوڑ ڈالے۔  
 ”اچھا تو کام کرے گا؟“ بختاں کی آواز خوشی سے کپکپائی۔ ”کیا کام کرے گا؟“ وہ بے قرار تھی۔  
 ”جو تو کہے.....“ شیدے نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماری۔

”تو ایسا کر ٹھیلہ لگا لے.....“

”کیا مطلب.....؟“

”ہاں..... ہاں ٹھیلہ لگا لے..... ہر مال دس، دس روپے کا۔“

شیداء بختاں کی خوشی پر بے ساختہ ہنس دیا۔  
 ”ہنس مت شیدے، آج میں بہت خوش ہوں۔“  
 ”لیکن بختاں ٹھیلہ لگانے کے لیے پیسہ کہاں سے آئے گا۔“ شیدے نے سب سے اہم نکتہ اٹھایا۔  
 ”تو فکر مت کر شیدے..... وو ڈھائی ہزار روپے میرے پاس جمع پڑے ہیں باقی کے لیے میں اپنی اکلوتی بالیاں بیچ دوں گی.....“ بختاں نے ٹوٹے صندوق کی تہ سے مڑے مڑے دس اور بیس کے نوٹ ڈھائی ہزار کی شکل میں اور اپنی ماں کی واحد نشانی سونے کی بالیاں شیدے کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا اور شیداء سے دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

”واقعی ملانی جی صحیح کہتی ہیں، شیداء اتنا بھی برا نہیں ہے۔ اب وہ کام کرے گا اور میں صبح جاتے ہی مسز ارشد کو منع کروں گی کہ بیگم صاحب کسی اور کو رکھ لو اور اپنے میاں کو رہی سے باندھ کر رکھو.....“  
 بختاں نے نیاز کے لیے آئے کے گلے بناتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

وہ بہت خوش تھی..... اور شیداء.....

☆☆☆

”تم ہماری بیٹی کی طرح ہو..... تم بہارے پاس

رہو..... یہاں تم کو کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“ حاجی صاحب نے روتی ہلکتی..... ہراساں سی بختاں کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔  
 وہ مغرب کی نماز پڑھنے جا رہے تھے تو بختاں اپنے کپڑوں کا صندوق لے کر مسز احمد کے پاس چلی آئی اور جب حاجی احمد علی نے اس کی دکھ بھری داستان سنی تو فوراً ہی اسے رہنے کی اجازت دے دی۔

حاجی احمد علی نے اسے سختی سے منع کر دیا کہ اب اسے کہیں کام کرنے کی ضرورت نہیں..... بس وہ ان کے گھر کے کام کرے اور اس کی وہ تنخواہ جو تین گھروں سے اس کو ملتی ہے وہ اس کو دے دیں گے۔

☆☆☆

”کہا ہو گیا تھا آپ کو..... اتنی تنخواہ دینے کی کیا ضرورت تھی.....“ رات کو جب عشا کی نماز کے بعد بختاں اپنے کوارٹر میں چلی گئی تو مسز احمد نے حاجی صاحب کو ٹوکا۔

”ارے بیگم کیا ہر وقت حساب کتاب کی بات کرتی ہیں کچھ چیزیں صدقہ سمجھ کر کر دیا کریں..... غریب، مظلوم بد حال اور پریشان عورت ہے۔ ہم پر کیا فرق پڑتا ہے اگر 1000 یا 500 زیادہ دے دیں گے..... اور آپ کو بھی تو سہولت ہوگی..... گھر سنبھالنے کے لیے ذلت دار عورت مل گئی اور آپ کا اکیلا پن بھی کسی حد تک کم ہو جائے گا، حاجی احمد علی نے آرام سے بیوی کو سمجھایا تو وہ خاموش ہو گئیں..... کہ بات تو بالکل صحیح تھی.....“

☆☆☆

کیا موبجیں ہو رہی ہیں شیدے بھائی کی.....“ اللہ دتہ نے گھٹیا شراب اپنے اندر اٹھیلے شیدے کو چھیڑا۔

”کس کا موبائل چھینا ہے یا کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے۔“ اختر نے اپنے پیلے، پیلے دانت نکالے۔

”اوائے باؤلوں..... پرس اور موبائل تم چھینو،



## ماں

میری ماں.....!  
تیری نظریں دعاؤں کی طرح  
گھیرے میں لیے رہتی تھیں مجھے  
تیری زورور ہستی سے شام و سحر  
ضیا پاتی تھی میری ہستی  
میں تیری الفت کے کھلونوں سے بہنے والی  
میں جو اٹھلا کے اڑی پھرتی تھی  
تیری شفقت کی رداؤں میں چھپائے خود کو  
پھر اچانک ہی میری ماں! ہر ماں کی طرح  
وہی قصہ ازل کا دہرایا تو نے  
اپنے ہاتھوں سے کڑے ہجر کا قصہ لکھا  
اپنی پکوں میں چھپا کر آنسو  
مجھ کو دہلی میں بٹھایا تو نے  
میں اپنے نئے گھر میں تجھے کھوجتی تھی  
بہت یاد کرتی تھی میری ماں..... میں تجھے شام و سحر  
جب تیری خوشبو گلشن کی صبا لاتی تھی  
تیری ممتا کی مہک آنگن میں اتر آتی تھی  
میری ماں! کئی بار کڑے ہجر میں سنبھالا مجھ کو دیا  
تیری ہستی نے سہارا میری دنیا کو دیا  
ایک جا نغز احساس میرے ساتھ تو تھا  
مگر اب تیری ہستی کو تراشوں کیسے؟  
میں تجھے جنت کی حوروں میں تلاشوں کیسے؟  
تو نے میری دنیا کو اپنی ضیاء سے محروم کیا  
کڑے ہجر کو، پیاسے صحرا کو مقدر کر کے  
کیا پاتا تھا تو یوں چلی جائے گی  
مجھے تیری دعاؤں کی ضرورت پہلے سے  
کہیں زیادہ ہے  
میری ماں.....!

شاعرہ: نیر رانی شفق، ڈی جی خان

میرے تو گھر میں گنگا بہتی ہے۔ یہ تو میری بیوی نے  
دیے ہیں سالی کہہ رہی تھی محنت کرو..... ٹھیلالگاؤ.....  
گدھی کہیں کی۔" شیدے نے زمین پر تھوکا۔

"اوائے خیر..... میرا یہ..... اتنے روپے دو  
کر بیٹھا ہے اور یا ر موج نہ اڑا میں۔ یہ تو ظلم ہے  
بھئی..... چل پھر آج بانی کا گانا سنتے ہیں۔" ارشد بھی  
باچھیں پونچھتا اٹھ آیا۔

شیدے نے ان سب کو ایک تختیر آمیز نظر سے  
دیکھا اور پھر اپنی مونچھوں کو تار دیتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"ہانی کے پاس صرف گانا سننے جاتے ہو تم  
لوگ؟" شیدے نے ان سب کو گھر کا۔

اور پھر ان کی کھیالی ہنسی میں شیدے کا قبضہ  
بھی شامل ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

"تجھ پر خدا کی مہربانی..... اللہ کرے تو سرحدے  
منوس..... تیرے ساتھ رہنے سے بہتر ہے میں اکیلی  
رہوں، تجھے نہیں پا لوں گی اب تیرے اور میرے  
راتے الگ ہوئے..... یا اللہ تو اسے اٹھالے  
اس منی کے ذخیر کو..... جو صرف مجھے دکھ دیتا  
ہے تکلیف دیتا ہے۔ یا اللہ اس کی زندگی  
میرے لیے صرف تکلیف کا باعث ہے..... یا اللہ تو تو  
اپنے بندوں کو ان کی بہت سے زیادہ دکھ  
نہیں دیتا..... مجھے اس دکھ سے نجات دے  
وے..... اس کمبخت کو اٹھا لے۔" وہ ہلک رہی تھی۔

"کتنا خوش تھی میں..... کہ یہ کام کرے گا۔  
ہائے میرے اللہ میری جمع پونجی اور میری ماں کا واحد  
نشان بھی طوائف کے کوٹھے پر لٹا آیا۔ یہ بے  
غیرت..... یہ بدنصیب....."

نشے میں دھت پڑے شیدے کو بچاں نے  
نفرت سے دیکھا اور اللہ سے فریاد کرتی رہی۔

☆ ☆ ☆

"اللہ کا شکر ہے میں اب سکون سے ہوں۔ یہ

الگ بات ہے کہ سارا دن گھر میں کام کرتے کرتے میری ہڈیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ لیکن حاجی صاحب..... اور باجی دونوں ہی میرا..... اتنا خیال رکھتے ہیں کہ تھکن، تھکن نہیں لگتی۔ اب تو انشاء اللہ میں مرتے دم تک شیدے کی شکل بھی نہیں دیکھوں گی۔ آج بھی حاجی صاحب کتنی محبت سے کہہ رہے تھے..... بس اب بختاں بیٹیں رہے گی..... ہماری بیٹی کی طرح..... اللہ حاجی صاحب کو لمبی زندگی دے۔ ”وہ کوارٹر میں بیٹھی اپنے صاحب کے لیے دعائیں کر رہی تھی کہ دستک ہوگی۔“

”بختاں دروازہ کھول۔“ دروازے پر ہلکی دستک کے ساتھ سرگوشی ابھری۔

”حاجی صاحب..... اس وقت.....؟“ بختاں نے حیرت سے گھڑی کی سوئیوں کو رات کے دو بجاتے دیکھ کر اپنے سے کہا۔

☆☆☆

”نہ جانے بختاں کہاں، کہاں کی تھوکریں کھا رہی ہوگی۔ بے وقوف کو کتنا سمجھایا تھا کہ اپنی چار دیواری کے باہر صرف بھیڑیے گوشت نوچنے کے لیے گھڑے ہیں۔ گھر سے نہ نکل۔ اپنا مرد جیسا بھی ہو۔ اپنا ہی ہوتا ہے۔ آج کل تو اللہ معاف کرے، سنگے رشتوں کا بھروسہ نہیں وہ نہ جانے کس پر بھروسہ کر بیٹھی ہے۔ یا اللہ اسے عقل دے۔ اسے سمجھ دے۔ میرے مالک اس کی عزت و آبرو کی حفاظت فرما۔ میرے مالک.....“ ملائی جی نے تہجد کے نفل پڑھ کر دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے تو روز کی طرح بختاں کے لیے دعا کرنا نہ بھولیں۔ اور تہجد کے وقت کی دعا بھی رد نہیں ہوتی۔ یہ تو ہم سب ہی جانتے ہیں۔

☆☆☆

”میری رانی..... میری جان..... بختاں دروازہ کھول۔ کہاں ہے تو..... اب صبر نہیں

ہوتا..... دروازہ کھول.....“ حاجی صاحب کی سرگوشیاں مسلسل بڑھ رہی تھیں۔

”حاجی صاحب..... آپ تو مجھے بیٹی کہتے تھے..... آپ میرے باپ کی جگہ ہیں..... اللہ کے واسطے واپس چلے جائیں۔“

بختاں کے لب خاموش تھے لیکن اس کا دل دہائیاں دے رہا تھا۔

”اری بچی، کوئی منہ بولا باپ اور بھائی نہیں ہوتے..... یہ سب غیر شرعی ہے۔“ ملائی جی کی ایک نصیحت عملی طور پر سامنے آئی۔

”دروازہ کھول بختاں.....“ حاجی صاحب کی سرگوشی غراہٹ میں بدل۔

”کم بخت..... کم نسل..... اپنے میاں کی نہیں..... تو ہماری کیا ہوگی..... اس میں سرخاب کے پر تھوڑی لگے تھے جو میں اسے اپنے گھر میں رکھتا اور اس کو اتنی زیادہ تنخواہ دیتا..... ارے اس کی جوانی نے تو مجھے اپنی جوانی یاد دلادی..... کیسا ٹھن کیسا روپ ہے اس کا.....“ حاجی صاحب کی سوچوں نے چور میں لپٹی بختاں کی عزت تار تار کر دی۔

☆☆☆

سزا احمد کسی شادی میں گئی ہوئی تھیں..... حاجی صاحب پر شیطانیت کا وہ غلبہ تھا کہ کسی بھی مجھے دروازہ ٹوٹ سکتا تھا۔

”نہیں، نہیں ایسی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ میں اپنے سینے میں خنجر مار لیتی ہوں لیکن ہائے..... شیدے تو کہاں ہے؟“

بختاں کو شیدا یا دایا..... چاہے نشئی تھا..... لیکن اگر اس وقت ہوتا کم از کم حاجی صاحب کی اتنی ہمت نہ ہوتی.....

”ہائے شیدے.....“ آنسو اس کے گالوں پر پھیلے۔

”رک جا۔ ہمیں میں دیکھتا ہوں۔“ وہ جو دروازہ کھونٹے کے لیے آگے بڑھی تو شیدے نے چنگ پر

سے اٹھتے ہوئے اسے روکا۔

”نہ جانے کون ہوگا..... ہر ایرے غیرے کے سامنے نہ آیا کر.....“ شیدے نے غرا کر کہا۔

”سارا دن تیرے میرے گھر میں کام کرتی ہوں اور اب تجھے خیال آیا ہے۔“ بختاں طنز یہ لمسی۔

”ہاں وہ الگ بات ہے.....! لیکن اس وقت

تو میرے گھر میں ہے..... اور میرے سامنے کوئی تجھ

کو نظر اٹھا کر دیکھے تو سارے کی آنکھیں نکال کر اس کی

ہتھیلی پر رکھ دوں گا۔“ شیدے نے دروازے کی

کنڈی کھولنے سے پہلے.... آنکھ کے اشارے سے

اسے اندر جانے کو کہا۔

”ادھر بڑا آیا..... رکھو!.....“ بختاں اپنے آپ

سے کہتی منہ بناتی گھر کے واحد کمرے میں چلی گئی۔

”بختاں دیکھ دروازہ کھول دے..... ورنہ تیرا

وہ حشر کروں گا کہ ساری دنیا دیکھے گی۔“ حاجی

صاحب کی دھمکی اسے حقیقت میں واپس لے آئی۔

اس نے ہلتے دروازے کو دیکھا..... اور پھر

صندوق میں تیزی سے ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگی۔

اور پھر اس کے ہاتھ میں موبائل آ گیا۔ وہ

موبائل جو اس نے اپنے باپ سے بات کرنے کے

لیے شیدے سے چھپا کر خریدا تھا۔

”کوئی پریشان کرے تو 15 پر نمبر ملا دیتا۔“

سزا احمد کی نصیحت یاد آئی وہ تیزی سے نمبر ملانے لگی۔

لیکن دوسری طرف کال ریسیو نہیں ہو رہی تھی۔

وہ بار بار نمبر ملا رہی تھی اور پھر کال ریسیو ہو گئی۔

”ہیلو..... شیدے میں بختاں..... تیری بختاں

مجھے آکر لے جا شیدے۔“ اس نے جلدی، جلدی

شیدے کو پتا چلتا تھا..... اور فون بند کر دیا۔ اصل میں

اس نے 15 پر کال ملا دی تھی..... شیدا اس کے لیے

کیا تھا آج کڑی دھوپ میں کھڑے ہو کر اسے اچھی

طرح احساس ہو گیا تھا۔

## ایک خوفزدہ ماں

### کے دل کی صدا

میرے بچے تجھے گھر سے نہ نکلنے دوں گی

مجھ میں ہمت نہیں ہے تجھے کھودینے کی

مجھ میں طاقت ہے کہاں تجھ سے

چھڑ جانے کی

میں نے پالا ہے تجھے خون جگر سے اپنے

ہنس کے جھیلنا ہے ہر دکھ تیرے سکھ کی

خاطر

تو میرے گلشن ہستی کا وہ گل ہے جس

سے

اپنی دنیا کو نکھارا ہے ہر اک پل میں نے

ہاں سکھائی تھی تجھے میں نے بلند پروازی

تیری ہمت کو بڑھایا تھا سدا میں نے ہی

اپنے ہیروں پہ کھڑا ہونا سکھایا تجھ کو

کب خبر تھی مجھے، دن ایسا بھی آئے گا

کبھی

اپنے آئین کی بہاروں میں خزاں کے

ڈرے

صرف گولی ہی سے کیا خود سے چھپاؤں

کی تجھے

گھر سے نکلا اور اگر آیا نہ واپس تو

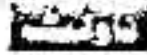
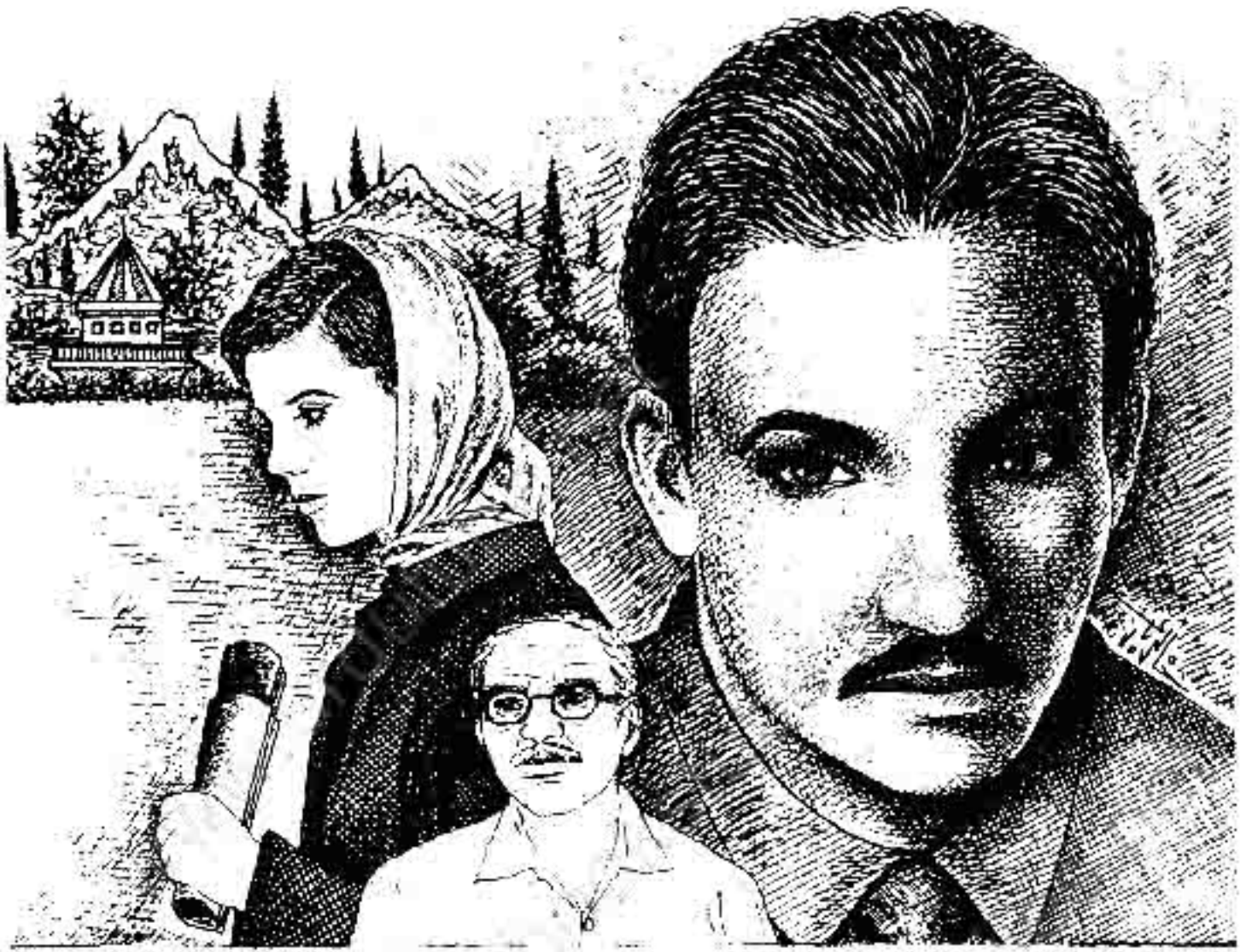
پھر.....؟

بس اسی خوف سے گھر میں ہی تجھے

رکھوں گی

میرے بچے تجھے گھر سے نہ نکلنے دوں گی

کلام: شائستہ زریں، کراچی



## چلو ہم سب ساتھ چلتے ہیں؟

صابر اکرم

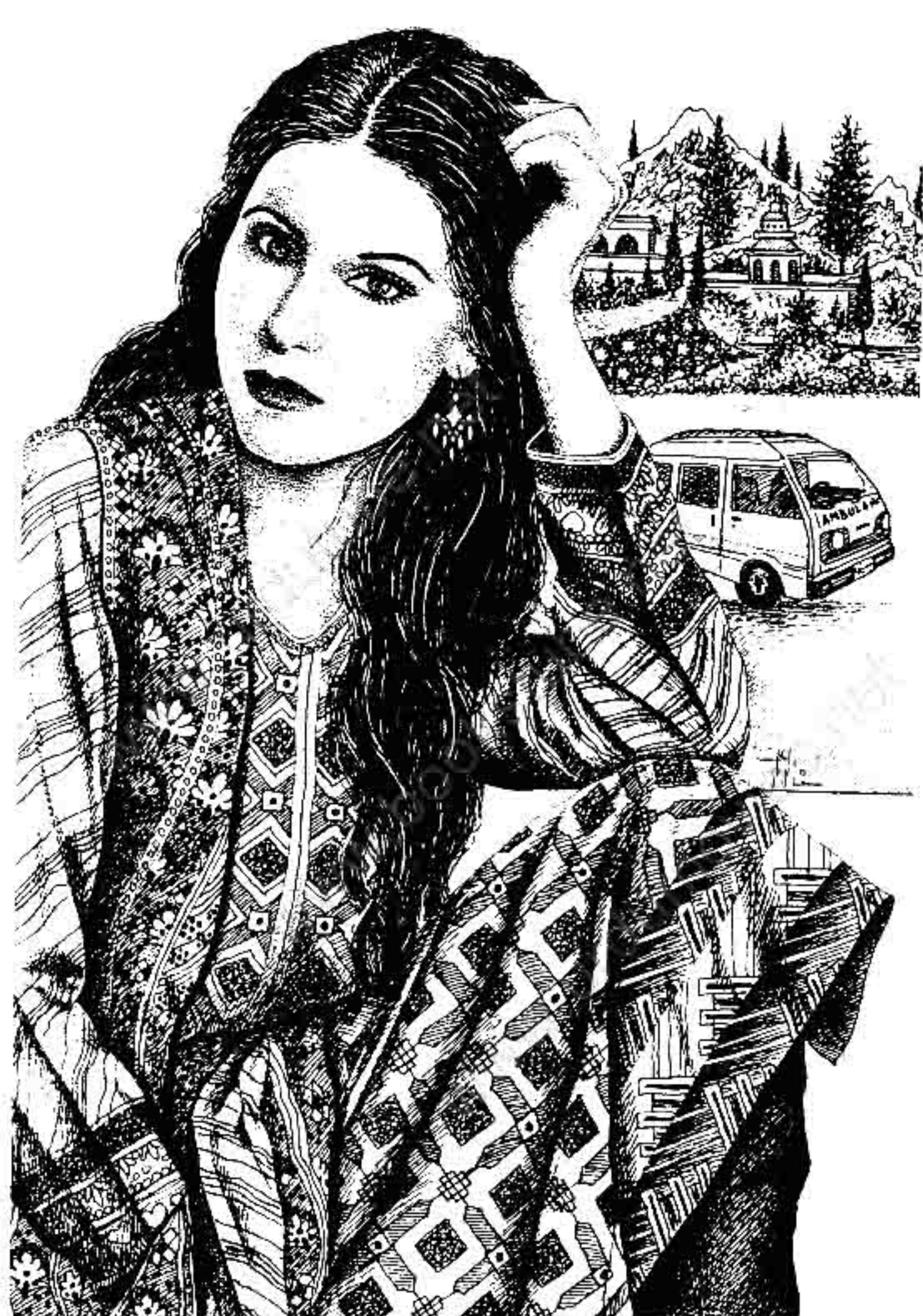
اسے ذرا بھی اس چیز کا احساس نہیں تھا۔  
”وہ خاصی ”پچی“ ہوئی چیز ہے، یہ ناچر لفظوں  
میں نہیں بتا سکتا۔۔۔۔۔“ عمو نے طنزیہ لہجہ میں کہہ کر لمبی  
سانس لی اور اضطراری کیفیت میں اپنے ماتھے کو دو

”آخر یہ چیز کیا ہے بھوہ خالہ۔۔۔۔۔؟“ احیان  
نے کچھ جھنجھلا کر ہاتھ میں پکڑا پیپر وٹ میز پر رکھا اور  
اپنے بزنس پارٹنر عمو کو دیکھا، جو پریشانی کی کیفیت میں  
اپنی ناپسندیدہ بلیک کافی کا دوسرا کپ پی رہا تھا اور

116 مابنامہ باکیزدہ۔ مئی 2015ء







انگیوں سے ملنے لگا۔ احیان نے کھا جانے والی نگاہوں سے اپنے بزنس پارٹنر کو دیکھا جس نے اتنی ایمر جیسی تافذ کی تھی کہ اسے اپنا چھ مہینوں کا امریکا کا ٹرپ مختصر کر کے تین ماہ میں واپس آنا پڑا۔ دونوں نے نیا، نیا ایما بزنس اشارت کیا تھا۔

”یار کچھ تو بتاؤ، آخر پتا تو چلے اس محترمہ کے بارے میں۔“ احیان کو اب عمار پر غصہ آنے لگا۔

”نیکسٹ پیجی پر عدالت میں جا کر دیکھ لینا، قد تو اس کا ساڑھے پانچ فٹ لیکن زبان پوری چھ فٹ لمبی ہے اور جب شالیمار ایکسپریس کی طرح چلتی ہے تو کہیں انجن بھی فیل نہیں ہوتا اس کم بخت کا۔“ عمار اپنی مخالف پارٹی کی وکیل پر بری طرح تپا ہوا تھا۔

”تو تم بھی کوئی ڈھنگ کا وکیل کر لیتے۔“ احیان نے منہ بنا کر مشورہ دیا۔

”تم نے اس مکار لڑکی کی فہمی کی طرح چلتی زبان نہیں دیکھی، ہمارے اچھے خاصے گھاگ وکیل کو کراہائے عدالت میں انگیوں پر پھاری ہے۔“ عمار بھل کر بولا۔

”اچھا مھکو کھوڑا ڈھونڈا ہے تم نے، جو فوراً ٹاپنے کو بھی تیار ہو جاتا ہے۔“ احیان کو عمار کے وکیل پر غصہ آیا۔

”یار قصور اس پچارے کا نہیں ہے، وہ آتی ہی اتنی تیاری کے ساتھ ہے۔“ عمار نے اپنے وکیل کی سائنڈل۔

”تو تم نے ایسا نالائق وکیل ہار ہی کیوں کیا، جو منہ اٹھا کر بغیر تیاری کے اپنا مذاق بنوانے آ جاتا ہے۔“ احیان کے پاس بھی ہر بات کا جواب تھا۔

”تو ٹھیک ہے تم ڈھونڈ لو، خود تو امریکا جا کر بیٹھ گئے۔“ عمار غصے میں بلیک کافی کا تیسرا کپ بنانے لگا۔

”میرا تو دماغ ہی کام نہیں کر رہا، کروڑوں کا معاملہ ہے یار، ڈیڈی تو قتل کر دیں گے مجھے۔“ احیان کو ایک اور خوف لاحق ہوا۔

”اور میرے پاپا تو ڈی چوک میں کھڑا کر کے ڈائریکٹ پھانسی دیں گے مجھے۔“ عمار جھنجھلا کر کھڑا ہوا۔

”کتنا منع کیا تھا ڈیڈی نے عینہہ بزنس کرنے سے۔“ احیان کو ساری چیزیں ایک، ایک کر کے یاد آنے لگیں۔

”اور مجھے تو پاپا نے کہا تھا انشاء اللہ روٹے ہوئے واپس آؤ گے۔“ عمار اب باقاعدہ آنکس میں ٹپلنے لگا۔

”معاف کرنا یار، تمہارے پاپا کی زبان خاصی ”کالی“ واقع ہوئی ہے۔“ احیان نے اپنے بیٹ فریڈ کو چرایا۔

”تمہارے ڈیڈی کی زبان سے جتنے پھول جھرتے ہیں، وہ بھی دیکھ رکھے ہیں میں نے۔“ عمار نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا جو رات ہی پاکستان پہنچا تھا۔ احیان نے اس کا طنز خاصے محل سے برداشت کیا اور قدرے شجیدگی سے پوچھا۔

”نیکسٹ پیجی کب ہے۔“

”نیکسٹ منڈے۔“ لیکن میں ہرگز نہیں جاؤں گا اپنا خون جلانے۔“ عمار پریشانی کے عالم میں ایک دفعہ پھر سیٹ پر بیٹھ کر کافی پینے لگا۔

☆ ☆ ☆

”تم لوگوں کو ضرورت ہی کیا تھی، اپنی ٹیکسٹری کے لیے وہ ممتاز زمین خریدنے کی۔“ اس دن وہ شام کو اپنا غم غلط کرنے والی کی اسٹڈی میں پہنچ گیا۔ جنہوں نے سارا قصہ سننے کے بعد آرام سے اپنا سگار لگایا لیکن اس سے زیادہ تو احیان غصے سے سلگ اٹھا۔

”آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے اس زمین پر سارے وارلوں کے بڑے، بڑے پوسٹرز لگے ہوئے تھے اور ہم حاضری رجسٹر اٹھا کر ون بائے ون سب کی اینڈنس لگاتے اور پھر آگے کارروائی کرتے۔“ وہ جل کر کھڑا ہوا اور اپنی چینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ٹپلنے لگا۔

والی نے مسکرا کر اپنے سب سے لاڈلے اور چھوٹے پوتے کو دیکھا جس کا بزنس اینڈسٹریشن کی ڈگری کے بعد پہلا تجربہ ہی خاصا تلخ واقع ہوا تھا۔ اس

پردہ مزید مشکوک ہوا۔

”کوئی خفیہ شادی وادی تو نہیں کر رہی آپ نے.....؟“ اس کے شکی لہجے پر داجی بے اختیار ہنسنے لگا۔

”مگر ہم اس کی عمر چوبیس پچیس سال ہوگی اور میری سب سے بڑی پوتی عمادہ اس وقت تیس سال کی ہے۔“

”لیکن.....؟“ وہ شش و پنج کا شکار ہوا۔

”تمہارا پراہلم حل ہو جائے گا۔ ہنڈرڈ پرسنٹ گارنٹی ہے۔“ داجی نے اسے مزید ناجائز دیا۔

”عماد بتا رہا تھا بہت اصول پسند ہے.....“ احیان نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

”کہا ناں کچھ نہیں کہے گی“ داجی اب پرسکون تھے۔

”پھنسوا مت دیجیے گا کسی چکر میں.....“ اس کا دل تو نہیں مان رہا تھا لیکن معاملہ کروڑوں کا تھا اس لیے اپنے دس کو ایک ساڈہ پر رکھ کر سوچنا ہی پڑا۔

اس کے داجی سید مختار علی شاہ کے دو بیٹے سجاد علی اور مراد علی تھے۔ بڑے بیٹے سجاد علی کی صرف ایک بیٹی عمادہ تھی جو شادی کے بعد لاہور میں مقیم تھی۔ جبکہ چھوٹے بیٹے مراد علی کے تین بیٹے حمزہ، بلال اور احیان تھے۔ جن میں حمزہ اور بلال شادی شدہ اور باپ کے ساتھ بزنس میں مکمل ہاتھ بٹا رہے تھے لیکن احیان کو شروع سے اپنی راہیں خود نکالنے کا شوق تھا اور وہ مراد صاحب کی مخالفت کے باوجود اپنے دادا کی مکمل حمایت کے ساتھ علیحدہ بزنس اپنے بہترین دوست عماد کے ساتھ شروع کر چکا تھا۔ لیڈر ٹیکسٹری کے لیے خریدی جانے والی زمین ان کے لیے وہ نوالہ بن چکی تھی جسے نہ وہ نگل سکتے تھے اور نہ اگل

سجاد علی اور مراد علی کی بیویاں آپس میں ملکی زمینیں تھیں اور شہر میں ایک پرائیویٹ انکلیش میڈیم اسکول بڑی کامیابی کے ساتھ چلا رہی تھیں۔ مراد علی کو اپنے سب سے چھوٹے بیٹے احیان سے کافی شکایتیں تھیں۔ وہ ضد کر کے پڑھنے کے لیے باہر گیا اور وہاں آ کر اپنا علیحدہ بزنس شروع کرنے کا اعلان کر کے اس

لیے تو اسے آج کل بات بے بات غصہ آ رہا تھا۔

”پھر بھی..... یہ آہستہ، آہستہ اس زمین کے اتنے وارث کہاں سے آگئے گئے.....“ داجی نے عینک کا میٹھ صاف کرتے ہوئے اسے مزید چڑایا۔

”ہمیں تو خود تب ہا چلا جب باقی وارثوں نے کیس کیا ہمارے اوپر.....“ اس نے منہ بنا کر مزید کہا۔

”اون میں تارے دکھا دیے ہیں انہوں نے ہمیں۔“

”اب اس مسئلے کا کوئی حل.....؟“ داجی کو تشویش لاحق ہوئی۔

”جو بھی حل نکالتے ہیں وہ فساد لڑکی، ایک منٹ میں اس کے بچے ادھیڑ دیتی ہے۔“ احیان سپ کر بولا۔

”کون لڑکی.....؟“ داجی حیران ہوئے۔

”مخالف پارٹی کی وکیل محترمہ ہسمہ خالد مغل صلاب.....“ احیان نے ایسے چبا چبا کر اس کا نام ڈھرایا، جیسے حقیقت میں اسے دانتوں سے چبا رہا ہو۔

”ہسمہ خالد مغل.....“ داجی بری طرح چونکے۔

”فاروق ایسوسی ایشن کے چیمبر میں بیٹھتی ہے ناں؟“

”آپ کیسے جانتے ہیں.....؟“ احیان کو حیرت کو جھٹکا لگا کیونکہ اسے علم تھا پچھلے دس سال سے داجی بزنس سے بالکل کٹ کر گھر تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔

”وہ ہی ہے ناں.....؟“ داجی کے لبوں پر ایک پراسرار سی مسکراہٹ ابھری۔

”ہاں..... ہاں سو فیصد وہی ہے۔ سو سٹ جونیر لیکن حد درجہ شارپ۔“

”تم ملے ہو اس سے.....؟“

”نہیں.....“

”تو جاؤ، جا کر ملو اس سے اور کہنا شاہ جی نے بھیجا ہے.....“ داجی کی بات پر اس نے الجھ کر انہیں دیکھا۔

”آگے سے اس نے پوچھ لیا کہ کون شاہ جی.....؟“

”نہیں پوچھے گی.....“ داجی اب کھل کر مسکرا رہے تھے۔ احیان کو ان کی ذہنی حالت پر کچھ شک ہوا۔

”ایک لفظ بھی نہیں پوچھے گی.....“ داجی کی بات



نے اپنے باپ اور تایا کو حیران کم اور پریشان زیادہ کر دیا تھا۔ دادا کی سپورٹ کی وجہ سے احیان کے اکثر مسائل آسانی سے حل ہو جاتے تھے لیکن متنازعہ زمین کے مسئلے نے دونوں دوستوں کی راتوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ دونوں ہی اپنے والدین سے یہ بات چھپائے ہوئے تھے اور اپنے طور پر حل کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔

☆☆☆

اس نے سرائی گھر سرخ اینٹوں سے بنی قدیم اور جدید امتزاج کی حامل عمارت کو سرسری سی نگاہ سے دیکھا۔ اس پانچ منزلہ عمارت کی دلکشی میں ایک محسوس کی جانے والی مسانت اور سنجیدگی تھی۔ اس کے سامنے لاش گرین گھاس اور پودوں سے آراستہ خوب صورت لان تھا جس کی کانٹ چھانٹ اور پودوں کی ترتیب سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ اس نے ایک توصلی نگاہ لان پر ڈالی.... اس کی سلور ہنڈ اسوک اب اس بلڈنگ میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کے داخلی دروازے کے پاس ایک خاص ترتیب میں سفید سنگ مرمر کے گملے رکھے گئے تھے جس نے ارد گرد کے ماحول کی خوب صورتی کو دگننا کر دیا تھا۔ لان کے انتہائی بائیں طرف وسیع و عریض پارکنگ تھی۔ جہاں اس وقت ایک اینڈ ہونے کی وجہ سے گاڑیوں کی تعداد خاصی کم تھی۔

احیان نے انتہائی سنجیدگی سے اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا۔ باہر نکل کر چھٹی سیٹ کا دروازہ کھول کر اپنا لیپ ٹاپ والا بیگ اور اس کے اوپر رکھا چشمہ اٹھا۔ اس کے چہرے پر دنیا جہان کی اکٹاہٹ تھی۔ کسی ناپسندیدہ شخصیت سے ملاقات کا تصور جتنا بیزار کن ہوتا ہے اس سے کئی گنا بیزاری احیان کے چہرے پر فیک رہی تھی۔

بلیک کمر کے انٹکس سوٹ میں اس کا قد خاصا لمبا اور شخصیت میں محسوس کی جانے والی بے نیازی تھی۔ باہر نکلتے ہی اس نے آنکھوں پر سلور کمر کا چشمہ لگایا اور

بریف کیس اٹھا کر گاڑی کو لاک کیا۔ سفید سنگ مرمر کی روش پر بیزاری سے چلتے ہوئے وہ اس عمارت کی طرف بڑھا۔ گھاس وال کا بنا دروازہ اندر کی جانب دھکیل کر وہ جیسے ہی عمارت میں داخل ہوا اسے سی کی خوشگوار خنڈک میں کسی دلغریب ایئر فریشر نے اس کا استقبال کیا۔

رہنمون پر لڑکی نے اس ڈشنگ پرسن لٹی کے حامل شخص کو اندر آتے دیکھا تو فوراً ایکٹو ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر بڑی پروفیشنل قسم کی مسکراہٹ پھیلی۔ وہ اب سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”قاروق ایسوی ایس کا آفس کس فلور پر ہے؟“ وہ وہاں پہلی دفعہ آیا تھا۔

”قاروق فلور پر رائٹ کارڈر میں.....“ اس نے مسکرا کر اس کی رہنمائی کی۔

”آپ کو وہاں کس سے ملنا ہے؟“ اس لڑکی نے بڑے خوشگوار انداز سے پوچھا۔

”ایڈووکیٹ ہسمہ خالد سے.....“ وہ سپاٹ سے انداز میں کہہ کر لفٹ کی جانب بڑھ گیا۔

”بہت ہی روڈ بندہ ہے.....“ رہنمون پر موجود لڑکی نے براہ راست بتاتے ہوئے سوچا اور اپنے کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”واہ..... احیان مراد اب تم پر یہ وقت بھی آتا تھا۔“ لفٹ میں سوار ہو کر اس نے خود کو کوسا۔

”دھیان سے جانا، ہسمہ خالد بولتے ہوئے کسی کا لحاظ ذرا کم ہی کرتی ہے.....“ لفٹ سے باہر نکلتے ہوئے اسے اپنے بزنس پارٹنر عمار کی بات یاد آئی تو دل میں کوفت کا احساس مزید بھر گیا۔

قطار میں بنے ہوئے آفسز پر ناموں کی تختیاں پڑھتے ہوئے وہ قاروق ایسوی ایس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ وہ یہاں آتا نہیں چاہتا تھا لیکن آچکا تھا۔ جیسے ہی وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا کاؤنٹر پر موجود خاتون رہنمون نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ سامنے ایک اور کارڈر تھا، جہاں دائیں بائیں



فارل انداز سے گفتگو کا آغاز کیا۔  
”نو ٹھیکس.....“ احیان نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

”جی فرمائیں آپ کسی کیس کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں؟“ ہسمہ نے ہلکے پھلکے انداز سے پوچھا تو احیان کو اپنے پارنر کی ساری باتیں مبالغہ آرائی پر مشتمل لگنے لگیں جو اس نے اس معصوم سی لڑکی کے بارے میں پھیلا رکھی تھیں۔

”میں آپ سے کسی نیوکیس کے سلسلے میں بات کرنے نہیں آیا۔“ اس نے سنبھل کر بات کا آغاز کیا۔  
”میرا تعلق انارگروپ آف کینیزر سے ہے.....“ اس بات پر وہ زبردست انداز سے چونکی اور اس کا چہرہ ہلکا سا تناؤ کا شکار ہوا۔

”دیکھیں اگر آپ اس متنازعہ زمین کے کیس کے بارے میں بات کرنے آئے ہیں تو آئی ایم سو سو ری آپ ہمارے کلائنٹ نہیں ہیں۔“ اس نے بے رخی کے سارے ریکارڈ ایک لمحے میں توڑے۔ احیان کا چہرہ خفت کے گہرے احساس سے سرخ ہوا۔ اسے پہلی دفعہ اندازہ ہوا اتنے معصوم چہرے کے پیچھے کتنی خطرناک زبان چھپی ہوئی ہے۔

”میں اس موضوع پر بات کرنے ہرگز..... نہیں آیا.....“ اس نے بے مشکل محل بھرے انداز سے کہا۔  
”پھر.....؟“ اس کا انداز سراسر اہلکار تو جین آمیز لگا۔

”مجھے شاہ جی نے آپ کے پاس بھیجا ہے.....“ اس نے اپنی جیب سے وہ طلسم نکال کر اس پر پھونک دی دیا جس کے بارے میں واجی کا خیال تھا کہ سامے دروازے کھل جاسم سم کی طرح کھلتے جائیں گے۔

”کیا.....؟“ ہسمہ کو شاک لگا۔ اس نے سخت تعجب اور بے یقینی سے اس کی جانب دیکھا۔ جس نے گویا کمرے میں صور پھونک دیا ہو۔

”آپ کو شاہ جی نے بھیجا ہے؟“ اس نے بڑی سرعت سے خود کو سنبھالا۔ اب اس کے لہجہ میں ترشی کے

چھوٹے چھوٹے آفسز بنے ہوئے تھے یہ سب اس جیسیر میں بیٹھنے والے ایڈووکیٹس کی پرائیویسی کے خیال سے بنائے گئے تھے۔ سامنے ایک میٹنگ ہال تھا۔

”ہسمہ خالد کا آفس کہاں ہے؟“ اس کے سنجیدہ سے انداز پر اس نے دائیں کارڈور کی طرف اشارہ کیا۔ وہ فوراً اس سائڈ پر مڑا تو پہلے ہی دروازے پر اس کا نام دیکھ کر اس نے ہلکا سا ٹک کیا اور اندر داخل ہوا۔ سامنے ایک نازک سی یگ لڑکی کو دیکھ کر اسے جھٹکا سا لگا۔

”یہ چھناٹک بھر لڑکی بھی کسی کو ٹاکوں چنے چوڑا سکتی ہے؟“ اس کے ذہن میں پہلی سوچ یہی ابھری تھی۔  
”مجھے ایڈووکیٹ ہسمہ صاحبہ سے ملنا تھا.....“ احیان کے لیے اتنی کم عمر وکیل کو ہضم کرنا مشکل ہو رہا تھا اس لیے اس نے اپنی تسلی کرنے کے لیے پوچھ ہی لیا۔  
”جی میں ہی ہوں ہسمہ.....“ اس نے لیپ ٹاپ سے نظر ہٹا کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”مجھے احیان مراد کہتے ہیں، میں نے کل ریپشن پر بارہ بجے اپنا نمسٹ کے لیے اپنا نام لکھوایا تھا.....“ اس نے وال کلاک پر ایک نظر ڈال کر اسے بتایا۔

”اوہ یس.....“ اس نے ہلکا سا ہاتھ اپنی پیشانی پر مار کر اپنی یادداشت کو کوسا اور جلدی سے میز پر رکھا اپنا چشمہ ٹشو سے صاف کرنے لگی۔

”آئی ایم سو ری میرے ذہن سے ہی نکل گیا.....“ اس نے چشمہ لگاتے ہوئے سنجیدگی سے وضاحت دی تو احیان کو محسوس ہوا کہ گلاسز کی وجہ سے وہ اب اتنی بھی کم عمر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جتنی گلاسز کے بغیر لگتی تھی۔

”افس اوکے.....“ اس نے بھی فارل انداز میں کہہ کر اس کے آفس کا انیٹریز پر دیکھا۔ جس میں سفید اور گرے رنگ نمایاں تھا۔ اس کی سیٹ کے پیچھے ایک دیوار گیر شیشے کی الماری تھی جو قانون کی مولی، مولی کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔

”چائے لیں گے یا کافی.....؟“ اس نے بڑے

بجائے نرمی اور نظروں میں تلخی کے بجائے عقیدت تھی۔  
 ”جی۔ آپ کو کوئی شک ہے تو ان کو کال کر کے پوچھ سکتی ہیں۔“ احیان کو اس کے یوں گرمی کی طرح رنگ بدلنے پر حیرت ہوئی۔

”میرے پاس ان کا کوئی کاٹلیٹ نمبر نہیں ہے۔“ اس کے جواب نے اب احیان کو حیران کیا۔ جدوہ ایک لمحے کے توقف کے بعد گویا ہوئی۔

”ان کا اسٹار گروپ آف کینیڈا سے کیا تعلق ہے؟“ وہ اب حقیقتاً پریشان دکھائی دے رہی تھی۔  
 ”ان کا نہیں میرا تعلق ہے۔“ احیان کے منہ سے پھسلا۔

”آپ کا ان کے ساتھ کیا ریلیشن ہے۔۔۔؟“ اس نے بے چینی سے پہلو بدل کر پوچھا۔  
 ”میرے گریڈ فادر ہیں وہ۔۔۔۔۔“ احیان کی بات پر اس کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی۔

”اوہ آئی ایم سوری۔۔۔۔۔“ وہ بہ مشکل مسکرائی۔  
 ”میرے خیال میں ہمیں اب اس کیس پر بات کر لینی چاہیے۔ میں کیا سیلپ کر سکتی ہوں آپ کی؟“ وہ فوراً اٹھی اور دیوار میں ایک تریب سے بٹے میٹس میں سے ایک فائل نکال کر لے آئی۔

”میں نے آپ سے کہا تھا ناں، میں اس کیس پر بات کرنے نہیں آیا۔۔۔۔۔“ گیند اب احیان کے کورٹ میں تھی، اس نے بڑی مہارت سے سے شارٹ لگایا اور کھڑا ہو گیا۔ بسم نے حیرانی سے اس شخص کو دیکھا۔ جبکہ اس کے چہرے کی حیرانی اور بوکھلاہٹ احیان کو لطف دے رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ کاش عماد بھی اس کے ساتھ ہوتا اور اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھتا تو شاید اس کی اتنے دنوں کی اذیت میں کمی آ جاتی۔

”بیٹھ جائیں، مجھے اندازہ ہو چکا ہے، شاہ جی نے آپ کو میرے پاس کیوں بھیجا ہے؟“ وہ اب بڑے پُر اعتماد انداز سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”کس وجہ سے بھیجا ہے۔۔۔؟“ احیان نے

سراسر اسے چڑایا۔

”یہی کہ مجھے اس کیس پر نظر ثانی کرنی چاہیے اور جس حد تک ہو سکے آپ کی کمپنی کے لیے نرم گوشہ رکھنا چاہیے۔“ وہ اب مسکراتے ہوئے اس کا سکون درہم برہم کر رہی تھی۔

”ایسا کچھ نہیں ہے۔۔۔۔۔“ احیان نے نظریں چرائیں۔  
 ”جھوٹ بولنے کے بھی کچھ آداب ہوا کرتے ہیں۔ جن میں سر فہرست قد مقابل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا ہے۔“ اس کا طنزیہ لہجہ احیان کو سلگ گیا۔

”جی۔۔۔۔۔ اس کا عملی مظاہرہ تو آپ اکثر کورٹ میں کرتی ہوں گی، اسی جھوٹ پر ہی تو آپ کی روزی روٹی کا انحصار ہے۔“ حساب برابر کرتے ہی وہ آفس سے گولی کی طرح نکلا اور بسمہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

☆☆☆

”یار نہیں تمہارے داہنی کا اس کی والدہ کے ساتھ ماضی میں کوئی انفیر تو نہیں چترا رہا۔۔۔۔۔؟“ عماد نے فرائڈ رائس اپنی پلیٹ میں نکالتے ہوئے شرارت سے کہا۔ وہ دونوں اس وقت میریٹ میں موجود تھے اور احیان اسے سارا قصہ سنا چکا تھا۔

”تمہیں وہ اتنی اچھی لگتی ہے جو اپنی والدہ کے کسی پرانے عاشق کا نام سنتے ہی اپنے سارے اصول بدل ڈالے؟“ احیان نے برا سامنے بتایا۔

”پھر مجھے تو یہ بات ہضم نہیں ہو رہی، پوچھو ناں داہنی سے۔“ عماد کا تجسس عروج پر تھا۔

”ہا تو ہے تمہیں داہنی کا۔۔۔۔۔ جو بات نہ بتائی ہو، جتنا مرضی دیوار سے سر پھوڑ لو نہیں بتاتے۔“ احیان نے اسے یاد دلایا تو وہ مسکرا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا۔

”کچھ بھی ہے یار، اب مجھے کچھ تسلی ہے، معاملہ منڈل ہو جائے گا۔“ عماد نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہوتا بھی چاہیے۔۔۔۔۔ اس زمین کے معاملے میں دھوکا تو ہمارے ساتھ بھی ہوا ہے، ہمیں کون سا پتا

ہیں۔" عماد نے اس کے دو بڑے بھائیوں کا نام لے کر یاد دلایا۔

"مجھے پسند نہیں، میں اپنے مل بوتے پر کچھ کرنا چاہتا ہوں۔" احیان کے زعمی گزرنے کے اپنے اصول تھے۔

"ویسے اس ملاقات کا کوئی اثر بھی ہوگا یا اس زمین سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔" عماد کا ذہن اب بھی اسی کہیں میں الجھا ہوا تھا۔

"اللہ بہتر جانتا ہے۔ ہم نے بھی تو کروڑوں کا سودا اندھوں کی طرح کر لیا۔ کسی سے مشورہ تک کرنا مناسب نہیں سمجھا۔" احیان کو آج کل اپنے اوپر کچھ زیادہ ہی غصہ آرہا تھا۔

اس کی بات پر عماد نے فوراً تائید کرنے کے لیے اثبات میں سر ہلایا۔

"ایکسکیوز می! آپ عماد ورائی ہیں ناں۔؟" ہسمہ کی آواز پر وہ دونوں ایک دم چونکے، وہ ہاتھیں کب ان کے سر پر پہنچی، انہیں گفتگو کے دوران احساس ہی نہیں ہوا۔ اس وقت رائل بیو سوٹ میں اس کی شفاف رنگت دمک رہی تھی۔

"ہیس..... مس ہسمہ..... ہو آ سیٹ پلیز....." عماد بوکھلا کر کھڑا ہوا۔

"نو پراجیکٹس.....! مجھے سید بھٹی علی شاہ صاحب کا نمبر چاہیے تھا۔" وہ دیکھ احیان کی طرف لیکن مخاطب عماد سے تھی۔ احیان اس وقت بے نیازی کے سارے ریکارڈ توڑتے ہوئے بڑے آرام سے کھانا۔ کھانے میں مگن تھا۔

"جی ضرور....." عماد نے جلدی سے اپنے سیل فون سے ان کا نمبر دیکھ کر اسے دکھوایا۔

"پراجیکٹس....." وہ مسکراتے ہوئے خاصی دلکش لگتی تھی، احیان کو پہلی دفعہ احساس ہوا۔

"یار تم نے ایک دفعہ بھی اسے بیٹھنے کو نہیں کہا۔ اپنی کینٹس اور سمیز زبھی کسی چیز کا نام ہیں....." وہ جیسے ہی وہاں سے گئی عماد، احیان پر برس پڑا۔

تھا۔" احیان نے رشمن سلاو پلیٹ میں نکالتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ ہسمہ خالد ہی ہے ناں، فاروق صاحب کے ساتھ....." عماد کھانا کھاتے ہوئے ایک دم چونکا۔

"کہیں اس بابے نے کوئی لائن تو فٹ نہیں کر رکھی، اس لڑکی کے ساتھ....." احیان نے اس کی نظروں کے تعاقب میں مڑ کر دیکھا۔ ہسمہ مسکراتے ہوئے ساٹھ سالہ فاروق احمد کے ساتھ اسی ہوٹل کے ہال میں ایک ریزرو ٹیبل کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"نہیں یار..... اس ٹاپ کی نہیں ہے وہ۔" عماد نے فوراً ہی تردید کی۔

"وہ نہ سہی، فاروق احمد تو ہوسکتا ہے ناں....." احیان شرارت سے مسکرایا۔

"یار سب جانتے ہیں اس نے ہسمہ کو اپنی بیٹی بنا رکھا ہے، اس کی بیٹی کی کلاس فیلو تو تھی یہ، ورنہ فاروق احمد کہاں کسی نئے ویل کو گھاس ڈالتا ہے۔" عماد کی معلومات مکمل تھیں۔

"تم نے بڑا ریسرچ ورک کر رکھا ہے اس زبان وراز پر۔" احیان ہنسا۔

"تم تو امریکا میں جا کر بیٹھے ہوئے تھے، یہاں سب کو مشافہت میں ہی دے رہا تھا۔ تم نے اس کی کورٹ میں چلتی زبان نہیں دیکھی۔" عماد کو ایک پرانا زخم یاد آیا۔ "فیس ٹوفیس بات کرنے میں وہ جتنی 'سٹگین' لگتی ہے، تمہیں اس کا اندازہ نہیں۔" احیان نے منجورین پیٹ میں نکالتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"ویسے وہ جتنی ذہین اور حسین ہے۔ یہ دونوں خوبیاں کسی بھی عورت کو مردوں کے لیے واقعی سٹگین بنا سکتی ہیں۔" عماد اب کھل کر ہنسا۔

"ہاتھیں ڈنڈی نے اتنا بڑا بزنس کیسے سنبھالا ہوا ہے، یہاں تو سر منڈاتے ہی او لے پڑ رہے ہیں....."

احیان کا پہلا ہی بحر بہت تھا۔

"تو کس نے کہا تھا ایڈونچر کرنے کو، جزرہ اور بلال بھائی بھی تو انکل کے ساتھ ہی بزنس کر رہے

”ہاں تو تمیز اسے ہونی چاہیے، میرے دادا کا نمبر وہ تم سے مانگ رہی ہے.....“ احیان چڑ کر بولا تو عمار کو فحشی آگئی۔

”اچھا تو اصل دکھ تمہیں اس بات کا ہے.....“ عمار اب تسلی سے سویٹ ڈش پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ جبکہ احیان نے کھا جانے والی نظروں سے اپنے اس بہترین دوست کو دیکھا اور بیزاری سے سر جھٹک کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”ویسے نمبر کس لیے لیا ہے اس نے؟.....“ عمار ہلکا سا پریشان ہوا۔

”اللہ بہتر جانتا ہے.....“ احیان نے مسکرا کر جواب دیا۔

”جا کر واجی سے پوچھنا ضرور.....“ عمار کی سولی دہیں اٹکی ہوئی تھی۔

”جی جناب ضرور، جو حکم سرکار کا.....“ احیان نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا اور کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆

”جھینکس گاؤ.....“ پراہلم حل ہو گئی۔ ”وہ جیسے ہی آفس میں داخل ہوا، عمار نے پُر جوش انداز میں اسے اطلاع دی۔

”وہ کیسے؟.....“ وہ سخت حیران ہوا۔

”ہاشمی صاحب آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ دوسری پارٹی مصالحت کے لیے تیار ہو گئی ہے، ہمیں اپنی مصحف واپس مل جائے گی۔“ عمار نے ہچکچاتا سے اچھی خبر سنائی تھی۔

”لیکن یہ سب کیسے ہوا؟“

”ایڈووکیٹ ہمد آج ہاشمی صاحب کے جمیر آئی تھی، اپنے موکل کے ساتھ۔“

”پھر؟.....“ احیان کو یقین نہیں آیا۔

”ہمیں اپنی مصحف واپس مل جائے گی، باقی

اس زمین کے مالکان آپس میں جو بھی طے کریں یہ ان کا معاملہ ہے۔“ عمار نے تفصیلاً بتایا۔

”جھینکس گاؤ.....“ احیان کو پورے تین ماہ بعد

اپنے اعصاب پر سکون ہوتے محسوس ہوئے۔ ”مجھے واجی کو خود یہ خبر سنانی چاہیے۔“ وہ فوراً اپنی گاڑی کی چابی اٹھا کر نکلا۔

جیسے ہی اس کی گاڑی ”مجتبیٰ کالج“ کے سامنے پہنچی۔ مین گیٹ کھلا اور اندر سے ایک سلور گرے سوئفٹ گاڑی نکلی۔ جسے ہمد ڈرائیو کر رہی تھی۔ احیان کو اسے دیکھ کر حیرت کا جھونکا لگا۔ ہمد نے ایک سرسری نگاہ اس پر ڈالی اور اپنی گاڑی نکال کر لے گئی۔

”یہ محترمہ کس سے ملنے آئی تھیں؟.....“ اس نے اپنی گاڑی ایک منٹ کے لیے گیٹ پر روکی اور چوکیدار سے پوچھا۔

”بڑے صاحب سے۔“ چوکیدار نے منودبانہ انداز سے جواب دیا۔

”کب آئی تھیں؟.....“ احیان نے حیرانی سے دریافت کیا۔

”دو گھنٹے پہلے۔“ چوکیدار کے جواب نے اسے مزید حیران کیا۔

”اوکے۔“ اس نے ہلکا سا سر کو خم دیا اور گاڑی پورج کی طرف لے گیا۔

”وہ دو گھنٹے واجی سے کیا باتیں کرنے آئی تھی؟.....“ وہ یہی سوچتا ہوا واجی کے کمرے میں پہنچ گیا۔

”عشق کا شین“ پڑھنے میں مگن تھے۔ اس کے سوال کو انہوں نے بے پروائی سے سنا اور اس سے بھی زیادہ بے پروائی سے جواب دیا۔

”کہاناں، ویسے ہی ملنے آئی تھی.....“ واجی کی بات پر وہ جھنجھلا اٹھا۔

”واجی.....“ آپ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں؟“

اس نے ہلکا سا چڑ کر جواب دیا۔ اس گھر میں وہی تھا جو انہیں اس لہجہ میں جواب دے سکتا تھا اور نہ تو مجتبیٰ علی شاہ کے دونوں بیٹوں اور ان کی آل اولاد کو ان کے سامنے بے تکلفی سے بھی بات کرنے کی جرات نہیں ہوئی تھی۔

”سمجھنے کی کیا بات ہے، وہ تو تم ہو.....“ واجی



ایڈیٹر ایک ہی سیشن میں بھگتا دیتی تھیں۔  
 ”یہ فیضان صاحب کا وہی پوتا ہے ناں جو اسکول  
 میں احیان کا گلاس فیلو تھا.....؟“ حاجی نے یونہی بات  
 بدھانے کو کہا۔ جبکہ احیان منہ بتاتے ہوئے اپنے سیل  
 فون پر کسی کو فیکس کرنے لگا۔ مسز مراد ان کی اسٹڈی کا  
 تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے چومکس۔

”جی..... جی وہی.....“ انہوں نے تائید میں سر  
 ہلایا۔ ”یہ گلشن آپ کی اسٹڈی کی ڈھنگ سے صفائی  
 نہیں کرتی ہو کیسے ذرا کونے میں جالا لگا ہوا ہے۔“  
 ”تم جالوں کو چھوڑو، اس تالاق کے لیے کوئی  
 لڑکی ڈھونڈو، کب تک یونہی پھرتا رہے گا.....“ حاجی  
 کے شرارتی انداز پر احیان نے کوفت سے پہلو بدلا۔

”لڑکی سے مجھے یاد آیا۔ کچھ دیر پہلے بڑی پیاری  
 سی لڑکی پورچ کی طرف جا رہی تھی، میں نے اپنے

نے مسکراتے ہوئے کتاب بند کی۔ ”تم پوچھنا کیا  
 چاہتے ہو؟“

”آپ اس لڑکی کو کیسے جانتے ہیں.....؟“ وہ  
 ناراضی سے گویا ہوا۔

”میرے ایک دوست کی بیٹی ہے.....“ انہوں  
 نے صاف اسے بہلایا۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا.....“ احیان نے فوراً  
 ہی ان کی بات کو مسترد کیا۔ ”اس کی جتنی عمر ہے اس  
 لحاظ سے آپ اس کے دادا یا نانا کے دوست تو ہو سکتے  
 ہیں۔ اس کے قادر کے نہیں..... احیان کی دلیل پر حاجی  
 نے بے ساختہ سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ ہمیشہ کی طرح انہیں  
 لا جواب کر چکا تھا۔

”احیان کیوں پریشان کر رہے ہو مجھے.....؟“  
 حاجی ہلکا سا جھنجھلائے۔

”میں پریشان کر رہا ہوں یا آپ.....؟“ اس  
 نے شکایتی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

”تمہارے کیس کا فیصلہ تمہارے حق میں ہو  
 گیا، پس بات ختم؟“ انہوں نے اسے پھر سے بہلانا چاہا۔  
 ”ختم کہاں.....؟“ ابھی تو شروع ہوئی ہے، پلیز  
 بتائیں ناں۔“ وہ ضد پر اتر آیا۔ اس سے پہلے حاجی کوئی  
 اور بہانہ بتاتے ان کی اسٹڈی کا دروازہ کھلا۔

”بابا، شام میں فیضان صاحب کے پوتے کا  
 ولیمہ ہے، آپ کو بہت اصرار کر کے بلایا ہے انہوں  
 نے.....“ مسز مراد کی اچانک آمد نے احیان کو  
 جھنجھلاہٹ میں مبتلا کیا جبکہ حاجی کے حلق سے بڑی  
 پرسکون سانس خارج ہوئی۔

”مئی کو بھی ابھی آتا تھا.....“ احیان ان کو سلام  
 کرتے ہوئے جی بھر کر دل ہی دل میں کوفت کا شکار ہوا۔  
 ”شکر ہے بہو، تم نے یاد دلادیا، ورنہ میرے تو  
 ذہن میں ہی نہیں تھا.....“ حاجی نے مسکرا کر اپنی چھوٹی  
 بہو کو دیکھا۔ جو کم، کم ہی ان کے پورشن کو رونق بخشی  
 تھیں لیکن جب کبھی آ جاتیں تو پھر دو کھٹے سے پہلے  
 جانے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ سارے معاملات، خانہ دانی

## رات کا مسافر

منی کے ٹکڑے میں سیشن کے آخری صفحات پر

قارئین کے محبوب قلم کار  
 طاہر جاوید مغل کا نیا شاہکار

جذبات کے بھنور میں الجھے ایک نوجوان  
 کی سرکشی، جس کے پیروں میں ایک  
 وعے کی زنجیر سے نکلنے نہ دیتی تھی.....  
 رنگین و سنگین پڑاؤ کی دربار داستان

الگ مسجد بنا کر بیٹھ جائے، اچھا خاصا اپنے باپ کا چلن  
ہوا بزنس چھوڑ کر خود بخود بے کرنے بیٹھ گیا ہے۔“  
”پتا تو ہے تمہیں اس کے مزاج کا، سب بچوں  
سے مختلف ہے۔“ دامی کے لہجے میں احیان کے  
لیے محبت ہی محبت تھی۔

”اس کا مختلف ہونا ہی تو پریشان کرتا ہے  
بہیں۔ حزرہ اور بلال بھی تو ہیں۔“ انہوں نے منہ  
بنایا تو وہ مسکرا دیے۔

”تم چھوڑو اسے، یہ بتاؤ مراد آگیا اسکاٹ لینڈ  
سے۔“ دامی نے ان کی توجہ دوسری جانب  
مبذول کی۔

”نہیں۔۔۔ رات دس بجے کی فلائٹ ہے ان  
کی۔۔۔“ مسز مراد نے سنجیدگی سے جواب دیا اور ان کی  
اسٹڈی کے پردے ہٹائے۔ دھوپ کا ایک طوفان سا  
کمرے میں گھس آیا۔ سامنے ہی احیان کی گاڑی گیٹ  
سے نکل رہی تھی۔

☆☆☆

”ویسے یار بڑا احسان کیا ہے بسمہ خالد نے ہم  
پر۔۔۔۔۔“ وہ دونوں گالف کلب سے نکل رہے تھے۔ عمار  
کی بات پر احیان نے تپ کر اسے دیکھا۔  
”ایسا کون سا احسان کر دیا ہے، جو تم صبح شام  
اس کے نام کی تسبیح کر رہے ہو؟“

”یہ بات کیا کم ہے اس نے اپنا وہ کیس بیچ میں  
چھوڑ دیا۔ جسے وہ آسانی سے جیت سکتی تھی۔“ عمار  
نے ریموٹ سے اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا۔

”تو کیا کمال کیا؟“ احیان کا مزاج خواہ مخواہ  
ہی برہم تھا۔

”کمال یہ کیا کہ ہمارے وکیل کو اس کیس کے  
سارے دیک پوائنٹ بتا دیے۔ جس کے نتیجے میں  
دوسری پارٹی کو مجبوراً ہم سے مصالحت کرنی پڑی۔“

عمار کی بات پر اس کا دماغ بھک کر کے اڑا۔  
”تمہیں کس نے بتایا؟“ اس نے بے تابی  
سے پوچھا۔

نیرس سے دیکھا تو ملازمہ نے بتایا۔ آپ سے منے آئی  
تھی۔“ مسز مراد کی بات پر احیان کے چہرے پر بڑی  
ظنیہ مسکراہٹ ابھری۔ دامی ایک دفعہ پھر گھیرے میں آ  
چکے تھے۔

”وہ۔۔۔“ دامی نے لمبا سادہ ادا کیا۔ ”میرے  
ایک فرینڈ کی پوتی ہے۔“ دامی کے بیان بدلنے پر  
احیان نے ناراضی سے ان کی طرف دیکھا۔

”کیا کرتی ہے۔۔۔؟“ مسز مراد نے دلچسپی  
سے پوچھا۔

”ایڈووکیٹ ہے، پریکٹس کر رہی ہے آج کل۔“  
”اوہ۔۔۔ کب تک بات و ات طے ہے اس کی۔۔۔؟“  
ان کی دلچسپی میں مزید اضافہ ہوا۔

”میرا خیال ہے، ابھی نہیں۔۔۔۔۔“ دامی نے مسکرا  
کر احیان کو دیکھا جس کے چہرے کے زاویے بری  
طرح بگڑ رہے تھے۔

”تو بات کریں تاں احیان کے لیے۔ اچھا ہے  
یہ بھی ٹھکانے لگے۔“ ممی کی بات پر احیان کو جھٹکا لگا۔  
”حد کرتی ہیں ممی آپ بھی، میں اتنا ممی گزرا  
ہوں؟ ایک نیرس سے جھانک کر آپ نے لڑکی کو  
دیکھا اور میرے لیے پسند کر لیا۔“ اس کے تلخ انداز پر  
وہ مسکرائیں۔

”وہ دور سے اتنی پیاری لگ رہی تھی تو قریب سے  
تو یقیناً بہت خوب صورت ہوگی۔“ مسز مراد کی بات پر  
ایک استہزائے مسکراہٹ اس کے چہرے پر دوڑی۔

”ممی اچھی زندگی گزارنے کے لیے لائف پارٹنر کا  
صرف ظاہری طور پر خوب صورت ہونا ضروری نہیں  
ہوتا۔ اس کا مزاج، عاداتیں اور رویہ زیادہ اہم ہے۔“ وہ

جھنجھلا کر اٹھا اور سر جھٹک کر کمرے سے نکل گیا۔  
”اسے کیا ہوا۔۔۔؟“ مسز مراد نے حیرانی سے  
اپنے سر صاحب کا تجسیم چہرہ دیکھا۔

”کچھ نہیں۔۔۔ بزنس کی وجہ سے اب پیٹ  
ہے۔۔۔“ انہوں نے بہانہ بنایا، جو ان کے ہی گلے پر لگ گیا۔  
”تو اسے کس نے کہا ہے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی

چرانے کے لیے اچانک مخاطب کیا۔  
”کیا مطلب.....؟“ اس کی آنکھوں میں  
ابھرنے لگی۔

”آپ نے اپنے سابقہ کلائنٹ کے سارے  
ویک پوائنٹس دوسری پارٹی کے وکیل کو بتائے، اس  
مات فیر.....“ احیان کے طنزیہ انداز پر وہ مسکرائی۔

”ہوں۔“ وہ دونوں بازو سینے پر باندھ کر اس  
کے تھوڑا قریب آئی۔ ”آپ کو کس نے کہا ایسا.....؟“  
”شہریار صاحب نے۔“ احیان کا اطمینان  
دیدنی تھا۔

”انہوں نے یہ نہیں بتایا پروفیشنل لائف میں  
جہاں مجھے یہ محسوس ہو کہ اگلی پارٹی کے ساتھ حقیقتاً  
زیادتی ہو رہی ہے، میں اپنا کیس وہیں ڈراپ کر دیتی  
ہوں۔“ ہسمہ نے بڑے پُر اعتماد انداز سے اس کی  
آنکھوں میں جھانکا۔

”دوسری پارٹی کی زیادتی کا آپ کو شاہ جی سے  
پلنے کے بعد پتا چلا ہوگا۔“ احیان کے چہرے پر طنزیہ  
مسکراہٹ ابھری۔

”نہیں۔“ وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی۔  
”حقیقت پتا چلنے کے بعد ہی میں ان سے معذرت  
کرنے لگی تھی۔“

”فرض کریں، ہم لوگ غلط ہوتے، تب بھی آپ  
شاہ جی کے کہنے پر وہ کیس چھوڑ دیتیں۔“ احیان کو اس  
سے بحث میں اب مزہ آنے لگا۔

”نہیں۔“ ہسمہ نے اسے حیران کیا۔  
”شاہ جی نے آپ کو میرے پاس بھیجا تو میں سمجھ  
گئی کہ کسی نہ کسی پوائنٹ پر میں غلط ہوں۔ ورنہ وہ ایسا  
نہ کرتے۔“ اس کی بات پر احیان کو جھٹکا لگا۔

”آپ کیسے کہہ سکتی ہیں.....؟“  
”وہ کم از کم مجھ سے کسی غلط بات پر فیور نہیں  
ماگ سکتے۔“ اس نے گاڑی کا دروازہ ایسے بند کیا  
کہ ایک لمحے کو احیان کو لگا جیسے وہ اس کے منہ پر طمانچہ  
مار کر گئی ہو۔ وہ اب گاڑی اشارت کر رہی تھی۔ احیان

”شہریار ہاشمی نے۔“ عمامہ نے اپنے وکیل کا نام  
لیا تو احیان کو اس کی بات کا یقین آ ہی گیا۔ اندر کی کہانی تو  
اسے آج معلوم ہوئی تھی۔ ورنہ وہ تو یہی فرض کیے بیٹھا تھا  
کہ معاملہ بہت آسانی سے طے ہو گیا تھا۔ اسی لیے تو وہ  
ہسمہ خالد کا احسان ماننے کو راضی نہیں تھا۔

”سچ مانو، میں تو بہت مشکور ہوں اس کا.....“  
عمامہ کی بات پر وہ چنسا گیا۔

”ایسا کرو ایک تسبیح خریدو اور اس پر اس کے نام  
کا پہاڑ اڑھنے لگو.....“

”خیر ہے تم کیوں اتنا بھڑک رہے ہو۔ کس نے  
تمہاری دم برپاؤں رکھ دیا؟“ عمامہ ہنسا۔

”پتا نہیں یار، آج کل خواہ مخواہ ہی غصہ آنے لگا  
ہے مجھے.....“ احیان نے گل کر اعتراف کیا۔

”تو میری جان، کچھ ریٹ ریٹ کرو۔ یہ  
لڑکیوں کی طرح بات ہے بات غصہ کرنا تم جیسے مرد پر  
سوٹ نہیں کرتا.....“ عمامہ اس کی گھوریوں کی پروا نہ  
کرتے ہوئے اپنی

گاڑی میں بیٹھ کر اسے اشارت کر چکا تھا۔ اس  
سے پہلے کہ وہ تپ کر اسے جواب دیتا، وہ شرارت سے  
گاڑی لے کر نکل گیا۔

☆☆☆

آج کافی دن کے بعد وہ بڑی فرصت سے  
شاپنگ کے لیے نکلا تھا۔ جناح پیر سے ہو کر وہ سینٹورس  
شاپنگ مال کی طرف نکل آیا۔ دو گھنٹے ٹھیک ٹھاک  
شاپنگ کر کے وہ باہر نکلا تو سامنے ہی ہسمہ بہت سے

شاپرز اٹھائے پارکنگ کی طرف ہی آرہی تھی۔ اس کی  
گاڑی احیان کی گاڑی کے بالکل ساتھ تھی۔

”کیسے ہیں آپ؟ شاہ جی کیسے ہیں؟“ وہ مسکرائی۔  
”بہتر ہیں.....“ احیان نے سنجیدگی سے جواب  
دیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا جو اپنی شاپنگ گاڑی  
کی چھٹی سیٹ پر رکھ رہی تھی۔

”ویسے پروفیشنل لائف میں، میں آپ سے اس  
بددیانتی کی توقع نہیں رکھتا تھا۔“ احیان نے اسے

جھنجھلا کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھا اور آندھی کی طرح اڑتا ہوا اپنے گھر پہنچا۔ سامنے داجی لان میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ وہ انہیں سرسری سا سلام کر کے اندر کی جانب بڑھ رہا تھا جب داجی نے اسے پیچھے سے مخاطب کیا۔

”تم ناراض ہو مجھ سے؟“ وہ چلتے، چلتے مڑا۔

”میں ایسی جسارت کر سکتا ہوں بھلا۔۔۔“ وہ

داجی ان سے خفا تھا۔

”جسارتیں تو تم خاصی بڑی، بڑی کرنے لگے

ہو، تمہیں خود بھی پتا نہیں چلتا۔“ داجی کے گلے پر وہ

ہلکا سا جھنجھلا یا۔

”آپ کو وہ لڑکی مجھ سے زیادہ عزیز ہے۔“

”ہاں؟“ ”بہ اختیار ہی اس کی زبان پھسلی تو وہ مسترا دیے۔“

”کسی کی پرسنل لائف کو اس کی اجازت کے بغیر

ڈسکس کرنا مجھے مناسب نہیں لگتا۔“ داجی کے سنجیدہ

انداز پر وہ ٹھنکا۔

”اس نے منع کیا ہے آپ کو؟“

”نہیں۔۔۔۔۔۔“ وہ لان چیمبر پر بیٹھتے ہوئے

بولے۔ ”میرا اپنا بھی تو اخلاقی طور پر کچھ فرض بنتا ہے۔“

”اُس اوکے۔“ ”کچھ دیر سوچنے کے بعد اس

نے ہتھیار ڈال ہی دیے کیونکہ یہ بات تو طے شدہ تھی وہ

داجی سے ان کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں اگلا

سکتا۔ اگلے کئی دن تک وہ اور عمار اپنی فیکٹری کے لیے

کوئی اور جگہ ڈھونڈنے میں مصروف رہے۔ آخر کار

انہیں ایک مناسب جگہ مل ہی گئی لیکن اس دفعہ دونوں

خاصے محتاط تھے۔ اس لیے معاملہ خیر اسلوبی سے سر

انجام پا گیا۔ انہی مصروفیات کی بنا پر اس کی کئی دن تک

داجی سے ملاقات نہیں ہوئی اور ہمسہ تو بالکل ہی ذہن

سے نکل چکی تھی۔ اس دن وہ رات بارہ بجے کے قریب

گھر پہنچا تو حیران رہ گیا۔

پورچ میں داجی کی گاڑی اسٹارٹ کھڑی تھی اور

ملازم ان کا چھوٹا سوٹ کیس گاڑی میں رکھ رہا تھا۔ جبکہ

داجی پریشانی کے عالم میں کسی سے فون پر بات کر رہے

تھے۔ اسے دیکھتے ہی انہوں نے فون بند کر دیا۔

”داجی تمہیں جا رہے ہیں کیا۔۔۔۔۔۔“ اہیان کو سخت

حیرانی ہوئی کیونکہ بہت عرصے سے انہوں نے ہا ہر ٹکٹا

خاصاً کم کر دیا تھا اور اب رات گئے اس طرح سوٹ

کیس کے ساتھ ٹکٹا واقعی تعجب کی بات تھی۔

”ہاں ایک ایمر جنسی ہو گئی ہے۔“ وہ اپنی گاڑی

کی طرف بڑھے۔ ”مری کے لیے نکل رہا ہوں۔“

”مری، اس وقت؟ کوئی پرابلم ہے تو میں ساتھ

چلوں۔۔۔۔۔۔؟“ وہ پریشان ہوا۔ داجی ایک لمحے کو ٹھکے۔

”کچھ سوچا پھر اثبات میں سر ہلایا۔“

”میں گاڑی میں ہوں۔ تم ایک دو سوٹ لے آؤ

اپنے۔ ہمیں رہنا پڑے گا وہاں۔“ اپنی بات کہہ کر وہ

جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اہیان ابھٹن بھرے

انداز میں اپنے کمرے کی بڑھاؤ مین سوٹ اپنے بیگ

میں ڈالے اور لیپ ٹاپ اٹھا کر باہر نکل آیا۔

رات کی تیرہ بجی میں گاڑی گھر سے نکلی، اس نے

جلدی سے عمار کو ٹیکسٹ کر کے بتایا کہ وہ داجی کے

ساتھ گاؤں جا رہا ہے باقی معاملات وہ دیکھ

لے۔ ایف سیون سیکٹر سے گاڑی اسلام آباد ایکسپریس

دے پر پہنچ چکی تھی۔ داجی کا چہرہ سپاٹ اور انداز میں

کوئی بات ایسی تھی کہ وہ کئی دفعہ انہیں مخاطب کرتے،

کرتے رہ گیا۔

شکر پڑیاں اشارے سے گاڑی ایچ ایٹ سیکٹر کی

طرف مڑ گئی۔ وہ تھوڑا سا حیران ہوا، یہ مری کا روٹ تو

نہیں تھا۔ کار اسلام آباد کے شفا انٹرنیشنل اسپتال کے

سامنے جا کر رک گئی۔ اہیان نے سوالیہ نگاہوں سے

داجی کی طرف دیکھا جو ٹکٹ بھرے انداز میں گاڑی

سے نکلے اور اسے وہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ دس منٹ

کے بعد ان کی دایبسی ہمسہ خالد کے ساتھ ہوئی۔ جس کا

چہرہ شدت گریہ سے سرخ اور آنکھوں سے آنسو قطار کی

صورت بہہ رہے تھے۔

اہیان کو غیر متوقع طور پر اسے دیکھ کر جھٹکا لگا۔ وہ

سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس سے اگلی ملاقات اتنے عجیب



جلائے بیٹھے تھے۔

”کیا ہوا احمد بخش؟“ داعی کی آواز میں تشویش کا عنصر شامل ہوا۔ انہوں نے شیشہ نیچے کر کے ڈرائیور سے پوچھا جو گاڑی کا جائزہ لینے میں مگن تھا۔

”صاحب جی گاڑی کا پچھلا ٹائر پتھر ہو گیا ہے۔“ احمد بخش کے دانت سروئی کی شدت سے بج رہے تھے۔ پیچھے آنے والی ایسولینس بھی رک گئی۔

”آپ لوگ سامنے والے ہوٹل میں چلے جائیں، میں کچھ کرتا ہوں۔“ ڈرائیور کے مشورے پر احیان نے جیسے ہی گاڑی کا دروازہ کھولا۔ بارش کی ایک تیز بو چھاننے اس کا استقبال کیا۔ سردیوں کی اس سخت رات میں پہلی دفعہ احیان کو بارش سخت پری لگی۔ ہڈیوں کو منجمد کرنے والی ہوائے اچھی خاصی ٹپکی کی کیفیت پیدا کر رہی تھی۔

وہ، داعی اور بسندہ سڑک پر پہنچے اس چھوٹے سے ہوٹل میں چلے آئے۔ دو منٹ کی واک نے ان تینوں کو اچھا خاصا بھگو دیا تھا۔ رات کے دو بجے اس ہوٹل کا مالک تین لوگوں کو آتا دیکھ کر حیران ہوا۔

”چائے ملے گی؟“ داعی کے پوچھنے پر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”واش روم کس طرف ہے؟“ داعی کی بات پر ہوٹل کے مالک نے ایک طرف اشارہ کیا۔

”بسندہ بیٹا آپ بیٹھیں۔“ داعی نے سامنے رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا تو وہ افسردہ سے انداز میں اس طرف چل پڑی۔ احیان سامنے لگے واش روم کی طرف آگیا اور قہقہوں کر جیسے ہی ہاتھ دھونے کے لیے نیچے کیے۔ اس کو جھٹکا سا لگا۔ غٹھنڈا پانی ایک لمحے کو سارے حواس معطل کر گیا۔ اس نے جھٹکے سے ہاتھ پیچھے کیے اور مزید دھونے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

جیسے ہی وہ واپس آیا۔ اسے ایک دم جھٹکا لگا۔ بسندہ سامنے موجود کرسیوں پر نہیں تھی۔

”کہاں گئی وہ؟“ احیان پریشانی سے ہوٹل سے باہر نکلا۔ موسلا دھار بارش میں وہ سڑک کے پاس

طریقے سے ہوئی۔ وہ داعی کے کندھے سے بھی گاڑی کی طرف آتے ہوئے مسلسل رو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی کسی گہرے صدمے سے دوچار ہوئی ہو۔

”احیان تم ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر چلے جاؤ۔“ داعی کے سنجیدہ انداز پر وہ فوراً خاموشی سے گاڑی سے اتر اور اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”ایسولینس کے ڈرائیور سے کہو، وہ ہماری گاڑی کے پیچھے رہے۔“ داعی نے اپنے ڈرائیور کو اگلا حکم صادر کیا جسے سنتے ہی احیان کا دماغ بھک کر کے اڑا۔ وہ ابھی تک یہ سارا سمجھنے سے قاصر تھا۔

”اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“ کچھ سیٹ پر بیٹھے داعی نے یقیناً یہ دلا سا بسندہ کو دیا تھا۔

گاڑی اب اسلام آباد ایکسپریس دے سے سری کی جانب بھاگ رہی تھی۔ اس کے پیچھے خاموشی سے دوڑتی ہوئی ایسولینس اس بات کی گواہ تھی کہ اس میں آنے والا مردہ جسم اپنی زندگی کی بازی ہار چکا ہے اور یقیناً اس کا بسندہ کے ساتھ کوئی خاص تعلق ہے۔ رات کے سنانے میں اس لڑکی کی سسکیاں ماحول کو عجیب سا بٹارہ بن گئیں۔ سردیوں کا موسم تو آنے لگا ہے غرض جہان بے رقیب۔ اس وقت بھی ٹیپر بچر خفی میں تھا۔ رات لی تیرگی میں دائیں بائیں بلند و بالا پہاڑ بعض دفعہ بہت ہیبت ناک لگتے ہیں۔ احیان اپنے ارد گرد کے مناظر سے بے نیاز بس کچھ سیٹ پر بیٹھے دو لوگوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

”کون ہے یہ لڑکی اور اس کا داعی سے کیا رشتہ ہے؟“ سوچ، سوچ کر اس کا دماغ تھک چکا تھا۔

”ایسولینس میں رکھی میت کس کی ہے؟“

”اس میت کا داعی سے کیا تعلق بنتا ہے؟“

وہ انہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ سڑک پر دوڑتی ہوئی گاڑی کو ایک دم جھٹکا لگا اور ڈرائیور نے جلدی سے بریک لگا دی۔ فوراً گاڑی سے اتر آ احیان نے چونک کر دیکھا سڑک کے کنارے پر ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ جس کے برآمدے میں دو آدمی ٹکڑیوں کا الاؤ

رکی ایسبولینس کا دروازہ کھڑے بری طرح رو رہی تھی۔ سردیوں کی اس ٹھنڈی، بے رخی رات میں دھواں دھار ہونے والی بارش کے درمیان ایسبولینس کے پاس کھڑی وہ لڑکی اپنے ہوش و حواس میں نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے کندھوں تک آتے بال اور سیاہ شال بری طرح بھگی چکی تھی۔

”پانگل ہو گئی ہو کیا؟“ احیان نے ناراضی سے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کیا۔ اس لمحے اس کی آنکھوں میں اس قدر اذیت، وحشت اور سراسیمگی تھی کہ احیان نے خوفزدہ ہو کر اس کا بازو چھوڑ دیا۔

اس کے چہرے پر پھیلا کرب وہ رات کی اس تاریکی میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ وہ رو نہیں رہی تھی بلکہ لمحہ لمحہ ختم ہو رہی تھی۔ وہ اذیت کی اس انتہا پر تھی جہاں انسان کا رابطہ اپنے ارد گرد کے ماحول اور موسموں سے بالکل کٹ جاتا ہے۔

”ماما میز اٹھ جائیں۔۔۔۔۔“ وہ ایسبولینس کا دروازہ کھڑے دیوانوں کی طرح رو رہی تھی۔ احیان کو ساری فضا ہی سو گوار محسوس ہوئی۔ ایسے لگا جیسے آسمان بھی اس کے غم میں کھل کر رو رہا ہو۔ ہر بوند اشک بار تھی۔

”نیک اس ایزی میز۔۔۔۔۔“ اس نے بے ساختہ ہی جذبہ ہمدردی سے مفلوج ہو کر اسے اپنے بازو کے ساتھ لگایا اور وہ تو ویسے ہی ہوش و حواس سے بیگانہ تھی۔ اس کے بازو پر ہاتھ رکھے بری طرح رو رہی تھی۔

”احیان۔۔۔۔۔ بسمہ۔۔۔۔۔“ داجی نے ہوش کے برآمدے کے سرے پر آ کر بلند آواز میں پکارا۔۔۔۔۔ احیان نے آستنگی سے اس کا بازو پکڑا اور اسے زبردستی پکڑ کر اپنے ساتھ ہوئی کی طرف لے آیا۔ وہ بری طرح کپکپا رہی تھی۔ اس کے ہونٹ سردی کی شدت سے نیلے ہو رہے تھے۔

”بسمہ۔۔۔۔۔“ داجی کی آواز میں پنہاں دکھ اس وقت وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ جس قیامت سے وہ گزر رہی تھی۔ وہ لوگ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے تھے۔

”بے وقوف لڑکی سارے کپڑے کیلے ہو گئے ہیں

تمہارے۔۔۔۔۔“ داجی کے لہجے میں شفقت کی فراوانی تھی۔ ”سوری انگل۔۔۔۔۔“ اس نے ہاتھ کی پشت سے اپنی آنکھوں کو بے دردی سے رگڑا۔

”احیان، اس کا بیگ نکال کر لاؤ گاڑی سے۔۔۔۔۔“ وہ پانچ منٹ کے بعد واپس آیا تو وہ کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ ڈرائیور گاڑی کا مائٹر تبدیل کر چکا تھا اور اس وقت بھی لوگ خاموشی سے چائے پی رہے تھے۔ جب تک انہوں نے چائے ختم کی، وہ اپنا ڈرائیور تبدیل کر کے آچکی تھی۔ اب وہ سیاہ سوٹ پر سیاہ رنگ کی شال اوڑھے ہوئے اس تاریک رات کا کوئی سو گوار سا حصہ لگ رہی تھی۔

ڈرائیور نے گاڑی میں بیٹھتے ہی میٹر چلایا تو گرمائش نے اندر کا ماحول خاصا بہتر کر دیا تھا۔ رات نے مری کے بلند و بالا پہاڑوں کی دلکشی کو چھپا دیا تھا۔ ڈرائیور اب بڑی مہارت سے گاڑی چلا رہا تھا۔ وہ لوگ جب مری پہنچے تو رات کے دو بج رہے تھے۔ بسمہ کا گھر مری کے قریب بھور بن کے علاقے میں واقع ایک چھوٹے سے گاؤں میں تھا۔ گاڑیاں اونچی نیچی بل کھاتی سڑکوں پر چلتی ہوئی ایک چھوٹے سے گھر کے سامنے جا کر رک گئیں۔ اس گھر کے کیمنوں کو شاید اس حادثے کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ اس لیے گاڑیوں کی آوازیں سنتے ہی دو تین مرد باہر نکل آئے۔ جبکہ ایک بوڑھی سی خاتون نے آگے بڑھ کر بسمہ کو گلے لگایا اور وہ ایک دفعہ پھر بے آواز رونے لگی۔ میت کو بڑے آرام سے اتارا جا رہا تھا۔ ان کے کافی رشتے دار باہر نکل آئے تھے۔

”شاہ جی، آپ اُدھر آ جائیں۔۔۔۔۔“ بسمہ کے کسی بزرگ رشتے دار۔۔۔۔۔ نے احترام کے ساتھ گھر کی بیٹھک کی طرف اشارہ کیا۔ احیان، داجی کی پیروی میں اندر داخل ہوا۔ اندر کا ماحول خاصا گرم تھا۔ آتش دان میں آگ جل رہی تھی اور چھوٹے سے کمرے میں دو پلنگ، دو کرسیاں اور میز رکھی ہوئی تھی۔ کمرے میں آرائشی چیزیں بالکل نہیں تھیں۔

اطلاع دے کر خود کچھ اور مہمانوں کے ساتھ ایسے مصروف ہوئے کہ پھر اگلے دن ہی ہاتھ آئے۔ وہ اس وقت تک جی بھر کر بور ہو چکا تھا۔ لیپ ٹاپ کی بیٹری ختم ہو چکی تھی اور وہ ساتھ لانا بھول گیا تھا۔ تنگ آ کر وہ اگلے دن باہر نکل آیا۔ آج موسم خاصا خوشگوار تھا۔ موسم سرما کی نرم دھوپ نے تمام پہاڑوں پر بسیرا کر رکھا تھا۔ وہ پتھروں پر چلتا ہوا خاصا دور نکل آیا۔ گاؤں کے جنوبی سائڈ پر چھوٹا سا قبرستان تھا۔ صنوبر اور چیز کے درختوں کے نیچے دور، دور تک کافی سنگ مرمر کی بنی ہوئی قبریں تھیں۔ جو شاید یہاں کے بھگتے موسموں کی وجہ سے بنائی گئی تھیں۔ ایک تازہ تازہ بنی ہوئی قبر پر فاتحہ کرتی لڑکی کو دیکھ کر اسے کافی حیرت ہوئی۔

”ہمسہ آپ.....؟“ وہ اسے پہچان چکا تھا۔  
”کیسے ہیں آپ.....؟“ وہ پھیکے سے انداز سے مسکرائی۔

”میں تو ٹھیک ہوں، آپ کی والدہ کی ڈیجھ کا بہت افسوس ہوا۔“ اس نے گئے ہاتھوں افسوس کی رسم بھائی۔

”وہ میری والدہ نہیں، دادی تھیں.....“ اس کی اطلاع پر اسے جھٹکا لگا۔

”اوہ..... مجھے پتا نہیں تھا.....“ وہ شرمندہ ہوا۔  
”کیوں، شاہ جی نے نہیں بتایا آپ کو.....؟“

اس کے سواہ سے انداز میں احیان کو طکر کی آمیزش محسوس ہوئی۔ وہ اب چل پڑی تھی۔

”بتایا تو تھا لیکن میں نے شاید غور نہیں کیا۔“ اس نے جلدی سے صفائی دی۔

”آپ کے پیرنس کہاں ہوتے ہیں.....؟“ وہ چلتے، چلتے رکی۔ استغابیہ انداز سے اسے دیکھا۔

”میرا خیال ہے شاہ جی نے آپ کو شاید ان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا.....“ اس نے بالکل درست اندازہ لگایا۔ وہ کل کی نسبت آج خاصی کمپوزڈ تھی۔

”ایسا نہیں ہے.....“ اس نے فوراً جھوٹ بولا۔ ”اچھ نکلی میرے ذہن سے نکل گیا، شاید آج کل

”آپ لوگ ریٹ کریں۔ ہم لوگوں کو میت کے حوالے سے کچھ انتظامات کرنے ہیں۔“ وہ بزرگ معذرت کر کے بیٹھک سے نکل گئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد گرم گرم چائے، اسٹے اٹلے اور ڈرائی فردنس کی ٹرے اندر آ گئی۔ چائے کی طلب تو دونوں کو بھی لیکن باقی چیزوں کو انہوں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ اسی دوران چند اور مرد بھی شاہ جی سے ملنے کے لیے آئے اور احیان نے اندازہ لگایا وہ حاجی سے بڑے احترام اور عقیدت بھرے انداز میں مل رہے تھے۔

”احیان تم سو جاؤ۔“ ان کے کمرے سے نکلتے ہی حاجی نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو وہ خاموشی سے لیٹ گیا۔ دماغ میں ان گنت سوالوں نے ہلچل مچا رکھی تھی لیکن اس ذہنی اور جسمانی مشقت کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ اگلے ہی پندرہ منٹوں میں گہری نیند میں تھا۔ اگلی صبح نو بجے جا کر ہی اس کی آنکھ کھلی۔ واش روم میں گرم پانی سے بھری بالٹی اور ایک چھوٹا ٹب رکھا ہوا تھا۔

اسے پہلی دفعہ پہاڑی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کی مشکلات کا اندازہ ہوا۔ شاور لے کر وہ باہر نکلا تو سامنے چھوٹے سے ٹینٹ میں چند لوگ اکٹھے تھے۔

”وہ بچے جنازہ تھا۔ ہمسہ کے سارے ہی رشتے دار اکٹھے ہو چکے تھے۔ حاجی بھی اس وقت چند بزرگوں کے گھیرے میں تھے۔ احیان ایک سائڈ پر بیٹھ گیا۔

”ہمسہ دو تین دن یہاں رہنا ہوگا۔“ جنازے کے بعد حاجی کی سنجیدگی سے دی گئی اطلاع پر وہ حیران ہوا۔

”وہ کیوں.....؟“

”ہمسہ کے کچھ معاملات ہیں، جن کو نبھانا ضروری ہے۔“ حاجی کی بات پر اسے یاد آیا کہ رات سے اس نے دوبارہ اس کی شکل نہیں دیکھی تھی، وہ یقیناً خواتین والے حصے میں ہوگی۔ حاجی نے بھی شاید اس کی سوچ کو پڑھ لیا تھا۔

”اس کی طبیعت رات سے خاصی خراب ہے، ڈاکٹر نے اعصاب کو پرسکون کرنے کے لیے فیندکا انجکشن لگایا ہے، وہ ابھی سو رہی ہے۔“ حاجی اسے

بزنس کی طرف زیادہ دھیان تھا میرا۔" وہ اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ وہ اونچے پنچے پہاڑی راستے پر بڑی مہارت اور تیزی سے چل رہی تھی۔ جبکہ احیان کو چلنے میں ذرا دشواری ہو رہی تھی۔

"اچھا....." اس نے تبصرہ نہیں کیا۔ احیان کو مایوسی ہوئی۔

"آپ کے اور بہن بھائی نظر نہیں آئے اس موقع پر....."

"میں اکلوتی ہوں....." اس نے اطلاع دی۔

"اوہ....." وہ حیران ہوا۔

"دامی آپ کے کیا لگتے ہیں....." وہ چپے، چلتے رکی اور دونوں بازو سینے پر باندھ کر بڑے آرام سے بولیں۔

"کچھ بھی نہیں۔"

"کیا مطلب؟" اسے جھکا لگا۔

"اگر دنیا میں انسانیت، ہمدردی اور انسان دوستی کی بنیاد پر بنائے جانے والے رشتوں کا کوئی نام ہے تو سمجھ لیں، شاہ جی کے میرے ساتھ یہی رشتے ہیں۔" وہ سنجیدگی سے کہہ کر اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔ وہ وہیں کھڑا سوچتے کا سوچتا رہ گیا۔

"یار یہ کیا فلم چل رہی ہے یہاں؟" اس نے شک آکر عماد کو فون ملا لیا۔

"لگتا ہے دامی کا اس کی دادی مرحومہ کے ساتھ کوئی نہ کوئی تعلق ضرور رہا ہے....." عماد کی بات نے اسے ہلکی سی الجھن میں مبتلا کیا دل ایک دم بد مزہ ہو گیا۔ ست سے قدموں سے وہ اس کے گھر تک پہنچا، جینٹل کا دروازہ باہر کی جانب کھلتا تھا۔ جیسے ہی دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا۔ ہسمہ، دامی کے سامنے والے چنگ پر دل گرفتہ سے انداز میں بیٹھی تھی۔ وہ اسے کچھ سمجھا رہے تھے۔

"اپنی دادی سے ہی کچھ سیکھ لو، کتنی باہمت خاتون تھیں وہ۔ تم ابھی سے حوصلہ ہار رہی ہو۔" دامی کی بات پر احیان نے چونک کر دامی کا چہرہ دیکھا۔ عماد کی بات میں اسے کوئی نہ کوئی سچائی محسوس ہوئی۔

"ان کے جیسے تو میں سر کر بھی دو بارہ پیدا نہیں ہو سکتی....." وہ خاصی دل گرفتہ لگ رہی تھی۔ احیان کو اس موقع پر اپنا آپ خاصا آ کر رڈ لگ رہا تھا لیکن وہ ڈھیٹ بن کر خود ہی دامی کے چنگ پر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ایسے گفتگو کر رہے تھے جیسے کوئی اور کمرے میں موجود ہی نہ ہو۔

"تمہیں اگر عطا الرحمن پسند نہیں ہے تو میں خود تمہارے تایا سے بات کر لیتا ہوں۔" دامی کی بات پر وہ الجھا۔

"مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی....." وہ واقعی کسی گہری الجھن میں مبتلا تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ وہی ہسمہ خالد ہے جو کورٹ میں پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے کی تک ایک منٹ میں پہنچ جاتی تھی۔ وہ اپنی ذاتی زندگی کے معاملے میں اس قدر شش و پنج کا شکار تھی۔

"نھیک ہے، پھر آپ جاؤ، ریٹ کرو، مجھے کچھ سوچنے دو....." دامی کی بات پر وہ اثبات میں سر ہلا کر کمرے سے نکل گئی۔ دامی اب اس کی طرف متوجہ ہوئے جو دنیا جہان کی بیزاری اپنے چہرے پر سجائے بیٹھا تھا۔

"تمہیں کیا ہوا.....؟" وہ اس کے مزاج آشنا ہونے کا دعویٰ یونہی تو نہیں کرتے تھے۔

"کچھ نہیں..... کب چلنا ہے یہاں سے دامی.....؟" وہ واقعی سخت بور ہو چکا تھا۔

"بس دو چار دن اور....." ان کی بات پر اسے کرنٹ ہی تو لگا تھا۔

"کیا.....؟ دو چار دن اور.....؟" وہ ایک دفعہ پھر بد مزہ ہوا۔

"تم اگر بور ہو رہے ہو تو میں تمہیں واپس بھجوا سکتا ہوں اسلام آباد، میں ایک دو دن بعد آ جاؤں گا۔" ان کی بات پر وہ جھنجھلا اٹھا۔

"مجھے سمجھ نہیں آرہی دامی، جب آپ نے مجھے ڈھنگ سے کوئی بات تو بتائی نہیں ہے تو میں کیا یہاں بیٹھ کر کھیاں ماروں؟"



”بسمہ کی والدہ کا انتقال اس کی پیدائش پر ہی ہوا گیا تھا۔ اس کی دادی اور باپ پر ہی اس کی ساری ذمہ داری تھی۔“

”پھر؟“

”بس میں نے اس کے والد کی ماہانہ بنیادوں پر مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا، جب تک اس کے والد زندہ رہے، ان کا میرے ساتھ رابطہ رہا۔“ دادی نے مزید بتایا۔

”اب کیا ان کا انتقال ہو چکا ہے؟“

”ہاں آج سے کچھ سال پہلے جب بسمہ نے گریجویشن کیا تھا۔“ دادی کی بات پر اسے مزید افسوس ہوا۔ ”تب اس کی دادی نے دوبارہ مجھ سے رابطہ کیا اور کہا کہ بسمہ لاؤ پڑھنا چاہتی ہے۔ میں نے اس کا ایڈمیشن کروا دیا اور اس کے فادریں وفات کے بعد بھی اس کی جاب ہونے تک امداد کا سلسلہ جاری رکھا۔“

”اچھا..... تو یہ بات ہے.....“ احیان کو ساری بات سمجھ میں آگئی۔

”لیکن جیسے ہی بسمہ پریکٹیکل لائف میں آئی تو اس کی دادی نے بتایا کہ اب انہیں مزید سپورٹ کی ضرورت نہیں۔“

”تو آپ کبھی نہیں ملے تھے اس سے.....؟“ وہ جلدی سے بولا تھا۔

”نہیں.....“ دادی کی بات نے اسے حیران کیا۔ ”کبھی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ حتیٰ کہ میری تو کبھی بسمہ سے بھی بات نہیں ہوئی تھی۔ اصل میں اس کی دادی نے بہت عرصے کے بعد اسے بتایا تھا کہ گھر کے مالی معاملات کس طرح سے چلتے رہے ہیں۔“

”تو اب اسے کیا مسئلہ ہے.....؟“ احیان نے الجھن بھرے انداز سے پوچھا۔

”زیتون خاتون کے انتقال کے بعد اب ان کے سارے ہی رشتے دار انھیں کرا گئے ہیں اور اب بسمہ بھی مالی طور پر مستحکم ہے تو اس کے تایا اپنے بیٹے کا رشتہ کرنا چاہتے ہیں بسمہ سے۔“ انہوں نے اصل بات بتائی جسے سنتے ہی احیان کو غصہ آ گیا۔

”اچھا، پوچھو، کیا پوچھنا ہے.....؟“ ان کی اگلی بات نے احیان کو حیران کیا۔

”بسمہ آپ کی کیا لگتی ہے.....؟“

”کچھ بھی نہیں۔“

”تو پھر ہم یہاں کیوں بیٹھے ہوئے ہیں.....؟“ وہ بیزار سے انداز میں کھڑا ہو گیا۔

”کسی کا مسئلہ حل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اگلے بندے کے ساتھ آپ کا کوئی تعلق یا رشتے داری ضرور ہو۔“ دادی کے سنجیدہ انداز پر وہ چونکا۔

”کوئی نہ کوئی تو لنک ضرور ہوتا ہے، ورنہ ہم کیوں کسی کے لیے ایسے خوار ہوں۔“ احیان نے طنز یہ انداز سے انہیں دیکھا۔

”تمہیں کس نے کہا، میں خوار ہو رہا ہوں.....“

دادی کی بات پر وہ شیشا سا گیا۔

”میں تو ہو رہا ہوں۔“ وہ یہ بات صرف سوچ سکتا تھا، کہنے کی صورت میں دادی کی دل آزاری یقینی تھی۔ اس لیے وہ چپ رہا۔

”بسمہ تمہارے تایا کی فیکٹری کے ایک مزدور کی بیٹی ہے.....“ دادی کی بات پر اسے کرٹ سا لگا۔ ”آج سے بیس سال پہلے جب بسمہ صرف چار سال کی تھی، اس کے والد فیکٹری میں ایک کرین سے ٹکرانے کی وجہ سے اپنی ٹانگوں سے محروم ہو گئے تھے۔“ دادی نے آخر اپنی پوٹلی کھول ہی دی تھی۔

”پھر.....؟“ وہ سخت حیران ہوا۔

”تمہارے تایا نے اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا، تب بسمہ کی دادی زیتون بیگم روٹی ہوئیں میرے پاس آئیں۔“ دادی مضطرب انداز میں کھڑے ہوئے۔

”پھر کیا ہوا.....؟“ وہ بے تاب انداز میں گویا ہوا۔

”اس کی دادی نے بتایا کہ رشتے داروں نے بھی ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا ہے..... حتیٰ کہ بسمہ کے بچے اور تایا بھی کسی قسم کی مالی سپورٹ کرنے کو تیار نہیں۔“

دادی نے سنجیدگی سے اس کہانی کے کچھ اور پہلو کھولے۔

”اوہ.....“ اسے افسوس ہوا۔

”اور آپ ان خود غرض اور مفاد پرست لوگوں میں شادی کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں اسے.....“

”میں نے اسے کبھی مشورہ نہیں دیا، ہمیشہ اس کی رائے کا احترام کیا ہے، وہ میرے لیے بالکل عمرہ کی طرح ہے۔“ داجی نے اپنی اکلوتی پوتی کا نام لیا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے ایسے لوگوں کے ساتھ کوئی بھی رشتہ قائم کرنے کی، جنہوں نے اتنے مشکل وقت میں اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔“ احیان کا بے رنگ تبصرہ بسمہ نے بیٹھک میں داخل ہوتے ہوئے بتا کی ہوش و حواس سنا تھا۔ وہ جو کھانے کی ٹرے لیے اندر آ رہی تھی۔ اسے سامنے دیکھ کر احیان ایک دم سٹیپ سا گیا۔

”داجی کھانا۔“ بسمہ کی بات پر احیان بری طرح چونکا۔ بسمہ نے انہیں ”شاہ جی“ سے ”داجی“ کہنا کب شروع کیا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا۔

”میز پر رکھ دو بیٹا، میں ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔“ داجی فوراً وائش روم کی طرف بڑھے۔

”کچھ باتیں کہنا جتنا آسان ہوتا ہے ان پر عمل درآمد کرنا اتنا ہی مشکل۔“ وہ احیان سے مخاطب ہوں۔

”میں صرف اتنا جانتا ہوں، آپ کے لیے کوئی بھی چیز مشکل نہیں ہونی چاہیے نہ کمرہ ہائے عدالت میں اور نہ زندگی کے میدان میں۔“ احیان کی بات پر اس نے چونک کر اس شخص کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھیں بالکل داجی کی طرح تھیں۔

”یہ کوئی عدالت کا کٹہرا نہیں ہے جہاں میں وائش کے ساتھ مخالف گروپ کو لا جواب کر دوں۔“ ذاتی زندگی میں انسان کو بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔

بسمہ کی بات پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ احیان کے چہرے پر ابھری۔

”اپنی ذاتی زندگی کو دوسروں کی پسند ناپسند پر داد پر لا کر بھی کوئی عقلمندی نہیں۔“ وہ داجی کو وائش روم سے باہر نکلتے دیکھ کر خود بھی ہاتھ دھونے کے لیے بڑھ گیا لیکن جاتے، جاتے وہ بسمہ کو کسی گہری سوچ میں مبتلا کر گیا تھا۔

”آؤ بیٹا، تم بھی ہمارے ساتھ کھاؤ ناں۔“ داجی نے محبت بھرے انداز میں اس سے کہا۔ وہ چونکی۔

”نہیں داجی مجھے بھوک نہیں ہے۔“ وہ کمرے سے نکل گئی۔

”تم کرو گے بسمہ سے شادی۔“ داجی نے کھانا کھاتے ہوئے بڑے عام سے انداز میں اچانک پوچھا، اس کے ہاتھ سے نوالہ گر گیا۔

”کیا کہا آپ نے.....؟“ احیان کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آیا۔

”میں نے پوچھا ہے کہ تم بسمہ سے شادی کرو گے۔“ داجی نے ایک دفعہ پھر مکمل اطمینان سے پوچھا، دوسری طرف بسمہ جو سوٹ ڈش لیے ہوئے دوبارہ بیٹھک کی طرف آ رہی تھی داجی کی بات سن کر سے جھٹکا سا اگا، وہ دروازے کے پردے کے پیچھے ہی رک گئی۔

”داجی مذاق کر رہے ہیں آپ؟“ احیان سنبھل کر بولا۔

”تمہارا اور میرا مذاق کا رشتہ ہے کیا۔“ داجی ٹھیک ٹھاک برامان گئے۔

”آئی ایم سوری داجی، مجھے یہ پروپوزل کچھ مناسب نہیں لگ رہا اپنے لیے۔“ اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ باہر کھڑی بسمہ کو دھچکا سا لگا۔

”اس لیے کہ اس کا باپ مزدور تھا۔“ داجی کی بات پر احیان نے خاموشی سے سر جھٹکا لیا۔

”مجھے تو آج پتا چلا تم بھی اپنے والدین کی طرح ہی سٹینس کانٹنس ہو، مجھے تم سے کوئی ٹھک نہیں یہ تمہاری زندگی ہے تم اپنے لیے بہتر فیصلہ کر سکتے ہو۔“ احیان کی مسلسل خاموشی اس بات کی گواہ تھی کہ داجی بالکل درست کہہ رہے ہیں۔ دروازے کے پردے کے پیچھے کھڑی بسمہ کو ایسے لگا جیسے مری کے سارے پہاڑ اڑتے ہوئے اس کے وجود سے آنکرائے ہوں اور اس کا وجود ہزاروں حصوں میں تقسیم ہو رہا ہو۔ وہ اذیت کی انتہا پر تھی۔

دوسرا اور اختتامی حصہ اگلے ماہ

# ماں

## رفعت شہباز

اماں کمرے میں اکیلی بیٹھی کھڑکی کی جانب خالی  
نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جانے کیا سوچے جا رہی  
تھیں۔ وقت کتنی جلدی کتنا آگے نکل گیا تھا اور سب بچے  
مرئی کے بچوں کی طرح دانہ چک کر اپنی، اپنی منزلوں کی  
جانب رواں دواں ہو گئے اور وہ وہیں اکیلی رہ گئیں۔  
اماں کچھ دیر کے لیے ماضی میں چلی گئیں۔ صبح،  
جن اس رد منزلہ عمارت میں افرا آفری کا سماں  
ہوتا۔ کوئی اسکول، کوئی کالج تو کوئی آفس کے لیے  
تیاری کر رہا ہوتا۔ سب کے ہاتھ تیار ہو رہے ہوتے  
اور اماں ہر بچے کی فرمائشیں پوری کر رہی ہوتیں۔  
بلال اور جلال کو انڈے پرائیڈ چاہیے  
ہوتے۔ ابا جو آفس جانے کے لیے تیار ہو رہے



ہوتے، بیوی کو سب کا جلدی، جلدی ناشتا تیار کرتے ہوئے دیکھ رہے ہوتے۔ وہ آخر میں جاتے تھے وہ ان کے لیے اندھا بانے کے لیے رکھ دیتیں اور پھر ایک بچی کے بال گوندھ رہی ہوتیں تو دوسری کی پونی بنا رہی ہوتیں۔۔۔۔۔ کسی کا بستہ سیٹ کر رہی ہوتیں، غرض آٹھ بچے تھے ان سب کی فرمائشیں اور ضرورتیں پوری کر کے سب کو بھیج کر پھر میاں کو بھی روانہ کر کے سکون سے بیٹھتیں اور کچھ دیر بعد دوپہر کے کھانے کا انتظام کر رہی ہوتیں۔ ان کا کوئی مددگار نہیں تھا۔۔۔۔۔ کیونکہ بچیاں چھوٹی تھیں اور لڑکے کالج جانے کی عمروں کے تھے۔

اب اس گھر کے درو یوار پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ ہر کمر خالی اور ویران لگتا۔۔۔۔۔ کبھی اس گھر کے ہر کمرے میں لوگ بسا کرتے تھے۔ ہر طرف آتھموں کی آوازیں آیا کرتیں۔۔۔۔۔ کبھی لڑائی جھگڑے، چھوٹے، چھوٹے ہنگامے۔۔۔۔۔ بہن بھائیوں کے آپس کے معصومانہ جھگڑے۔۔۔۔۔ سب اماں کی نگاہوں میں گھومتے گئے۔

”اماں اس جلال نے میرا بستہ پھینک دیا۔“

جلال چیخ کر اماں کو متوجہ کرتا۔  
”ہاں اپنی بھی تو بات بتاؤ، تم نے بھی تو میرے جو گرز چھپا دیے تھے“ جلال بھی اپنی شکایت کرتا۔ اماں اسی طرح تمام ہون لڑائی جھگڑوں کی صلح کراتی رہتیں۔  
”اماں میں نے اپنی دوست کے گھر جانا ہے۔“  
جلال بھائی سے بولیں وہ مجھے چھوڑ دیں۔۔۔۔۔ عظمیٰ تیار ہو کر اماں کے سامنے آئی۔

”میں نہیں جاؤں گا۔۔۔۔۔ تم نیل کے ساتھ چلی جاؤ۔۔۔۔۔ ایک میں ہی تم کو نظر آتا ہوں پورے گھر میں جیسے مجھے اور کوئی کام نہیں ہے۔“ بلال نے غصے سے جواب دیا۔

”اماں میں کیسے جاؤں۔۔۔۔۔ بنیل بھائی جا رہے ہیں اور نہ ہی بلال بھائی۔۔۔۔۔ عظمیٰ منسنائی۔“  
”چلو ساجد تم نادور کو بلاؤ، وہ عظمیٰ کو چھوڑ دے گا اور کون سا تم کو اتنی دور جاتا ہے۔“ نادور کے ساتھ

پیدل چلی جاؤ۔“ اماں نے مشورہ دیا۔

غرض کہ ہر طرف زگینیاں اور چھپا ہست تھی۔۔۔۔۔ انہیں حاصل کرنے کے بعد آہستہ، آہستہ بیٹیوں کی شادیاں ہوتی گئیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تینوں بچیاں اپنے، اپنے گھروں کی ہو گئیں۔ بیٹوں کی جاب ملنے کے بعد ان کی بھی شادیاں ہو گئیں اور خیر سے پانچ بہویں اس گھر میں دلہن بن کر آ گئیں۔ وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ ایک خوش حال زندگی گزار رہی تھیں۔ آخری بیٹے کی شادی سے قبل شوہر کا انتقال اچانک ایک ٹریفک حادثے میں ہو گیا تھا اور اب وہ اپنے اس تکشن میں سب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی تھا۔ بیٹوں کی نوکریاں لگیں اور کچھ جمع جیتا تھا جو اب مکان تین منزلہ بنالیا گیا تھا۔ سب سے پہلی منزل پر وہ دونوں بلال کے ساتھ رہتے تھے اور اب شوہر کے انتقال کے بعد وہ ان بیٹا، بہو کے ساتھ تھیں۔ نادور تیسری منزل پر اپنی بیوی بچوں کے ساتھ خوشحال زندگی گزار رہا تھا۔ نیل قریب ہی رہتا تھا اور وہ اماں کی خیریت آتے جاتے پوچھتا رہتا تھا۔

جلال ان کا دوسرے نمبر کا بیٹا تھا۔ اس کی بیوی کو سب کے ساتھ رہنا پسند نہیں تھا اس لیے وہ ایک پوش ایریا میں رہنے گئے تھے۔ کبھی کبھار فون پر بات کر لیا کرتے تھے اور سال میں دو تین چکر لگایا کرتے تھے۔ لیکن ان کی گفتگو زیادہ تر زبانی کلامی ہوتی اور ساری سنجوسی اماں پر آ کر ختم ہوتی تھی۔

☆☆☆

”ارے اماں بڑی خاموش بیٹھی ہیں، لائٹ تو جلا لیں مغرب کا وقت ہونے والا ہے۔“ آنے والی نادور کی بیوی نے تھی جس کی آواز سے اماں چونک گئیں اور اپنے خیالوں سے پلٹ آ گئیں۔  
”اماں رات کو جلال بھائی آئے تھے وہ کیا کہہ رہے تھے؟“

”کوئی خاص بات نہیں کہہ رہے تھے۔ بس خیریت پوچھنے آئے تھے۔“ اماں نے بہو کی طرف نظر



”جیتے رہو بیٹا تم اس وقت.....؟“

”اماں مسجد سے آرہا ہوں۔“ نیل نے جواب دیا۔  
 ”بیٹا تم تو قریب ہی رہتے ہو..... لیکن آج ایک  
 ہفتے کے بعد اپنی شکل دکھا رہے ہو، کہاں تھے تم اس  
 دن سے.....؟“

”در اصل آفس سے آنے کے بعد فرصت ہی  
 نہیں ملتی..... تھکا ہارا آ کر لیٹ جاتا ہوں۔ آج جمعہ تھا  
 تو جلدی گھر آ گیا۔“ اس نے نہ آنے کا عذر سنا دیا۔  
 ”اماں آج مسجد میں مولوی صاحب نے بڑا اچھا  
 درس دیا تھا۔ وہ بھی ماں باپ کے حقوق پر.....“ مولوی  
 صاحب کے درس نے اس کے دیرخا صا اثر کیا تھا جیسی  
 ماں کے پاس فوراً چلا آیا تھا۔

”اماں مولوی صاحب بتا رہے تھے کہ قرآن پاک  
 میں ہے کہ ماں، باپ کے ساتھ احسان کرو اگر تیری  
 موجودگی میں ان میں یا دونوں میں سے ایک بڑھاپے پر  
 پہنچ جائے تو ان کے آگے ٹک نہیں کہنا..... ان کی  
 آواز پر آواز بلند نہ کرنا۔ ان کے ساتھ احترام سے  
 بات چیت کرنا اور عجزی کے ساتھ ان کے آگے جھکے  
 رہنا اور دعا کرتے رہنا کہ اے میرے رب ان پر دیا  
 رحم کر جیسا انہوں نے میرے بچپن میں میری پرورش  
 کے وقت کیا۔ اماں اس کے علاوہ یہ بھی کہا کہ بھول کر  
 بھی کبھی کسی سے اپنے ماں، باپ کے متعلق برا نہ  
 کہو۔ یہ گناہ کبیرہ ہے۔ اور حقوق العباد کی.....  
 ادائیگی میں کوتاہی اللہ کو سخت ناپسند ہے۔“

ساجد جو ابھی ابھی دفتر سے آیا تھا وہیں اماں کے  
 پاس بیٹھا، نیل کی باتیں سن رہا تھا۔ فوراً بولا۔  
 ”ہاں بھائی ماں باپ کی خدمت کرنا بہت بڑی  
 نیکی ہے۔“

”ہے تو نیکی لیکن خالی باتیں کرنے سے کچھ نہیں  
 ہوتا کچھ خدمت بھی کرلو..... اماں کی.....“ نیل نے  
 طنز یہ کہا اور اماں سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ نیل  
 اور ساجد کی کافی گفتی تھی ساجد سے اکثر ماں کی طرف  
 سے غفرت برسنے پر طنز کرتا تھا۔

انھا کر کہا۔

”اماں آپ کو لے جانے کے لیے تو نہیں کہا۔“  
 شمع نے کرید..... انہوں نے گردن ہٹا کر نیلی میں جواب  
 دیا۔ اور ذرا توقف کے بعد بولیں۔

”میں کہیں نہیں جا رہی ہوں یہ میرے مرحوم  
 شوہر کا گھر ہے میں یہیں رہوں گی۔“

”ارے، ارے اماں میں تو یونہی کہہ رہی تھی اگر  
 چلی بھی جاتیں تو تھوڑا ان کے بچوں کا دل رہ جاتا۔  
 میں کچھ دن بعد نادور کو بھیج کر واپس بلوائیتی۔“ شمع ایک  
 دم گھبرا گئی۔ اپنی بات کہہ کر وہ مزید لگاوٹ سے بولی۔  
 ”وہیے بھی اماں آپ کے بغیر ہمارا دل بھی  
 نہیں لگتا..... ہمارے بچے بھی آپ کی غیر موجودگی میں  
 اداس ہو جاتے ہیں۔“ شمع نے وضاحت کی..... ویسے  
 بھی اماں نادور اور بلال کے بچوں کے ساتھ بہت خوش  
 رہتی تھیں اور اپنی ہر بات زیادہ تر شمع..... سے شیئر  
 کرتی تھیں اور شمع کی ہر بات مانتی بھی تھیں..... اور  
 شمع، غفرت کی بیٹی تھی جو اماں کی چھوٹی بہن تھیں۔ اس  
 طرح شمع اماں کی بھانجی بھی تھی۔

”میں کہیں نہیں جا رہی ہوں، میرا کہیں بھی دل  
 نہیں لگتا..... میں اسی گھر میں ٹھیک ہوں..... اور کیا میں  
 تم پر بوجھ ہوں جو تم لوگ مجھ سے پیزار ہو گئے ہو؟“  
 اماں نے اب غصے سے کہا۔

”نہیں اماں ایسی کوئی بات نہیں ہے میں تو ویسے  
 ہی کہہ رہی ہوں۔ ارے میری اماں آپ تو ناراض  
 ہو رہی ہیں۔ میں تو آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گی۔“  
 شمع ایک دم اماں سے لپٹ گئی۔

☆☆☆

”ارے دیکھنا، دروازے کی قفل بج رہی ہے  
 کوئی آیا ہے۔“ اماں نے حنا کو آواز دی۔

دروازے پر نیل تھا۔

”اماں نیل بھائی آئے ہیں.....“ بلال کی بیوی  
 حنا نے اماں کو بتایا۔

”السلام علیکم اماں.....“

”یہ میری دوائیں ختم ہو گئی ہیں بازار جاؤ تو لیجے آنا۔“ انہوں نے نیل کو دوا کا پرچہ پکڑا دیا۔

”وہ اماں ابھی تو مجھے وقت نہیں ہے۔ ایک دوست کی عیادت کو جا رہا ہوں۔ تاہم ملا تو لا دوں گا آپ ایسا کریں کل پر رکھ لیں ورنہ یہ ساجد تو خالی بیٹھا رہتا ہے اس سے منگوالیں۔“ ساجد کو فوراً غصہ آ گیا۔

”میں کہاں گھر پر رہتا ہوں، دفتر کے بعد پارٹ ٹائم کرتا ہوں..... سارا دن تو مصروف رہتا ہوں تم تو عصر کے بعد سے ہی گھر آ جاتے ہو۔“

”چھوڑو آپس میں نہ لڑو میں منگوا لوں گی تم دونوں چپ ہو جاؤ۔“ اماں نے دونوں بھائیوں کو الجھتے ہوئے دیکھا تو بولیں۔

تھوڑی دیر خاموشی کے بعد ساجد پھر بھائی سے مخاطب ہوا۔

”بھائی تمہارا گھر کتنے عرصے میں مکمل ہو جائے گا اور تم سب شفقت پور رہے ہو؟“

”بھئی ابھی تو اس میں کافی کام باقی ہے۔“

نیل نے ساجد کو جواب دیا۔

”ارے اماں، سنا ہے کل آپ چندرہ دن کے لیے نہیں بھائی کے گھر جا رہی ہیں؟ ہے نہ بھائی.....؟“

ساجد نے جان بوجھ کر نیل سے پوچھا۔

”مجھے نہیں پتا ابھی تو ہمارے بچوں کے امتحان ہونے ہیں تو کنزروی بھی نہیں جاتی اور نہ مہمانوں کو پسند کرتی ہے۔“ نیل ایک دم گھبرا گیا اور فوراً بولا۔

”پر تمہاری ساس بھی تو آئی ہوئی ہیں۔“

”تمہارا کیا مطلب ہے اب میں کسی کو اپنے گھر آنے سے منع کر دوں اور وہ آتی ہیں تو بچوں کو سنبھال لیتی ہیں۔ ابھی پچھلے ہفتے عظمیٰ باجی (نیل کی بڑی بہن) آگئی تھیں سارا دن انہی کے چکر میں ختم ہو گیا اب ہم بچوں کو سنبھالیں یا آنے والوں کو دیکھیں۔“

ساجد کی بات پر نیل ایک دم غصے میں آ گیا اور بولا۔

اماں نیل کی لمبی تقریریں سن کر پریشان ہو گئیں

اور بولیں۔

”تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو..... ساجد کو تو عادت ہے مذاق کرنے کی، میں تمہارے گھر نہیں آ رہی ہوں اور عظمیٰ کو بھی سمجھا دوں گی۔“

”ارے اماں تم تو ناراض ہو جاتی ہو، میں اس لیے تھوڑی کہہ رہا ہوں۔“ نیل شرمندہ ہو گیا اور کچھ منٹوں کے بعد خدا حافظ کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔

”اماں یہ نیل بھائی بھی بہت لمبی، لمبی تقریریں کرتے ہیں۔ زیادہ تر زبانی جمع خرچ ہے اور عمل سے کوسوں دور ہیں۔“ ساجد کو ایسے ہی کافی غصہ آ رہا تھا۔

”چھوڑو بیٹا تیرا بڑا بھائی ہے۔“ اماں نے ساجد کو پیار سے ڈانٹ کر چپ کرادیا۔

”اماں میں کیوں نہ بولوں..... ابھی تم کنزری بھائی کو ایک لفظ کہہ کر تو دیکھو سارے وعظ ان کے ختم ہو جائیں گے۔ دوسروں کو نصیحت کرتے رہتے ہیں، کوئی کام کہہ دو تو ناں مٹول سے کام لیتے ہیں۔ دوائیں لانے سے منع کر دیا اور اپنی ساس اور بیوی کے غلام بنے رہتے ہیں۔ کل ہی مارکیٹ سے اپنی ساس کی دوائیں لے کر آ رہے تھے اور تم کو منع کر دیا..... ماں کے کام کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہے اور گرتے ہیں ماں باپ کے حقوق کی بات..... ہونہہ منافق کہیں کے۔“ ساجد کا غصہ ختم نہیں ہو رہا تھا۔

اماں ساجد کی بات سنی رہیں، وہ بھی جہاں دیدہ خاتون تھیں انہیں سب کی حقیقت معلوم تھی لیکن وہ بات نہیں بڑھاتا چاہتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

”ارے عظمیٰ آئی ہوئی ہے، کیا حال چال ہے کب آئیں.....؟“ حنا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اپنی شند کا حال پوچھا۔

”بھابی ابھی ابھی آئی ہوں، اماں کی طبیعت کا سا تھا تو سوچا مل کر آ جاؤں۔“ وہ خوش دلی سے بولی۔

”دیکھو اماں بیچاری خود تو کسی سے کچھ کہتی نہیں ہیں ہم لوگوں کے ساتھ رہتی ہیں تو ہم خبر گیری کرتے

## حصہ

کسی کے صے گھر آیا کسی کے صے دکان آئی  
میں گھر میں سب سے چھوٹا میرے صے میں ماں آئی  
مرسلہ ایمان چوہدری، فیصل آباد

”کیوں بکواس کرتی ہو تم کچھ نہیں جانتی ہو  
خاموش رہو اور اپنا کام کرو اور مجھے اپنا کام کرنے دو،  
وہ میری ماں ہیں کوئی اپنا فرض ادا کرے یا نہیں کرے،  
مجھے اپنا فرض ادا کرنے دو..... میری عاقبت خراب  
کرنے کی کوشش نہ کرو۔“

”چلو تم اپنا فرض ادا کرتے رہو لیکن وہ نیل بھائی  
اور جلال بھائی کہاں ہیں ویسے تو لمبی، لمبی تقریریں  
کرتے ہیں۔ بڑی سمجھتی کرتے ہیں لیکن ماں کی  
خدمت کرنا یا نہیں آتی، ان کو اپنا فرض یاد نہیں آتا۔“  
”سب نے اپنی، اپنی قبر میں جاتا ہے تم میری قبر  
خراب نہ کرو اور ہاں اپنی بھی قبر کے لیے تیاری کرلو۔  
ہر وقت دوسری بھائیوں کے ساتھ مل کر برائیاں کرتی  
رہتی ہو۔“ جلال جھنجھلا کر بولا۔ حنا بڑبڑاتی ہوئی اپنے  
کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

”جلال نہ جانے اماں کے کمرے میں کیا کھسر  
پھسر کر رہا ہے۔“ حنا نے سوچا۔  
”کر رہی ہوں گی بسوؤں کی برائیاں یا پھر کوئی  
فرمائش.....“ حنا کے دماغ میں اچانک آیا کہ۔ کیوں نہ  
آج اماں کو رگٹے ہاتھوں پکڑا جائے۔ آج تک اماں  
میرے ہاتھ نہیں آئی ہیں۔“ یہ سوچ کر وہ دہرے کمرے  
میں کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ کھڑکی بھی ہوئی  
تھی اور جلال، اماں سے بات کر رہا تھا۔ جلال کی پیٹھ  
کھڑکی کی طرف تھی اور دیوار کے مہارے اماں نے بھی  
ہوئی تھی دونوں حنا کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ حنا نے سوچا  
آج بیوی بی کی ساری جالا کی نکال دوں گی اور ان کی  
باتیں سب کو بتا دوں گی ایسا کرتی ہوں کہ سوا بکل

رہتے ہیں اب دیکھو..... جلال بھائی آئے تھے دو دن  
پہلے..... کچھ دیر بیٹھ کر خالی باتیں بنا کر چلے گئے ان کو  
بھی اماں کے لیے وقت نکالنا چاہیے ان کی بھی تو ذمے  
داری ہے۔ کیوں غلطی میں کیا غلط کہہ رہی ہوں؟“ حنا  
نے نند کوئی طلب کر کے کہا۔

”ہاں بھائی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن  
احساس دلاتے پر بھی کسی کو خیال نہیں آئے تو پھر کہنا  
پکار ہے۔“ تھوڑی دیر غلطی رک کر چائے پی کر جانے  
لگی تو حنا نے روکا بھی.....

”بھئی کھانا کھا کر جاتا۔“ لیکن غلطی جلدی میں  
تھی اس کا ڈرائیور بھی آگیا تھا اس لیے وہ چلی گئی۔

☆☆☆

”اماں..... اماں ارے اماں کیا سو رہی ہیں؟  
دیکھیں تو دن نکل آیا اور دس بج رہے ہیں۔“ جلال نے  
گھبراتے ہوئے اماں کو پکایا۔

”ہاں بیٹا، ڈاکٹر کی دوا سے خیمہ آگئی  
تھی۔“ اماں ہڑبڑا کر اٹھ گئیں۔

”اچھا اماں یہ گرم، گرم دودھ پی لیں۔“ جلال  
روز صبح جاتے ہوئے اور رات کو واپسی پر اماں کو اپنے  
ہاتھ سے دودھ کا گلاس پلاتا تھا۔ اماں، جلال کو بہت  
دعا میں دیتی تھیں۔ جلال بھی بیوی سے چھپ کر اماں کو  
کچھ نہ کچھ کھلاتا رہتا اور تمام باتوں سے اماں کو آگاہ  
رکھتا..... آفس = آنے کے بعد وہ زیادہ تر اپنی ٹیلی اور  
اماں کے ساتھ رہنا پسند کرتا تھا کبھی انہیں اخبار کی خبریں  
پڑھ کر سنا دیتا کبھی فی وی کھول کر حالات حاضرہ سے  
اماں کو آگاہ کرتا اور اماں کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتا۔  
جلال اماں کو دودھ دے کر جیسے ہی کچن میں خالی  
گلاس رکھنے گیا حنا نے جلال کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

”خوب کرلو خدمت..... کتنا دودھ پلاؤ گے.....  
اپنے بچوں کا تو تم کو خیال نہیں سارا خرچہ اماں پر کرتے  
ہو..... ہائے میری قسمت ہی خراب ہے اماں سب کی  
ہیں لیکن سارا بوجھ ہم پر ہی ہے۔“ جلال نے بیوی کی  
جین پکار پر ادھر ادھر دیکھا اور چپ کراتے ہوئے کہا۔

میں ریکارڈ کر لیتی ہوں اور سب کو سناؤں گی کہ دیکھو ہم تو خدمت کرتے ہیں اور یہ ہمیں کیا صلہ دے رہی ہیں۔  
حنانے ذہن میں شیطانی منصوبہ تیار کر لیا تھا اور بھانے سے جا کر موبائل اندر رکھ آئی تھی اور خود آ کر وہیں کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئی۔

”بچوں کی فیس کے لیے چھالیا کے ڈبے میں....  
تیس ہزار رکھے ہیں خاموشی سے نکال لو۔“ پچھلی دفعہ پچیس ہزار رکھے تھے لیکن اس مرتبہ دواؤں پر زیادہ خرچ آ گیا اب اتنے ہی لے لو۔ تمہارے باپ کی پشیمانی کے پیسوں سے اور جو دوسرے بھائی دیتے ہیں ان سے بچاتی ہوں۔“

”نہیں اماں نہیں..... میں نہیں لوں گا۔ تم ہر دفعہ اتنی بڑی رقم دے دیتی ہو ورنہ ان سب کو پڑھانا میری کم آمدنی میں تو ممکن نہیں تھا۔“

”ہاں بیٹا، ہر بھائی تمہارا اچھا کمار ہے صرف تو ہی ان سب میں مالی طور پر کمزور ہے۔ اس لیے میں تیرے لیے پس انداز کر کے یہ پیسے رکھتی ہوں۔ اگر کسی اور بیٹے یا بہو کو معلوم ہو جائے تو یہ سب میرے دشمن ہو جائیں گے۔“ بلال ماں کو گھٹے لگانے لگا تو وہ ایک دم کراہ اٹھیں۔

”بیٹا کل سے میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میری لمبیں بڑی تکلیف ہے، اب ایک گروہ زیادہ تکلیف دے رہا ہے۔“ اماں کراہتے ہوئے بولیں۔ ”بیٹا اب تو اس گروے میں زیادہ تکلیف ہونے لگی ہے۔“ انہوں نے اپنی کمر پر ہاتھ رکھا۔

”ہاں اماں ایک گروہ تو تم نے مجھے دے دیا تھا۔ اگر نہ دیتیں تو میں مرجاتا ناں.....“ بلال نے اماں سے کہا۔

”نہ بیٹا نہ ایسی بات نہ کر، یہ بات صرف مجھے اور تیرے مرحوم باپ کو اور تجھے پتا ہے اور کسی کو کبھی نہیں بتانا۔ تو میرا پہلا، پہلا بیٹا تھا تجھے بچانا تھا اور میرا گروہ تجھ سے بچ بھی ہو گیا۔ اس وقت اللہ نے تجھے زندگی دی بس یہ سمجھ لے کہ مجھے دوسری زندگی ملی.... اب کبھی ایسا نہیں کہنا۔“ انہوں نے اسے گلے لگایا۔

”پچھلی دفعہ جب ڈاکٹر کے پاس گئی تھی مادر کے ساتھ تو ڈاکٹر کچھ تفصیل بتانے والا تھا پر میں نے اس کو اشارے سے منع کر دیا تھا کہ مادر کے سامنے نہیں کسی کو نہ پتا چلے.... بس بیٹا میں تو اب زندگی کے آخری مراحل میں ہوں تم سب خوش آیا رہو..... میری یہ تمام جائیداد تم سب میں برابر تقسیم ہوگی.....“ انہوں نے تمام قانونی مراحل پورے کر لیے تھے۔

”اور دیکھو میرا جو دوسرا پلاٹ ہے اس کے کاعدات میں نے تم کو دے رکھے ہیں وہ کسی نہیں بتاتا وہ پلاٹ بس اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے رکھ لیتا۔“ اماں نے تمام تفصیلات سے بلال کو آگاہ کیا۔

دوسری طرف حنا ایسے کھڑی تھی جیسے جسم میں لہو نہ ہو وہ اس وقت حیرت زدہ تھی، اس نے اپنے آپ کو کنٹرول کیا اور جب بلال کمرے سے باہر آیا تو اماں کے کمرے میں چائے پیئے تھے موبائل نکال لائی اور ٹارنل طریقے سے بلال سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں ہو۔ آج اس نے اماں کی پسند کا کھانا بنایا اور کافی دیر ساس کے ساتھ بیٹھی ان کے چیر دباتی رہی۔

بلال حیرت سے اسے کھتا رہا پر بولا کچھ نہیں۔ رات کو حنا جب سونے کے لیے لیٹی تو اس کا ذہن ماضی کی طرف چلا گیا۔ اماں ان کی شادی پر کتنی خوش تھیں۔

اماں اکثر بلال کو وزن اٹھانے یا بھاری کام کرنے سے بھی منع کرتی تھیں، یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اماں کے اور بھی بیٹے تھے لیکن اماں بلال کا زیادہ خیال رکھتی تھیں اس کے کھانے... اور پانی پر ہر وقت زور دیتی تھیں کہ پانی زیادہ پیو..... اور وہ کبھی بلال پر ناراض بھی نہیں ہوتی تھیں۔

اس نے کئی، کئی مرتبہ بلال کو الماری کی خفیہ دروازے میں کچھ رکھتے اور نکالتے دیکھا لیکن وہ کبھی شہر نہیں کرتا تھا اور اس کو ہمیشہ لاک کر کے رکھتا تھا۔ اس نے بھی کبھی کھوج کی کوشش نہیں کی لیکن آج کی بات کے بعد اس



ہو جاؤ۔" بلال نے کہا۔

"بلال یہ شمال میں اماں کو دے دوں؟" حنا نے کچھ سوچ کر شمال کو دیکھا اور بلال سے کہا۔ بلال نے کمرے میں جاتے، جاتے رک کر اس کو حیرت سے دیکھا اور اس کی دماغی حالت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی، ایک لمحہ خاموش سا رہا اور پھر کہنے لگا۔

"تمہاری مرضی....." حنا نے سوچا کہ صبح کو اپنے ہاتھوں سے میں اماں کو اوڑھا دوں گی۔ دوسرے دن وہ صبح سویرے اٹھ گئی گھر کے دوسرے کام..... آج اس نے اماں کے اٹھنے سے پہلے نمٹا دیے تھے اس دوران وہ دو دفعہ اماں کے کمرے میں جھانک کر آ چکی تھی۔

"اماں، اماں اب تو اٹھ جائیں..... آج آپ کو کیا ہو گیا..... دس بج رہے ہیں..... چلیں انھیں....." ناشتا کریں اور دیکھیں میں آپ کے لیے کیا لے کر آئی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے شمال اماں کے اوپر ڈالی لیکن اماں کا وجود بے حس اور بے حرکت تھا۔ اس نے اماں کو ہاتھ لگایا تو اماں کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

یہ دیکھ کر وہ چیختے لگی اور اس دوران بلال اور دیگر لوگ بھی جمع ہو گئے۔ بھابیوں اور بچے سب نیچے آ گئے تھے۔

آج حنا نے اماں کی خدمت کا دل سے سوچا تھا اپنی زندگی کو بدلنے کا ارادہ کیا تھا اور اماں کے احسانات اتارنے کے لیے لاکھ عمل تیار کیا تھا لیکن اس سے پہلے اماں اپنا لاکھ عمل تیار کر چکی تھیں انہوں نے اس کے احسان کو لیٹا ہی پسند نہیں کیا اور اسے موقع ہی نہیں دیا کہ زندگی بھر کی بدسلوکی اور برے رویے کی وہ تلافی کر سکے۔

وہ بک، بک کر بین کر رہی تھی۔ ساری بھابیوں اس کے اس طرح رونے پر حیرت زدہ تھیں کہ حنا جو کبھی اماں کو گھاس بھی نہیں ڈالتی تھی آج کس قدر بری طرح رد رہی ہے، یہ تو صرف حنا ہی جانتی تھی کہ حیرت زدہ وہ لوگوں کو نہیں کر رہی بلکہ اماں نے اسے حیرت زدہ بک شرمندہ کر دیا تھا۔ اس نے تو اماں کو گھاس نہیں ڈالی لیکن اماں اپنی تمام پونجی اس کے آگے ڈال کر چلی گئی تھیں۔

کا تجسس بڑھ گیا۔

ایک دن بلال کو آفس کے کسی کام کے لیے حیدر آباد جانا تھا اس نے سوچا کہ کیوں نہ کچھ کیا جائے..... اس نے اپنے تجسس کی خاطر اس دروازے کی خفیہ طور پر چابی بنوائی تھی اور چھپا کر رکھ دی تھی۔

بلال کے جانے کے بعد اس نے کمر اندر سے لاک کر دیا اور چابی سے دروازہ کھولی تو اس میں پلاٹ کے کاغذات، میڈیکل رپورٹس کچھ دواؤں کے نسخے..... اماں کا وصیت نامہ اور بینک کے چیک تھے۔ انشورنس اور سیونگ سٹوفیلیٹ وغیرہ تھے۔ اس نے سب کچھ پڑھ کر واپس اسی طرح رکھ دیا اور لاک کر دیا۔

حنا کے ذہن سے تمام پردے اترنے لگے اس کی نظر میں اماں ایک قابل پرستش ہستی نظر آئیں اور اپنا وجود ایک کچرے کا ڈھیر اسے اپنے آپ سے شرم محسوس ہونے لگی۔ اب اس نے اپنی زندگی کو ایک نئے رخ پر ڈالنے کی کوشش کی۔

"جاؤ دواؤں بلارہی ہیں۔ وہ پانی مانگ رہی ہیں، ان کو پانی جا کر دو۔ تولیا جا کر دو۔ دواؤں ہاتھ پونجیوں کی۔ ان سے پوچھو کچھ چاہیے تو نہیں..... دوسرے دن اس نے بچوں سے کہا۔

بچے حیران تھے اور دیکھ رہے تھے کہ امی کو کیا ہو گیا پہلے تو دواؤں کے پاس جانے سے روکتی تھیں۔

حنا بار، بار موبائل آن کرتی اور اکیلے میں وہ تمام باتیں سنتی جو اماں اور بلال کے درمیان ہوئی تھیں اور بار، بار اپنے وجود کو ایک معمولی کیزا سمجھتی اور افسوس کرتی اپنے آپ پر..... وہ سوچتی یہ سچ ہے کہ بدگمانی کے پودے بڑی جلدی پھٹتے پھوٹتے ہیں۔ تیسرے دن بلال واپس آ گیا تھا۔ وہ اس کے لیے شمال لے کر آیا تھا اور بچوں کے لیے بھی گفٹ لے کر آیا۔

"اماں کے لیے کیا لائے ہو؟" حنا نے بلال سے پوچھا۔

"اماں کو صرف میری ضرورت ہے جس طرح مجھے اماں کی ضرورت ہے..... بس تم یہ شمال لے کر خوش



## رنگِ خلش کو

### رفاقتِ حیا وید

کسی عجب بات ہے کہ ہماری زندگی کے حسن لمحے  
 بھی غمش کی قدر ہو جائے ہیں اور یہ جوں جوں میں احساسِ کوس گئے  
 اندر گہرائیوں میں دفن کر کے کی کوسیں کر رہے ہیں غمش کے سے حساب رنگوں  
 کی پردہ کشائی میں مضطرب کر کے نکلی ہے اور مکافاتِ عمل کی کہی نہ جاسکتی والا  
 سلسلہ شروع ہو جاتا ہے... گنہہ چاہے حیوانیوں کا... سزاوارہ و بدنام ہے... اس  
 نے باوجود سدا سحر سے گہرا ربط و تعلق رکھتا ہوا بھی ہے اور عبادت  
 و رعبت بھی ہے، نا اوصیل بھی اور وحدان بھی ہے۔

ممکن ہے ایسا وقت ہو ترتیبِ وقت میں  
 دشمن کو تیرا ہاتھ بڑھے میرا در نہ ہو





”عالیہ! رشتہ تو مجھے ہر لحاظ سے پسند ہے۔ لوگ بھی اپنے ہی جیسے ہیں۔۔۔۔۔ نمرائی کی تو شرط ہے۔ کہ رزق حلال پر پلنے والا لڑکا ہو۔۔۔۔۔ دوسرے اپنی ہی ذات پات کے ہیں۔۔۔۔۔ نمرائے کے لیے اس خاندان میں ایڈجسٹ ہونا مشکل نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ اور پھر ہم دونوں بھی اس خاندان سے مراسم بڑھانے میں کسی قسم کی تنگی محسوس نہیں کریں گے۔ بڑے گھر میں بنی کا رشتہ کرنا یوں سمجھو کہ بیٹی کو چیتے جی ہی درگور کرتا ہے۔ جس سے ملاقات بڑے گھر کے بڑے بزرگوں کی اجازت کے بغیر ناممکن ہو جاتی ہے۔“ رحمان نے نمرائے کے کئی رشتوں پر غور و خوض کرنے کے بعد بیوی سے کہا۔

”رحمان جی! آپ جیتے، میں ہاری۔۔۔۔۔ میں نے اپنی بیٹی کے لیے بہت دلنشین سنے دیکھے تھے۔ لگتا ہے کہ بیٹی بھی اپنا مقدر ان ہیروئنہ کی طرح کر لے گی۔۔۔۔۔ ماں کی زندگی حسرت و یاس میں ہی بیت گئی۔ بھلا بیٹی مہارانی کیسے بن سکتی ہے؟“ عالیہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”بیگم۔۔۔۔۔ اگر تم اور میں رستے کا تعین ہی ایک دوسرے سے مخالف سمت میں کریں گے تو یہ رستہ کسی بھی موڑ پر ایک نہیں ہو سکے گا۔ اور رستے جدا ہونے کا مطلب تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ہم نمرائے کے لیے اچھا فیصلہ نہیں کر سکیں گے۔ بچوں کے رشتوں میں کامیابی والدین کی ذہنی ہم آہنگی سے ہوا کرتی ہے۔ بعض اوقات میں دوسروں کی شخصیت کی کچھ خوبیوں اور خامیوں کو نظر انداز کر دیتا ہوں تو تم مجھے جھنجھوڑ کر چوکنا کر دیتی ہو۔۔۔۔۔ یہی حال تمہارا ہے، ٹھنڈے دل سے ہمیں اپنی بیٹی کے لیے سوچ، سمجھ کے بعد فیصلہ کرتا ہے۔۔۔۔۔ طعنے تشنہ دے کر ایک دوسرے سے دور ہونا بیٹی کی بد نصیبی کو آواز دینے کے برابر ہے۔ اس وقت ہمیں ایک جان ایک قالب اور یک زبان ہونے کی ضرورت ہے۔“ رحمان نے ملائمت سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”اور تم اپنے دل سے عادل کے خیال کو یکسر نکال دو۔۔۔۔۔ ہمیں پاگل داماد نہیں چاہیے۔“

”آپ نے درست فرمایا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو ایک بات کہوں؟“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔

”کہو عالیہ۔۔۔۔۔ جو بھی ڈر اور خدشات تمہارے دل میں اس رشتے کے بارے میں ہیں، مجھ سے شیئر نہیں کرو گی تو کس سے کرو گی؟“ وہ نرمی سے بولے۔

”آپ نمرائے کے رشتے کے متعلق بہت سنبھلے ہیں۔۔۔۔۔ میری کسی بات پر کان نہیں دھرتے۔۔۔۔۔ اس لیے میں نے تو خود سے یہی عہد کر لیا ہے کہ اب اس معاملے میں کچھ نہیں بولوں گی۔“ وہ روہانسی ہو گئی۔

”ماں نہیں بولے گی تو اور کون ہوگا جو مخلص اور بہترین مشورہ دے گا۔۔۔۔۔ میری باتوں کو ٹیکہ مست لو۔۔۔۔۔ اس وقت مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولے۔

”ایک اور اعتراض بھی ہے مجھے۔۔۔۔۔ لڑکا نمرائے کا کلاس فیلو ہے۔ اسی کا ہم عمر، ابھی تک جاب لیس ہے یعنی ماں، باپ کے ٹکڑوں کا محتاج۔۔۔۔۔ بیوی کی معمولی خواہش بھی پوری کرنے سے قاصر۔۔۔۔۔

☆☆☆

مجھے نمرائے کے لیے چار چھ سال بڑا لڑکا چاہیے۔ جو سیٹ بھی ہو اور اپنے والدین کا محتاج بھی نہ ہو۔۔۔۔۔ اپنے فیصلے کرنے کے قابل ہونا کہ والدین کے اشاروں پر ناپٹنے والا ہو۔“ وہ مستحکم لہجے میں بولی۔

”دوسرا مسئلہ قابل تشویش ہے۔۔۔۔۔ اس طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا کہ وہ تو ابھی تک جاب لیس ہے۔ چھوٹی، موٹی تو کر رہا ہے مگر مستقل نہیں ہے۔ تم درست کہہ رہی ہو۔۔۔۔۔ اچھا ہوا کہ تم نے چپ کار و زہ توڑا۔۔۔۔۔ یقیناً جانو مجھے ان کے گھر کے ماحول کا قطعاً اندازہ نہیں ہوا۔ اور دوسرا پوائنٹ تو اتنا ویلڈ ہے جس پر ہماری بیٹی کا فیوچر منحصر ہے۔ اس ملک میں بیروزگاری کا دور دورہ ہے۔ خوش فہمیوں میں رشتہ نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ انکار کر دو تم۔۔۔۔۔ ایسا



سلطنت و طریقہ تو مجھ میں ہے نہیں۔ تم ہی دانشمندی سے سمجھا پھرا کر انہیں ہال سکتی ہو۔ ان کی عزت بھی رہ جائے اور ہمیں بھی شرمندگی نہ ہو۔“ وہ دھیمے لہجے میں بولے۔

”اب دوسرے رشتے کو دیکھ لیتے ہیں۔ لڑکا انجینئر ہے، برسرِ روزگار ہے، ہاں خاندانِ خوب لمبا چوڑا پھیلا ہوا ہے۔“

”مگر رحمان جی اٹھوتا بیٹا ہے۔“ اس نے ان کی بات کاٹی۔ ”میری نمرائیں اتنی ہمت کہاں کہ خاندان بھر کو مرتے دم تک نبھاتی رہے اور جوتے الگ کھاتی رہے۔ میری بچی تو اس خاندان کی ملازمہ بن کر رہ جائے گی۔“

”اچھا تو تیسرے کے بارے میں مختصر مد کے کیا خیالات ہیں؟“ وہ سہمے ہوئے بولے۔ ”امید ہے یہ تمہیں ضرور بھاجائے گا۔“

”بھئی لڑکے کی ماں حیات نہیں..... چار عدد جوان بچے چھوڑ گئی ہیں..... نمرائیں بڑی بہو..... دو عدد دندوں اور ایک عدد دیور کی خدمتیں اور شادیاں کرتے ہی جوانی ٹاپ جائے گی..... کیوں رحمان جی.....؟ کیا انہوں نے اپنے بچے میری نمرائے کے لیے پیدا کیے تھے؟“ وہ نخوت سے بولی۔

دونوں میاں، بیوی نمرائے کے لیے آئے ہوئے دو تین رشتوں پر تبصرے کر رہے تھے۔ عادل کے رشتے کو انکار کرنے کے بعد عالیہ چاہتی تھیں کہ بس جلدی ہی کہیں نمرائے کا رشتہ طے ہو جائے۔ ادھر رحمان ہر رشتے کی ہار یکیاں کھول کر بیٹھ جاتے تھے۔ اس وقت بھی یہی ہو رہا تھا جب ہر رشتے میں عالیہ کو بے تحاشا منفی پہلو دکھائی دینے لگے تو رحمان اب کی بار چڑھ کر بولے تھے۔

”تو پھر عالیہ ایسے کرو۔ گھر داماد کے بارے میں سوچو..... اور انتظار کرو کسی میں تمہیں فیملی بڑی لگی اور کسی میں خوشحالی کا فقدان..... چلو تمہارے تمام دلائل ول کو جانگے ہیں لیکن زندگی میں ایسے ہی ہوتا ہے۔ شادی ایک ان دیکھے کلچ کا نام ہے۔ جس میں ہاتھ ڈالیں تو بھی ڈاکٹر نکل آتا ہے تو بھی کوئلہ..... کبھی ریشم ہاتھ لگ جاتا ہے تو کبھی ٹاٹ کا کھر درانگڑا..... جہاں تک میرا خیال ہے..... دور رشتہ بہت موزوں رہے گا..... لڑکا انجینئر ہے، ملٹی نیشنل کمپنی میں وی پی کے عہدے پر فائز ہے۔ دو ڈھائی لاکھ تنخواہ تو ضرور ہوگی۔ ماں، باپ کے پاس جو بھی جمع پونجی ہے وہ اسی کی ہے۔ نہ کوئی دوسرا حصہ دار ہے، نہ ہی کوئی اور در دوسرے..... اور تمہاری یہ خواہش بھی پوری ہوتی نظر آ رہی ہے کہ نمرائے چھ سات سال بڑا بھی ہے۔“ وہ اسے نرمی سے سمجھاتے ہوئے بولے۔ ”اور ہیں بھی دیکھنے میں بے حد سادہ اور شریف لوگ۔“ باطن میں کیا کچھ پوشیدہ ہے وہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہاں ہماری ذات کے نہیں ہیں۔“

”میں تو چاہتی ہوں بس میری بچی خوش رہے۔“ وہ ایک آہ بھر کر بولی۔ ”سچ سسرال تو ایسا کرب اور درد ہے کہ اپنا سر کاٹ کر ٹرے میں رکھ کر ان کی خدمت میں پیش کیا جائے تو بھی اسے فریب، مکاری اور چال بازی کا نام دیں گے۔“ وہ دھکی لہجے میں بولی۔ ”میری مثال آپ کے سامنے ہے۔ ساس، سسر، دندوں، دیوروں کے علاوہ بھی باقی سسرالی رشتوں کے لیے میں نے کیا کچھ نہیں کیا..... مگر کیا انہوں نے قدر جانی؟ اپنا حق سمجھ کر میری خدمت، توجہ اور پیار کو وصول کرتے رہے۔ اب تو دل یہ چاہتا ہے کہ نمرائیں بچے دن سے ہی شوہر کے ساتھ الگ گھر میں بیاہ کر جائے اور پھر سب سے دنیا داری اور خاطر جوئی اتنی ہی کرے جتنی دوسری طرف سے ملنے کے امکان ہوں۔ میری طرح ہر ایک کو خوش کرنے کے چکروں میں اپنے دن کا چھین اور رات کا آرام قربان نہ کرے۔ یہی میری نصیحت ہوگی۔“

”ماشاء اللہ، خوب ٹریننگ کر رہی ہو..... اللہ کی بندی اسے سسرال کو جیتنے کے گر سکھاؤ۔ تاکہ مقابلے بازیاں اور بدتمیزیاں سکھا کر اس کی اور دوسروں کی زندگی حرام کر دو۔“ وہ تلخ لہجے میں بولے۔

”سر جھکانے والی، بہو قابلِ مذمت ہوتی ہے، جوتوں اور گھونٹوں کے قابل۔ جس کی گرون جی ہو، اسے کوئی ہاتھ لگا کر..... یا کچھ سنا کر تو دیکھے..... سب آپ جناب میں رہتے ہیں، اپنی عزت کے بچاؤ کی خاطر.....“ وہ تنک کر بولی۔

”اگر تمہارے بھی یہی خیالات رہے تو مجھے تو نمر کا مستقبل کچھ تاریک سا ہی لگ رہا ہے۔“ وہ متذبذب لہجے میں بولے۔

”شکل اچھی نہ ہو تو بات ہی حسین کر لیتے ہیں۔ میری نمر راج کرے گی دوسروں پر، نہ کہ دوسرے راج کریں اس پر۔“ وہ چڑ کر بولی۔

”ویسے آپس کی بات ہے کہ تم عورتوں نے ڈھکوسلا چار کھا ہے مظلومیت اور ستم ظریفی کا۔ مظلوم تو مرد ہے بیچارہ..... جو اتنی ذراے بازاستی کے مجھے چڑھ کر دنیا کے سامنے تماشا بن جاتا ہے۔“ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولے تو وہ بھی ہلکا سا مسکرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”اچھا تو آپس سیدھی پٹری پر آ جاؤ۔“ اب وہ سنجیدہ ہو چکے تھے۔ ”آخری رشتے کے نقوص ذرا سوچ سمجھ کر بنانا۔ لڑکا یوٹائیٹیشنز میں جاب کر رہا ہے۔ تنخواہ دولکھ سے زائد ہے۔ مع گاڑی تین شادی شدہ بہنیں..... ایک عدد عمر رسیدہ ماں..... باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ لڑکا اکھوتا ہے اس کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔“ وہ ہاتھ کو مائیک کی شکل دے کر اس کے لبوں کے نزدیک کرتے ہوئے پھر سے شگفتہ لہجے میں بولے۔

”اور اس کا نام بھی تمہاری پسند کا ہے، سلمان خان..... ہر لحاظ سے سننے میں بہترین لگ رہا ہے۔“

”ان کا گھریلو، رہن بہن اور طور اطوار دیکھ لیتے ہیں۔“ وہ ہاتھ کو پرے ہٹاتے ہوئے بولی۔ ”بڑھیا اسی اکلوتی بہو کے لئے پڑ جائے گی۔ یہ تاریک پہلو ہے۔“

”تو پھر بیگم ایسا کرو کسی تنیم خانے کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ جس بچے کا آگے پیچھے ہی کوئی نہ ہوگا وہی تمہارے لیے آئیڈل ثابت ہوگا۔“ وہ کسی نگاہ اس پر ڈال کر زہر آلود لہجے میں بولے۔ ”یا پھر ایک اور بھی طریقہ ذہن میں آیا ہے۔ شادی کے فوراً بعد ہی ماں کو زہر کھلا دیتے ہیں تاکہ وہ بیٹے کی ماں ہونے کا مزہ تو چکھ لے۔ جس پر وہ غرور و غرور سے مٹی ہوئی تھی۔ اور پھر اس کے سر سہرا بچنے کی آرزو کا خمیازہ بھی بھگتنا ضروری ہے ناں۔“

☆☆☆

”نمر! کب سے فون کر رہی ہوں..... کہاں ہو؟“ حمیرا نے خفگی سے کہا۔

”سمجھا کر دو، گھر میں بہت اہم مہمان تشریف فرما ہیں۔ ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں تھی۔ حمیرا مجھے لوگ بہت خوب لگے ہیں، سلمان بھی بہترین لڑکا لگا۔ دل کو بھانپ گیا ہے، تم بھی اسے پاس کر دو گی۔“ وہ مسرت آگئیں لہجے میں بولی۔

”نمر! اللہ تعالیٰ تمہاری جھولی کو خوشیوں سے بھر دے۔ تمہارے لیے سب بہتر ہونے کے روشن امکان واضح ہیں۔ عاویٰ بہت اپ سیٹ ہے۔ میں نے اس کے دل سے تمہارا خیال نکالنے کی حتی الوسع کوشش کی..... لیکن اس کی سوئی ایک ہی جگہ پر انک کر رہ گئی ہے۔ مجھے اس پر بے پناہ ترس اور پیار آنے لگا ہے۔“ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ”ایسی محبت تو اب صرف فلموں اور کہانیوں تک ہی محدود رہ گئی ہے۔ نہ جانے یہ اس دنیا کے کس حصے کا

## انگ خلش

باشندہ ہے کہ تمہارے نام کا ورد بھی الفت و راحت میں تو کبھی تنفر و جنون میں جھپٹے نہیں تھکتا۔ وائس چانسلر نے اسے اپنے آفس بلا کر اسے فارغ کرنے کی وارنگ دے دی ہے۔ اب تو وہ بیچارہ ہتھے سے ہی اکھڑ گیا ہے۔ اس کی عادت سیما ب میں شوریدگی بڑھ گئی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں خود کو کوئی جانی نقصان ہی نہ پہنچائے۔ وہ افسردگی سے بولی۔

”میں تو مجھے اعتراض ہے کہ وہ نارمل نہیں پاگل ہے۔ اسے پاگل خانے جمع کراؤ۔۔۔۔۔ اگر تمہارا دل اتنا ہی پیچ گیا ہے تو تم اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟ وہ قدرے برہمی سے بولی۔

”تمہارے مشورے پر غور و خوض کیا جاسکتا ہے۔ تم جانتی ہو کہ مجھے اس سے بالکل لگاؤ نہیں۔۔۔۔۔ ہاں ہمدردی ضرور ہے۔ حالانکہ وہ تمہارے لیے تو ایک انمول ہیرا ثابت ہوتا۔۔۔۔۔ میرے لیے تو کھوٹا سکھ ہی ہے۔ اس کے باوجود مجھے اس کی جان کی پروا ہے۔ مجھے اسے سہارا دینا پڑے گا۔“ وہ شدتِ احساس سے بے دم ہو کر بولی۔

”فارغاؤ سب۔۔۔۔۔ اس کا غصہ بھی برا اس کا پیار بھی لعنت۔۔۔۔۔ اس سے دور رہو۔۔۔۔۔ مجھے تو اس پر رتی بھر اعتبار نہیں۔۔۔۔۔ اس کی دشمنی اور دوستی دونوں ہی قابلِ مذمت اور قابلِ مذمت ہیں۔“ وہ زہر آگئیں لہجے میں بولی۔

”میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے نہرا۔۔۔۔۔“ حمیرا نے لاچاری سے کہا۔۔۔۔۔ ”وہ بہت بے ضرر اور صلح جو انسان ہے۔ تم نے اس دولت کو لات مار دی جو ڈھونڈنے سے بھی حاصل نہ ہو۔ فرعون کا خزانہ لٹانے سے بھی اس کا حصول ممکن نہیں۔“ یہ دلوں کے سودے اور لین دین کی باتیں ہیں۔“ وہ دھکی لہجے میں بولی۔

”اگر تم نے اپنے دل کی بیہودہ اور قابلِ مذمت آواز پر اپنی سوچ کو قربان کر ہی ڈالا ہے تو میں منع کرنے والی کون ہوتی ہوں۔ میری دعاؤں تمہارے ساتھ ہوں گی۔ اب میرے اختیار میں صرف یہی رہ گیا ہے۔“ وہ آرزوگی سے بولی۔

”حمیرا دیکھو جو بندہ مجھے اپنے لیے پسند نہیں۔۔۔۔۔ بھلا میں اپنی بہن کے لیے اس کا انتخاب کیسے کر سکتی ہوں۔ تم نے میرا سکون غارت کر ڈالا ہے۔ پلیز حمیرا میری بات غور سے سنو۔ آج اس سر پھرے پر ترس کھانے کا مطلب جانتی ہو۔۔۔۔۔ آنے والے کل میں دنیا کے لیے قابلِ رحم بن جاؤ گی۔ اپنے جیسے مثالی وہم آہنگ خاندان کی بہو بننے کا سوچو۔۔۔۔۔ اس خاندان میں بے حساب مسائل ہیں۔ جن سے ہمیں نابلد رکھا گیا ہے۔“

”ادکے۔۔۔۔۔ میرے مسکے سے باہر نکل کر اپنی طرف آ جاؤ۔ اب جو رشتہ آرہا ہے، اس میں تمہاری مرضی اور پسند کا دخل بہت اہم ہے۔ زندگی تمہاری ہے۔ اسے دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی غلطی مت کرتا۔ اپنا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے دیکھو۔۔۔۔۔ ورنہ تمہارا بوجھ دوسرے لوگ اپنے کندھوں سے اتارنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔“ وہ سختی سے بولی۔

”فینک یو حمیرا۔۔۔۔۔ تمہارے مشوروں پر چلتی تو آج ایک پاگل کے ساتھ میں بھی پاگلانہ حرکتیں اور باتیں کر رہی ہوتی۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”اسے بار بار گل مت کہو نہرا۔۔۔۔۔ میں نے اسے اپنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ بس اس کی طرف سے آمادگی اور رضامندی کا انتظار ہے۔ اشارنا اسے اپنے دل کا پیغام دینے کی کوشش کر دوں گی۔ اب دیکھتے ہیں کہ وہ کتنا سمجھ پاتا ہے۔“ وہ شجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

”اور قربانی کی بے زبان گائے صلابہ ذرا دھیرے، دھیرے اور دیان و گیان سے۔۔۔۔۔ بچی وہ کلیں بات سمجھ نہیں پاتا۔ تمہارے اشارے کنائے کیا خاک سمجھے گا؟ اس کے سامنے کھل کر اعلان کرو۔۔۔۔۔ اس کے پلے کچھ

نہیں پڑے گا۔ اپنی بات پر مصررہے گا کہ مجھے نمر اچا ہے بس نمر اچا ہے۔ یہ تجربہ کر دیکھو۔۔۔ اگر میں جھوٹی ثابت ہوئی تو مجھے ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر اس کی ہو جانا۔۔۔ اگر تمہیں میری باتوں میں سچائی نظر آئی تو پھر تم اسے الوداع کہہ دینا بغیر کسی حیل و جھٹ کے۔“ وہ بھی سنجیدگی سے بولی۔

”میرا خیال ہے نمر۔۔۔ تم تھوڑی جیلس ہوگئی ہو۔ بھی تمہیں وہ سوٹ نہیں کیا۔ میرے ساتھ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ میرے خاندان میں وہ خوب فٹ ہینٹھے گا کیونکہ اسٹینس میں فرق نہیں۔“ وہ الجھ کر بولی تو نمر اٹھا موش ہوگئی۔

☆☆☆

سلمان اور اس کی ماں بہنیں اپنے چند قریبی رشتے داروں کے ہمراہ نمر کو انگوٹھی پہنانے سرشام ہی ان کے گھر پہنچ گئے۔ سلمان تو خوشی سے پھولا نہیں سہا رہا تھا۔ نمر اچھی شریک حیات عالیہ جیسی خوش مزاج ساس اور رحمان جیسا فرشتہ خصائل سسر اسے خدا کی انعامات سے کم نہیں لگتے تھے۔ اور ان کی طرف سے بھی ایسی رُوئے عمل اپنائیت و انسیت میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ کیے جا رہا تھا۔

نش پیش کرتی ہوئی ڈائمنڈ کی انگوٹھی سلمان نے اس کے نازک اور دودھ کے مانند گورے بائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی میں پہنا کر ہلکی سی سرگوشی کی۔ ”اس کے ذریعے میرا پیغام دل تک تو پہنچ ہی گیا ہوگا۔“ نمر اس کی بات پر ذرا سا مسکرائی۔ اور ساس نے لڈو اس کے منہ کی طرف بڑھایا تو اس نے نخرے و نزاکت سے لب کھولے اور لڈو کا معمولی سا حصہ لے کر آہستہ آہستہ چباتے ہوئے دل ہی دل میں بولی۔

”اس لڈو کا ذائقہ کتنا مختلف ہے۔ سنا تھا کہ سنگنی کے لڈو میں محبت و چاہت کی چاشنی کی آمیزش سے اس کا ذائقہ بہت اٹو کھا اور ذرا لا ہو جاتا ہے۔ آج میں نے ایسا ہی محسوس کیا ہے۔“

اگلا مرحلہ سلمان کو انگوٹھی پہنانے کا تھا۔ لرزتے ہوئے ہاتھوں سے نمر نے اس کا ہاتھ پکڑے بغیر اسے انگوٹھی پہنائی تو اس کی حیا و شرم دیکھ کر رحمان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ سعود کی بے حیالی، بے باکی اور بے پردگی ان کے ذہن میں ورو کی لہروں سمیت دارو ہوئی۔

”کاش سعود تم بھی میری بیٹی ہوتے۔“ ان کے دل میں اضطراب اور بے تابی سامی۔ اس کے فوراً بعد نمر وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی اور سلمان کا منہ لٹک گیا۔

”جی جی جی۔۔۔! پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔۔۔ آپ کو قید یا مشقت کی سزا تو سزا دی گئی ہے۔ بس اب ہے آپ کو کھٹکھٹانی زنجیروں میں قید کرنے کا اولین کام۔ وہ بھی بزرگوں نے سوچ رکھا ہے۔“ حیرانے سلمان کو چھیڑتے ہوئے کہا تو وہ مسکرایا۔

”بیٹا سلمان! بھائی صاحب اگلے مہینے کے آخری ویک اینڈ کی بات کر رہے ہیں۔ تمہیں چھٹی لینے میں پراہم تو نہیں ہوگی؟“ سلمان کی والدہ محترمہ صلحہ نے بیٹے کے قریب آ کر سرگوشی کی۔

”اسی مہینے کا آخری ویک اینڈ بہتر رہے گا۔“ وہ بے اختیار سے بولا تو لاؤنج میں موجود تمام لوگ ہنسنے لگے۔ وہ نادم سا ہو کر گویا ہوا۔ ”در اصل چھٹی زیادہ نہیں مل پائے گی اس لیے میں نے عرض کی تھی۔ اس کا ذخیرہ سے جلد از جلد سبکدوش ہو جائیں تو بہتر رہے گا۔“

”بیٹی والے ہیں، کچھ تیاری وغیرہ کے لیے انہیں وقت چاہیے۔ ان کی مجبوری ہے حالانکہ میں نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ جس نے اپنے جگر کو ہماری جھولی میں ڈال دیا وہاں جہیز بے معنی دے وقعت ہو جاتا ہے۔“ ماں



نے سنجیدگی سے کہا تو سلمان نے سر اثبات میں ہلا دیا۔  
 ”رحمان بھائی، اوکے کر دیا ہے سلمان نے۔“ ماں خوشی سے بولی تو کمرے میں موجود سب کے ہاتھ دھلے  
 ... خیر کے لیے اٹھ گئے۔ مہمان ڈنر کے بعد خوشی، خوشی اپنے گھر چلے گئے۔ عالیہ اور رحمان تھکن کے باوجود اپنے  
 بید پر بیٹھے گفت و شنید کرنے لگے۔ پیسے کا جوڑ توڑ، تھوڑا بہت بینک سے قرض... کچھ چھوٹے بھائیوں سے مدد.....  
 دونوں نے مل کر تمام لسٹ تیار کر لی..... کہ کہاں، کہاں سے پیسہ نکالا جاسکتا ہے۔ آخر بیٹی کی شادی تھی۔ جینز وینا بھی  
 لازم تھا۔ سعود کی کئی بدستور عالیہ کوڑ لاتی رہی۔ جس کا ذکر کرنا مناسب نہ لگا تھا۔  
 گھر کی خاموشی میں ایک خوشگوار سی رونق اور گہنا گہمی کا احساس ہونے لگا تھا۔ حالانکہ ابھی تک گھر میں وہی  
 تین لوگ تھے۔ شاپنگ نے ماحول کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ نمر اور عالیہ صبح ناشتے سے فارغ ہو کر جو نکلتیں تو شام کو  
 رحمان آفس سے فارغ ہوتے ہی انہیں مخصوص جگہ سے پک کرتے اور تینوں کی معمولی اور سستی جگہ سے کھانا  
 پکڑتے اور گھر واپس آ جاتے۔ یہ خوشیوں بھرے دن یادگار بننے جا رہے تھے جبکہ سعود کی کئی احساس تینوں کو اندر  
 ہی اندر گھائل کر رہا تھا۔

مختار راجہ نے رحمان کو جو چند دن پہلے سعود کی رپورٹ دی تھی۔ وہ کافی تسلی بخش تھی کہ اس کا ویزا ری نو ہو گیا  
 تھا۔ اور وہ ابھی تک مختار کے گھر میں رہائش پزیر تھا۔ وہ آگے کیا کرنا چاہتا تھا، رحمان کی بیٹی سے بات نہیں ہوئی  
 تھی۔ وہ اس کی غلطیوں کو معاف کرنے کا سوچ کر آگ بگولہ ہو چکا کرتے۔ اس لیے مختار بھی ابھی انہیں اس کے  
 بارے میں تفصیل بتانا نہیں چاہتے تھے جو ناقابل یقین تھی۔ ایک معجزاتی عمل کا زبانی کلاسی یقین کرنا بہت مشکل ہوتا  
 ہے۔ رحمان نے اپنے بیٹے کو جس حد تک غلاظت کے ڈھیر پر ہوش و خرد سے بیگانہ دیکھا تھا۔ اب کانوں پر بھر وسا  
 جھانکتی ہی لگتا۔ اپنی آنکھوں پر یقین کر کے ذہن و قلب کو اعتماد میں لینے کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

”مختار! اس ناخوار کو بتا دینا کہ اس کی بہن کی شادی کی ڈیٹ اگلے مہینے کی پچیس تاریخ کو فکس کی ہے۔ میں  
 اسے بتانا ضروری سمجھتا ہوں، آخر وہ نمر کا بھائی ہے۔ باقی اسے یہاں آنے سے روکے رکھنا۔ تم ہمیشہ کی طرح بہت  
 فراخ دل اور صابر و شاکر انسان ہو جو اسے اتنے دنوں سے سینے سے لگائے بیٹھے ہو۔ میں تو اس پتی کو اپنا بیٹا کہتے  
 ہوئے ڈوب مرتا۔“ رحمان نے مختار سے بات کرتے ہوئے اپنا بند پریشور ہائی ہوتا محسوس کیا۔

”رحمان تم اس کی فکر کرنا چھوڑ دو..... یوں سمجھو کہ وہ میرا دوسرا بیٹا ہے۔ اللہ کرے گا ٹھیک ہو جائے گا۔ آخر  
 تمہاری اور بھالی کی تربیت میں پروان چڑھا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کا اثر ابدی نہ ہو..... جوانی بڑی ظالم شے  
 ہے۔ اچھے بھلوں کو ذلیل کر دیتی ہے۔ یہ تو ابھی بہت چھوٹا ہے۔ شیطان کے چلکے میں آ گیا۔ اسے معاف کر دو۔ جو  
 ہوا سو بھول جاؤ۔ میں سعود کو اگلے مہینے کے شروع میں پاکستان بھیج رہا ہوں۔ گرمی کے بجائے نرمی سے کام لیتا،  
 جوان بچوں کو پینڈل کرنے کے طریقے سیکھ لو، فائدے میں رہو گے۔ ان کے ساتھ ڈنڈے کا استعمال ہماری  
 تربیت کی ناکامی ہے۔ اس کی نوبت ہی نہیں آتی چاہیے۔ سانب بھی مر جائے لاشی بھی سلامت رہے، جوان اولاد  
 کے ساتھ یہی گڑبیس ان گنت پریشانیوں سے دوڑ رہتا ہے۔ بس تھوڑے کو بہت سمجھو اور غلط کو تار سمجھو..... اور تمہیں  
 کیا سمجھاؤں۔“ وہ ہنس کر بولے تھے۔

”خدا کے لیے ہمیں ان نئے رشتے داروں کے سامنے شرمندہ مت کرنا۔ بس اسے وہیں میرا گیری پر لگائے  
 رکھو۔ میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ مجھے نہیں چاہیے سعود جیسا بیٹا۔ اور اس کی ماں کو کچھ خبر نہیں کہ اس

کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ ایک ہی دکھ اس کے لیے کافی ہے کہ وہ ہم سے خفا ہو کر بغیر بتائے واپس چلا گیا۔ آگے کے حالات سے بے خبری ہی بہتر ہے۔ سب قسمت کا لکھا ہے۔ بہت بے بسی ہے۔" وہ سچی انداز میں بولے۔

"کیا بھائی، بہن کی ڈولی کو کندھا دینے نہیں آئے گا؟ کیسی عجیب باتیں کرتے ہو..... ویسے تم میں ہمیشہ سے اونٹ کی خصلتیں نمایاں رہی ہیں..... غفو دور گزر کر نا سیکھو..... انتقامی جذبے نفرت و غصے سے بھرپور باتیں اور رشتوں سے کنارہ کشی بہت عظیم دکھ ہے۔ عمر کے اس حصے میں ان خباثتوں سے باہر نکل آؤ۔ ورنہ بلڈ پریشر اور شوگر لیول ہائی ہونے میں دیر نہیں لگے گی اور ہارٹ ایک تو سوتے ہوئے میں اپنا کارنامہ دکھ جائے گا۔" وہ نرمابٹ سے سمجھاتے ہوئے بولے۔

"مختار تم پر بھی مغربی رنگ چڑھ گیا ہے جو اس کی حمایت ہو رہی ہے۔" وہ تاسف بھرے لہجے میں بولے۔

"رحمان اپنا رویہ بدلو..... لعن طعن کے دن گئے۔ اس حقیقت کو جتنی جلدی تسلیم کر لو گے اضطرابی کیفیت سے چھٹکارا پا لو گے۔ میری ریکویسٹ پر غور کرو۔" وہ محل سے بولے۔

"اس نامراد کا حلیہ ناقابل برداشت اور اس کے اعمال ناقابل معافی ہیں۔ ہم اپنی بیٹی کی خوشیوں کے رنگوں میں بھنگ کی ملاوٹ نہیں کرنا چاہتے۔ اس کی سسرال والے ٹیک طینت، نمازی، حاجی اور پریزگار لوگ ہیں۔ اس نمونے کو دیکھ کر رشتہ توڑ دیں گے۔ خاندان بھر میں بہت رسوائی ہو جائے گی۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے ہم۔ تم یہاں کے کلچر کو کیوں بھول گئے ہو؟ ایسا کرو تم اور بھابی کیوں نہیں آ جاتے؟ اگر تمہارا پرنس اجازت دیتا ہے تو شادی سے دو ہفتے پہلے آ جاؤ، خوب مزہ رہے گا۔ تم سے ملے ہوئے بھی ایک عرصہ بیت گیا۔ یہاں سے ایسے گئے کہ کبھی لوٹ کر آنے کی خواہش ہی نہیں ہوئی۔" وہ دکھ اور مسرت بھرے انداز میں بولے۔

"پرنس تو خیر پرانا ہو چکا ہے، میری غیر حاضری میں بھی اب فرق پڑنے والا نہیں..... تمہاری بھابی سے مشورہ کر کے میں تمہیں اپنا پروگرام بتا دوں گا۔" مختار رضامندانہ انداز میں بولے۔

"یار تم بدلے نہیں، کیا اب بھی سانس لینے سے پہلے بھابی کی اجازت چاہیے ہوتی ہے تمہیں؟" رحمان نے شرارت بھرے لہجے میں دوست کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے..... ہاں، ہاں بالکل تمہاری طرح..... بھلا فطرت بھی کبھی بدلی....." مختار قہقہہ لگا کر بولے۔

"ماحول، جگہیں، رسم و رواج، تہذیب اور دوست احباب بدلنے سے فطرت بھی بدل ہی جاتی ہے۔" رحمان نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم کیوں نہیں بدلے، واقعی حیرت کی بات ہے۔ خیرل بیٹھیں گے تو ایک دوسرے کی تبدیلیوں کو پوائنٹ آؤٹ ضرور کریں گے۔ بس تم میری خوشی کو چار چاند لگانے کا پروگرام بناؤ..... اور آ جاؤ۔" وہ ہنستے ہوئے بولے۔

سگنل ویک ہونے کی وجہ سے فون کٹ گیا تھا۔ مزید گفتگو نہ ہو سکی۔

☆☆☆

"میں نے تمہیں کل دس بار فون کیا۔ ذرا موبائل پر مسد کال دیکھو..... اور فوراً سوری بولو....." عادل نے حمیرا کو فون پر سخت بیزارگی سے کہا۔

"سر میں کل نمر کی سگنی کی رسم اٹینڈ کرنے گئی تھی۔ فون گھر پر ہی رہ گیا تھا ہمیشہ کی طرح..... آتے ہی میں نے آپ کی مسد کال دیکھ لی تھیں۔ دیر ہو جانے کی وجہ سے آپ کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں لگا۔ صبح بارہ بجے تک سوتی رہی۔ ابھی سوچ ہی رہی تھی آپ سے بات کرنے کا کہ آپ کا فون آ گیا۔" حمیرا نے دھڑکتے دل سے اسے نمر کی

سنگی کی خبر بھی سنائی۔

”نہرا کی سنگی ہوگئی؟ یہ خوب رہی..... مجھے بے وقوف بنا کر چلی ہے کسی اور کی دلہنیا بننے..... میرا یہ نہیں ہو سکتا۔“ وہ تہر آلود لہجے میں بولا۔

”وہ تو عمر ہو کر رہے گا۔ اس کی شادی کی ڈیٹ بھی فکس ہو چکی ہے۔ اب تو آپ اپنی توجہ کسی اور طرف مبذول کر لیں..... آپ مجھے چند سو اور وسیعہ انسان کے لیے لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں..... آپ کسی طرف اشارہ تو کریں..... اسے آپ کے قدموں میں لا کر کھڑا کر دوں گی۔“ حمیرا نے عادل کو جنون و دیوانگی کی حد تک مستعد پا کر معاملہ فہمی سے کام لینا چاہا۔

”حمیرا تم جانتی ہو..... مجھے اس سے بے پناہ محبت ہے۔ اس کے ٹھکرانے کے باوجود وہ میرے دل کے نہاں خانوں میں آباد ہے۔ راتوں کے اندھیرے میں وہ میرے ساتھ ہوتی ہے۔ دن کے اجالوں میں وہ میرے دم قدم چلتی ہوئی مجھے اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ میں اس کے بغیر خود کشی کر لوں گا..... اسے میرا پیغام پہنچا دو حمیرا..... پلیز.....“ وہ التجائیہ لہجے میں بولا۔ آنسو عورتوں کی طرح چھم چھم بہہ نکلے تھے۔ اور وہ مایہ بے آب کے مانند ترپ رہا تھا۔

”سر..... اودہ آپ سے نفرت کرتی ہے، آپ کیسے عجیب مرد ہیں کہ جو سامنے ہے وہ نظروں سے اوجھل ہے، حالانکہ وہ دل و جان سے قدا ہے۔ آپ کو اپنا نا چاہتا ہے مگر اس کی محبت کی حدت کو محسوس کرنے سے قاصر ہیں آپ۔“ وہ دھکی لہجے میں بولی۔ مگر ایسی گول مول بات اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔

”حمیرا صرف ایک بار اس سے ملو اودا کیلئے میں..... اسے منا کر چھوڑ دوں گا..... میں نے پچھلے دو سالوں سے

**رات کا مسافر**

ساحل سے پیارے لوٹنے والے ایک مسافر کی ایسی مسافت کا احوال

**طاہر جاوید مغل** کے قلم سے آخری صفحات پر سوغات

**قطب الدین ایبک**

تاریخ کے شہرے اور اوراق کا جادو..... ابتدائی صفحات پر

**ڈاکٹر ساجد امجد** کا انداز بیان

**سودانہ ظور**

مسلمانوں کی جہد مسلسل کا دلخراش ماجرا..... **ڈاکٹر**

**عبدالرب بھٹی** کے قلم سے تلخ حقائق کی نقاب کشائی

**ماروی**

اپنے محبوب کے بمقدم شکر یز رستوں پر گامزن چاہتوں کی

**محی الدین نواب** کا شاہکار

خوابِ ناک داستان.....

2015ء

نورِ کبریا کی گواہی

**سینئر ناٹکسٹ**

ماہنامہ

**مزید**

خطوطِ حیات کی تحفہ

مختار شاعر و سخن اور

مرزا امجد بیگ کا دلدادہ انداز

151

ماہنامہ پاکیزہ - سنی 2015ء

151

ماہنامہ پاکیزہ - سنی 2015ء

بڑے، بڑے پھٹے خانوں کو سیدھا کیا ہے..... نمر اکیا چیز ہے؟ اگر اس نے مان کے نہ دیا تو اسی کے سامنے خود کو گولی سے اڑا دوں گا۔ میں تو تم لوگوں کے درمیان نہیں ہوں گا اس کا حشر دیکھنے کے لیے میری بات یاد رکھنا مانا اس پر تھو کے گا۔“

اس کے دل میں جو بھی آ رہا تھا وہ بولے جا رہا تھا۔ حیرا ڈر کے مارے کانپ اٹھی۔ اس وقت وہ اسے بالکل اپنے ہوش و خرد سے بیگانہ معلوم ہو رہا تھا۔

”سرا میں آپ کو نمر اسے بہ آسانی ملوا سکتی ہوں۔ لیکن آپ کا اس سے ملنے کے بعد کارڈ مل کافی بھیا تک اور روح فرسا ہے۔ اس لیے میری تو پہلی ایسا قبیح فعل کرنے سے پہلے ہی میں مر جاؤں تو بہتر ہے، نمر ا میری بہت پیاری دوست ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس نے آپ کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے، آپ کو خوش خیالی کی دنیا میں پاگل و بے وقوف بنائے رکھا۔ یہ اس کا کمپلیکس تھا، احساس کسٹری یا احساس برتری تھا کہ آپ کو کوری جیکٹ کر کے کسی اور کے آگے کی رونق بننے جا رہی ہے۔ اس کی ریا کاری اور خود غرضی سے مجھے انکار نہیں..... لیکن میں اسے کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچانا چاہتی۔“ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی آواز کسی گہری کھائی سے نکل رہی ہو۔ تمام شوخی رنچر ہو چکی تھی۔ تمام ہمدردی اور نرمی و عاجزی پر پانی پھر گیا تھا۔

”مطلب یہ ہوا کہ تم بھی دغا دے گئیں۔ حیرا اگر تم نے مجھے اپنا یہ روپ دکھایا تو یقین جانو یہ ٹوٹا ہوا دل بھی جڑ نہیں پائے گا۔ میں پہلے ہی اس کی کج روئی سے بہت مضطرب ہوں۔ ایسا انگ و دے سے چور ہو کر گرا رہا ہے۔ تم نے تو اک مضبوط اخلاقی سہارا مجھے اس وقت دیا تھا۔ جب میں شکند تھا۔ اس کے انکار پر..... خود مرکزیت کا شکار ہو کر شغلی جذبات کے دھارے میں بہتا جا رہا تھا۔ ڈوبنے کو تھا کہ تم نے سہارا دے ڈالا۔ حیرا مجھے مر جانے دیا ہوتا۔ یہاں کسی کو میری ضرورت نہیں۔“ وہ آنسو گرا رہا تھا۔ آواز بھاری ہو چکی تھی۔

”سرا۔ آپ اس کم ظرف لڑکی سے بدظن کیوں نہیں ہو جاتے۔ اپنی مراد لگی کو بیدار کیجیے۔ غیرت وانا کو پکارتیں۔ وہ آپ کے دل سے اتر جائے گی۔ اس کی گارنٹی دیتی ہوں۔“ اسے اس کی حالت پر بے پناہ ترس آیا اور غصہ بھی۔ ”انوکھا مرد ہے کہ اس کی بے رخی و بے اعتنائی کے باوجود اسے یاد کر کے رو رہا ہے۔ اور اپنی زندگی کا ہر لمحہ جہنم رسید کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس سے ملاقات کے بعد مسئلہ حل نہیں ہوگا بلکہ اس کی بے قراری، شعلگی اور کم مائیگی کا احساس اتنا بڑھ جائے گا کہ برداشت کرنا مشکل ہو جائے گا۔ بہتر ہے جو محبت کا چھپر اس نے کھولا تھا اسے ابھی بند کر کے مطمئن و پرسکون ہونے کی کوشش کرے..... میں جو اسے سہارا دینے کے لیے تیار ہوں۔ میں اس کی میا سحی بنوں گی۔ نمر ا تو بے وقوف نکل..... جس نے اس سادہ انسان کو کوری جیکٹ کر ڈالا۔ ایسی فطرت اور مزاج کے شوہر ہی تو اپنی بیوی کو بے پناہ خوشیاں دے سکتے ہیں مگر کم بخت کو میں نظر آؤں تو بات ہے۔ اسی کا ورد پڑھنے سے فرصت ملے تو اپنے حقیقی اور سچے پر خلوص مسیحا کو اپنے دل کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے محسوس کرے۔ وہ منہ میں بد بدائی جسے عادل نہ سمجھ سکا۔

”تو پھر وعدہ کرو کہ کب اور کہاں ملاقات کروا رہی ہوئے“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔ یہی تو اس کی سب سے بڑی خامی تھی کہ ایک بات پر اڑ جاتا تو پھر کسی کی سننا گوار نہیں کرتا تھا۔ نمر ا کا اعتراض اس کے کانوں میں چٹائی بن کر گونجنے لگا..... وہ گہری سوچ میں چلی گئی۔

”سوچنا پڑے گا۔“ وہ گھو خلاصی کرنے کے لیے بولی۔

”بس جلد ہی بتانا۔ انتظار میں سوئیں پاؤں گا کہ تم کیا جانو۔“ وہ آہ بھر کر بولا۔



## رنگِ خلش

”اس سے ملاقات مشکل اور نئی لڑکی ڈھونڈنا آسان لگ رہا ہے مجھے..... کیوں نہ ہم یہ نیک کام کریں۔۔۔۔۔  
آپ کی مہم کا بھی مسئلہ حل ہو جائے گا۔ بیٹے کا گھر آباد دیکھنے کی ہر ماں کو بہت چاہ ہوتی ہے۔ آپ اپنے ذہن کو کسی  
اور طرف مائل کرنے کی کوشش کریں۔ نمراب پرانی ہے بلکہ وہ کبھی آپ کی بھی ہی نہیں۔“ وہ نرمی سے بولی۔  
”وہ میری ہے حمیرا۔۔۔۔۔ وہ کسی کی نہیں۔“ وہ زور سے چیخا اور فون بند ہو گیا۔

”پاگل کہیں کا یہ تو حد درجے کا بے غیرت اور بے عزت نکلا۔۔۔۔۔ کچھ ذہنی مریض ہے۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی  
انھی، اتنا و ماغ کھپانے کے بعد اس کا سر پکرا گیا تھا۔ فرح کچھ کھول کر اس نے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور ایک ہی  
سائس میں غٹا غٹ جتی چلی گئی۔

”نمراب کا فیصلہ درست تھا۔ میں چلی تھی ہمدردی کرنے۔۔۔۔۔ نعت میری عقل پر اس سے شادی کرے گی میری  
جوتی..... یہ انسان تو دو گھنٹوں میں مجھے پاگل کر دے گا۔ آج کے بعد اس پاگل سے رابطہ بند.....“ نمراب کی باتیں اور  
فصاحتیں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ اس نے مستحکم اور اعلیٰ فیصلہ کیا تو دل سکون و طمانیت سے بھر گیا۔

☆ ☆ ☆

شادی سے تین ہفتے قبل نمراب کے مایوں کی رسم گھر میں ہی نہایت سادگی سے منائی گئی۔ اس میں شرکت کرنے  
والوں کی تعداد بھی بہت کم تھی۔ اس کی نکاح فیلوز اور سہیلیوں میں سے صرف حمیرا کو مدعو کیا گیا تھا جو اس کے بہت  
قریب تھی۔ پیلے رنگ کے جوڑے میں اس کا گورا صندل اور سندور کی آمیزش میں پنک لٹکارے مارتا ہوا رنگ  
اور نکھر گیا تھا۔ دھڑا ہوا، سر بے، کاہل اور لپ اسٹیک سے عاری چہرہ پیلے رنگ کے دوپٹے کے بالے میں ایسا  
پاکیزہ اور معصوم لگ رہا تھا کہ عالیہ عالم وارنگلی میں بار بار اس کی نظر اتارے جا رہی تھی۔ رحمان بھی مطمئن اور خوش  
نظر آ رہے تھے۔ حمیرا نے رات نمراب کے ساتھ ہی گزار دی۔ دونوں طلوع سحر تک کالج اور یونیورسٹی کی پرانی یادوں کو  
کرپرتے ہوئے کبھی اداس ہوتیں تو کبھی اپنی کئی بے وقوفیوں اور نادانیوں پر قہقہے لگاتے تھیں۔ اسی گفتگو کے  
دوران عادل کا نام بھی کئی بار اچھلا..... جسے نمراب نے مضحکہ خیز انداز میں پرے پھینک ڈالا تو حمیرا نے اسے چھیڑتے  
ہوئے کہا۔

”ویسے میں تمہاری دانشمندی، دور اندیشی اور چالاکی کی داد دیتی ہوں کہ تم نے خاموش رہ کر نہ تو اس کی محبت  
کا اقرار کیا نہ ہی انکار کو ضروری سمجھا..... اپنا مطلب نکالا اور اسے خبیثہ کا کردار بھی حاصل کر لی بلکہ اپنی کلاس  
میں ٹاپ کر گئیں۔“

”حمیرا تمہیں غلط فہمی ہے، میرے والدین کی طرف سے سوچ بچار اور فیصلہ کرنے میں دیر ہو رہی تھی۔ مجھے تو  
بر حال میں خاموش ہی رہنا تھا۔ ان کا فیصلہ ہاں میں ہوتا تو بھی مجھے خاموش ہی رہنا تھا۔ جب ابو جی نے میری  
آبادی جاننا چاہی تو میں نے انہیں اپنے دل کی سچائی کھول کر بیان کرنا ضروری سمجھا۔۔۔۔۔ کیونکہ میں ان سے چیننگ  
نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میرے اور ابو کے خیالات ایک دوسرے سے خاصی مشابہت رکھتے تھے۔ جبکہ امی اس کے  
برعکس تھیں..... میں نے سر عادل کو دھوکا دے کر ڈگری حاصل نہیں کی۔ اگر وہ میرا جی پنا اے بڑھا رہے تھے  
تو اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ میں آج بھی اس بات کا اعتراف کرتی ہوں کہ سر عادل نے مجھے دوسروں کے  
ساتھ شرمندہ بھی کیا اور مجھے میری نظروں میں گرا بھی دیا۔ میں جو بھی تھی جیسی بھی تھی اصل اور خالص تھی، خواہ مخواہ  
میری ڈگری میں غلاطت اور ندامت بھری۔ میں انہیں کبھی معاف نہیں کروں گی اور تم بھی دوسروں کی زبان بول  
رہی ہو کہ میں نے چالاکی اور ہوشیاری سے بے مثال کامیابی حاصل کر لی..... حمیرا تم نے آج کے بعد مجھے ایسی بات

کبھی تو خدا کی قسم تمہیں چھوڑ دوں گی ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے..... مجھے کسی کی باتوں کی پروا نہیں... لیکن تمہاری باتیں مجھے ہرٹ کرتی ہیں۔“ وہ احتجاجاً بولی۔

”آئی ایم سوری نمرا..... میں نے تو مذاقاً کہا تھا تم سیریس ہو گئیں۔“ حمیرا نے نادام ہوتے ہوئے کہا تو نمرا نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ بندہ کھسکا ہوا ہے، کیا سمجھتا تھا کہ مجھے احسانات کے بوجھ تلے دبا کر زمین کی گہرائیوں میں اتار دے گا اور میری سوچ پر خود کو مسلط کر کے اپنی خواہش پوری کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ یہ خوش خیالی تھی اس کی..... میرا نام بھی نمرا ہے جو کسی کے رعب و اب میں آنے والی نہیں..... وہ راہِ راست پر گامزن رہتی ہے اور اسے اپنی عزت کروانا خوب آتا ہے۔“ وہ غصے اور غفلت سے بولی۔

”مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ اس کے باوجود وہ بے غیرت انسان تمہیں ابھی تک بھلا نہیں پایا..... تمہیں یاد کرتے ہوئے بچوں کی طرح رونے لگتا ہے، میں نے بھی ہر حربہ استعمال کیا کہ وہ تمہیں دل سے نکال دے..... کیونکہ ایسے ہی پاگل لوگ جب انتقام لینے کی ٹھان لیتے ہیں تو پھر انہیں اپنی پروا رہتی ہے نہ دوسرے کی عزت و جلال کا خیال رہتا ہے۔ وہ تم سے کتنا پیار کرتا ہے، میں نہیں جان پائی مگر اب اندازہ کر سکتی ہوں۔ تمہاری نفرت بجا ہے۔“ وہ نھوت سے بولی۔

”آئی ڈونٹ نو حمیرا..... اسے پاگل پن، دیوانہ پن نہ کہوں تو اور کیا کہوں.....؟ اس کے دل میں میرے لیے جتنی تیزی سے محبت حملہ آور ہوئی تھی۔ اسی رفتار سے کافور بھی ہو سکتی ہے۔ میری شادی ہو جانے دو، پانی کے ٹیلے کی طرح اس کی محبت کا نشہ بیٹھ جائے گا جس محبت کا ڈھنڈورا بٹا دیا جائے وہ تو ذلت اور اذیت ہے۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔ یونیورسٹی کے ہر فرد کی زبان پر عا دل کی محبت و لگن کی اور میری بے وفائی دریا کاری کی داستان ہوگی۔ عورت کی عزت بہت نازک ہوتی ہے، سلمان تک اس کی یہ باتیں پہنچ گئیں تو نہ جانے کیا قیامت آجائے۔“ وہ رو پڑی۔

”تم ٹھیک کہتی ہو..... اگر وہ نارمل ذہن کا مالک ہوتا تو اپنے احساسات و جذبات کو یوں بے مول و بے قیمت تمہاری جھولی میں ڈالنے کی کوشش نہ کرتا..... بچے کی طرح ضد کہ گھیلن کو مانگے چاند۔“ حمیرا نے بھی نفرت آمیز لہجے میں کہا کبھی کبھار اس سے میری بات ہو جایا کرتی تھی۔ اس کی حالت پر مجھے اس پر بہت ترس آنے لگا تھا مگر میں نے محسوس کیا کہ اس کے اندر وحشت و درندگی کا بیج بھی اتنا ہی گہرا ہے جتنا تمہاری محبت کا..... اب میں نے اس سے رابطہ بند کر دیا ہے۔ تمہارا فیصلہ سو فیصد درست تھا۔ بس میری دعا ہے کہ تم نے اب جو بے غرضانہ سودا کیا ہے۔ اس میں کبھی خسارہ نہ ہو پھر بھی حفظِ ماتقدم کے طور پر سلمان کے گوشِ گزار دو، اس کی حماقت اور نادانی۔“ وہ دعا یہ انداز میں بولی۔

”حمیرا! حماقت میری تھی جو اس کم عقل کے بلانے پر فرسٹ ٹائم اس کے آفس چلی گئی اسے تو شل گئی اپنی محبت جتانے کی..... پھر اس نے کیسے، کیسے مجھے ذلیل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تم تو جانتی ہو، فیل کر کے بھی اور پاس کر کے بھی..... دونوں طریقے سراسر ذلت اور ندامت سے بھر پور تھے۔“ وہ افسردہ لہجے میں بولی۔ اس نے میری شرافت، صبر، مروت اور لحاظ کا غلط مطلب لیا۔ جب سوچتی ہوں تو دل کو کچھ کے اور تازیانے لگنے لگتے ہیں۔“

”چھوڑو نمرا..... ہم گزرے ہوئے وقت کی خوب صورت اور ناقابلِ فراموش یادوں کو آواز کیوں نہ دیں۔“

حمیرا نے ہنستے ہوئے کہا۔

## رنگِ خلش

”ان یادوں کے ہمراہ سرعادل کی یاد بھی نہ چاہتے ہوئے ہمیں قبول کرنی پڑے گی۔ بیچے ہوئے وقت کی یاد دہانی سے ہم مٹھاس اور مٹی کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے۔ دونوں مل کر ذہن و قلب پر برستی ہیں۔“ نمرائے دہلی لہجے میں کہا۔ ”یہ ایسا یونیورسٹی کے نام کے ساتھ ہی منسوب ہو چکا ہے۔“

”نمرائے دہلی نے تمام رات کپ شپ میں ہی گزار دی۔ اپنے ہی بھائیوں، بہنوں کا گوشت بھی کھایا۔ اور طبیعت بھی خراب کر لی۔ ابکائی آنے لگی ہے اب تو۔“ حمیرا نے ہنستے ہوئے غیبت گوئی کی طرف اشارہ کیا۔

”ابکائی تو خیر اور ایکٹنگ محسوس ہو رہی ہے۔“ نمرائے دہلی ہنسنے لگی۔ ”میں ابھی قہوہ بنا کر لاتی ہوں۔ تم وضو کرو اور نماز پڑھ کر سونے کی کوشش کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔ ورنہ دن بھر طبیعت بہت بوجھل اور سست رہے گی۔“

”شادی میں دور کے مہمان ہمارے گھر ٹھہر ادینا کچھ دن ہمارے گھر میں بھی رونق اور گہما گہما جم جائے گی۔“ حمیرا نے جھٹکی لیتے ہوئے کہا۔

”ہم نے اسی شہر میں بسنے والے رشتے داروں کو انوائسٹ کیا ہے جو شادی ہال میں ہی آئیں گے اور کھانا کھا کر وہیں سے رخصت ہو جائیں گے۔ گھر میں ٹھہرانے والا ایک فرد بھی نہیں کیونکہ امی کے لیے بہت مشکل ہو جاتی۔ حالانکہ دل تو یہی چاہتا ہے کہ شادی والا گھر دور سے نظر آئے لیکن ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ تمہاری شادی پر اپنے تمام ارمان پورے کر لوں گی۔“ نمرائے دہلی نے پرسکون لہجے میں کہا اور اٹھ کر کچن کی طرف چل دی۔ حمیرا بھی وہاں سے اٹھ کر اس کے پیچھے چل پڑی۔

☆☆☆

”واٹ آبگ سر پرانز۔۔۔۔۔۔ مختار تم نے بہت اچھا کیا۔۔۔۔۔۔ آکر دیکھو کہ چند سالوں میں پاکستان کتنا بدل گیا ہے۔“ رحمان نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

”اس کا اندازہ تو مجھے ہے۔ اس لیے بچوں کے ساتھ اپنے ملک آنے کا کوئی شوق نہیں رہا۔ ایسے وزٹ کا کیا مزہ جس میں ڈر اور خوف ہر وقت سر پر منڈلاتا رہے۔ اب بھی ہم دونوں ہی آرہے ہیں۔ سوچا شادی کے بہانے سب سے ملاقات ہو جائے گی۔“ مختار نے کچھ تاگواری سے کہا تو رحمان کو بہت برا محسوس ہوا۔

”یار۔۔۔۔۔۔ ایسی بھی کوئی خوف و خطر اور ظلم کی بات نہیں۔۔۔۔۔۔ جب یہاں رہو گے تو تمہیں حالات بے حد نارمل معلوم ہوں گے۔ دور رہنے والوں کے لیے تو ایسے ہے جیسے یہاں تو ہر وقت قیامت برپا رہتی ہے۔ خدا سمجھے اس میڈیا سے جنہوں نے اپنے ہی ملک کو ذلیل و رسوا کر کے رکھ دیا ہے۔“ رحمان نے افسردگی سے کہا۔

”بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ ذرا غور کرو کہ اب دنیا کا بچہ، بچہ ہمارے ملک کے نام سے آشنا ہے۔ خوش قسمتی سمجھو ورنہ ہمیشہ بے نام و نشان ہی رہتے۔ خیر۔ آکر ہی تمام باتیں ہوں گی۔ پرسوں شام پانچ بجے کی فلائٹ ہے ہماری۔۔۔۔۔۔ کام کی مصروفیت میں بھول نہ جانا۔“ مختار نے شریر لہجے میں کہا تو رحمان بھی ہنسنے لگے۔ فون بند کر کے وہ کچن کی طرف بڑھ گئے۔ یہ مژدہ جانفزا عالیہ کو سنانے کا کہ سعود کے کمرے کو ان کے لیے سیٹ کر لے۔

”رحمان جی! کاش میرا بچہ بھی آ جاتا۔“ وہ بھرائی آواز میں بولی۔ ”مختار بھائی اسے ضرور ڈھونڈ نکالے۔“

”چپ۔۔۔۔۔۔“ انہوں نے لبوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ”رنگ میں بھگ ڈالنا ہمارے فیور میں نہیں جاتا۔ ہم لڑکی والے ہیں، یہ مت بھولو۔ ہمارا تعلق مل کلاس سے ہے اور ان لوگوں کا حافظہ بہت تیز ہوتا ہے۔ سالوں پرانی بات کی یاد دہانی ایسے لفظ بہ لفظ کرنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ جیسے کل کی بات ہو۔ اس لیے سعود کا کردار، مزاج اور ظاہر اندہ پن یاد رکھو۔۔۔۔۔۔ اور کبھی بھولے سے بھی اپنے دل میں اس خواہش کو ابھرنے نہیں دینا۔ وہ

اُسی ماحول کا دلدادہ تھا۔ وہیں نوکری کر رہا ہوگا۔ وہ ضرور خیریت سے ہے۔۔۔۔۔ ورنہ اس کی طرف سے اتنی خاموشی نہ ہوتی۔ بس یہی دعا کیا کرو کہ بس جیسا بھی ہے زندہ سلامت رہے اور مشکلات و آزمائشوں سے بچا رہے۔ ہمارے لیے تو وہ غیر ہو گیا۔ مگر ہے تو ہمارا اپنا خون۔ وہ دکنی لہجے میں بولے تو عالیہ کے آنسو رخساروں کو بگھونٹنے لگے۔

”رحمان جی! وہ میرے جسم کا حصہ ہے۔ چاہے جسم کا قابلِ خدمت حصہ ہی کیوں نہ ہو اسے کیسے فراموش کر دوں۔۔۔۔۔ آپ کو میں مستی ہوئی نظر آتی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اسے بھلا کر اپنی زندگی میں مست ہو گئی ہوں۔ ہر پہل وہ میرے ساتھ ہوتا ہے۔ آپ ماں کے دل کو نہیں جانتے۔ اس کی سوچ تک آپ کی رسائی نہیں۔“ وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ”اور پھر دوسرا ظلم یہ ہے کہ مجھ پر اس کا نام لینے پر بھی پابندی ہے۔ میں بھی اپنے خاندان بھر میں اس کی خوب تعریفیں کر کے اپنا دل ہکا کر لیتی ہوں۔ ورنہ تو پچھت ہی جاؤں۔“

”بیگم! تعریفوں کا سلسلہ جاری رکھو۔۔۔۔۔ جس دن اس کی اصلیت سب کے سامنے آگئی تو پھر پتو بھر پانی میں ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔ اور تمہیں چلو بھر پانی بھی نصیب نہیں ہوگا۔ تم ماں ہو، اپنے بچے کی برائی کرنا تمہیں زیب دیتا ہے نہ ہی تم سے اس کی توقع کی جاسکتی ہے لیکن خدا را خاموش تو رہ سکتی ہو۔“ وہ سمجھانے کے انداز میں بولے۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ بس مجبور ہوں خود پر اختیار نہیں۔“ وہ تان توڑے پر گرم کرتے ہوئے بولی۔ ”نقد یہ بھی کیسے، کیسے رنگ دکھاتی ہے۔ بیٹی کی طرف سے دلی تسکین اور ذہنی اطمینان ہے تو بیٹے کی طرف سے دکھ، درد اور رنج کا پیکانہ ایسا بدمعاش کہ ہر خوشی بے وقعت معلوم ہونے لگتی ہے۔ ہاتھ بالکل خالی لگنے لگتے ہیں۔“

”اللہ پر بھروسہ رکھو۔۔۔۔۔ اس نے ہمارے لیے بہت بہترین سوچ رکھا ہے۔ اس میں ہی کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہے۔“ وہ زماٹ سے بولے۔

”کھانا ٹیبل پر لگاؤں کہ نرالی پر لے آؤں؟“ وہ ڈونگے میں سالن نکالتے ہوئے بولی۔

”جس میں تمہیں آسانی ہو۔۔۔۔۔“ لہجہ ہمدردانہ تھا۔ ”اگر حکم ہو تو کچن میں ہی کھانا کھالیتا ہوں۔“

”رہنے دیں۔۔۔۔۔ آپ کی خوشامدوں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ دوست آرہا ہے ناں۔۔۔۔۔ اب ان کی خدمت گزاری اور خاطر جوئی کے لیے میری کچھ تو خوشامد کرنی ہی پڑے گی۔“ وہ اپنا بھیگا ہوا چہرہ ددپنے کے پلے سے صاف کرتے ہوئے بولی۔ ”ویسے مہمانوں کے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔“

”اطلاعاً عرض ہے کہ اس کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ مختار میرا کو لیک اور بچپن کا ساتھی ہے۔“ وہ مسرت و راحت آگئیں لہجے میں بولے۔ ”میری جان بھی اس کے لیے حاضر ہے۔ میری ریکوئسٹ پر شادی اٹینڈ کرنے آرہا ہے۔“

”امی مجھے مدد کے لیے بلا لیا ہوتا۔“ اسی اثنا میں نرا بچن کے دروازے میں کھڑی ہو کر خوشگوار لہجے میں بولی۔

”مہمان بیٹی، ہماری میزبانی کو انجوائے کرے۔“ رحمان نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ”تمہاری جدائی اور دوری ہمیں ہر پہل انگھارہ کھے گی۔“

”تو پھر میں نہیں جاؤں گی آپ سے دور۔۔۔۔۔ میں تو عمر بھر آپ کے زپر سایہ رہنے کی خواہشمند تھی۔ آپ نے ہی جلد بازی دکھادی۔“ وہ نظریں جھکا کر بولی۔

”بیٹی ماں، باپ کے گھر میں نہیں اپنے گھر میں ہی بھلی لگتی ہے۔ ہمارے جنمبھروں نے بھی اپنی بیٹیاں دوسروں کے گھروں کی زینت بنا ڈالیں۔ ہم تو بہت تاتواں اور ارزاں حیثیت کے لوگ ہیں۔“ ان کے لہجے میں دکھ سا گیا تھا۔

☆☆☆



## رنگِ خلش

”حمیرا بیٹی! آج نمرائے کے پاس تمہاری موجودگی بہت ضروری ہے۔ اسی لیے تو میں شادی سے دو دن پہلے مایوں کی رسم کرنے پر زور دے رہی تھی کہ مایوں کی دلہن کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔ لیکن کیا کروں.....؟ میری کوئی بات سننے والا تو ہو..... یہ سن کر تندیں، بھابھیاں اور دیورائیاں تو کاٹ کھانے کو دوڑیں کہ ہمارا رواج مبینہ بھر پہلے مایوں بٹھانے کا ہے۔ کیونکہ لڑکی پر شادی کے جوڑے میں روپ خوب آتا ہے۔ میری نمرائے کا پہلے ہی روپ بھر بھر جاتا ہے۔ اسے دن رات امین رگڑنے کی ضرورت تو ہے نہیں۔ بس سب نے مجبور کر دیا۔ میں نے تو پھر مین ہنسنے پہلے اسے بٹھالیا بس اب بیٹا میں وقتاً فوقتاً تسہیں جگ کرتی رہوں گی۔ کیونکہ نمرائے کو اکیلا چھوڑنا درست نہیں۔“ عالیہ نے حمیرا کو فون پر نمرائے کے پاس رہنے کے لیے کہا۔

”بھد شوق..... آپ تنگ کریں..... میری خوش نصیبی ہے آنٹی..... ورنہ آپ کے بہن بھائیوں کی بیٹیوں کی کمی تو ہے نہیں..... یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی ہے کہ مایوں کے بعد دلہن کو تنہا چھوڑنے میں کیا قہاحت ہے؟“ وہ حیران کن لہجے میں بولی۔ ”ضرور پرانی ہتھ ہوگی۔“

”بیٹا ہم بزرگوں کی زبانی سنتے آئے ہیں کہ مایوں کے جوڑے میں دلہن پر ہر طرح کے بھوت پریت، جن اور پریاں عاشق ہوتی ہیں۔ وہ ہر وقت اس کے تنہا رہنے کا انتظار کرتی ہیں۔ اگر ایک لمحے کو بھی وہ انہیں اکیلی نظر آجائے تو اس پر حملہ آور ہو جاتی ہیں۔ دلہن مر بھی سکتی ہے۔ بے ہوشی میں بھی جاسکتی ہے اور عمر بھر کے لیے اپنا بچ بھی ہو سکتی ہے۔“ عالیہ کے لہجے میں خوف عمود کرایا تھا۔ حمیرا اس کی مصیبت پر قلقل ہنسنے لگی۔

اس نے عالیہ کو سمجھانے کی کوشش کی نہ ہی دلائل دیے۔ آنے کا وعدہ کر کے اس نے فون بند کر دیا۔ جب سے اس نے عادل سے شادی کرنے کے ارادے کو دل سے کھرچ کر نکال دیا تھا۔ وہ پھر سے نمرائے کے بہت قریب ہو گئی تھی۔ اور عالیہ سے حالاتِ حاضرہ، سیاست اور ملکی حالات پر زور شور سے گفتگو ہونے لگی تھی۔ ان دنوں موضوع بدل چکا تھا۔ تمام وقت شادی کے پروگرام بنانے میں مگن رہا کرتا تھا۔

☆☆☆

رحمان، محقر کو ریسو کرنے اور پورٹ جانے کے لیے تیار کھڑے تھے کہ عالیہ بھی پرس اٹھائے ساتھ جانے کے لیے چل پڑی۔ رحمان نے حیرت سے بیوی کی طرف دیکھ کر استغناء مہ لہجے میں کہا۔

”تمہارا تو ایسا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ نمرائے پر اکیلی ہوگی یا وہ بھی ساتھ چل رہی ہے۔ وہ بھی بیٹے مایوں کے جوڑے میں.....؟“

”حمیرا آنے ہی والی ہے۔ فکر کی بات نہیں۔ آپ مجھے مارکیٹ ڈراپ کرویں۔ نمرائے کا ویڈیو ڈریس تیار ہو گیا ہے اور جیولری کا بھی فون تمہیں چار بار آچکا ہے۔ سوچا دونوں کام آج ہی کیے دیتی ہوں۔ آپ کی جب بھی ازپورٹ سے واپسی ہوگی۔ مجھے فون کر لیجیے گا میں آپ کو شاپ کا پتا بتا دوں گی، وہیں سے مجھے پک کر لیجیے گا۔ ایک پنٹھ دوکان..... کیسا لگ میرا پروگرام۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

”بہت خوب، ورنہ کل میری شامت آگئی ہوتی۔ بھئی اب بازار کے پھر ختم کرو، گھر میں مہمان آرہے ہیں، کچھ ان کی خاطر تواضع کا سوچو..... مگر پلیز جان کی قربانی سے باز رہنا۔“ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولے تو دونوں مین زور سے ہاں نکلنے سے پہلے واپس پٹنے۔ نمرائے کے کمرے میں رحمان نے جھانکا۔ وہ ایپ ٹاپ پر بڑی تھی۔

”بیٹا..... میں ڈور لاک کر لو..... حمیرا بھی پہنچنے والی ہے۔ تسہیں اکیلے میں ڈر تو نہیں لگے گا؟“

عالیہ نے بھی اندر جھانک کر کہا تو نمرائے ٹاپ ساؤنڈ ٹیبل پر رکھ کر اٹھ گئی۔

”ای پہلے بھی تو ہزاروں بار اسی گھر میں اکیسی رہی ہوں۔ آج مجھے ڈر کیوں لگنے لگا ہے؟“ عالیہ ذرا سا مسکرائی اور دونوں باہر نکل گئے۔ نمرابا ہر ہی رک کر انیس گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پیار سے دیکھنے لگی تو عالیہ نے اندر جانے کا اشارہ کیا تو وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی مین ڈور لاک کر کے پھر اپنے کمرے میں آگئی۔

☆ ☆ ☆

حمیرا الماری میں سر دیے کبھی ایک ڈنگر باہر نکالتی تو کبھی دوسرا..... کیا مجال ہے کہ ایک ڈر لیس بھی پسند آ رہا ہو۔ اور موبائل کی رنگ نے تو کمرے میں بالکل چار کھی تھی۔

”اس موبائل کو دل چاہتا ہے کوڑے کے ڈھیر پر پھینک آؤں۔ کم بخت جب سے ایجاد ہوا ہے۔ دن اور رات کا سکون ہی غارت ہو گیا ہے۔ اب تو کوئی اور ہم سفر ڈھونڈنے کی ضرورت ہی نہیں..... یہی کم بخت اسی کا رول پہلے کرتا ہے۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی ڈر۔ سز کو وہیں چھوڑ کر مزی اور سائڈ ٹیبل سے فون اٹھا کر نمبر دیکھے بغیر آن کر دیا یقین تھا کہ نمر کا فون ہوگا۔ اس نے دوسری طرف سے ہیلو کی آواز کا بھی انتظار نہیں کیا تھا۔

”مجھے علم تھا کہ تمہارا ہی فون ہوگا۔ بس ایک گھنٹے میں تمہارے پاس ہوں گی..... تیار ہونے ہی جا رہی تھی اپنی نمودارہنیا کے لیے آکس کریم اور ریگر بھی لیتی آؤں گی۔ آخر چند دنوں کی مہمان ہو۔ بس پہنچ رہی ہوں مجھے معلوم ہے تم اکیلی ہوگی..... پر ڈرنے کی کی کوئی بات نہیں۔ جب تک اپنے ہونے والے دولہا میاں کو فون کرلو۔ گپ لگاؤ، تمہیں تنہائی کا احساس ہوگا نہ ہی میری کمی محسوس ہوگی۔“ حمیرا دانی سے بولے جا رہی تھی کہ دوسری طرف سے فون کٹ گیا۔

”بالکل ہی ڈر پوک ہے۔“ وہ فون وہیں پر رکھ کر پھر الماری کی طرف بڑھ گئی۔

راحہ عادل نے حمیرا کا تمام پروگرام اور نمر کے حالات سن کر کچھ کہے بغیر فون رکھ دیا تھا۔ ذہن میں لاوا الیچے گئی مہینے ہو گئے تھے۔ اب وہ بھٹنے کو تیار تھا۔ حمیرا کی خاموشی پر بھی بے پناہ قہر و جلال تھا کہ وہ بھی اب نہ تو فون کرتی تھی نہ ہی اس کی کال ریسیو کرتی تھی۔ محی اپنے گھر اور یونیورسٹی کے درمیان گھن چکر بنی ہوئی تھیں۔ گھر پر شوہر کی بیماری، بیمار داری اور یونیورسٹی میں لیکچرر کی ڈیمانڈ اور سمسٹر کا اشارٹ اور اینڈ کو پھناتے ہوئے عادل سے ملنے نہ آ پائیں۔ فون پر ہی رابطہ تھا، وہ بھی کبھی کبھار..... یونیورسٹی سے عادل کو ریزائن کرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا کیونکہ اس کی آئے دن کی چھٹیوں نے سمسٹر ہی لیٹ کر دیا تھا۔

عادل کو دنیا کے ہر بندے سے شکایت تو پہلے سے ہی تھی۔ اب اسے رینکشن کا جان لیوا کرب ستانے لگا تھا۔ روز بروز زخموں کی تعداد میں اضافے کی وجہ سے طبیعت میں انتقام و بدلے کا جذبہ بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے فون بند کیا اور غصے سے اسے سامنے والی دیوار پر دے مارا اور گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔ لفٹ تک پہنچتے ہوئے اس نے خود کو ہوش دلانے کی کوشش کی مگر سر میں خناس بھرا ہوا تھا۔ آنکھوں میں خون اتر رہا ہوا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اس نے نمر کو غلیظ اور بے ہودہ گالیوں سے نوازتے ہوئے گاڑی اشارٹ کی اور ہوا کی رفتار سے اڑاتا ہوا ریڈ لائٹس کر اس کرتا ٹریفک پولیس کی پروا کیے بغیر نمر کے گھر کے گیٹ پر گاڑی روک کر باہر نکلا۔ اوپر ہو کر گیٹ کھاندا۔ ہاتھ ڈال کر اس نے گیٹ کھولا اور اندر چلا گیا۔ مین ڈور پر پہنچ کر اس نے ٹیل دی تو نمر اٹھا نہیں بھرتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی اور مین ڈور کھولنے سے پہلے بڑبڑائی۔

”ای تو کہہ رہی تھیں کہ تم ایک ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچنے والی ہو۔ آج تو تم نے کمال ہی کر دیا۔ دیر سے آنے والی حمیرا میں اتنی جستی اور پھرتی کیسے آگئی۔ حیرت کی بات ہے۔“ وہ خود کلامی کرتی دروازے تک پہنچ گئی تھی۔ مین ڈور

## انگہ خلش

کھولتے ہی اس کی چیخ صلق میں پھنس گئی۔ سامنے عادل خونخوار طبعی میں کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سے کوئی سوال کرتی۔ عادل نے اسے ہلکا سا دھکا دیا اور تیزی سے اندر آ گیا۔ اور دروازہ لاک کر کے اس کا بازو مضبوطی سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا کمرے میں لے آیا۔ سکتے کے عالم میں وہ کم صم سی ہو گئی تھی۔

دو چیخ سکی نہ ہی اس غصے کی وجہ پوچھ سکی۔ حملہ اتنا جلد اور شدید تھا کہ اس کا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ اس کے منہ میں اسی کا پیلا مایوں کا دو پٹا ٹھونسا ہوا تھا اور وہ مابی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔

☆☆☆

حمیرا نے گیت کھلا دیکھا تو حیران و پریشان ہوتی ہوئی گاڑی پورچ تک لے گئی۔ مین ڈور کا ایک پٹ بند لیکن دوسرا ہلکا سا کھلا دیکھ کر وہ ششدر رہ گئی۔ تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ نمرا کو آوازیں دیتی ہوئی اس کے کمرے تک چلی گئی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا مگر لاک نہ نہیں تھا۔ حمیرا نے آہستہ سے دروازہ کھولا تو نمرا کو بستر پر نیم بے ہوشی کی حالت میں دیکھ کر چیخی۔

”نمرا، نمرا آنکھیں کھولو..... کیا ہوا ہے؟ مجھے کچھ تو بتاؤ۔ ورنہ مجھے کچھ ہو جائے گا۔“ نمرا نے بے بس ولا چار اجڑی ہوئی آنکھیں کھولی اور پھر بند کر لیں۔ عالیہ آنٹی کی باتیں حمیرا کے کانوں میں گونجنے لگیں، جنہیں وہم و توہمات سمجھ کر وہ فہم دی تھی۔

”نمرا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں..... جلدی اٹھو، میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔“ وہ اس کے بالوں کو ماتھے سے ہٹاتے ہوئے بولی۔ ”پیلے کپڑوں میں سرسوں کا پھول لگ رہی ہو۔“ تمہیں اچانک ہوا کیا ہے؟ ابھی تو میری تم سے بات ہوئی تھی۔ مگر اس وقت بھی تمہاری طرف سے کوئی رسپانس نہیں تھا۔ خاموشی تھی اور پھر تم نے فون بند کر دیا۔ کیا اس وقت بھی تمہاری یہی حالت تھی؟ ایک بار ایک دو لفظوں سے اپنا حال تو بتاؤ میں تیار ہوں بغیر پہنچ جاتی۔“ وہ اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولی مگر نمرا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھٹی، پھٹی نگاہوں سے چھت کو گھورتی رہی۔ حمیرا نے کبل ٹھیک کیا اور اس کا سر آہستہ، آہستہ دبانے لگی۔ کافی دیر بعد حمیرا نے اپنے موبائل پر ٹائم دیکھا۔ شام کے سات بج رہے تھے۔ شاید فلاسٹ لیٹ ہو۔“ وہ بڑبڑائی۔ ”آنٹی بیچاری بازار میں خوار ہو گئی ہوں گی۔ انگل کا انتظار کرتے، کرتے۔“ اس نے ہمدردی و خلوص سے سوچا اور عالیہ کو فون کر دیا۔

”میں تمہیں فون کرنے ہی والی تھی۔ دراصل فلاسٹ تین گھنٹے لیٹ ہے۔ اس لیے میں تو اس وقت نیکیسی میں بیٹھ رہی ہوں۔ تھوڑی دیر میں پہنچتی ہوں۔ تم میرے آنے تک نمرا کے پاس ہی رہنا۔ اسے اکیلا نہیں چھوڑنا بلکہ آج نمرا کے پاس ہی رہ جاؤ۔ وہ بھی خوش ہو جائے گی۔ بائیل کا دو چھوڑنے پر بہت اداس ہے۔“ وہ تاکیداً بولی تو حمیرا نے اسے دل کھول کر تسلی دی۔ نمرا کی خراب طبیعت کا ذکر کرنا مناسب نہیں لگا۔ کیونکہ وہ اداس ہے۔ بیمار نہیں..... اسے یقین ہو چلا تھا تقریباً آدھے گھنٹے بعد عالیہ گھر پہنچ گئی۔ نمرا ابھی تک آنکھیں بند کیے ساکت و جامد لیٹی ہوئی تھی۔ عالیہ دیکھ کر تڑپ گئی۔ جلدی سے گرم دودھ میں شہد ملا کر لے آئی۔ اسے سہارا دے کر بٹھایا اور زبردستی اسے دودھ پلانے کی کوشش کرنے لگی لیکن نمرا کی طرف سے بے حد خاموشی تھی۔ عالیہ ہلک اٹھی۔

”بیٹا اپنے گھر خوشی خوشی جاؤ، جانتی ہوں والدین کا در چھوڑنا آسان ہرگز نہیں..... لیکن یہ دکھ تو سہنا ہی پڑتا ہے۔“ دیکھا... حمیرا اتیری دوست کو حاسدوں کی نظر لگ گئی۔ میں نہ کہتی تھی کہ مایوں کے لباس میں دہن پر جن بھوت عاشق ہو جاتے ہیں، میں کل ہی حضرت جی کو گھر بلا لوں گی۔ کسی نے جاو کر دیا ہوگا۔ کیونکہ بغض و عناد میں شریک مر رہا ہے۔ بس رات خیریت سے گزر جائے۔“ وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اوٹ پٹا لگ بولے جارہی تھی۔ اور

حمیرا اندر ہی اندر شرمندہ ہو رہی تھی کہ اس نے آنے میں دیر کیوں کر دی؟ آنٹی کی بات تو سچ ہوگئی کہ اسکیلے پن میں اس کی طبیعت ہی خراب ہوگئی۔ ہو سکتا ہے کسی جن یا چڑیل نے قبضے میں لے لیا ہو۔

☆☆☆

”گاڑی اتنی تیز رفتار تھی کہ ایک سیڈنٹ ہونا لازم تھا۔“ پولیس مین نے سائرہ کو افسردہ سے بتایا۔ ”تنگم صلابہ آج کل کے لڑکوں پر، جوانی بھی عجیب ہی طریقے سے آئی ہے۔ نہ بڑوں کا لحاظ نہ چھوٹوں کی تمیز۔۔۔۔۔ اس لیے جوان لڑکوں میں ایک سیڈنٹ کی تعداد خاصی بڑھ گئی ہے۔ کیونکہ وہ ہمارے اشارے پر رکنا اپنی توہین سمجھتے ہیں، گالی دے کر گزر جانا ان کا شیوہ ہے اور آج کی لڑکیاں تو ان سے چار ہاتھ آگے ہیں۔ بس جی ایم نے بھی اسی سڑک پر کیسے، کیسے مزاج کے لوگ دیکھے ہیں۔ قومیت، انسانیت اور شرافت نام کی چیز نہیں رہی کسی میں۔ نفسا نفسی کا عالم ہے، بالکل ایسے ہی جیسے ہر کوئی چاہتا ہے کہ میں آگے جانے والی گاڑی سے آگے نکل جاؤں اور نکلتا ہی چلا جاؤں۔ تمام گاڑیاں میرے پیچھے ہوں، یہی حال ہے اس وقت ہمارے معاشرے کا۔۔۔۔۔ کرسی پر بیٹھے والوں کا۔۔۔۔۔“

سائرہ نے دیکھ بھری نظروں سے اسے دیکھا اور خدا حافظ کہہ کر اپنی گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔ عادل کی ٹونی پھوٹی گاڑی کو سڑک کے درمیان سے ہٹا دیا گیا۔ گاڑی کی موجودہ حالت دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ اس گاڑی میں سوار ایک فرد بھی زندہ نہیں بچا ہوگا۔ سائرہ نے ہاتھ جوڑ کر اللہ تعالیٰ کے غضب سے پناہ مانگی اور اس کا شکر ادا کرتی ہوئی اسپتال کی طرف چل دی۔ تمام راستے اس کے آنسو بہتے چلے گئے۔ عادل کی پیدائش سے قبل۔۔۔۔۔ اور بعد کے دن فلم کی طرح ذہن کے پروجیکٹر پر تیزی سے سامنے آنے لگے۔

”آف میرے بچے کا بچپن، لڑکپن اور جوانی حسرتوں کی آماجگاہ بنی رہی۔۔۔۔۔ میری ایک یادیدہ، انجانی معمولی سی غلطی کی سزا میرے اس لخت جگر کو بھگتنی پڑے گی۔ کاش مجھے اس کا علم ہو جاتا۔ میرے رب میرے بچے کو عمر و راز بخش۔ اور اسے بہترین صحت عطا فرما۔ اس کے ذہن و قلب کو اپنے نور سے روشن کر دے۔ اس کی حرکات و سکنات کو اپنی پسند کے مطابق ڈھال لے اور اسے سکون دے دے۔ اس کے اضطرابی اور سیما مزاج کا رخ تسکین و طمانیت کی طرف موڑ دے۔ آج تو نے اس کی زندگی بچا کر، مجھ پر احسان عظیم کر دیا ہے۔ میرے مولا میں تیرا شکر ادا کرنے والی زبان سے ہی محروم ہوں، مجھے وہ زبان عطا کر دے۔ جو سوائے شکرانے کے اور کسی لفظ سے آتش نہ ہو اور میرے گناہوں کی سزا میری اولاد سے ہٹا دے۔ میرے مالک تو، تو دلوں کے بھیدوں سے واقف ہے۔“ وہ اسی عالم میں دعائیں کرتی اسپتال کی پارکنگ میں پہنچ گئی اور بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی آئی سی یو کے باہر نرس سے عادل کی رپورٹ معلوم کرنے لگی۔

☆☆☆

رحمان نے وی آئی پی لاونج کے ریسپشن پر اپنا انٹری کارڈ دکھایا۔ اس رپورٹ سیکیورٹی سسٹم کی تمام فارمیٹیو پوری کرنے کے بعد وہ لاونج میں آگئے۔ صوفے پر بیٹھے وہ سامنے گئے ہوئے پلازما کی اسکرین پر ٹاک شو دیکھتے ہوئے مہمانوں کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ پیرے نے چائے کی پیش کش کی تو انہوں نے مسٹر دکر دی اور نظریں پھر ٹی وی پر جم گئیں۔ انہیں وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔ جب مختار راجا کی آواز سماعتوں میں گونجی تو وہ اچنبھے سے کھڑے ہو گئے۔ مختار سے ملنے کے بعد راحت بھابی سے علیک سلیک ہوئی اور ان کا اور بچوں کا حال دریافت کیا تو مختار نے آگے بڑھ کر اپنا نیت، لگاؤ اور محبت سے بھرپور سلجھ میں کہا۔

”رحمان میرا بیٹا بھی میرے ہمراہ ہے، ان سے ملے ان کا نام بھی بہت ہی خوب صورت ہے ان کی شخصیت و



کردار کی طرح، ”رحمان نے ان کے قریب کھڑے ہو جان کی طرف دیکھا۔

"آئی کانت بی لیواٹ....." ان کے منہ سے ہے اختیار اُکلا۔۔۔۔۔ معبود ایک مہذب پاکستانی شہری لگ رہا تھا اس کا چہرہ اس کی اندرونی کیفیت کی غمازی کر رہا تھا۔ لبوں پر ندامت بھری مسکراہٹ اور آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ ان سکتے کے عالم میں حواس باختہ سے ہوکرات دیکھے جا رہے تھے رآخر تو ٹوڑے توقف کے بعد معبود کے لب مشکل پھر پھر آئے۔

”ابو جی آئی ایم ایکسٹریملی سوری۔ میں نے آپ کو خوشیاں دینے کے بجائے بے حساب دکھ دیے۔“  
 اواز پر وہ ایک دم سے چوٹکے اور گردن کو جنبش دی۔ کافی دیر وہ خود کو ٹارٹل کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔  
 ”رستہ کھوجانے والے بھولے بسرے جب راہِ مستقیم پر آتے ہیں تو باری تعالیٰ انہیں معاف فرما دیتے ہیں۔  
 ہم تو پھر اس کے بندے ہیں۔“ یہ مشکل بولتے ہوئے وہ صوفے پر آ کر بیٹھ گئے۔ سب ان کے سامنے ہی براجمان  
 ہو گئے۔۔۔ وہ دھیمے لہجے میں گویا ہوئے۔ ”اور میں تو بہت ناجیز اور حقیر انسان ہوں۔ میری مجال نہیں بیٹا کہ تمہیں  
 معاف نہ کروں۔۔۔۔۔ بلکہ میں اسی مراجعت پر تمہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں لیکن تمہیں یہ بتا دوں کہ میری بعض  
 رک گئی تھی، دل کی دھڑکن جواب دے گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی شان کا یہ روپ دیکھ کر۔“ وہ اسے گلے لگا کر خوشی سے  
 اٹکھیار ہوتے ہوئے بولے تو راحت بھالی اور مختار کی آنکھیں بھر آئیں۔

”رحمان تم جو بھی دیکھ رہے ہو اس میں ہمارا کمال نہیں..... اوپر والے کو اس معصوم اور بھولے بھالے بچے پر رحم آگیا اور اس نے مجھے بھی ایک صبح ایسے ہی شاکدہ کر دیا تھا جیسے آج تم ہوئے ہو۔ یہ اس کی اپنی چوائس تھی، میرا برائے ہرگز نہیں تھا۔“

”مختار تم نے میری نسل کو تباہ و برباد ہونے سے بچا لیا۔ میرے نام کو ابدی بناؤ والا۔ اللہ تعالیٰ یہ نیک کام تمہارے ہاتھوں کروانا چاہتا تھا۔ ورنہ انسان کی مجال کہاں کہ پتھر کو موم بنا ڈالے۔ مان گیا ہوں ماشاء اللہ مختار تم تو بہت عقلمند نکلتے۔ ہمیشہ کی طرح مجھے آج بھی پچھاڑ کر خوش ہو رہے ہو۔۔۔۔۔ راحت بھابی آپ ہی اسے بیٹا کہنے کی سزاوار ہیں۔ محض پیدا کرنے والے ہی والدین کے رتبے کو حاصل نہیں کرتے۔ اس مرتبے پر آپ جیسے والدین بھی فائز ہو جاتے ہیں۔ جب وہ کسی کی بھڑی ہوئی اولاد کو راہِ راحت پر لا کر ان کی زندگی کے مقصد کو بدل ڈالتے ہیں تو ان کا مقام فرشتوں اور غنیمتوں کے برابر ہو جاتا ہے۔“ وہ عقیدت مندانہ انداز میں بولے جا رہے تھے اور سعود ابھی تک باپ کے گھٹنوں پر سر رکھے معصوم بچے کی طرح بیٹھا ہوا تھا اور مختار اور راحت یہ منظر جو اک یادگار بن گیا تھا دیکھ کر مفلوظ ہو رہے تھے۔

سامان کی کلیرنس ہونے کے بعد سب گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے تو مختار نے خوشی سے مغلوب ہوتے ہوئے کہا۔  
 "میں اپنے بیٹے کی مزید پروگریس رپورٹ دینا چاہتا ہوں۔ میرے بیٹے نے یونیورسٹی دو بارہ جوائن کر لی  
 ہے، اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں..... فیس کا انتظام اس نے بذاتِ خود کیا ہے، پڑھائی جاری رکھنے کا فیصلہ بھی اسی کا  
 ہے۔ اس نے اپنے لیے ہر فیصلہ خود کیا..... جاب سے لے کر یونیورسٹی تک کا سفر اس نے اکیلے طے کیا ہے۔ کسی کا  
 ساتھ تھا نہ ہی رہنمائی تھی۔ اپنا رہنما اور مسیحا اس کی اپنی ذات ہی تھی..... اور فقط اپنے مالک کی مددگاری شامل حال  
 تھی کیونکہ نیت نیک اس نے باندھی تو رہنمائی مالک نے کر دی۔ اس لیے رحمان تم اس کے اس حیلے کو عارضی مت  
 سمجھنا۔ وہاں کے اسلامک سینٹر کا ہر وائز ممبر ہے میرا سعود۔" سعود دلنشیں مسکراہٹ سے باپ کو دیکھے جا رہا تھا جیسے  
 کہہ رہا ہوں آپ کو ایسے ہی بیٹے کی چاہ تھی جس کے پیدا ہونے کی آپ نے خواہش کی تھی۔

”یہ معجزہ اس ذات کی طرف سے مجھ تا چیز پر کیسے نازل ہو گیا؟“ رحمان نے اسٹیرنگ تھماتے ہوئے حیرت و اشتیاق سے کہا۔ ”مختار مجھے اپنی قسمت پر یقین کیوں نہیں آ رہا۔ میری آنکھیں اور میرے کان بھی حیرت زدہ ہیں۔“

”آج تمہیں اللہ تعالیٰ نے چھپر پھاڑ کر بے حساب رزق سے نوازا ہے کیونکہ تم نے کروڑوں کے حرام سے اپنے لیے رزق حلال چھان لیا۔۔۔۔۔ بھابی کے صبر و تحمل کے شیر نے اسے پروان چڑھایا۔ آپ دونوں کی یہ قربانیاں میرا مولانا نکال کیسے کرتا۔۔۔۔۔ وہ تو رزق حلال پر اکتفا کرنے والوں کا ساتھی ہے اور صبر کرنے والوں کو بہترین اجر سے نوازنے کا اس نے وعدہ کر رکھا ہے۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ سبحان اللہ سبحان اللہ!“ مختار نے عقیدت مندانہ لہجے میں کہا تو رحمان کے اندر کی سچی اور انتشار میں تحفیف ہوئی تو وہ توقف کے بعد بولے۔

”سعود! بیٹا مجھے معاف کر دیتا۔ میں نے تمہارے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ درست ہرگز نہیں تھا اس وقت میرا ایمان کمزور اور اعتقاد بہت دھیمّا پڑ گیا تھا جو خود کو یہی سب کچھ سمجھ بیٹھا اور تمہیں چڑا تھا سدھارنے۔۔۔۔۔“ لہجے میں پچھتاوا اور شرمندگی تھی۔

”ابو آپ بے قصور تھے، میں نے کبھی آپ کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا۔ اگر آپ کی جگہ کوئی اور باپ بھی ہوتا تو وہ ایسے ضییت بیٹے کو زبردستی کر مار ڈالتا۔ آپ سے ایسا کوئی جرم اور گناہ سرزد نہیں ہوا۔۔۔۔۔ میں ہی قسمت کا مارا اور پاک ذات کا دھتکارا ہوا انسان تھا کہ اپنی جنت کو چھوڑ کر جہنم کا انتخاب کر لیا۔ اگر حق رانگل نہ ہوتے تو ابو میں عمر بھر جیل سے باہر نہ نکل پاتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کسی غیر مذہب سے دوستی مت لگو، وہ آہستہ آہستہ تمہیں اتنا کمزور اور لاغر کر دے گا جیسے لکڑی کو گھن اندر ہی اندر چاٹ کر کھوکھلا کر دیتا ہے۔ ابو جی میں نے اس گناہ کی سزا بھگت لی ہے، آپ نے ہمیں زندگی کے نشیب و فراز میں سرائٹھا کر جینے کی تربیت دی تھی، خود داری اور غیرت کا درس دیا تھا، حسین سلوک، اخلاقیات اور وضع داری کی مثال قائم کر کے ہمیں راہ راست پر چڑانے کی بے پناہ کوشش کی تھی۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ آپ کی اس شاندار تربیت کی مصروفیت کی ہماری شخصیت سے مفتو ہو جاتی۔ ابو اسی نور اور اسی روشنی کی چھاپ میرے گنہوں پر ثبت ہو کر مجھے پُر نور کر گئی۔ آپ کی محنت رانگیاں نہیں گئی۔ اللہ تعالیٰ مجھے ثابت قدم رکھے۔۔۔۔۔ یہی میری دعا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے اور کچھ نہیں مانگتا۔۔۔۔۔ جسے اپنے رب اور نبی پاک کا قرب حاصل ہو گیا اس کی تو جھولی فضل و کرم اور رحمتوں سے بھر گئی ناں۔۔۔۔۔“ سعود اپنی ہی لے میں بولے جا رہا تھا۔ اسے محسوس ہی نہیں ہوا کہ وہ اپنے ابو کو غیر محسوس طریقے سے لکچر دینے جا رہا ہے۔ اس کی زبان سے ادا کردہ ہر لفظ میں سچائی تھی۔ کہیں بھی جھوٹ اور مکاری نہیں تھی۔ خوشامد نہیں تھی۔ رحمان کی آنکھوں سے جو آنسوؤں کی جھڑی گئی تو رکنے کا کام نہیں لے رہی تھی۔ یہ وہ خوشی تھی جس میں دو جہانوں کی کامیابی ہی کامیابی تھی۔ آج رزق حلال کا مطلب کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ فخر کے بجائے رحمان میں عاجزی و انکساری نے ڈیرے جما لیے تھے۔ حالانکہ رحمان کے چہرے پر جی داڑھی اور شلو اور ٹخنوں سے اونچی اور سر پر ٹوپی اور ہاتھ میں تسبیح نہیں تھی مگر اعتقاد و ایمان رگ و ریشہ میں بسیرا کرتا تھا۔ ظاہر اندہ روپ سے بڑھ کر انہیں اسلامی عقیدوں و اصولوں پر چل کر خود کو بہترین مسلمان کہلانا تھا۔ وہ اسی راستے پر گامزن تھے اور مختار بھی ایسی ہی فطرت کا تھا۔ فقط قواعد و ضوابط پر اکتفا کرنے والا وہ بھی نہ تھا۔ اپنے اخلاقیات و دینی سلوک و رویے کا ہمیشہ سے قائل تھا اور یہی ان کی اصل قوت تھی جو سعود کو اپنے دین خالص کی طرف واپس لے آئی تھی۔

جاری ہے



## پرنذہ

شرح طاہر

”سوئے کا نوالہ کھلا کر شیر کی نظر سے دیکھنے والی  
 بات سمجھ میں آتی ہے مگر یہ روکھی سوکھی کھلانے کے بعد  
 شیر سے بھی زیادہ غضب ناک نظر سے دیکھنا بھلا کہاں کا  
 انصاف ہے؟“ وہ جو بڑے انہماک سے قمیص پر سوئی  
 سے کڑھائی کر رہی تھی اس کی بات سن کر وہیں ہاتھ  
 روک کر نا سمجھی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔  
 ”اب یہ تمہارے دماغ میں کون سے کیڑے نے  
 حرکت کی ہے جو کوڈل پکھری کرنے بیٹھ گئی ہو؟“

”بھی سانس نہ لیں۔“ اس کا انداز ایک دم تیزی لیے ہوئے تھا۔

”ہاں تو پھر مت لو سانس۔“ اس نے تو جیسے حد ہی کر دی۔

”زرین.....؟“ حیرت و دکھ کے سطرے جیسے تاثرات لیے اس نے کہا۔ ”تم میری سگی بہن ہو کر ایسی بات کیسے کر سکتی ہو جبکہ تم خود سب جانتی ہو۔“

پچھی آنکھوں کے ساتھ وہ اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

”سگی بہن ہوں تمہاری جیسی تمہیں سمجھاتی ہوں۔ تم خود کیوں نہیں سمجھ جاتیں..... ہم مولوی علیم اللہ کی بیٹیاں ہیں جنہیں خدا نے دو بیٹیاں دے کر گویا زندگی بھر کی آزمائش میں مبتلا کر دیا ہے۔“ اس نے بڑی تلخ حقیقت بیان کی تھی۔

”انہوں نے خود ہمیں اپنے لیے آزمائش بتالیا ہے ورنہ خدا کبھی بیٹیوں کو آزمائش بنا کر پیدا نہیں کرتا۔“ وہ اس تلخ حقیقت کی محی کم کر رہی تھی۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی وہ..... اس بار زرن نے اختلاف نہیں کیا اسے چپ دیکھ کر وہ مزید کہنے لگی۔

”جھک آگئی ہوں میں اس شخص زردہ ماحول سے۔ ابا کی بے جا سختیوں اور فضول کی روک ٹوک سے۔ دیکھنا جس دن میری برداشت ختم ہوگئی چھوڑ کر بھاگ جاؤں گی اس ماحول کو بھی اور ابا کو بھی۔“ تنفر سے کہتی وہ اسے دہلائی تھی۔

”ایسی باتیں مت کیا کرو رونا مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”اوسہ!“ اس کے خوف کو کسی کنتی میں نہ لیتے ہوئے وہ سر جھٹکتی اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔ زرن کنتی ہی دیر اس کے نقش پا کو دیکھتی ہوئی رہی۔ خود کو اس کے وقتی غصے کا دلاسا دیتی دوبارہ سے اسی ٹیبل کی طرف متوجہ ہوگئی تھی جو اسے آج رات مکمل کر کے دیٹی تھی۔

☆ ☆ ☆

مولوی علیم اللہ حد سے زیادہ دقیقاً نوی انسان

”تمہیں تو جیسے کچھ پتا ہی نہیں بہت معصوم ہو تم!“ خاصا جل کر جواب دیا گیا تھا۔

”کچھ پتا دوگی تو مجھے بھی پتا لگ جائے گا اور تمہاری بھڑ اس بھی نکل جائے گی۔“ اب کی بار اس نے سوئی اور فریم ایک طرف رکھ کر پوری توجہ اس کی جانب مبذول کی تھی۔

”ابا نے کالج میں داخلہ لینے سے منع کر دیا ہے..... کہہ رہے ہیں بس میٹرک کر لیا یہ کافی ہے۔

اب گھر بیٹھ کر گھر داری سیکھو۔“ برا سا منہ بتائے اس نے ساری تفصیل اس کے گوش گزار کی تھی جسے سن کر اس نے گہری سانس بھرتے ہوئے دوبارہ سے فریم اٹھا کر سوئی ہاتھ میں پکڑ لی اور بولی۔

”تو کیوں پڑھنا چاہتی ہو اتنا زیادہ.....؟“

”میرا شوق ہے بہت سارا پڑھنا۔“ اپنے شوق کا اظہار کرتے وقت اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمکے تھے۔

”شوق رول دیتے ہیں رونا، مت اسنے اونچے شوق پالا کر۔“ اس سے خود اس کی اپنی آواز میں دبی حسرتیں سن سکتی محسوس ہوئی تھیں۔

”یہ تمہاری سوچ ہے ورنہ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔“

اس کی بات کو رد کرتی وہ فوراً بولی۔

”تم شوق پال کے دیکھو، تمہیں حسین خوابوں کو پانے کی گن محسوس ہوگی تو زندگی بھی حسین محسوس ہونے لگے گی۔“ زرن نے بس ایک نظر اس کے جوشیلے انداز کو دیکھا پھر سر جھٹکتی بولی۔

”میں ہمیشہ اپنی چادر دیکھ کر شوق پالتی ہوں۔ اگر تمہاری طرح اونچے شوق پالنے لگ گئی تو چادر سے نکلتے پاؤں میری شخصیت کو بد صورت بنا دیں گے۔“ اس نے اپنی سر اٹھاتی حسرتوں کو بڑی آسانی سے جھڑکا تھا۔ ”تمہارے لیے بھی یہی اچھا ہوگا جیسا ابا چاہتے ہیں دیکھا کرو۔“

”وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ ہم اس چادر یواری میں



اس کی سبھی عادتوں سے خوب واقف تھی اس لیے اس بار اس نے اسے ٹوکا نہیں تھا وہ خود چاہتی تھی وہ اس کے سامنے اپنے دل کی ساری بھڑاس نکال لے تاکہ اس کا غصہ ختم ہو جائے مگر اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ بتی اماں کی پاٹ دار آواز محسن سے بلند ہوگی۔

”ارے رعنا، کہاں ہو تم.... ذرا یہ کپڑے تو چھت پر پھیلا آؤ۔“ رعنا کو فوراً ہی اعتراض کا ایک اور موقع ہاتھ لگ گیا تھا۔

”یہ دیکھو، اب یہ ہر چھوٹے کام کے لیے بھی چوبیس گھنٹے رعنا، رعنا ہوا کرے گی۔ رعنا کی شکل میں جیسے کل وقتی ملازمہ ان کے ہاتھ لگ جائے گی اب۔“

”اپنے گھر کا کام کرنے سے کوئی ملازم نہیں بن جایا کرتے رعنا۔“ زرین ذرا سا مسکرائی تھی۔

”ہاں، پتا ہے مجھے اپنے گھر کے نام پر تم سارا دن کون سے کام کر رہی ہوئی ہو۔“ اس پر بھی نظر ڈال کر اس نے باہر کی جانب قدم بڑھائے مگر چوکھٹ پر رک کر دوبارہ اس کی طرف پلٹی بولی۔ ”مگرایا رکھو تم.... میں چند روپوں کے عوض وہ سب نہیں کروں گی۔ جن سب میں تم اور اماں سارا دن رات لگی رہتی ہو۔“ اس کا صاف اشارہ کڑھائی اور سلاخی کے ان کپڑوں کی طرف تھا جو اماں اور زرین اجرت پر لوگوں کو تیار کر کے دیا کرتی تھیں۔ رعنا بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکلی اور مٹب اٹھا کر میزھیاں پھینکتی چھت پر چلی آئی۔

تار پر کپڑے پھیلاتے ہوئے یونہی اس کی نظر سامنے اٹھی تو وہ دنگ رہ گئی۔ سامنے کا مکان جو عرصے سے خالی پڑا تھا کی ایک کھڑکی پر ایک لڑکا بڑی فرصت سے کھڑا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا جو نیچے اس کی نظر پڑی تو وہ دلکشی سے مسکرا دیا۔

”ہائے اللہ....“ وہ ایک دم دیوار کی اوٹ میں ہوئی تھی۔ ”بدتمیز کیسے دانت نکال رہا ہے۔ ابھی جو اگر ابا دیکھ لیتے تو یہی چھت میرے لیے شہر خوشاں

تھے۔ مولوی صاحب لڑکیوں کو زیادہ پڑھانے لکھانے کے حق میں نہیں تھے۔ ان کے مطابق لڑکیاں زیادہ پڑھ لکھ جائیں تو ماں باپ کو آنکھیں دکھانے لگ جاتی ہیں۔ یہی وجہ تھی انہوں نے زرین کو آٹھویں کے بعد گھر بٹھا لیا تھا پھر جب رعنا نے آٹھویں جماعت پاس کی تو اسے بھی گھر بٹھانا چاہا مگر اسے ضد اور بھوک ہڑتال جیسی مشقتوں کے بعد بالآخر نویں جماعت میں داخلہ لینے کی اجازت مل گئی۔

یہی وجہ تھی اس نے زرین سے دو جماعتیں زیادہ پڑھ لی تھیں۔ مولوی صاحب ان پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ ان کی ان بے جا سختیوں اور روک ٹوک نے ان دونوں کا اعتماد بری طرح مجروح کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ دونوں ہی اپنے ماحول سے سخت الگ تھیں مگر چونکہ زرین نہایت کم گو اور صابر واقع ہوئی تھی اس لیے وہ اس ماحول سے بھی سمجھوتا کر لینے کو تیار تھی مگر رعنا.... وہ زرین کے بالکل برعکس تھی۔ حد سے زیادہ صاف گو اور اپنے ماحول سے نا پسندیدگی کا کھلم کھلا اظہار کر دینے والی۔ وہ ہر اس بات پر اڑ جاتی تھی جو اس کے مزاج کے خلاف ہوتی مگر اس بار اس کی تمام ضد اور بھوک ہڑتال سب بیکار گئی۔ مولوی صاحب نے کان لٹ جائے کی اس کی شدید خواہش کو سختی سے رد کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اب انتہائی خراب موڈ کے ساتھ منہ لٹکائے بیٹھی تھی۔

”سمجھ میں نہیں آتا جب ابا کو بیٹیوں کی چاہ ہی نہیں تھی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بیٹیاں دی ہی کیوں؟“ وہ غصے میں کچھ بھی بولے جا رہی تھی۔

”پاگل ہوئی ہو کیا۔“ کچھ بھی اول ٹول کئے جا رہی ہو۔ ”زرین نے اسے ٹوک دیا۔

”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں میں۔ بیٹیاں نہ ہوئیں ہم موم کی گڑیاں ہو گئیں جنہیں زمانے کی ہوا نہ لگے جن پر کسی کی نظر نہ پڑے۔“ وہ جب بھی غصیے موڈ میں ہوتی بھرپور دل کی بھڑاس نکالتی۔ زرین

بن جاتی۔ ”دھڑکتے دل کے ساتھ بڑبڑاتی ہوئی وہ سیریاں اتر آئی تھی مگر پھر اس کا کچا باغی ذہن اسی ایک بل میں انکارہ گیا تھا وہ کتنی ہی دیر اکیلی بیٹھی چپکے، چپکے اس لڑکے کو سوچتی رہی تھی۔ شام کو اماں کے کہنے سے پہلے ہی وہ چھت پر سے کپڑے اتارنے چلی آئی۔

اس بار اس کی نظر نے جان بوجھ کر سامنے کے گھر تک کا سفر کیا تھا۔ وہ حیران رہ گئی وہ لڑکا اب بھی اسی جگہ کھڑا اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئی تھیں، اسے مسلسل اپنی طرف دیکھتے پا کر لڑکے نے ہاتھ بلا کر جیسے اسے ہوش کی دنیا میں لانے کی کوشش کی وہ بڑبڑا کر جیسے ہوش میں آئی اور تیزی سے تار سے کپڑے اتار کر دوبارہ نیچے چلی آئی۔ پھر اگلے دن نہ چاہتے ہوئے بھی وہ خود کو اس چور راستے پر قدم رکھنے سے روک نہیں سکی تھی اور پھر ابا کا رعب و جلال بھی اس کے ان بڑھتے قدموں کو روک نہ سکا تھا۔

سلیم کے ابو ایک فرم میں ملازم تھے۔ ماں کا انتقال اس کی پیدائش کے وقت ہی ہو گیا تھا۔ سلیم نے بی اے کیا ہوا تھا اور آج کل ملازمت کے لیے جدوجہد کر رہا تھا، بات اشارے کنایوں سے خطوط تک آپہنچی تھی۔ وہ رعنا کو اور رعنا اسے دل و جان سے پسند کرنے لگے تھے اور اب دونوں شادی کر لینا چاہتے تھے مگر جب سلیم کے والد اس کا رشتہ لے کر مولوی صاحب کے پاس حاضر ہوئے تو مولوی صاحب نے اس رشتے سے انکار کر دیا۔ سلیم تک ان کا انکار پہنچ چکا تھا اور اب وہ اس انکار کی خبر رعنا تک پہنچانا چاہتا تھا۔

☆☆☆

رعنا اپنے مخصوص وقت پر دبے پاؤں چھت پر آئی تو پتھر میں لپٹا سلیم کا خط اس کے قدموں میں آن گرا۔ جسے اس نے فوراً جھک کر اٹھایا اور بنا ادھر

ادھر دیکھے نیچے چلی آئی۔ سلیم خود کو نظر انداز کر کے نیچے جاتی رعنا کو حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ رعنا اپنی پشت پر اس کی نظروں کو خوب محسوس کر رہی تھی مگر وہ اسے اپنی اس بے رخی کی وجہ نہیں بتا سکتی تھی پھر وہ اسے بتاتی بھی تو کیسے کہ آج ابا صبح سے گھر پر ہیں اور کسی بھی وقت اسے پکار سکتے ہیں ایسے میں اسے فوراً نہ پا کر انہوں نے طوفان کھڑا کر دینا تھا۔

خط کو مٹھی میں دبائے وہ نیچے آ کر دبے پاؤں اپنے اور زرین کے مشترکہ کمرے میں آگئی۔ زرین کمرے میں نہیں تھی۔ اس نے بے تابی سے خط کو کھولا۔ ابھی اس کی نظریں چند سطروں کو ہی پڑھ سکی تھیں کہ زرین کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس نے ایک بار پھر تیزی سے خط کو توڑ مروڑ کر مٹھی میں قید کر لیا اور خود کو مصروف ظاہر کرنے کی خاطر پاس پڑا ابا سے چھپا کر لیا گیا پر اتار سا لہ اٹھا کر پڑھنے لگی۔

”کیا پڑھا جا رہا ہے؟“ زرین اس کے برابر آن بیٹھی۔

”کیوں، تمہیں نظر نہیں آ رہا کیا؟“ اپنی چوری کو چھپانے کی خاطر اس نے بڑا ٹیکھا سا جواب دیا۔

زرین نے ایک دم بہت غور سے اس کی طرف دیکھا۔

”اب ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ کیا میرے سینک نکل آئے ہیں؟“ اسے مسلسل اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ جھنجھلائے لگی تھی۔

”دیکھ رہی ہوں کہ آج کتنے دنوں بعد تم اپنے پرانے میں موڈ میں نظر آئی ہو ورنہ تم جس طرح چپ ہو کر رہ گئی تھیں میں سمجھی کہ تم نے اپنے حالات سے سمجھوتا کر لیا ہے پھر تم نے کالج جانے پر بھی اس طرح ضد نہیں کی جس طرح نویں جماعت میں داخلہ لیتے وقت کی تھی.....“

”اپنے ان حالات سے سمجھوتا تم کر سکتی ہو میں نہیں۔“ اس نے بڑی نخوت سے سر جھکا۔

کر سکتی ہے۔ ان کو اپنی تربیت پر بے حد ناز تھا مگر وہ شاید نہیں جانتے تھے کہ ماں باپ کا اعتماد بچوں کو غلط راہوں پر جانے سے باز رکھتا ہے اور والدین کی بے جا سختی وار بے اعتمادی اولاد کو بدگمان کر دیتی ہے۔ زخم اتنا گہرا تھا کہ ہر دم ہی رستا رہتا تھا۔ مولوی صاحب کا بوڑھا ناتواں وجود اتنے گہرے زخم کی تاب نہ لاسکا اور وہ خالق حقیقی سے جا ملے۔ ایک طرف اماں کو بدنامی کا داغ لگا تھا تو دوسری طرف ان کا سہاگ اجڑ گیا تھا۔ ان کو تو جیسے چپ سی لگ گئی ایسے میں سارا ستم ٹوٹا بچاری نازک سی زرین پر اماں سے کہیں زیادہ سختی اور روک نوک اماں نے اس پر کی تو وہ نازک سی لڑکی ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی۔

نہ جانے وہ کب تک اماں کے اس عتاب و نفرت کا نشانہ بنی رہتی کہ ایک دن رشتے کروانے والی خالہ زرین کا رشتہ لے کر اماں کے پاس آئیں۔ ”صادق! قسم سے لڑکا بہت شریف ہے اور اونچے عہدے پر بھی فائز ہے اور ماں تو بہت ہی سیدھی سادی خاتون ہے، اللہ کا دیا سبھی تو ہے ان لوگوں کے پاس پھر بھی غرور نام کو نہیں ہے۔“ خالہ نے سارا پس منظر ایک سانس میں بتا ڈالا تھا۔

”مگر خالہ ہمارا تو اپنا گزر بسر مشکل سے ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ ایسے میں زرین کی شادی کرنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔“ اماں کو خرچے کی فکر نے آگھیرا تھا۔ ”نہیں صادق! تم خرچے کی بالکل فکر مت کرو۔ ان لوگوں کو جینے نہیں چاہیے، وہ تو مجھے کہہ رہی تھی کہ میرے بیٹے کے لیے کوئی اچھی اور نیک لڑکی ڈھونڈ دو اس کے علاوہ ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔“ خالہ نے فوراً ہی ان کی فکر ختم کی اور سردتے سے چھالیا کترتے ہوئے مزید کہا۔ ”نہ تو نند کا جھگڑا نہ دیور کا منا، تمہاری بیٹی عیش کرے گی عیش۔“ انہوں نے زرین کے مستقبل کی سنہری جھنک دکھائی تو اماں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے اس رشتے کے لیے

آج کل جن ہواؤں میں وہ اڑ رہی تھی اس نے اسے اپنے ماحول سے، سب سے، یہاں تک کہ خود سے بھی بیگانہ کر کے رکھ دیا تھا اور زرین سمجھ رہی تھی کہ اس نے سمجھوتا کر لیا ہے۔ کتنی ہی بار اس نے اپنے اور سلیم کے تعلق کے متعلق زرین کو بتانے کا ارادہ کیا تھا مگر زرین کی ہر بات اماں کو بتا دینے کی عادت کا سوچ کر ہر بار اس نے اپنا راز شیر کرنے کے خیال کو اپنے اندر ہی اتار لیا۔

دو پہر سے اب تک جانے کتنی ہی بار وہ سلیم کا خط پڑھ چکی تھی جس میں ابا کا ان کی شادی سے انکار بڑے صاف اور واضح لفظوں میں تحریر کیا گیا تھا۔ ہر بار اس انکار کو پڑھ کر اس کے دل میں پہلے سے کہیں زیادہ باغی خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ وہ جانتی تھی ابا کبھی اس کی شادی سلیم سے نہیں کریں گے۔۔۔۔۔ اور ابا ہی جیسے کسی مولوی سے شادی کرنا وہ ہرگز بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ صرف سلیم سے شادی کی خواہش مند تھی۔۔۔۔۔ سارے دن کی سوچ بچار کے بعد اس نے وہ فیصلہ کیا جو عام حالات میں وہ صرف سوچ ہی سکتی تھی۔ رات کی تاریکی میں اس نے چپ چاپ اپنا گھر چھوڑا اور سلیم کے ساتھ فرار ہو گئی۔

☆☆☆

”مولوی علیم اللہ کی بیٹی بھاگ گئی۔۔۔۔۔ جس نے سنا حیران رہ گیا اور حیران تو خود مولوی صاحب بھی تھے انہیں بالکل سمجھ نہیں آرہی تھی کہ انہوں نے ایسا کون سا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا جس سے چور آپا چوری کر کے بھاگ بھی گیا اور کسی کو خبر بھی نہ ہونے پائی۔ رعنا کہاں گئی کچھ پتا نہ لگ سکا۔ سلیم اور اس کے والد اسی رات وہ گھر چھوڑ گئے۔ مولوی صاحب کی غیرت پر ایک تازیانہ لگا اور وہ بستر سے لگ گئے۔ انا کا بت چکنا چور ہو جائے تو اس کی کرچیاں سمٹنا تو درکنار ان کی طرف دیکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کی بیٹی ایسا بھی



رضا مندی دے دی۔

”ٹھیک ہے خالہ مجھے کوئی اعتراض نہیں..... اماں کے اقرار کے کچھ دنوں بعد زرین شادی کی زندگی میں داخل ہوئی۔

ہر غم کے ساتھ خوشی جڑی ہوتی ہے۔ جب غم کا موسم گزر جاتا ہے تو خوشی کا وجود جنم لیتا ہے۔ زرین کے غم کا دور گزرا تو خوشیوں نے اس کی زندگی میں قدم رکھ دیا۔

شادی کے بعد زرین کی ساس نے زرین کو پھولوں کی طرح رکھا اور شاید بھی اس کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ ایک ساتھ اتنی خوشیوں کو پانے کے بعد زرین خدا کے حضور جھک جھک جاتی تھی۔ ابھی تک اس کا آنگن بچوں کی کلکاریوں سے نہیں گونجتا تھا مگر قدرت نے اسے زیادہ انتظار نہیں کروایا تھا اور اپنی نعمت بھل کی صورت اس کی جھولی میں ڈال دی تھی۔ وہ بھل کو پا کر پھولے نہیں سماتی تھی۔ اس نے دل میں عہد معہم کر لیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو وہ سب کچھ دے گی جو اس کے والدین اس کو نہیں دے سکے تھے۔

زرین نے بھل کو ہر طرح کی آزادی دی کبھی زیادہ روک ٹوک نہ کی اور یوں جوانی کو پہنچے تک بھل نہایت غرور اور بے باک ہوئی۔ زرین ہمیشہ اپنی بیٹی کو اتنے اعتماد سے بات کرتا دیکھ کر خوش ہوتی تھی مگر زرین کی ساس ہمیشہ زرین کو سمجھاتی کہ لڑکی ذات کو اتنی آزادی مت دو کہ وہ جان بوجھ کر غلط راہوں کو اپنالے مگر زرین ہمیشہ ان کی باتوں کو منس کرتا ہی دیتی اور کہتی۔

”اماں میں جو کرتی ہوں مجھے کر لینے دیا کریں، میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی کسی بھی طرح کی گھٹن کا شکار ہو.....“ اور اسی گھٹن کا شکار ہو کر کل کو رعنا کی طرح ماں باپ کا سر نہ جھکا دے۔ مجھے اپنی نزہت پر بہت بھروسہ ہے اماں۔ میری بیٹی غلط راہ پر نہیں جاسکتی۔“ وہ باقی کا جملہ دل ہی دل میں پورا کرتی۔

”وہ تو ٹھیک ہے بچے۔ مگر ہیرے کو تراش کر پھینک نہیں دیتے بلکہ اس کی نوک پک بھی سنوارتے ہیں، اس کو ایک اچھے سانچے میں ڈھالنے کے لیے اولاد کو اچھے برے کی تمیز سکھا کر اس کو اتنا کھلا نہیں چھوڑنا چاہیے کیونکہ چادر کتنی بھی صاف ستھری کیوں نہ ہو اگر باہر اسے کھلا چھوڑ دی تو گرد پڑ ہی جائے گی۔ ویسے بھی اولاد پرندے کی طرح ہوتی ہے۔“

زرین نے رعنا کے واقعے کا اتنا اثر لیا تھا کہ وہ ہمیشہ ان کی بھل کے متعلق کبھی کبھی باتوں کو نظر انداز کر دیا کرتی تھی مگر پرندے کی مثال اسے بھی سمجھنا آتی تھی۔ بھل نے میٹرک اچھے نمبروں سے پاس کیا تو اس کے کہے بغیر ہی زرین نے اس کا داخلہ کالج میں کروا دیا۔ کالج آ کر وہ پہلے سے کہیں زیادہ پُر اعتماد دکھائی دینے لگی تھی۔ شکل صورت سے تو ویسے بھی خدا نے اسے بڑی فیاضی سے نوازا تھا، اوپر سے اس کا نڈر اور بے باک انداز..... سب باتوں نے مل کر ایسے تک چڑھا اور قدرے مغرور بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی اس نے کالج میں صرف عدیلہ سے دوستی کی تھی خود عدیلہ بھی اس کی ہم مزاج تھی اس لیے دونوں کی دوستی ہر گزرتے دن کے ساتھ گہری ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

اسے بک چوائس سے کچھ ضروری ٹوش لینے تھے اسی لیے جب چھٹی کے وقت عدیلہ کالج سے نکلنے لگی تو وہ بھی اس کے ساتھ باہر چلی آئی۔ عدیلہ کی گاڑی روڈ کے دوسری طرف کھڑی تھی اور خود اسے بھی روڈ کے دوسری طرف ہی جانا تھا۔ اسی لیے وہ اس کے ساتھ چلتی روڈ کر اس کر آئی تھی۔ عدیلہ کا بھائی گاڑی کے باہر کھڑا اس کا منتظر تھا۔

”بھائی آج آپ مجھے کیسے لینے آ گئے۔ آپ کو تو یہ کام بالکل پسند نہیں؟“ اس نے بھائی کو سامنے دیکھا تو حیرت سے سوال کیا۔

”ڈرائیور بھی کے ساتھ گیا ہوا تھا اس لیے مجھے



## ماں

ماں

تیرے جانے سے

میرا میکا

موتی، موتی، موتی ٹوٹ رہا ہے

سب میں الفت اب ہے کم، کم

آنکھیں اپنی ہیں بس نم، نم

پیار کی باتیں خواب ہوئی ہیں

وہ میل ملاقاتیں نایاب ہوئی ہیں

میں کی ہی گردان لگی ہے

سب کو اپنی، اپنی پڑی ہے

پیار کی ماں

ملک عدم سے لوٹ آ دو بارہ

اور پھر سب کو باندھ دے

اپنے پیار کی زنجیروں سے

کلام: شگفتہ شفیق، کراچی

بجائے بھلے ناز سے مسکرا دی تھی کیونکہ اس طرح  
مسکراتا اس کا حق بنتا تھا۔

☆☆☆

نئی غنی محبت کے ثمار میں ڈوبی ابھی وہ عادی  
کے پیار کی ناؤ میں بیٹھی محبت کی حسین دنیا کی پوری  
طرح سیر بھی نہ کر پائی تھی کہ اپنی ناؤ طوفان کی زد  
میں آ کر ہچکولے لیتی محسوس ہونے لگی۔

”بھل بیٹا..... مجھے تم سے ضروری بات کرنی

ہے۔“ شاید صاحب نے کھانے کی میز پر کھانا  
کھاتے ہوئے بھل کو مخاطب کر کے کہا۔

آنا بڑا۔“ اس کو جواب دیتے ہوئے اس کی نظریں  
مستسل بھل پر جمی تھیں۔ جسے محسوس کرنے کے باوجود  
نظر انداز کر لی وہ بک شاپ کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن عدیلہ اس کے سامنے بیٹھی اس کے  
لیے اپنے بھائی کی بے تابی کا ذکر زور شور سے کر رہی  
تھی اور وہ اس طرح بے پروائی سے بیٹھی وہ سب سن  
رہی تھی جیسے اسے پہلے ہی اس سب کی خبر ہو اور اسے  
خبر کیسے نہیں ہوتی کیونکہ خدا جب حسن دیتا ہے تو  
نرا کت بھی ساتھ ہی عطا کرتا ہے۔ وہ بھی اپنے من  
کی دلکشی سے خوب واقف تھی۔ جانتی تھی کہ کوئی  
بھی اسے دیکھ کر اس طرح دیوانہ ہو سکتا ہے۔ اس  
نے عدیلہ کو خاص توجہ سے نہیں نوازا تھا مگر شاید عدیلہ  
کا بھائی واقعی سیریس تھا اور خود عدیلہ نے بھی بارہائیں  
مانی تھی۔ ایک دن دو دن پھر بہت سے ایسے دن  
گزر رہے تھے جن میں عدیلہ جان بوجھ کر اپنے بھائی  
کا ذکر کر کے اس کی توجہ اس طرف مبذول کرنے کی  
کوشش کرتے لگی۔ آخر وہ کب تک نظر انداز کر سکتی  
تھی۔ چاہے جانے کی خواہش تو ہر ایک کو ہوا کرتی  
ہے اور یہاں تو اسے وقت سے پہلے وہ سب کچھ مل  
رہا تھا جس کی اس نے ابھی خواہش بھی نہیں کی تھی۔  
عدیلہ کی مسلسل کوششوں نے اور خود اس کے بھائی  
کے کالج میٹ پر بھل کو ایک نظر دیکھ لینے کی خاطر  
گھنٹوں باہر کھڑے رہنے سے اس کے دل میں خود  
بخود ان کے لیے نرم گوشہ پیدا کیا تو وہ خود کو عادل کی  
محبت میں گرفتار ہونے سے نہیں روک سکی تھی۔ اس کی  
رضامندی کو پا کر عدیلہ نے سب سے پہلے بڑے  
مان کے ساتھ اس کے کان پہنچے تھے۔

”تم نے بڑے پاپڑ ملوائے ہیں بھل، ذرا  
بھائی بن کر میرے گھر آ جاؤ مگن، مگن کر بدلے لوں  
گی تم سے۔“

اس کے شکوے کے جواب میں کچھ کہنے کے

”جی پاپا.....“ بھل نے فوراً ہی سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

”ابھی تم کھانا کھاؤ..... جب فارغ ہو جاؤ تو میرے کمرے میں آنا۔“ شاید صاحب کھانا کھا چکے تھے اس لیے رومال سے ہاتھ پونچھتے انھہ کھڑے ہوئے۔  
”او کے پاپا۔“ اس نے سعادت مندی سے سر ہلا دیا۔

”پاپا آپ نے بلایا تھا؟“ کچھ دیر بعد وہ باپ کے کمرے میں ان کے سامنے کھڑی تھی۔

”ہاں..... بیٹھو بیٹا۔“ انہوں نے بہت پیار سے اسے اپنے برابر میں بٹھایا پھر ذرا توقف کے بعد بولے۔ ”میری بیٹی اتنی جلدی بڑی ہوئی مجھے پتا بھی نہیں چلا۔“ انہوں نے جیسے کچھ کہنے سے پہلے تمہید باندھی تھی وہ کچھ بھی نہیں سمجھی تھی اسی انداز میں ہنستے ہوئے باپ سے شرارت کرنے لگی۔

”سوچ میں پاپا..... دوسرے لفظوں میں آپ خود کو بوڑھا کہہ رہے ہیں۔“ اس کی شرارت پر وہ خود بھی مسکرا دیے تھے پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے۔  
”ہاں بیٹا، جب اولاد جوان ہو جائے تو ماں باپ بوڑھے تو ہو جاتے ہیں۔“

”پاپا..... کیا ہوا ہے؟“ اس بار اس نے ان کی سنجیدگی کو محسوس کیا تھا۔

”بات دراصل یہ ہے بیٹا کہ اب میں تمہارے فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتا ہوں۔“

”مطلب.....؟“ اس نے حیرت و نا سمجھی کے ملے جلے تاثرات لیے ان کی طرف دیکھا تھا۔

”مطلب یہ بیٹا کہ اب میں تمہاری شادی کر دینا چاہتا ہوں۔“ انہوں نے اس کی آنکھوں کو دور کیا تھا۔

”میری شادی..... وہ بھی اتنی جلدی؟“ وہ بری طرح گھبرا گئی۔ ”ابھی تو میں پڑھ رہی ہوں پاپا.....“ ابھی وہ عادل سے بات کیے بغیر اس کا نام

سامنے لانا نہیں چاہتی تھی اس لیے فی الحال پڑھائی کو آڑ بیٹا مگر پاپا نے بھی فوراً ہی اس کی اٹھائی اس کمزور سی آڑ کو گرا دیا۔

”بھل بیٹا اچھے رشتے مقدر سے ملا کرتے ہیں۔ یہ تو ہم پر خدا کا کرم ہے کہ تمہارے لیے اتنا اچھا رشتہ آرام سے مل رہا ہے..... آفندی میرا بہت پرانا دوست ہے۔ اس کا بیٹا محبت آفندی ابھی امریکا سے ایم بی بی ایس کی ڈگری لے کر آیا ہے۔ میں خود ملا ہوں محبت سے بہت سلجھا ہوا ذہین اور شریف لڑکا ہے۔ میں بہت متاثر ہوا ہوں اس سے۔ خود آفندی کئی بار اشارے کتابوں میں مجھ سے تمہارے لیے بات کر چکا ہے۔ جلد ہی وہ گھر بھی آئیں گے۔“ انہوں نے پوری تفصیل بتاتے ہوئے آخر میں اس سے اس کی رضا جاننی چاہی تھی اور ساتھ ہی اپنی مرضی بھی بتادی تھی۔

”بھیس تو اس رشتے پر..... کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اب تم کہو کیا کہتی ہو؟“ اب وہ اس کی مرضی جاننے کے متنی تھے۔ اسے یہ رشتہ منظور ہی نہیں تھا اس لیے دو ٹوک انداز میں باپ کے سامنے انکار کر دیا۔  
”پاپا مجھے یہ رشتہ منظور نہیں ہے۔“

”مگر کیوں؟“ انہوں نے حیرت بھری استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”پاپا..... کیوں سے جھگڑے کی ابتدا ہوتی ہے۔“ وہ اپنے اسی انداز میں اعتماد سے بولی تھی۔ انہیں اس کا انداز ایک آنکھ نہ بھایا۔

”مگر مجھے یہ رشتہ پسند ہے اس لیے تم بھی اس کے متعلق سوچ لو۔“ انہوں نے قدرے ناگواری سے حکمیہ انداز میں کہا تو وہ ایک جھٹکے سے ان کے پاس سے اٹھتی کمرے سے نکل گئی۔

اگلے دن کالج پہنچ کر اس نے عدیلہ کو اس رشتے کی خبر دی وہ کچھ پریشان سی ہو گئی پھر ذرا دیر کچھ سوچ کر اس نے بھل کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے

## اجھا لگتا ہے

گھرے بادل  
سڑک کنارہ  
ہلکی، ہلکی بوند باندی  
دھیرے، دھیرے چلنا  
بھیگتے جانا  
خٹک پتوں کو ہوا کا  
چوم جانا  
ان کا اڑ جانا  
سنوا چھا لگتا ہے  
چودھویں کا چاند  
صبح کا ستارہ  
میز پر بکھری کتابوں  
کا ڈھیر  
چائے کا آدھا کپ  
منو کے افسانے  
عمیرہ احمد کے ناول  
گھڑی کی ٹک ٹک  
بال پوائنٹ  
تنہا بیچ پر  
چپ، چپ، بیٹھنا  
سوچتے رہنا  
ہاں! سب اچھا لگتا ہے

از: سدرہ کلثوم مروت، لکی مروت

کھڑا کرتے ہوئے کہا۔

”میرے ساتھ چلو۔“

”مگر کہاں؟“ وہ حیران دکھائی دے رہی تھی۔

”میرے گھر.....“ اس کا انداز فیصلہ کن تھا وہ

مزید حیران ہوئی۔

”اس وقت..... پہلا پیریڈ شروع ہونے میں

بس کچھ ہی منٹ باقی ہیں۔“ اس نے جیسے اسے کچھ

احساس دلانا چاہا تھا مگر اس نے ارادہ نہ بدلا۔

”ہمارے لیے ابھی یہ پیریڈ اتنا اہم نہیں ہے

جتنا یہ مسئلہ۔ تم چلو فوراً میرے ساتھ۔“ اسے ساتھ

لیے وہ کالج سے باہر آئی اور ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے گھر

کی طرف چل دی۔ ٹیکسی عدیلہ کے گھر کے سامنے

رکی تو ان کی محل نما کوٹھی کو دیکھ کر ایک گونہ اطمینان اس

کے دل میں آن پڑا۔ وہ عدیلہ کے ساتھ اس محل میں

داخل ہوئی۔ ستر کش بھری نظروں سے اطراف کا

جائزہ لیتے وہ اس کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں آگئی۔

جہاں عدیلہ نے اسے ذرا دیر بیٹھ کر انتظار کرنے کو کہا

اور خود شاید عادل کو اپنے آنے کی خبر کرنے وہاں

سے چلی گئی تھی۔ ابھی اسے وہاں بیٹھنے زیادہ دیر نہیں

گزر رہی تھی کہ پُر جوش سا عادل ڈرائنگ روم میں

داخل ہوتا شوخی سے بولا۔

”زبے نصیب..... آج تو دل کے حکمرانوں

نے ہمارے غریب خانے کو رونق بخشی ہے۔“ عدیلہ

اس کے پیچھے ہی اندر داخل ہوئی تھی اس لیے اس کی

خوشی پر فوراً ہی اس نے کہا تھا۔

”اتنے خوش مت ہوں بھائی..... محل کو میں

زیربستی اپنے ساتھ لائی ہوں تاکہ یہ آپ سے بات

کر لے کیونکہ اس کے پاپا اس کا رشتہ کسی اور جگہ طے

کر رہے ہیں۔“ اس نے جیسے دھماکا کیا تھا عادل

چونک گیا۔

”ایسے کیسے کسی اور سے رشتہ طے کر سکتے ہیں

وہ..... جب ہم دونوں میں کمنٹ ہو چکی ہے؟“ اس

کی نظر میں بھل پر جی تھی۔ پھر کہاں گئی تھیں؟“ وہ جواب میں کچھ نہیں بولی تھی۔

”بھل میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔ بتاؤ کہاں گئی تھیں تم؟“ اس بار ان کا لہجہ پہلے سے کہیں زیادہ سخت تھا، بھل ڈر گئی۔ وہ جتنی بھی زیادہ نڈر اور بہادر رہی تھی مگر باپ کے سامنے بولنے کی جرأت وہ اپنے اندر نہیں کر پا رہی تھی۔ خود شاہد نے بھی آج سے پہلے کبھی اس سے اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی اور آج جب وہ جوال مکھی بنے ہوئے تھے تو اس کے اپنے حواس معطل ہوئے جا رہے تھے۔

”تم ایسے نہیں بتاؤ گی۔“ چپ کھڑی بھل کو دیکھ کر ان کے غصے کا گراف مزید بلند ہونے لگا تو وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھے تھے۔ انہیں بھل کی طرف غصے سے بڑھتے دیکھ کر کب سے خاموش تماشائی بنی کھڑی زرین ایک دم ان کے سامنے آئی تھی۔

”کیا کرتے ہیں شاہد۔“ جوان بچی پر ہاتھ اٹھائیں گے۔“

”تم ہاتھ اٹھانے کی بات کرتی ہو۔۔۔ آج جتنی ذلت میں نے برواشت کی ہے اس کے بعد تو میں اسے قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔“ وہ شدید غصے میں تھے زرین بہت زیادہ ڈر گئی۔

”آپ جی نہیں۔۔۔ میں اس سے بات کرتی ہوں۔“

”تم کیا بات کرو گی زرین بیگم۔ تمہاری ذلیل ہی نے تو آج یہ دن دکھائے ہیں۔“ انہوں نے ایک تیز نظر اس کے حوالے کر کے دوبارہ بھل کی طرف دیکھا۔

”تم درمیان میں مت بولو۔۔۔ اس سے جواب میں خود بولوں گا۔“ وہ ہرگز بھی ملنے کے موڈ میں نہیں تھے اور خود بھل کی ہمت کب سے ان کی عدالت میں مجرم بنے کھڑے اب جواب دینے لگی تھی اس لیے جب انہوں نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا تو اس نے دل کڑا کر کے انہیں سچ بتا ہی دیا۔

”میں عادل ہمدانی کے گھر گئی تھی۔“ اس کی

”خالی کمنٹ سے کچھ نہیں ہوتا عادل۔۔۔ شادی کے لیے گھر رشتہ لے کر آتا پڑتا ہے۔“ بھل نے ذرا کھل کر اس کو بات سمجھانی چاہی تھی جس پر وہ فوراً بولا تھا۔

”ہاں تو رشتہ لے آنے پر مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔۔۔ میں تو تمہاری پڑھائی کا سوچ کر ایسا کوئی قدم نہیں اٹھا رہا تھا۔“ اس کا جواب سن کر بھل ایک دم پرسکون ہو گئی۔

”ٹھیک ہے، میں آج ہی گھر جا کر مکی پاپا کو تمہارے متعلق بتا دوں گی۔“ دوسرے لفظوں میں اس نے اسے رشتہ بھیجنے کا اشارہ دیا تھا۔ عادل نے اس کا اشارہ سمجھ کر مسکرا کر سر ہلا دیا تو وہ مطمئن ہو گئی۔

باقی سارا وقت اس نے وہیں عہدہ اور عادل کے ساتھ گزارا تھا۔ عادل کی مکی نے بھی اس سے ملاقات کی تھی۔ وقت خوشگوار مگر بہت جلدی ختم ہو گیا تھا پھر جیسے ہی کالج کی چھٹی کا ٹائم ہوا تو وہ واپسی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ تب اس کے کہنے پر ہی عادل نے اپنی گاڑی میں اسے اس کے گھر سے ڈرائیو سے ڈراپ کیا تھا۔ خوشگوار موڈ میں وہ جب گھر میں داخل ہوئی تو خلاف معمول گھر میں چھائی ہوئی خاموشی کو محسوس کر کے حیران ہوئی آگے بڑھی۔ سب سے پہلے اس کا سامنا باپ سے ہوا تھا جو خوشنکین نگاہوں سے اسے گھورتے اسی کے منتظر تھے۔

”کہاں سے آ رہی ہو۔۔۔؟“ سوال بالکل غیر متوقع تھا۔

”کالج سے۔۔۔“ اس نے صفائی سے جھوٹ بولنا چاہا۔

”جھوٹ مت بولو۔ میں خود تمہیں لینے کالج آیا تھا مگر تمہاری کلاس فیلوز نے بتا دیا کہ آج تم نے کوئی کلاس امینڈ نہیں کی بلکہ صبح ہی کالج سے چلی گئی تھیں۔ ابھی تو تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم اگر کالج نہیں گئی تو



## پیاری امی کے حضور

کھڑکی جنت کی تیری قبر میں ٹھہری رہے  
آسمان تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

اے وہ ہستی جس کے وجود کا حصہ ہوں میں  
اے وہ ہستی جس کے خونِ جگر سے سنبھلی گئی

ہوں میں

اے وہ ہستی جس کے دامن میں ملیں  
رحمتیں ہزار

اے وہ ہستی جس کی دعا بلا دیتی ہے عرشِ بریں  
اے وہ ہستی جس کی ناراضی ہمیں گوارا نہیں

اے وہ ہستی جس کے پاؤں تلے ہے  
جنت میری

اے وہ ہستی جو ہمارے درمیاں تھی امانت  
رب کی

پیاری امی آپ کا رتبہ وہاں بھی سب سے  
اعلیٰ رہے

اور یہاں آپ کے بچوں پہ رب کا سایہ رہے  
بھائی بھی ہیں اور بہنیں بھی پر میری ماں

تجھ سار ہیرا ب ہمیں ملے گا کہاں  
تیری خودداری کا آتا ہے جب خیال

اشکِ دہش کراٹھتے ہیں تیرے سب عیال  
اپنی خودداری کا ماں تو نے لوہا منوالیا

جا خدا حافظ کہ تو نے خدا کو پالیا  
آنکھوں کی ٹھنڈک تیری کرتی ہے رب

سے التجا

نقشِ پا حیرے نہیں زندگی بھر ہمارے رہنما  
کلام..... قرۃ العین

مرسلہ: حمیرا یا سمین، کراچی

آواز میں ذرا سی لرزش نمایاں تھی مگر اس کے لفظوں  
میں کچھ تو ایسا تھا جس نے شاید کے ساتھ، ساتھ  
زرین کو بھی اپن جگہ ساکت کر دیا تھا۔

”کون عادل ہدائی؟“ سرسراتے لہجے میں  
انہوں نے استفسار کیا تھا۔

”میری کلاس فیلو کا بھائی ہے، ہم دونوں  
شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ اس کا تمام ذرا ایک دم

جانے کہاں جا سو یا تھا بھی وہ کھل کر ان کے سامنے  
بول پڑی تھی۔

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو کھل تم ہوش میں تو  
ہو؟“ جوان بیٹی کے منہ سے کسی اجنبی کا نام سن کر

زرین حواس باختہ سی بول رہی تھی۔ اس بار شاید  
صاحب نے اسے بولنے سے نہیں روکا تھا بلکہ انہوں

نے خود ایک بار پھر کھل سے سوال کر دیا تھا۔  
”کیسے جانتی ہو تم اسے؟“ ذرا دیر پہلے والے

غصے کے بجائے اب ان کے انداز میں محسوس کی  
جانے والی برف کی سی ٹھنڈک اتر آئی تھی۔ کھل نے

ان کے سوال کا جواب پہلے ہی دے دیا تھا مگر شاید  
انہوں نے غور نہیں کیا تھا اس لیے وہ دوبارہ بولی۔

”وہ میری دوست کا بھائی ہے۔“ چھوٹے  
سے جملے میں اس نے جسے ساری کہانی سنا دی تھی۔

شاید صاحب نے انگارہ آنکھوں سے ذرا دیر کو اس کی  
طرف گھورا پھر جیسے کسی نتیجے پر پہنچ کر وہ دم سادھے

کھڑی زرین کی طرف پلٹے۔  
”باپ کی عزت کا جنازہ تو یہ بڑی اچھی طرح

نکال چکی ہے اب کسی عادل سے میں اس کی شادی  
ہرگز نہیں کرواؤں گا۔۔۔۔۔ ویسے بھی آفندی کو زبان

دے چکا ہوں۔ اب تم اس کی رخصتی کی تیاری کرو۔“  
اتنا کہہ کر وہ جانے کو ذرا سا آگے بڑھے مگر دوسرے

یہ قدم پر پلٹ کر دوبارہ سے بولے۔  
”اب اس کا کالج جانا بھی بند ہے۔۔۔۔۔ کھل سے  
یہ کالج نہیں جائے گی۔“ بات مکمل کر کے وہ جواب

سننے کے لیے رکے نہیں۔

پھر کسی نتیجے پر پہنچ کر اس نے بڑی خاموشی سے اپنا سامان پیک کرنا شروع کر دیا۔ وہ اب اس گھر کو چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس کو دیکھنے کی نیت سے کمرے میں آتی زرین اسے اس طرح پیکنگ میں مصروف دیکھ کر ایک ہل کو وہ ہیں جم ہی گئی تھی۔  
”یہ تم کیا کر رہی ہو بھل؟“ دوسرے ہی ہل حواسوں میں آتے ہی وہ چیل کی طرح اس کی طرف لپکی تھی۔

”جو کچھ آپ لوگ میرے ساتھ کرنے جا رہے ہیں یہ میری برداشت سے باہر ہے، اسی لیے میں یہ گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔“ زرین نے بس ایک ہل کے لیے اس کے بے تاثر چہرے کو دیکھا دوسرے ہی ہل اس نے سمجھ کر اس کے منہ پر پھپھر دے مارا تھا۔

”چناخ.....“ اس کا اپنا حوصلہ جیسے جواب دے گیا تھا۔ گال پر ہاتھ رکھے بھل نے بڑی بے یقینی سے ماں کی طرف دیکھا تھا۔ جس نے آج تک پیار سے بھی اسے نہیں جھڑکا تھا۔ بس ایک ہل..... اس کے بعد وہ دوبارہ اپنے سامان کی طرف متوجہ ہوتی تیزی سے پیکنگ کرنے لگی۔ زرین نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پرے دھکیلا تھا۔

”اس دن کے لیے نہیں بڑا کیا تھا بھل کہ تم ہمارے سروں پر خاک ڈالو۔“ اس پر جیسے کوئی اثر ہی نہ ہوا تھا۔

”ٹھیک کہتے ہیں تمہارے پاپا..... میری ڈھیل نے ہی آج ہمیں یہ دن دکھائے ہیں۔“ اس کا انداز افسوس سے پُر تھا۔ ”کاش میں اماں کی بات سن لیتی۔“ وہ مزید کہہ رہی تھی۔ ”مگر میں نے تمہیں اتنی ڈھیل اس لیے نہیں دی تھی کہ تم غلط راہوں کو اپنا کر ہمارا سر نیچا کر دو، بھل میں تمہیں ہرگز بھی ایسا کرنے نہیں دوں گی۔“ اس کا انداز جستی تھا تو دوسری طرف بھل نے بھی دو ٹوک انداز میں کہا تھا۔

زرین بے سدھ کی کھڑی کچھ بول ہی نہیں پاری تھی۔ اسے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ اتنی احتیاط کے باوجود اس سے کہاں بچوک ہوگئی جو آج اسے یہ دن دیکھنا پڑ رہا ہے۔ ساس صحیح کہتی تھیں کہ ہیرے کو تراش خراش کر اس کی بے حد حفاظت بھی کی جاتی ہے مگر اولاد پرندے کے مانند کیسے ہل سکتی ہے، کیا قید میں یا پھر..... اس سے آگے اسے سمجھ نہیں آتی تھی۔ اس سے پہلے وہ کچھ بولتی بھل کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔  
”ممی میں عادل کے سوا کسی سے شادی نہیں کروں گی یہ بات آپ پاپا کو سمجھا دیں اور اگر پاپا نے زبردستی کرنے کی کوشش کی تو میں یہ گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔“ زرین کی سانس ایک دم رکی تھی۔ وقت نے جیسے اپنا آپ ڈہرایا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب اس کے سامنے اس کی بہن رعنا کے بجائے اس کی بیٹی بھل کھڑی اسے دہرا رہی تھی۔ اپنا فیصلہ سنا کر وہ کب کی جا چکی تھی اب کمرے میں صرف زرین تنہا کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

ایک سرد جنگ تھی جو گھر میں جاری تھی۔ تین دن سے بھل کا کالج جانا بھی بند ہو چکا تھا اور اس کا سیل فون بھی باپ نے اپنے قبضے میں کر کے گویا اس کے لیے ہر راستے کو بند کر دیا تھا۔ خود جب سے اس نے گھر چھوڑ کر جانے کی دھمکی دی تھی زرین ہر وقت اس کا پہرہ دیتی دکھائی دیتی تھی۔ اس ساری صورت حال نے بھل کو بری طرح پریشان کر دیا تھا اور پر سے اس کے نکاح کے سلسلے میں گھر میں ہوتی تیاریوں کو دیکھ کر وہ مزید پریشان ہوگئی تھی۔ چاہنے کے باوجود بھی وہ عادل سے رابطہ نہیں کر پار ہی تھی مگر یہ تو طے تھا کہ اس نے شادی صرف عادل ہی سے کرنی تھی۔ ان سب تیاریوں سے اسے کوئی غرض نہیں تھی۔ ایک دن مزید اس نے چپ کر کے یہ سب برداشت کیا تھا

ڈھٹائی سے انہیں خطا وار ٹھہرا کر وہ خود بری الذمہ ہو گئی تھی۔ زرین منہ کھولے حیرت سے بت بنی اپنے سے کچھ فاصلے پر کھڑی محل کو دیکھے جا رہی تھی۔ جس نے بڑی آسانی سے ان کی نادانستہ غلطیوں کی نشان دہی کر کے انہیں ہی غلط قرار دے دیا تھا۔

☆☆☆

”اولاد کو اچھے برے کی تمیز سکھا کر اس کو کھلا نہیں چھوڑ دینا چاہیے کیونکہ چادر کتنی ہی سفید کیوں نہ ہو باہر کھلا چھوڑ دینے سے اس پر گرد پڑ ہی جاتی ہے۔“ اس کی ساس کے کہے لفظوں نے اس کی سماعتوں پر دستک دی تو وہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔ اس کی اپنی کوتاہی کی بدولت اس کی سفید چادر پر بھی گرد بڑ چلی تھی۔ ماضی کے جس ڈر کی بدولت اس نے محل کو ہر طرح کی آزادی دی تھی آج وہی آزادی ایک بار پھر ماضی کو دہرانے کو تیار کھڑی تھی۔ محل کے تئو رہتا رہے تھے کہ جیسا وہ کہہ رہی ہے وہ ویسا ہی کرے گی۔ ویسے بھی اب کچھ بھی کہنے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہونے والا تھا اس لیے زرین بنا کچھ کہے کمرے سے نکل آئی۔ اب اس کا رخ اپنے کمرے کی طرف تھا جہاں اسے شاہد کو سمجھانے کا فریضہ انجام دینا تھا کیونکہ واقعی وہ اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ اولاد صرف ایک پرندے کے مانند نہیں ہوتی کہ جسے پنجرے ہی میں قید کر کے رکھا جائے بلکہ وہ تو ایک جیتا جاگتا انسان ہے ایک عقل و شعور رکھنے والا معاشرے کا ایک فعال اور کارآمد فرد کہ جس کی تربیت پر اچھی نسل کا دار و مدار ہوتا ہے۔ شاید کہ زرین کی کوششیں بار آور ثابت ہوں اور وہ ایک اعتدال کا راستہ نکال لے۔

کاش والدین اپنی بہترین تربیت سے یہ موقع ہی نہ آنے دیں کہ اولاد کوئی انتہائی منفی اقدام اٹھانے کا سوچ بھی پائے..... اے کاش!

”کس غلط راہ کی بات کر رہی ہیں می آپ؟ یہ غلط تو نہیں ہے می۔ عادل کو میں نے پسند کیا ہے تو اس میں برا کیا ہے؟ پہلے بھی تو میری ہر چیز میں آپ لوگ میری پسند کو اہمیت دیا کرتے تھے پھر اس بار اتنا اختلاف کیوں کیا جا رہا ہے؟“ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی آج سے پہلے زندگی کے ہر مقام پر اسے آزادی دی گئی تھی مگر اب اس مقام پر آ کر جو ایک دم اس کی آزادی اس سے چھیننے کی کوشش کی جا رہی تھی تو اس کا احتجاج کرنا بڑا فطری سا امر تھا۔

”میری زندگی کا اتنا اہم فیصلہ میری مرضی کے خلاف کیا جا رہا ہے۔ آپ کی نظر میں یہ آپ لوگوں کا پیار ہے میرے لیے؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا تھا۔ ”مگر میں بتا رہی ہوں می مجھے صرف اور صرف عادل ہی سے شادی کرنی ہے۔“ کس قدر بے حیا ہو گئی تھی وہ اس کا اندازہ آج زرین کو ہوا تھا۔

”گڈے گڑیا کا کھیل سمجھ رکھا ہے تم نے شادی بیاہ کو جو ایسی ضد کر رہی ہو؟“ اس نے غصیلی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا پھر مزید بولی۔ ”ہر ضد پوری کرنے کی نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی تم اب بچی رہی ہو کہ نفع نقصان کی پروا کیے بنا ہم تمہاری ہر ضد اور فرمائش کو پورا کرویں گے۔“ اس نے سر جھٹکتے ہوئے بیڈ پر پڑے اس کے بیگ کو اپنی طرح کھینچا تھا۔

”ہمارے لاڈ پیار کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ تم.....“ محل ایک دم ہلنیا ہلنیا تھی۔

”عادل سے شادی میری ضد نہیں ہے می بلکہ میرے دل کی خواہش ہے اور اپنی اس خواہش سے میں کسی صورت دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہوں۔ اس لیے آپ لوگ چاہیں تو اپنی خوشی سے میری اس خواہش کو پورا کر دیں ورنہ دوسری صورت میں اپنی خواہش کی خاطر اگر میں کوئی غلط قدم اٹھاتی ہوں تو اس کے ذمے دار خود آپ لوگ ہوں گے۔“ بڑی



ناولٹ

## ناری سبائی

امریسن

”یہ..... یہ کیا کر رہی ہو زویا؟“ کوئل نے  
حیرت سے اسے دیکھا جو بیگ میں سے میک اپ کا  
مختلف سامان نکال کر مہارت سے اس کا استعمال  
اپنے چہرے پر کر رہی تھی۔ جس تیزی سے اس نے وہ  
سب نکالا تھا گنے کے بعد اب دوبارہ بیگ کے خفیہ  
خانے میں منتقل کر دیا تھا۔

”ہوں..... اسے بتاؤ تم کیا کہہ رہی تھیں؟“  
ذرا سی توجہ سے وہ نوخیز کلی لمحوں میں کھل کر گلاب لگ





رہی تھی..... بیک کی زپ بند کر کے اس نے حیرت سے خود کو دیکھتی کوئل سے سوال کیا۔

”میں یہ کہہ رہی ہوں کہ تم شاید بھول رہی ہو کہ ہم اس وقت کالج میں ہیں اور یونی فارم میں تو..... یہ میک اپ؟ تم تو کہیں آتی جاتی بھی نہیں ہو اور پہلے شاید بھی تم نے یہ سب یوز بھی نہیں کیا۔“ کوئل حیرت دے رہی تھی اسے ایک کے بعد ایک سوال کرنے لگی اور اس کی ابھرنے کو سمجھ کر زویا ایک عجیب سی ہنسی ہنس دی۔ کچھ لمحے اسے دیکھا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کی عجیب و غریب حرکتوں پر کوئل ایک بار پھر بری طرح پریشان ہو گئی۔

”کیا ہوا ہے زویا مجھے بھی کچھ بتاؤ گی یا یونہی پراسرار حرکتیں کرتی رہو گی؟“

آج صبح معمول کے مطابق وہ کالج آئی تھی۔ دونوں نے معمول کے مطابق تمام کلاسز اینڈ کی تھیں۔ آج کا دن قدرے تھکا دینے والا اور مصروفیت لیے ہوئے تھا۔ کیمسٹری، فزکس کے لگاتار دو پریکٹس کے بعد دس منٹ کی بریک تھی پھر لگاتار پیریز کے بعد اب آخری پیریز جو کہ بائیولوجی کا تھا کی سمجھ نہیں آئی تھیں سو سب لڑکیاں گراؤنڈ میں یہاں وہاں سرما کی دھوپ کا مزہ لینے پھیل گئی تھیں ویسے بھی کچھ دیر میں چھٹی ہونے والی تھی سو ایسے میں کوئل اس کا ہاتھ پکڑ کر چھٹی ہوئی اسے کالج کی پچھلی طرف والے گراؤنڈ میں لے آئی تھی جہاں درختوں کے جھنڈ ہونے کے باعث دھوپ کم آتی تھی۔ اس وقت وہاں اکا دکا لڑکیاں موجود تھیں۔ وہ اس کو..... لیے کونے میں..... آ کر بیٹھ گئی اور کوئل حیران پریشان بس سوال ہی کیے جا رہی تھی۔

”تم چپ رہو بس کل آ کر بتا دو گی کہ میں کہاں گئی تھی۔“ اس نے مبہم لہجے میں کہا تو کوئل کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

”کیا مطلب کہاں گئی تھیں؟ بل بچ گئی ہے

گاڑی آنے والی ہے اور اب ہم گھر جانے والے ہیں، تم کہاں جا رہی ہو؟“ اچھی سے اس نے سوال کیا تو وہ ایک بار پھر ترنگ میں آ کر مسکرا دی۔

”یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں جا رہی مجھے کہیں اور جانا ہے اور اب یہ مت پوچھنا کہ کہاں..... یہ میں کل آ کر بتاؤں گی۔“ دین میں سب کو بتانا کہ مجھے میرا کزن لینے آیا تھا میں اپنی نانی کے گھر گئی ہوں۔“ یہ کہتے ہی وہ جلدی، جلدی بیک میں سے چادر نکال کر اوڑھنے لگی تو کوئل کو بھی ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوتا ہوا حالانکہ دماغ میں کئی سوال کھلبلا رہے تھے۔ زویا جیسی اچھی، سلیجی ہوئی لڑکی اور ایسی مشکوک سرگرمیاں..... کوئل سے یہ سب بالکل مبہم نہیں ہو رہا تھا۔ زویا اب تیز، تیز چلتی ہوئی ٹیٹ سے باہر نکلتے جہوم میں شامل ہو گئی اور دوسرا ہڈ پر ہو کر کھڑی ہو گئی تاکہ ان کی دین کی باقی لڑکیاں بھی آجائیں۔ آتے ہی تقریباً سب نے ہی زویا کا پوچھا۔ ابھی وہ اس کا دیا گیا جواب دینے ہی والی تھی کہ اس کے دماغ میں ایک دم دھماکا ہوا کہ اس کی توانائی اماں حیات ہی نہیں تھیں نہ ہی ایسے کسی کزن کا وجود تھا۔

”وہ..... اس کی امی کی طبیعت خراب تھی تو اس کے پاپا اسے جلدی لے گئے۔“ ان سب کو تو اس نے مطمئن کر دیا تھا پر ذہن میں ان محنت سوال کھلبلا رہے تھے۔ دس سال کا ساتھ تھا ان دونوں کا۔ کوئل اس کی فیملی کو جانتی تھی کئی بار ان کے گھر جا چکی تھی، اچھے کھاتے پیتے اور شریف لوگ تھے۔ والد کی ایک اچھی پوسٹ پر جاب تھی جبکہ والدہ بھی پڑھی لکھی اور سلیجی ہوئی خاتون تھیں۔ یہ تو وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کے ابو اکلوتے اور امی بھی اکلوتی تھیں۔ ننھیال اور دھیمال میں کوئی نزدیکی رشتے دار نہیں تھا تو پھر آج یہ نانی اماں اور کزن کہاں سے آگے آئے تھے۔ انہی خیالات میں کب اس کا گھر آ گیا پتا بھی نہ

روانی سے چہرہ بھگوتے چلے گئے۔ اس کی طرف سے  
کی گئی ہر کوشش اور ہر عمل اس شخص کو جو قسمت سے اس  
کا شوہر تھا۔ خوش کرنے میں ناکام رہا تھا۔ کھانا  
کھانے کے بعد اس نے سعید احمد کو دودھ کا گلاس دیا  
اور خود باہر آگئی۔ ایک نظر دونوں بچوں کے کمروں  
میں ڈالی۔ ہنی کا آدھا میل اوپر آدھا نیچے تھا۔ وہ  
ٹھیک کر کے دروازہ بند کرتی سنی کے کمرے کی  
جانب آگئی۔ وہ بھی بے خبر سو رہا تھا۔ بیرونی  
دروازے کا لاک اور کچن کا لاک چیک کرنے کے  
بعد وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ سعید احمد اپنی جگہ پر  
لیٹ چکے تھے، وہ آہستہ سے چلتی بیڈ کی پانچ کی  
طرف آگئی اور پاس بیٹھ کر ان کے پاؤں دبانے لگی  
کہ برسوں سے اس معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا  
تاؤنٹیکہ وہ گہری نیند میں نہ چلے جائیں۔ کمرے میں  
گہری ہوتی سانسوں کی آواز نے یقین دلایا کہ وہ  
سو چکے ہیں تو اس نے ہاتھ روک دیے اور ایک نظر  
اپنے مجازی خدا کو دیکھا۔ سوتے ہوئے ان کا چہرہ  
کسی قسم کے غصے اور تیوریوں سے پاک ہوتا ان کے  
ساتھ گزارے سترہ سالوں میں بہت کم دن اس کی  
زندگی میں ایسے تھے جب اس نے اس شخص کو  
مسکراتے دیکھا تھا۔ صبح کا تھکا ہارا جسم اور دماغ کسی  
پرسکون نیند کے منتظر تھے لیکن لفظ سکون کا لفظ برسا  
برس بیت گئے ان کو برتے ہوئے اب وہ اس لفظ  
سے آشنا تو تھی پر جانتی نہیں تھی کہ وہی سکون نام کس  
چیز کا ہے۔ اس کا ذہن وقت و زمانے کی بھیڑ چال کو  
بھلاتا کئی سال پہلے کے اس کچے آگن کی طرف چلا  
گیا جہاں بھلے غربت تھی پرسکون تو تھا۔

انسان بھی عجیب مخلوق ہے رب کی دی گئی بے  
شمار نعمتوں کو اپنا حق سمجھ کر وصول کرتا ہے اس کا  
احسان اتارنا تو ایک طرف شکر کا ایک کلمہ بھی اس کی  
زبان سے ادا نہیں ہوتا اور اپنے جیسے انسان کے کیے  
گئے احسان کو اس حد تک یاد رکھتا ہے کہ بعض دفعہ اس

چلا۔ وہ تو ساتھ اترنے والی لڑکی نے اسے ٹھوکا دیا تو  
وہ بھی ہزبڑائی اور اپنے گھر والی سڑک دیکھ کر نیچے  
اتر گئی۔

☆☆☆

ڈورنیل کی تیز آواز پر صوفے سے ٹیک لگا کر  
بیٹھی خدیجہ ہزبڑا کر جاگ گئی۔ جو بھی تھا نیل پر ہاتھ  
رکھ کر گویا بھول گیا تھا۔ اس نے بوکھلا کر جلدی سے  
سلیپر پاؤں میں اڑ سے اور تیزی سے دروازہ کھولنے  
چل دی۔

”اپنے آرام اور سکون کے علاوہ اور کوئی پروا  
ہے تمہیں کہ خاوند تھکا پارا گھر آئے گا تو گھنٹا بھر  
دروازہ ہی پینتا رہے لیکن تمہیں کیا پروا۔“

اس کے دروازہ کھولتے ہی سعید احمد کا بیزار اور  
غصیلہ چہرہ دکھائی دیا۔ جو اس کی ہلکی سرخ آنکھیں  
ان کے انتظار میں اوگھ آ جانے کے باعث تھیں کو دیکھ  
کر شروع ہو گئے تھے۔

”کھانا کھائیں گے؟“ ساری کڑواہٹ اپنے  
اندر اتار لینے کے بعد خدیجہ نے ڈرتے، ڈرتے سوال  
کیا۔ مبادا کوئی اور بہانہ کر کے مزید گرجے لگیں۔

”ہاں تو باہر تمہارا باپ میرے لیے خوان سجا  
کے بیٹھا تھا جاہل عورت..... صبح کا ناشتا کر کے نکلا ہوا  
ہوں۔ درمیان میں صرف ایک کپ چائے اور گندا  
سا برگر ہی کھایا ہے اور اب ٹائم دیکھو رات کے گیارہ  
بجے گئے ہیں اور پوچھ رہی ہو کھانا کھائیں گے۔“ اس  
نے بیوی کو لتاڑتے ہوئے اس کی نقل اتاری۔

”ہونہہ..... وہ اور عورتیں ہوتی ہیں جن کے  
دم سے گھر جنت بن جاتے ہیں یہاں تو تمہاری  
جہالت اور نخوست نے نرا جہنم بنا رکھا ہے گھر کو۔ میرا  
منہ کیا دیکھ رہی ہو جاؤ لے کر آؤ کھانا۔“ غصے میں  
دھاڑ کر کہا گیا تو کسی روبرو کی طرح خدیجہ چلتی ہوئی  
کچن میں آگئی۔ یہاں آکر روبرو میں جیسے کسی نے  
احساسات کے سیل ڈال دیے تھے۔ اس لیے آنسو



احسان کا بدلہ اتارنے کی کوشش میں وہ انسانی جذبات جیسی گرافتِ دولت کو بھی اپنے پاؤں تلے روند ڈالتا ہے۔ خدیجہ اور سعید احمد کی زندگی کی کہانی بھی رشتوں اور احساسات کے جوڑ توڑ کی کہانی تھی۔ سعید احمد کے والدین ان کے بچپن میں کسی حاوٹے میں وفات پا گئے تھے۔ خدیجہ کے ابا ایک تعلیمی ادارے میں کلرک تھے انہوں نے یتیم بچے کو اپنی زیرِ کفالت لے لیا تھا۔ اس وقت سعید احمد آٹھویں جماعت کا اور خدیجہ پانچویں کی طالبہ تھی۔ خدیجہ جو اپنے اکلوتے پرن سے تنگ تھی دوسرا ہٹ میسر آنے پر بے طرح خوش تھی۔ حالات و واقعات کی اکھاڑ پھھاڑ اور انسانوں پر اس کا اثر جانے بغیر وہ خوش تھی کہ کبھی کبھار کسی موقع یا تقریب میں ملنے والا تک چڑھا کر ان کے گھر ہمیشہ کے لیے آ گیا ہے۔ تک چڑھا تو وہ تھا اب بہت خاموش طبع ہو گیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ وہ ان کے گھر اور مکینوں سے مانوس ہوتا چلا گیا۔

سعید احمد کے یونیورسٹی آجانے تک خدیجہ اس کے نزدیک صرف ایک چچا زاد تھی پر خدیجہ کے نزدیک یہ کھٹا میٹھا سا تعلق کوئی اور رنگ اختیار کر گیا تھا وہ اپنے اس مغرور کزن کو دل میں جگہ دے نہ سکتی تھی۔ ابا اب ریٹائر ہو گئے تو اس نے چچا پر مزید بوجھ نہ بنتے ہوئے چھوٹی موٹی ٹیوشنز کر کے اپنا تعلیمی خرچ خود اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ انہی دنوں یونیورسٹی میں اسے اپنی ایک کلاس فیلو بے طرح پسند آ گئی اور اس کی طرف سے ملنے والے مثبت ردِ عمل نے اسے آسمان تک پہنچا دیا۔ سعید احمد کا انجینئرنگ کا آخری سال تھا کہ اس کی چچی یعنی خدیجہ کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ ادھر خدیجہ تو جیسے دنیا کی بھیڑ میں تنہا پڑ گئی۔ اس پر سعید احمد کی باتوں میں فاریہ کا تذکرہ اور بے حد تذکرہ اس کا دل بھی میں لے لیتا۔ فاریہ اور سعید احمد کے تعلقات اس بچے تک آ جاؤ گے اب وہ اس

رشتے کو کوئی نام دینا چاہتے تھے پر فاریہ کے والد اگرچہ اس محنتی نوجوان سے متاثر تو تھے پر اتنے نہیں کہ اپنی اکلوتی بیٹی کا ہاتھ ایک بے روزگار کے ہاتھ میں تھما دیتے سو تذہیب کا شکار تھے۔

انہی دنوں قسمت نے پلٹا کھایا اور سعید احمد کو اسکا لرشپ مل گئی اور وہ فاریہ کو دعوں اور امیدوں کے کئی جگنو تھما کر دو سال کے لیے اسپیشلائزیشن کے لیے باہر چلے گئے۔ خدیجہ نے بی اے کر لیا تھا اب مزید پڑھائی سے اس کا دل اجاڑا ہو گیا تھا۔ ابا بیمار رہنے لگے تھے وہ گھر پر رہ کر ان کی خدمت کرتی ایسے میں کبھی اس سنگدل کا خط آ جاتا تو دنوں اڑی، اڑی پھرتی حالانکہ اس نے خدیجہ کے جذبات کو کبھی پزیرائی نہیں بخشی تھی وہ انجان تھا یا جان بوجھ کر انجان بن رہا تھا خدیجہ آج تک سمجھ نہیں پائی تھی۔ بے چوڑے خط میں اس کے نام کی صرف ایک لائن..... خدیجہ کیسی ہے؟ اسے بھی سلام کہیے گا اسے ہفتوں سرشار رہتی۔ فاریہ اور سعید احمد کا رابطہ مسلسل تھا۔ اب تو بیٹی کی ضد سے ہار مان کر اس کے والدین بھی اس کی شادی سعید احمد سے کرنے کو تیار تھے کچھ امریکا پلٹ مھنتی لڑکے کا روشن مستقبل نظر آ رہا تھا پھر اکیلا لڑکا تھا سے اپنی مرضی سے زندگی گزارنے پر مجبور کر سکتے تھے۔ ویسے بھی ان کا سب کچھ ان کی بیٹی کا ہی تھا۔ سعید احمد کو جب فاریہ کے والد کی رضامندی پتا چلی تو وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے اڈاکر پاکستان پہنچنا چاہتا تھا تا کہ چچا جان کو بھیج کر اپنی محبت کو اپنے نام کر دالے لیکن زندگی اگر اسی بچے پر گزرتی جس پر انسان نے سوچ رکھا ہے تو خدا کے ہونے کو تو کوئی نہ مانتا۔ وہ بہت خوش، خوش وطن واپس لوٹا تھا پر لوں سے ہی چچا کی بگڑتی طبیعت نے اس کے ہاتھ پاؤں پھلا دیے، اپنی آخری سانسوں میں انہوں نے مانگا بھی تو کیا..... اس کی زندگی ہی تو مانگ لی۔ اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر کہا



میں تادیب کرے کہ وہ آئندہ پھر ایسا ویسا قدم نہ اٹھائے لیکن زویا کے کسی بھی عمل سے ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ اسے کوئی پکھتاوا ہے یا یہ کوئی غلط کام ہے؟ وہ پونی کو جھلاتے، چیونگم چباتے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی جیسے کوئل یہ سب باتیں اسے نہیں کسی اور کو سنارہی ہو۔  
”زویا..... میں تم سے مخاطب ہوں۔“ اب کے کوئل نے اس کا باقاعدہ بازو ہلایا تو وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔

”ہوں..... تم نے مجھ سے کچھ کہا؟“ اس کی بے نیازی دیکھنے لائق تھی۔

”ہاں، تم جیسے پتھر سے سر پھوڑ رہی ہوں۔“ کوئل نے دانت پیسے۔ ”کیا بکواس کر رہی ہو کون ہے وہ لڑکا؟ تم سے کہاں ملا اور تم اس سے ملنے کیوں نکلیں؟“ کڑے لہجے میں اس سے استفسار کیا۔

”ہمارے بلاک سے اگلے بلاک میں رہتا ہے۔ ایک دن ہمارے بلاک میں موجود اپنے انکل کے گھر کسی کام سے آیا تھا جب اس نے مجھے دیکھا اور میرے حسن جہاں سوز کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہونے کے قریب ہو گیا۔“ وہ فخریہ انداز میں اٹھی۔ ”اس کے بعد پورے ایک ہفتے تک وہ میرے راستے میں آکر کھڑا ہوتا رہا۔ کچھ ہمت بندھی تو میرے پیچھے، پیچھے گئی تک آگیا اور مسلسل دو ماہ سے وہ ملنے کے لیے اصرار کر رہا تھا۔ اس کے بے حد اصرار پر تنگ آکر کل میں اس سے ملنے چلی گئی اور میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا وہ ایک شریف اور سلجھا ہوا لڑکا ہے۔ مجھے پسند کرتا ہے بلکہ محبت کرتا ہے مجھ سے۔“ فخریہ انداز میں اپنی تھوڑا سا محبت کے قیے سناتی وہ اسے سخت زہر لگی۔

”گلی، محلوں اور سڑکوں پر ہونے والی محبت محبت نہیں ہوتی، رسوائی کی طرف جانے والی منزل کا پہلا قدم ہوتی ہے اور تم اتنی، اتنی دیر بات کرتی تھیں تو کوئی دیکھتا نہیں تھا نہ کسی نے نوٹ کیا تم دونوں کو

تھا کہ مرنے سے پہلے وہ دونوں کو نکاح کی ڈور میں باندھ دینا چاہتے ہیں اور چچا کے احسانات کے آگے اس کے وعدے، محبت، وفا کیں اور خواب سب دھڑلے کے دھڑلے رہ گئے۔ نکاح کے تیسرے دن بیٹی کی زندگی سے شانت ہو کر چچا تو ملکِ عدم سدھار گئے پر اسے جیسے جلتے برزخ میں چھوڑ گئے تھے۔ اگلی بار جب وہ فار یہ سے ملا تو اس کی حیثیت بدل چکی تھی۔ نولے ہوئے لہجے میں ساری تفصیل اسے بتاتے وہ رو دیا تھا۔ روئی تو فار یہ بھی بہت تھی اور بغیر کچھ کہے وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔ وہی ایک لمحہ پھیل کر اس کی پوری زندگی پر محیط ہو گیا۔ خدیجہ کا پیار، والہانہ لگاؤ، بیٹی کی پیدائش، سنی کا دنیا میں آ جانا کچھ بھی خدیجہ کے جرم کو کم نہ کر سکا..... وہ جرم جو اس نے اس کی زندگی میں آکر کیا تھا سترہ سالوں کا طویل عرصہ دونوں نے بردہ نہ پا کر گزارا تھا۔ سعید احمد نے چاہت کو کھو دینے اور اُن چاہے ساتھی کے زندگی میں شامل ہو جانے کے دکھ میں اور خدیجہ نے اس کے بدل جانے کی آس میں۔

سعید احمد نے کروٹ بدلی تو خدیجہ باضی کے اس سفر سے واپس لوٹی جس کی یاد اسے یونہی رات، رات بھر جگاتی تھی۔

☆☆☆

”مگر زویا یہ غلط ہے جس طرح کی روش تم نے اپنائی ہے وہ سوائے بربادی کے کچھ نہیں..... اور میں تو حیران ہوں تم جیسی سنجیدہ اور معاملہ فہم لڑکی اس قسم کی فضولیات میں پڑ کیسے گئی؟“ کوئل تو یہ جان کر ہی شکوہ رہ گئی کہ کل وہ کسی لڑکے سے ملنے گئی تھی اور اب سخت لہجے میں اسے کافی کچھ سنا بھی ڈالا تھا۔

”ادمانی گاڈ، تم نے اتنا بڑا قدم اٹھالیا۔ تمہارے پیرنس کو ہٹا چل گیا تو اور..... اور اگر وہ تمہیں کہیں اور لے جاتا تو..... کون ہے؟ تمہیں کہاں ملا؟“ پریشان ہوتی کوئل کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کن الفاظ

سر راہ کھڑے ہوئے، کوئل نے طنز یہ پوچھا۔  
 ”لو میں بھلا کوئی پاگل ہوں جو سر راہ کھڑے  
 ہو کر ہمیں لڑاؤں کی لینڈ لائن نمبر لے لیا تھا اس نے  
 ہمارا۔ فون پر بات ہوتی تھی۔“ وہ مسکرا کر بولی تو کوئل  
 بے ساختہ طویل سانس لے کر رہ گئی۔ اسے یقین  
 ہو چلا کہ فون نمبر بھی زویا نے خود ہی دیا ہو گا۔

”میں تو پھر بھی یہی کہوں گی زویا کہ کچھ دن  
 پہلے تک تم خود ایسی لڑکیوں کا مذاق اڑاتی تھیں جو  
 ماں باپ کے اعتماد کو دھوکا دے کر ایسے ویسے کام  
 کرتی ہیں چنانچہ کیا وجہ تھی کہ تم بھی انہی لڑکیوں کی  
 صف میں جا کھڑی ہوئیں، مجھے یقین نہیں آ رہا۔“  
 تاسف سے کی گئی کوئل کی بات پر زویا کو غصہ آ گیا۔

”کیا مطلب کوئل ایسے..... ویسے... میں نے ایسا  
 کوئی کام نہیں کیا جس پر مجھے شرمندگی ہو۔“ تیوری پر بل  
 ڈال کر اس نے کوئل سے کہا تو وہ کچھ دیر اس کا باغیانہ  
 انداز دیکھتی رہی پھر طویل سانس لے کر گویا ہوئی۔

”تم میری بہت اچھی دوست ہو سوا چھا برا بتانا  
 میرا فرض تھا۔ میم غوری کی کلاس ہے اگر چلنا ہے تو چلو  
 نہیں تو میں جا رہی ہوں۔“ کپڑے جھاڑ کر کتاہیں  
 اٹھاتے کوئل نے کہا۔ زویا ان سنی کر کے منہ دوسری  
 طرف پھیرے بیٹھی رہی گویا اس کی بات سے اسے کوئی  
 سروکار نہ ہو۔ دو تین منٹ کھڑے رہنے کے بعد کوئل  
 اسے وہیں چھوڑ کر کلاس لینے آگے بڑھ گئی تو زویا بھی  
 سامنے والے گراؤنڈ سے اٹھ کر پچھلی طرف آگئی نہیں تو  
 ہیڈ گرلز جو مختلف کلاسز کی تھیں کی نظروں میں آ جاتی۔  
 انتظامیہ کی طرف سے ان کو سخت تاکید تھی کہ کلاسز کے  
 اوقات میں کوئی بھی لڑکی کلاسز تک کر کے بیٹھی نظر نہ  
 آئے اور یہ زویا کی پہلی کلاس تھی جو اس نے بنک کی  
 تھی شاید آگے یہ سلسلہ طویل ہونے والا تھا۔

☆☆☆

”ہاں بھئی ہئی، آج چھٹی ہے تو بتاؤ کھانے  
 میں آج کیا بناؤں بلکہ ایسا کرو سنی سے بھی بھاگ کر

پوچھ آؤ کہ لُچ میں مینو کیا ہوتا چاہیے؟“ خدیجہ اپنے  
 گھر کے ماحول اور بچوں کی تربیت پر اپنے سرور  
 تعلقات کا سایہ نہیں پڑنے دینا چاہتی تھی۔ جانتی تھی  
 کہ ایسا ممکن نہیں ہے، ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے  
 کئی بار سعید احمد بچوں کے سامنے بلاوجہ اسے جھاڑ  
 دیتے تو وہ خفت سے دوچار ہو جاتی، جب تک بچے  
 چھوٹے تھے سہم جاتے تھے پر اب جب سنی کا لُچ  
 اور سنی میٹرک میں آیا تھا وہ ایک عجب سی لائق اور  
 بے رخی ان کے انداز میں محسوس کرنے لگی تھی۔ ایسے  
 میں اس کی کوشش یہی ہوتی کہ شوہر... کو کسی قسم کی  
 شکایت کا موقع نہ دے خصوصاً بچوں کے سامنے لیکن  
 ان کو بھلا برا ماننے کے لیے کب کسی شکایت کی  
 ضرورت ہوتی۔

ابھی کل ہی تو اس نے دبے لفظوں میں....  
 انہیں بتایا بھی تھا کہ تنہائی میں بٹھلے اسے جو کہ سن لیں  
 بچوں کے سامنے اپنے رویے میں چلک پیدا کریں  
 لیکن نہیں جانتی تھی کہ دلوں کی جنگ ہارنے والا ایسا  
 پتھر دل ہو جاتا ہے کہ کوئی بھی ضرب اس پر اثر نہیں  
 کرتی نہ لفظوں کی، نہ جذبات کی، نہ اعمال کی۔ سعید  
 احمد نے اننا اسے بے نقط سنائی تھیں۔

”تم..... تم جاہل عورت اپنی بدتمیز اولاد کو  
 سمجھانے کے بجائے مجھ سے باز پرس کرنے بیٹھ گئی  
 ہو۔ بیٹا ہے تو بات کرنے پر منہ کو آتا ہے۔ بیٹی کو اتنی  
 توفیق نہیں کہ باپ کو ایک گلاس پانی ہی پوچھ لے۔  
 میں کہتا ہوں میں ان کا باپ ہوں یا وہ میرے۔“ وہ جو  
 سمجھ رہی تھی کہ وہ بچوں کے بدلتے رویے سے بے  
 خبر ہیں اس کی غلط فہمی تھی۔ انہوں نے بھی اولاد کی  
 نظروں میں جھلکتی خفگی اور انداز کی برہمی کو بھانپ لیا  
 تھا پراسوس اس کی وجہ پر غور کرنے کی زحمت کیے بغیر  
 پچھلے ہر گناہ کی طرح یہ ناکردہ گناہ بھی اس کی ناقص  
 تربیت کے کھاتے میں درج ہو گیا تھا۔

”واہ ماما، آج تو مزے ہوں گے ہئی بتا رہی

میں نظر نہیں آتی۔۔۔“ وہ دونوں باپ کے روتے کے خلاف جی بھر کر بولی رہے تھے۔ خدیجہ بہت چاہنے کے باوجود اپنے آپ کو کچھ بولنے پر مجبور نہ کر پائی۔۔۔ پر اپنے بچوں کا باپ سے متنفر ہونا اسے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ انہیں کسی اور وقت سمجھانے کا تہیہ کر کے ان دونوں کو تیار ہونے کا کہہ کر وہ خود کچن میں آگئی۔

☆☆☆

”فارسی۔۔۔۔۔“ ماہ و سال کا طویل عرصہ جیسے ان کے بیچ آیا ہی نہیں تھا۔ فارسیہ ایک ایک سے دیکھے جا رہی تھی۔ لکھوں بعد اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔ بھولی تو وہ بھی اسے نہیں تھی بس حالات و واقعات کی دھند نے کچھ سالوں کے لیے سب کچھ دھندلا ضرور کر دیا تھا۔

”سعید۔۔۔۔۔!“ اس کے لبوں سے سرسراہٹ ہوئے سعید احمد کا نام کسی سرگوشی کی صورت ادا ہوا۔ انہیں قطعاً پتا نہیں تھا کہ بریلی جس کی یاد نے انہیں زندگی کا صحیح معنوں میں لطف نہیں لینے دیا تھا وہ یوں سر راہ اچانک آکر اٹکرائے گی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ایک قریبی ریسٹورنٹ میں موجود تھے۔

”کیا بتاؤں فارسی، تم سے چھڑ کر زندگی گزار تو دی پرچی نہیں پایا۔“ ادھوری اور بے کیف زندگی کا دکھ ان۔۔۔۔۔ کے لہجے میں آ رہا تھا۔ ”تم سناؤ فارسی، کیسی ہو؟ شادی کی؟ بچے کتنے ہیں؟“ اس کو بے قراری سے تکتے دیکھ کر وہ بے درپے سوالات کیے گئے۔

”کی بھی شادی ہاں ضرور کی تھی پر اولاد نہ دے سکے کی پاداش میں اس شخص نے شادی کے محض پانچ سال بعد ہی مجھے چھوڑ دیا۔ پھر پاپا بھی چھوڑ کر چلے گئے مجھے۔۔۔۔۔ پھر تو شخص زندگی کا تنہا اور طویل سفر تھا اور میں تھی۔“ وہ اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں الجھتی ہوئی آہستہ سے اپنے دکھ سناتی چلی گئی تو ان دکھوں کی تھکن اور جھمن کو اس نے اپنے دل پر محسوس کیا۔

”تمہارے کتنے بچے ہیں؟ بیوی کیسی ہے

ہے کہ وہ جابر حکمران آج گھر پر نہیں ہیں۔“ دفعۃً سنی کی پُرجوش آواز اسے خیالات کے ہجوم سے ہاتھ پکڑ کر حال میں لے آئی۔

”بری بات سنی، پاپا کے بارے میں کوئی الٹا سیدھا لفظ استعمال کیا تو میں بہت سختی سے پیش آؤں گی۔“ اس نے بہت سخت لہجے میں اسے ڈانٹا تو وہ منہ بنا کر رہ گیا۔

”ماما آج کتنے عرصے بعد تو موقع ملا ہے کیوں ناں لہجے باہر کرنے جائیں آج؟“ ہنی کی آنکھیں کسی خیال سے چمک اٹھیں۔

”ویری گڈ آئیڈیا ڈریس۔۔۔۔۔ کیا خیال ہے ماما؟“ ”خیال تو اچھا ہے پر تمہارے پاپا بتا کے نہیں گئے کہ کہاں جا رہے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ وہ آئیں اور گھر پر ہمیں نہ پا کر خفا ہو جائیں۔“ دونوں کے پُر امید چہرے دیکھ کر وہ قدرے ہچکچاہٹ سے بولی۔ بچوں کی خوشی دیکھ کر اس کا بھی دل نہ چاہا کہ ان کا دل توڑے بہت عرصے بعد یوں بے ساختہ فرمائش ان کے منہ سے نکلی تھی ورنہ تو اسکول، کالج کی لفٹ روٹین، باپ کا بیزار رویہ، ماں کی بے بسی پر ہنی تو اپنی ذات میں گم ہو گئی سنی نے بھی پتا نہیں کن مصروفیات میں خود کو گم کر لیا تھا۔

”افوہ ماما پہلے آپ کو اپنے شوہر نامدار کبھی دن کی روشنی میں نظر آئے ہیں جو آج آئیں گے۔ آہمی گئے تو کون سا ہم کوئی ڈاکا ڈالنے جا رہے ہیں جو آپ یوں ڈر رہی ہیں۔ یا تو ان کے لیے کھانا رکھ جائیں یا پھر پیک کروالائیں گے اور ماما پلیز برا مت مانے گا یہ آپ نے ہی ان کو چپ رہا رہ کر سر پر چڑھا رکھا ہے ورنہ آج کل کے دور میں، میں سنے آپ جیسی سنی سادری قسم کی لیڈیز بہت کم دیکھی ہیں۔“ ”بالکل ٹھیک کہا تم نے یہی بلکہ مجھے تو لگتا ہے صرف ماما ہی ہیں ورنہ آج کل ایسی دو من صرف ڈراموں، فلموں کی حد تک محدود ہے۔ ریکل لائف



تمہاری؟ خدیجہ نام بتایا تھا غالباً تم نے؟“ چند لمحوں بعد وہ سنبھل گئی تو اس سے سوال کیا۔

”دو بچے ہیں بڑی بیٹی فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہے جبکہ بیٹا میٹرک میں ہے۔ میرا تو گزرا تمام عرصہ پچھتاؤں کی کڑی دھوپ میں گزرا۔ ہر لمحہ ہر پل یہی سوچ کر تڑپتا رہا کہ کاش چچا کو اسی وقت انکار کر دیتا تو نہ خود ان دیکھی آگ میں جلتا نہ ان کی بیٹی کو جلاتا۔ ان کے بے شمار احسانات کا بدلہ اتارنے کو زباں بندی کی میں نے..... پر جانتا ہوں ان کی روح تو آج بھی بے چین ہوگی اپنی بیٹی کو ناخوش دیکھ کر۔ آسودگی کا ایک لمحہ بھی تو نہیں دے پایا میں اس عورت کو۔ اتنی وسعت ہی پیدا نہیں ہو پائی دل میں کہ تمہیں بھلا کے اسے جگہ دے پاتا۔ اس ایک انکار سے وہ اس وقت ناراض ہو جاتے پر اتنی زندگیوں میں نا آسودگی تو نہ ہوتی ناں..... تم..... میں..... خدیجہ کوئی بھی تو خوش نہیں رہا۔“ وہ اعترافات جو آج تک صرف اپنے دل میں کرتے آئے تھے محرم کو سامنے پا کر لوک زبان تک آ کر اظہار کا راستہ پا گئے تھے۔ دو گھنٹے ان کو یہ دکھ سکھ کہنے میں لگ گئے یوں وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چل سکا۔

☆☆☆

پورے سات دن بعد وہ ایک بار پھر ایک ہوٹل میں اس کے ساتھ موجود تھی۔

”بہت ٹائم ہو گیا ہے روحیل اب مجھے چھوڑ آؤ۔ زیادہ دیر ہوگئی تو ماما پریشان ہو جائیں گی۔“ وہ چادر کی اوٹ سے یہاں وہاں دیکھتی گویا ہوئی۔

”ابھی سے..... ابھی تو میں نے تمہیں جی بھر کے دیکھا بھی نہیں کہ تمہیں جانے کی پڑ گئی ہے؟“ وہ منہ بنا کر بولا تو نوخیز زویا گھبرا کر نظر جھکا گئی۔ گھر کے ماحول سے تنگ آ کر اس نے ایک قدم اٹھا تو لیا تھا لیکن روحیل کے التفات پر اس کے ہاتھوں سے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔

”روحیل پلیز، کالج سے نکلے ہوئے ہمیں ڈیڑھ گھنٹا ہو گیا ہے۔ ماما نے کسی کو بھیج کر وانیہ کے گھر سے پتا کروالیا تو بہت برا ہوگا۔“ اس نے اپنے بلاک کی ہی ایک لڑکی کا حوالہ دیا۔ ایک دفعہ بارش میں دین خراب ہوگئی تھی تو ماما ملازمہ کو ساتھ لے کر وانیہ کے گھر پتا کرنے چلی گئی تھیں۔ خوف اس کی آنکھوں سے مترشح تھا۔

”اچھا بابا صبر کرو، چھوڑ آتا ہوں پہلے تم یہ پکڑو۔“ اس نے ایک پیکٹ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا ہے؟“ زویا نے ایک نظر اس پیک پر اور دوسری اس پر ڈالی پر لینے کو ہاتھ نہیں بڑھائے تھے۔

”موبائل ہے یا راتنا گھبرا کیوں رہی ہو۔ لینڈ لائن نمبر سے پہلے تمہارے اماں، بابا کے سو جانے کا انتظار کرو پھر نہیں جا کر ترس، ترس کر تمہاری آواز سننے کو ملتی ہے۔ یہ سم ہے۔“ وہ ڈبا کھول کر موبائل نکال کر اسے اس کے آپریٹ کرنے کے طریقے کے متعلق بتانے لگا۔ تھوڑے سے تذبذب کے بعد زویا نے وہ سیل فون چار جرسمیت اٹھا کر اپنے بیگ میں ڈال لیا اور ڈبا واپس کر دیا۔ آج کی ملاقات کے بعد روحیل پر اس کا اعتماد کچھ اور بڑھ گیا تھا وہ جو کول کے الفاظ سے بظاہر بے نیازی برتنی دل ہی دل میں ڈر گئی تھی پریں مطمئن تھی۔

”اپنے ماں باپ کی ہی عزت کا خیال کر لو زویا۔ زمانہ بھلے جتنا ہی ترقی کیوں نہ کر جائے عورت کی عزت ہر زمانے میں شیشہ ہوتی ہے اور اس کا نادانستگی اور نادانی میں اٹھایا جانے والا قدم اس شیشے کی شفافیت کو خراب کر دیتا ہے۔ صرف یہی ایک بات تم سوچ لو کہ جنہوں نے لڑکی کو گھر کی عزت بنانا ہوتا ہے لوگوں کے سامنے اس کا نام تک زبان پر لانے سے ڈرتے ہیں کہ رسوائی کی دھول ان کے گردار کو گہنا نہ دے۔ وہ بلند و بانگ دعوے



کبائٹ اسٹڈی ہے یا کبائٹ آوارگیاں..... وہ چھپے پلیٹ میں بیچ کر دہاڑے۔

زویا کو اپنے اوسان خطا ہوتے محسوس ہوئے اس نے چیر کا سہارا لے لیا۔ اگر جو پاپا نے تھوڑی سی مزید انوسٹی گیشن کی تو اس کی ساری پول کھل جائے گی۔ اپنی پریشانی میں اس نے ہاں کی تادیل نہیں سنی جو وہ اس کے باپ کو دے رہی تھیں۔ وہ بس نظر پر نیچی جھکائے باپ کو مگر جتا برستان رہی تھی..... اور اگر پاپا نے چیک کر لیا تو..... اس نے بیگ پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے چور نظروں سے باپ کی طرف دیکھا۔ پاپا کی طرف سے اسے فون سننے پر بھی پابندی تھی کچا کہ سیل فون رکھنا اور استعمال کرنا۔ باپ کے پیٹھ پیچھے جتنا بھی بول لیتی ان کے سامنے اس کی ٹھٹھی بن جاتی تھی کیونکہ سعید احمد نے شفیق روایتی باپ کا رول بھی نبھایا ہی نہیں تھا گھر میں ہر رشتے کے لیے وہ ایک ڈکٹیٹر تھے جو ہمیشہ حکم چلاتے، چیختے چلاتے نظر آتے۔ وہ تو شکر کرتی کہ پاپا زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہتے تھے ورنہ چونکہ اس گھر کی فضا پر بھی ہم طاری ہوتا۔ باپ کا رویہ کرخت تھا تو ماں نے بھی بھی پاس بٹھا کر ان کے مسئلے مسائل جاننے کی کوشش نہیں کی تھی، نہ ہی ایک مخصوص بے تکلفی موجود تھی ان ماں بیٹی کے درمیان جیسا کہ عموماً ہوتی ہے۔ اپنے ہی گھر میں وہ دونوں انجینی بن کر رہتے سو جب پہلی بار توجہ اور تعریف ملی..... اپنے آپ کو بہت روکنے کے باوجود وہ اس کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ اپنے اندر کی گھٹن کو نکالنے کے لیے اس نے جو چور دروازہ

ڈھونڈ نکالا تھا بھلے ہی غلط تھا پر اس کی تعریف اور کیئر اسے آسان پر اڑالے جاتی، محض دو ملاقاتوں میں ہی وہ انجانے دلیں کے کئی سفر اس کے ہمراہ کر آئی تھی۔

”مہنی مجھے صبح بتا کر مہنی تھی کہ وہ لیٹ ہو جائے گی، میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا ہے اور سنی بھی جھوٹ نہیں بولتا۔ کل ان تین دوستوں نے یہاں مل

نہیں کرتے عمل کرتے ہیں۔ پارکوں، ہوٹلوں اور گھر سے باہر کی جانے والی ملاقاتیں رسوائی، بدنامی کا پیش خیمہ تو ہو سکتی ہیں محبت اور عزت کا نہیں۔“

کول نے اسے کہا تھا۔

اور وہ دل ہی دل میں ہزار ہا خدشات لیے اس کی کسی بات کا جواب دیے بغیر چھٹی ہوتے ہی کالج سے نکل کر سائڈ والی گلی میں آگئی تھی جہاں روٹیل اس کا منتظر تھا۔ زویا کو اب کوئی پروا نہیں تھی کہ صبح دین میں اس کے ساتھ آنے والی لڑکیاں کیا سوچیں گی کہ وہ کہاں گئی ہے نہ ہی کچھلی بار کی طرح اس نے کول کو کوئی تاکید کی تھی۔

”بس یہیں روک دو۔“ اپنے گھر سے تین چار گلیاں چھوڑ کر اس نے بائیک رکوائی تھی۔

”سنو، گیارہ بجے میری کال کا انتظار کرنا۔“ روٹیل یہ کہہ کر چلا گیا تھا۔ زویا سرشاری گھر لوٹ آئی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ دھک سے رہ گئی۔ خلاف توقع پاپا کھانے کی ٹیبل پر موجود تھے۔ اس نے ڈرتے، ڈرتے سلام کیا تو جواب دیے بغیر انہوں نے نظر اٹھا کر سامنے والے کلاک کو دیکھا۔

”یہ تم روز اس ٹائم کالج سے آتی ہو یا آج آرہی ہو؟“ کرخت لہجے اور غصیلے تیور اس کے ہوش اڑا گئے۔

”وہ..... وہ پاپا..... پریکٹیکل تھا آج تو لیٹ ہو گئی ہوں۔“ سفید چہرہ لیے بیگ کے اسٹریپ کو مضبوطی سے پکڑے اس نے اپنی ٹانگیں کاٹتی ہوئی محسوس کیں۔

”تم نے کبھی اولاد پر چیک رکھنے کی کوشش کی ہے یا یونہی شتر بے مہار چھوڑا ہوا ہے؟ دو بجے چھٹی ہو جاتی ہے اور تمہاری بیٹی جا رہے گھر آرہی ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ آج پریکٹیکل تھا بھی یا نہیں؟ بیٹا ہے تو اسکول سے آنے کے بعد کھانا کھا کر کبائٹ اسٹڈی کے بہانے غائب ہے۔ کبھی بتا بھی کیا کہ

کراسٹڈ کی تھی آج ایک دوست کے گھرباری رکھی تھی۔“ خدیجہ ان کو دھیما کرتے ہوئے بولی۔ اور ایک شاکی نظر آنسو پتی بیٹی کی طرف دیکھا۔

”اچھا، اچھا بس تم جیسی مائیں ہی ہوتی ہیں جو اولاد کے بیسوں پر پروہ ڈال کر ان کو تباہی کے دہانے لگا کر ا کرتی ہیں۔“ انہوں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ خدیجہ گہری سانس لے کر رہ گئی بولتی تو بھی بری بنتی۔ نہ بولتی تب بھی پھنکار اس کی قسمت میں لکھی تھی۔

”بہر حال، یہ اس سال اس کی پڑھائی کا جنٹ ختم کرواؤ ایک دور شستے ہیں میری نظر میں۔“ ”تم اپنے کمرے میں جاؤ بیٹی۔“ خدیجہ کی نظر بیٹی کے آنسوؤں سے تر چہرے پر پڑی۔ شوہر کی بات ان سنی کرتے اسے کمرے میں جانے کو کہا۔ زویا آہستہ آہستہ قدموں سے چلتی اپنے کمرے کی جانب بڑھی۔

”بچوں کے سامنے ہی کم از کم لحاظ کر لیا کریں اور بیٹی کی عمر ہی کیا ہے یہ مشکل سولہ سال کم از کم بی اے تو کرنے دیں۔“ بے بسی اور اہانت کے شدید احساس سے خدیجہ کی آواز جھنجھکی۔

”ہاں تو اس وقت کا انتظار کروں جب تمہاری اولاد میرے سر پر دھول ڈال کر نکل جائے اور میں سر پینتا رہ جاؤں۔“ تیور دیکھے ہیں اپنی اولاد کے۔“ اپنے کمرے کا اینڈل کھولتے جو پاپا کی آخری بات زویا کے کان میں پڑی اس نے اس کے اندر بغاوت کی ایک شدید لہر کو دوڑایا، خون کی جگہ جسم میں گویا شرارے دوڑنے لگے۔ جھٹکے سے دروازہ کھول کر اس نے دہاز سے بند کیا اور فیک لگا کر نیچے بیٹھتی چلی گئی۔

کتنی حسرت سے وہ کول اور دوسری لڑکیوں کے گھر کے ماحول، ان کے والدین کے باہمی تعلق، ان کے پیرنس کی شفقت کے حال سنتی تھی پر اپنی ذہنی توڑ پھوڑ کو کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ آنکھ کھولتے ہی اس نے اپنے باپ کو اپنی ماں پر ہمیشہ جیتنے سنا تھا، ان سے

بے رخی ضرور برتتے پاپا پر کبھی ان پر بظاہر ڈانٹ ڈپٹ کا کوئی سلسلہ نہیں رکھا تھا پر کچھ عرصے سے وہ اور سنی بھی ان کے عتاب سے محفوظ نہیں رہے تھے۔ والدین اپنے بچوں خصوصاً بیٹیوں کو جو مان اور اعتبار دیتے ہیں وہ تو ہمیشہ سے ان کے لہجے اور رویے میں مفقود تھا، اب تو شک کی زہریلی چنگاریاں بھی لب لب لہجے میں لودینے لگی تھیں۔ بے رخی کے بیج کودل اور روح کی سرزمین پر ڈالا جائے اور اسے اہانت۔۔۔۔۔

بڑھتی بڑھتی اور نفرت کا پانی دیا جانے لگے تو دل کی زرخیز زمین پر بہت کم عرصے میں ہی تناور درخت آگ آتا ہے پھر اس جڑ پر بغاوت کے پھل لگتے ہیں اور اگر وہ بے اعتباری ماں باپ میں سے کسی ایک یا دونوں کی طرف سے ہو تو انسان بہت جلد ہی وہ پھل کھا لیتا ہے۔ پھر قصور چاہے جس کا بھی ہو نقصان دونوں کا ہوتا ہے۔ وقت گزر جانے کے بعد اس قصور کا ماتم تو کیا جاسکتا ہے عداوتیں۔ سعید احمد کی بے رخی، بے اعتباری سے بغاوت تو خدیجہ کو بھی ہوئی تھی پر اس نے اس بغاوت کو اپنی گم گشتہ محبت میں لپیٹ لیا تھا صرف اس کا دل ویران ہوا تھا۔ اس کا گھر، اس کی دنیا اور آخرت بچ گئی تھی پر افسوس بیٹی اور سنی کے دلوں میں باپ کی طرف سے محبت کے دو الفاظ تک کا زور راہ نہ تھا جس کو سہارا مان کر وہ بغاوت سے منہ موڑ لیتے، انہوں نے اس چیز کو خوب بھٹنے پھونے دیا اور اب اس کا پھل تیار تھا۔ نقصان کہاں اور کس کا ہونا تھا یہ صرف کاتب تقدیر کو پتا تھا۔

☆☆☆

”قاری۔۔۔۔۔!“ ان کے لہجے میں جذبات کی تمام شدتیں تھیں۔ خدیجہ کے لیے آگ برسانے والی زبان میں اس وقت پھولوں کی سی نرمابھٹ تھی۔ ”آؤ قاری شادی کر لیں۔۔۔۔۔ ایک ہو جائیں۔ لہذا بن باس کاٹا ہے میں نے۔ ایک عرصہ رسائی کا دکھ سہا ہے۔ اب۔۔۔۔۔ اب زندگی کا باقی ماندہ سفر تمہاری ہمراہی





اور وہ آہستہ آہستہ ساری باتیں اسے بتاتی چلی گئی۔  
 ”پاپا کہتے ہیں کہ جلد ہی کوئی رشتہ دیکھ کر مجھے  
 رخصت کر دیں گے۔ میں ان کے نزدیک ناقابل  
 اعتبار ہوں۔ کہتے ہیں کہ زیادہ دیر گھر میں بٹھائے  
 رکھا تو ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا دوں گی۔ ان کی یہ  
 باتیں میرے دل و دماغ میں آگ لگائے ہوئے  
 ہیں۔ ایسے ہوتے ہیں والدین؟ ایسے ہوتے ہیں  
 باب؟ میری کلاس فیلو زاپنے پیرئش کی محبت، گھر کے  
 خوشگوار ماحول کی باتیں کرتی ہیں تو مجھے لگتا ہے سب  
 مجھے چڑا رہی ہوں۔ میرا مذاق اڑا رہی ہوں۔ کبھی  
 کبھی تو میرا دل کرتا ہے کہ خودکشی کر کے اس دنیا سے  
 چھٹکارا حاصل کر لوں۔“ یاسیت سے وہ اپنے دل کی  
 حالت بیان کرتی چلی گئی۔

”ارے..... ارے ایسا غضب مت کرنا.....  
 خودکشی کر کے مرنے سے نقصان کس کا ہوگا..... تمہارا  
 ماں اور کسی کو کیا فرق پڑے گا۔ تمہارے پاپا خوش  
 ہو جائیں گے جان چھوٹ گئی۔ دیکھو یہ ہماری زندگی  
 ہے اس پر سب سے زیادہ حق ہمارا ہے۔ اگر ہمارے  
 پیرئش کو ہمارا خیال نہیں ہے تو ہم کیوں کسی کا  
 سوچیں۔ کیا ہمیں خوشیاں حاصل کرنے کا کوئی حق  
 نہیں؟“ جد باتی ہوتے ہوئے وہ اسے بغاوت کے  
 سنے اسباق پڑھا رہا تھا اور کئی باغی سوچیں زویا کے  
 ذہن کی دھرتی پر نمودار ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

”فاری میری زندگی..... میری جان میں آج  
 بہت خوش ہوں۔ دنیا جہان کی خوشیاں گویا میرے  
 قدموں تلے آ بسی ہیں۔“ وصل کے لمحوں سے سرشار  
 سعید احمد مدہوش سے لہجے میں بوسے تو فاریہ بھی  
 مسکرا دی۔ سعید احمد کا التفات اور اصرار آخرا سے بھی  
 حتمی فیصلہ کرنے پر مجبور کر ہی گیا تھا۔ کل ہی ان کا  
 نکاح ہوا تھا۔ فاریہ کے بے حد اصرار پر وہ لوگ  
 فاریہ کے گھر پر ہی تھے۔

”اب جب ہم دونوں ایک ہو چکے ہیں سعید تو  
 پھر کیا حیرا کیا میرا.....“ انہوں نے جب فاریہ کو  
 نئے فلیٹ میں لے جانے پر اصرار کیا تو اس نے کہا  
 تھا۔ ”میں نے اپنا بہت سارا وقت یہاں گزارا ہے۔  
 میرے بابا کی یادیں ہیں سعید اس گھر میں..... میں  
 اسے چھوڑنا نہیں چاہتی۔“ فاریہ نے وجہ بتائی تو  
 وہ..... چپ ہو گئے تھے۔ خدیجہ سے ایک ہفتے کے  
 برنس ٹور کا کہہ کر وہ فاریہ کے ساتھ شمالی علاقہ جات  
 ہو کر آئے تھے۔ ہاں گھر میں ان کے تیور وہی تھے  
 پہلے جیسے۔ سنی کو البتہ ایک دن اسکول میں کسی کلاس  
 فیلو سے ان کی دوسری شادی کا پتا چلا تھا۔ وہ تو اس  
 لڑکے سے لڑنے مرنے کو آ گیا تھا۔ بس چھٹی ہونے  
 کا انتظار کیا تھا اور گھر آ کر اس نے غصے میں بہت توڑ  
 پھوڑ کی۔ بہت چیخا چلا یا۔ خدیجہ تو یہ سن کر ہی سنائے  
 میں آ گئی۔

”سنی ایسے مت کرو بیٹا، لوگوں کی تو عادت  
 ہوتی ہے فضول میں دوسروں کے گھروں میں تاک  
 جھانک کر کے معاملات بگاڑنے کی۔ تمہارے پاپا  
 آجائیں پھر ان سے پوچھ لینا کہ کیا بات ہے۔“  
 ”چالیس لڑکوں کی کلاس میں ایک مجھے ہی  
 کیوں کہا ماما اس نے کہ تمہارے پاپا نے ایک برنس  
 دومن سے شادی کر لی ہے اور لاسٹ ویک اس کے  
 ساتھ بھور بن گئے تھے۔ وہ تو بتا رہا تھا کہ کل اس کے  
 پاپا نے ان دونوں کو میریٹ میں ڈنر کرتے بھی دیکھا۔  
 میں کہتا ہوں کہ آخر ان کو ضرورت ہی کیا ہے جھوٹ  
 بولنے کی۔ ایک اور لڑکا کہنے لگا۔ ”واہ سنی تم لوگوں کے  
 تو وارے تیارے ہو گئے خوب صورت اور نئی نویلی ماما  
 بھی مل گئیں اور ان کی بے شمار دولت الگ۔ تمہارے  
 پاپا نے کسی طور بھی گھانے کا سودا نہیں کیا یا۔“ مجھ  
 سے کلاس میں بیٹھنا دو بھر ہو گیا۔ ”اب کے وہ ماما کی...  
 خود..... میں مردے کر رہا ہوں۔“

”پاپا کو کیا ضرورت تھی ماما ایسے کرنے کی؟



برداشت نہیں کروں گا میں۔“ انگلی اٹھا کر وارن کرنے کے انداز میں انہوں نے سنی سے کہا اور ایک جتنا نظر خدیجہ پر ڈال کر اندر چلے گئے۔

”آئی ہیٹ یو پاپا..... آئی ہیٹ یو۔“ وہ بند دروازے کو دیکھ کر زور سے چلا یا تو خدیجہ نے آگے بڑھ کر اسے قابو کرنا چاہا۔

”میں شوٹ کروں گا ماما اس عورت کو۔“ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور لہجہ بے حد ہانسی تھا۔

”اس کو شوٹ کر دو گے اور خود جیل چلے جاؤ گے؟“ ہنی نے سپاٹ انداز میں پوچھا۔

”ہاں چلا جاؤں گا جیل لیکن میرے دل کے اندر جو آگ لگی ہے وہ ایسے ٹھنڈی نہیں ہوگی۔ تم نہیں سمجھتی ناں ہمارے اسکول میں درخت دیکھتیں ہر چہرہ جیسے میرا مذاق اڑا رہا تھا اور ہر آنکھ خود پر ہنسی لگ رہی تھی۔“

”بس کرو..... خدا کے لیے بس کرو سنی۔ میرا ہی خیال کر لو۔“ خدیجہ میں اس سے زیادہ برداشت کرنے کی سکت نہیں تھی وہ کہتے ہوئے صوفے پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ تمام کر رو پڑی۔ ہنی نے غصے سے بھائی کو دیکھا اور ماں کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور باں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گویا اپنے لمس سے ان کو تسلی دے بٹھا ہو۔ سنی کا غصہ بھی ماں کو روتے دیکھ کر جھاگ بن گیا تو وہ بھی ان کے دوسری طرف آ کر بیٹھا۔

”آئی ایم سوری ماما..... میرا مقصد آپ کو دکھ دینا نہیں تھا لیکن بیوی پایا نے بہت برٹ کیا ہے۔ پوری لائف انہوں نے بغیر کسی وجہ کے آپ پر برستے گزاری اور اب جوان اولاد کے ہوتے ایسا شرم ناک اسٹیپ اٹھا لیا۔“ وہ ماما کے ہاتھ کو تھکتے ہوئے بولا۔

”کچھ بھی ہو جائے سنی تم وعدہ کر دو کہ کوئی بھی ایسا قدم نہیں اٹھاؤ گے جو مجھے دکھ پہنچائے۔ میرا سب کچھ تم دونوں ہو اور میری تمام امیدیں تم سے

انہوں نے ایک ہل کو ہمارا سوچا نہ آپ کا۔ کس چیز کی کمی تھی انہیں؟“ اس کے کسی سوال کا جواب خدیجہ کے پاس نہیں تھا۔ ابھی تو ہنی کالج سے نہیں لوٹی تھی اس کا رد عمل بھی کم و بیش ویسا ہی ہوتا۔ اس دن ہنی بہت لیٹ آئی تھی۔ ابھی خدیجہ اس سے باز پرس کرنا ہی چاہتی تھی کہ سعید احمد کی آمد ہوگئی۔ کھانا کھا کر وہ اپنے کمرے میں جاتا ہی چاہتے تھے کہ سنی کسی کونے سے نکل کر ان کے سامنے آگیا۔

”کیا یہ بات سچ ہے کہ آپ نے دوسری شادی کر لی ہے؟“ اس کے اس سوال پر انہوں نے اپنے سامنے تن کر کھڑے سنی کو دیکھا ایک نظر اپنی سائنڈ پر گھڑی خدیجہ کو اور اپنے کمرے کے دروازے پر گھڑی ہنی کو۔

”اگر میں کہوں ہاں تو.....؟“ وہ اپنی طبیعت کے خلاف سکون سے بولے۔ خدیجہ وہیں ساکت ہو گئی۔ اس کی عمر بھر کی ریاضت رائگاں چلی گئی تھی جبکہ ہنی کے دل میں باپ کے خلاف نفرت کی ایک زوردار لہر نے سر اٹھایا۔

”کیوں.....؟“ سنی منھیاں بھیج کر حلق کے بل چیخا۔

”میں اس بات کے لیے تمہارا جواب دہ نہیں ہوں۔ وہ یہاں نہیں آئے گی نہ ہی تم لوگوں سے اس کا کوئی تعلق ہوگا۔ تمہاری ضروریات، طرز زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اس کے آنے سے۔“ وہ کہہ کر سائنڈ سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگے۔

”اور میں اپنی ماما کی جگہ کسی ایری غیری آوارہ عورت کو نہیں دے سکتا۔“ سنی نے ایک بار پھر چیخ کر کہا پر اس بار ان کے ہاتھ اس کے منہ پر لگنے والا پھنٹر اتنا شدید تھا کہ سنی گال پر ہاتھ رکھے لڑکھڑا گیا۔

”اس نے تمہاری ماں کی جگہ نہیں بلکہ تمہاری ماں اس کی جگہ پر چلی آئی تھی۔ میں وضاحتیں دینے کا قائل نہیں ہوں پر آئندہ اس قسم کی فضول گوئی

وابستہ ہیں۔" اب وہ آنسو پونچھ کر بولیں۔

☆☆☆

سعید احمد کو سنی کے تیور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہے تھے پر قاریہ کی رفاقت کچھ ہلے کو انہیں ساری فکریں ضرور بھلا دیتی تھی۔ آج وہ دونوں لٹچ پر آئے تھے۔ قاریہ شادی کے بعد بہت خوب صورت ہو گئی تھی جیسے یونیورسٹی کے دنوں میں تھی۔ حقیقی خوشی کا عکس ایسے ہی چہرے پر روشنی بن کر چمکتا ہے۔

ابھی کھانا لگنے میں کچھ دیر تھی سو وہ دونوں یونیورسٹی کے دنوں کی خوشگوار یادوں میں مگن تھے۔ جب سعید احمد کی نظر کوٹنے میں رکھی ایک ٹیبل پر گئی اور واپس پلٹنا بھول گئی۔

"زویا یا اردو دن سے گھر نہیں جا رہا ہوں۔ سمجھ نہیں آتا کیا کروں، میری وجہ سے ماما اور بابا کا جھگڑا شدید نوعیت اختیار کر گیا ہے۔ بابا کے کہنے کے مطابق پھوپھو اور ان کی دختر نیک اختر ہمارے گھر پر براجمان ہیں۔ بابا کا خیال ہے جلد از جلد میرا اور اس کا نکاح کر دیا جائے جبکہ ماما کا اصرار ہے کہ بابا سے چوری میں ماما کی بھانجی سے ارجنٹ نکاح کر لوں تاکہ بعد میں بابا کچھ نہ کر سکیں۔ میں نے آج تمہیں اسی لیے ارجنٹ بلوایا ہے کہ اب تمہاری محبت کے امتحان کا صحیح وقت آ گیا ہے۔ تم بتاؤ کہاں تک میرا ساتھ دے سکتی ہو؟" پوری بات کرنے کے بعد وہ ڈرامائی وقفہ دے کر بولا تو زویا گھبرا گئی۔

"کیا مطلب روجیل، تم کیا کہنا چاہ رہے ہو، میں کبھی نہیں.....؟"

"میں سمجھتا ہوں۔ میں اس طرح بغیر اپنے پیرنس کی کسی بھی قسم کی سپورٹ کے اگر تمہارے پیرنس کے پاس رشتہ لے کر آتا ہوں تو کسی بھی صورت قبول نہیں کیا جاؤں گا جبکہ ایک بار میں گھر واپس چلا گیا تو بابا یا ماما کسی کی بھی ایموٹل بلیک میننگ مجھے کسی بھی ان چاہے رشتے میں بندھنے پر

مجبور کر سکتی ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمیں نکاح کر لینا چاہیے۔" اطمینان سے اپنے فیصلے کے اسباب اور خدشات بتاتے ہوئے اس نے زویا کے سر پر ہم پھوڑا۔ زویا بہت دیر بعد کچھ کہنے کے قابل نہ ہو سکی۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو روجیل، میرے بابا کبھی نہیں مانیں گے پر میں ایک دفعہ اپنی ماما کو ضرور اعتماد میں لینا چاہتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہمارا ساتھ ضرور دیں گی۔"

"پر یار جیسا تم نے بتایا تھا تمہاری ماما بہت ڈرتی ہیں تمہارے بابا سے اور گھر میں سارا ہولڈ تمہارے بابا کا ہی ہے تو تمہاری ماما بھی کچھ نہیں کر سکتیں نہ اسٹینڈ لے سکتی ہیں۔ ہاں نکاح ہو جانے کے بعد ہم انہیں بتا دیں گے پھر تو لازمی تمہاری اور میری فیملی کو سب کچھ ماننا ہی پڑے گا۔" اس کا مثبت ردِ عمل دیکھ کر روجیل مزید پرجوش ہو کر بولا۔

"پر..... روجیل....." زویا کچھ تذبذب کا شکار تھی۔ "سب سے چھپ کا یہاں تک چلے آنا ایک اور بات تھی پر نکاح جیسا انتہائی قدم..... اچھا میں تمہیں سوچ کر بتاتی ہوں۔" روجیل کے چہرے پر سنجیدگی دیکھ کر زویا کی جان پر بن آئی۔

"سوچنے کا ہی تو وقت نہیں ہے زویا۔" وہ جھنجھلایا۔ "تم ایسا کرو آج کی رات سوچ لو صبح مجھے کال کر دینا کہ تمہارا کیا فیصلہ ہے۔" مگر زویا نے اس کی آخری بات سنی کہاں تھی۔ سامنے نظر پڑتے ہی اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔ وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ روجیل ارے، ارے کرتا اس کے ساتھ ہی باہر نکل آیا اور اس کے بے حد اصرار پر روجیل نے اسے جلدی سے گھر کے پیچھے والی روڈ پر اتار دیا اور اس کے بدلتے رویے کی وجہ پوچھتا ہی رہ گیا پر زویا اپنے حواسوں میں کہاں تھی وہ اس کی کسی بات کا جواب دیے بغیر جلدی سے

کہاں غائب ہے۔“ سعید احمد کے نئے کچوکے نے خدیجہ بیگم کو توڑ ہی ڈالا۔

”یہاں سے تو اسکول کے لیے ہی جاتا ہے۔ اب مجھے کیا معلوم کہاں جاتا ہے؟ پہلے تو کچھ ایسا نہیں کیا۔“ وہ روہا کی ہو کر بولیں۔

”میں پہلے ہی لڑکیوں کی اتنی تعلیم کے خلاف ہوں۔ میٹرک کافی تھا تمہاری اس ناخلف اولاد کے لیے۔ مری جاری تھی تم کہ کالج میں داخلہ دلو اور اس دیکھ لیا نتیجہ اب کالج بھیجنے کا۔ اس سے کہو دفع ہو جائے، دور ہو جائے میری نظروں سے۔ کرتا ہوں کچھ بندوبست اس کا بھی۔“ وہ دھاڑ کر بولے تو زویا ایک کٹیلی نظر ان پر ڈال کر جلدی سے بیگ منہال کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہ انتہائی فیصلہ جو وہ کرتے ہوئے سو بار سوچتی سعید احمد کی سختی، ان کے سخت الفاظ اور اہانت بھرے لہجے نے اس سے سیکنڈوں میں کروا لیا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے پہلا فون روہیل کو اپنی رضا مندی کا کیا اور پروگرام پوچھا کہ اسے اب کیا کرنا چاہیے۔ روہیل اسے آہستہ، آہستہ ساری تفصیل بتانے لگا۔ اس پل ایک لمحے کو بھی اس نے اپنی ماں کا نہیں سوچا جس پر زندگی کا دائرہ حیات پہلے ہی تنگ تھا اب زویا کے اس قدم سے کیا ہونا تھا کوئی نہیں جانتا تھا۔

بچی عمر کی سادہ لڑکی

تم جو کچھ سوچ رہی ہو

کرنے کو پر تول رہی ہو

میں بھی باتیں، سنہریے سننے

طلسمی وعدے، رنکس چاہتیں

ان دیکھا اک جال ہے

جس میں تم بھنس جاؤ گی

پھر نکل نہ پاؤ گی

بچی عمر کی سادہ لڑکی

☆☆☆

سڑک کر اس کر گئی۔ اسے ان سے پہلے گھر پہنچنے کی جلدی تھی پر آج شاید اس کے ستارے گردش میں تھے۔ گھر کا دروازہ کھلا تھا اور داخل ہوتے ہی لاؤنج میں پہلی نظر ادھر سے ادھر ٹپکتے پاپا پر پڑی۔

”میں جھوٹ بولتا ہوں ناں تو پوچھو اپنی لاڈلی سے کہ کہاں سے آوارہ گردیاں کر کے آرہی کالج کے بہانے سے۔ کون تھا اس کے ساتھ؟“ بے دردی سے زویا کا ہاتھ پکڑ کر سعید احمد نے اسے ایک طرف ہراساں کھڑی خدیجہ کے پاس دھکیلا۔ زویا کے حواس سن ہو گئے۔ اسے لگا قیامت کا لمحہ آچکا تھا۔ وہ جو کبھی بھی کہ انہوں نے اسے نہیں دیکھا، وہ ان کی نظروں سے بچ گئی تو وہ اس کی بھول تھی۔

”مہنی آپ کے پاپا کیا کہہ رہے ہیں؟ کہاں سے آرہی ہیں آپ؟“ خدیجہ نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنی طرف موڑا اور زویا کا نظریں چرانا خدیجہ کا کلیجہ دھلا گیا۔

”آج سے اس کا کالج جانا، باہر نکلنا سب بند۔ کاظمی صاحب نے ایک دفعہ اپنے بیٹے کے رشتے کا ذکر کیا تھا میں آج ہی ان کا پتا کرتا ہوں۔ ایسی اولاد سے تو بے اولاد ہونا بھلا جو بڑھاپے میں رسوائی کا سامان کرتی پھرے۔ کس دیدہ دلیری سے اس آوارہ لڑکے کے ساتھ وہاں ٹیکسٹ بکس اڑانے لگی تھی۔“

”آپ بھی تو نئی ٹویلی کے ساتھ کچھ سے اڑانے میں معروف تھے وہاں۔ ہونہ۔۔۔ اپنے لیے اور اصول اور دوسرے کے لیے دوسرے اصول۔“ ایک بانگی سوچ کی لہر زویا کے دماغ میں کروٹ لے کر پیدا ہوئی۔

”کون سے بچوں کی فوج لگی ہوئی تھی یہاں جو تم توجہ نہیں دے پائیں۔ دو ہی تو بیٹے تھے ان کی بھی تربیت نہ ہو سکی تم سے۔ بیٹا ہے تو تعلیمی قابلیت زیرو کل پرنسپل صاحب کا فون آیا تھا۔ نو دن سے غائب ہے وہ اسکول سے۔ کچھ پتا ہے کہ اسکول کے بہانے



سنی کے گھر لوٹنے پر اب ایک اور تماشا ہوا تھا۔ سعید احمد، سنی پر خوب چلائے تھے جواب میں وہ کون سا کم تھا۔ باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دو بدو جواب دیے تھے۔

”تمہیں لوگوں کی فکر میں گھلنے کی ضرورت نہیں۔ ان کا کام ہوتا ہے باتیں بنانا۔ ایک دو دن ایک موضوع پر بات کر کے وہ تھک کر نئے موضوع کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ فضول لوگوں کی فضول گوئی کی خاطر تم اپنا کیرئیر خراب کر دو گے کیا۔۔۔۔۔؟“ وہ دھاڑے۔ جواب سنی نے کہا کہ اسے کسی اور اسکول بھیجیں یا اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ سعید احمد کو بھی ٹھیک ٹھاک غصہ آیا تھا اس کی بات سن کر۔

”دماغ خراب ہے تمہارا، سیشن کے اینڈ پر جب تمہارے اینول ایگزام میں صرف دو ماہ رہ گئے ہیں۔ کون سا انسٹیٹیوٹ تمہیں داخلہ دے گا اس وقت؟“

”یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا یا پا۔ آپ نے ساری عمر ماما کو کوئی سکھ نہیں دیا اور عمر کے اس حصے میں آکر سب کچھ برباد کر دیا آپ نے۔ ہماری زندگی ہمارا کیرئیر سب کچھ۔۔۔۔۔ آئی ہیٹ یو پا۔ آئی ہیٹ یو۔“ سرخ چہرے اور چمکتی آنکھوں کے ساتھ اس نے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور جا کر اپنے کمرے میں بند ہو گیا۔ جواب میں شوہر۔۔۔ کی بری بھلی سننے کو خدیجہ رہ گئی جسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اپنے گھر کے منشی شیراز سے کو کیسے سمیٹے۔ شوہر کی ستم ظریفیاں کم تھیں جو اب اولاد بھی ہٹ دھری پر اتر آئی تھی۔ دونوں باپ بیٹا اپنا غصہ اتار کر اپنے، اپنے کمرے میں بند تھے جب تکے تھکے قہقہے خدیجہ، زویا کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ بستر پر اوندھی پڑی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر زویا نے مندی آنکھوں سے انہیں دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا منہ سرخ اور آنکھیں سو جی ہوئی تھیں۔

خدیجہ بھی آکر بیڈ کے کنارے ٹک گئی۔ ”میری محبت اور اعتبار میں کیا کمی رہ گئی؟“ جو آپ ایسی راہ پر چل پڑیں جو قطعاً شریف بیٹیوں کا شیوہ نہیں ہے اور جس کا انجام رسوائی اور بدنامی کے سوا کچھ نہیں۔ اپنے پاپا کا نہ سنی آپ نے ایک بار بھی سزا نہیں سوچا کہ آپ کو تو جو رسوائی اور بدنامی ملے گی سو ملے گی کیا میں زندہ رہ پاؤں گی؟“ وہ رو پڑی۔ ”میری اس دکھی زندگی میں خوشی کے جو ایک دو جگہ ہیں تم دونوں کے دم سے ہیں۔ کون ہے وہ لڑکا؟ اور آپ کیوں گلیں اس کے ساتھ کہیں ہنی؟ سوچ، سوچ کر میری دماغ کی رگیں پھٹنے کے قریب ہیں کہ میری وہ ہنی جسے میں نے زمانے کی سخت ہوا سے بھی بچا کے رکھا آج اتنی باغی ہو گئی کہ ماں باپ کی نظروں میں دھول جھونک کر ایک انسان لڑکے سے ملنے چلی گئی۔“ غم دغصے سے اس کی آواز لرز رہی تھی اور آنکھیں نم تھیں۔

”وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے اور میں بھی۔۔۔۔۔“ اب کے ساکت بیٹھی زویا کے وجود میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ بول اٹھی۔

”ہونہ شادی۔۔۔۔۔ میں کالجوں، یونیورسٹیوں میں نہیں پڑھی نہ زیادہ دنیا دیکھی ہے پر میرا تجربہ اور مشاہدہ تم سے کہیں زیادہ ہے۔ پارکوں، سڑکوں، ہوٹلوں میں کی جانے والی ملاقاتیں بے راہ روی اور بے حیائی کے زمرے میں آتی ہیں۔ کوئی بھی مخلص بندہ اپنی عزت جسے بنانا چاہتا ہے اسے لے کر ادھر ادھر رلتا نہیں پھرتا۔ احترام سے اپنے والدین کے ذریعے بات کو بڑھاتا ہے۔ وہ بھی اگر مخلص ہوتا۔۔۔۔۔ تو اپنے ماں باپ کو بھیجتا۔ تمہیں اتنی سائنس کی بات دیکھ کر بھی عقل نہیں آئی۔ اپنے پاپا کی نظر میں تو اعتبار کھو ہی چکی ہو جی اب۔۔۔۔۔“

”تو ان کی پروا ہی کسے ہے۔ انہوں نے اپنی لائف سیٹ کرتے ہوئے ہم سے پوچھا تھا کیا اور



### عیب پوشی

☆ اگر تم کوئی عیب پاؤ تو یہ خلا پڑ کر دو..... بلند و بالا ہے وہ ذات جس میں کوئی عیب نہیں۔

☆ بعض لوگ خواہ خواہ معاملات کو ان کے سائز سے زیادہ اہمیت دے کر اپنے اعصاب جلاتے رہتے ہیں۔ لوگوں کی وہ خطائیں جو آپ کی نظروں سے پوشیدہ ہیں، انہیں کرید کر نکالنے کی کوشش نہ کریں۔ دوسروں کے عذر قبول کرنے میں کشادہ دلی کا مظاہرہ کریں۔

☆ جو اپنے بھائی کا عیب تلاش کرتا ہے، اللہ اس کا عیب تلاش کرتا ہے اور جس کے عیب کے درپے اللہ ہو جائے تو وہ اسے اس کے گھر میں ذلیل و رسوا کر دیتا ہے۔

جی ہاں اغلیوں کا شمار نہ کیجیے..... لوگوں کے عیب تلاش نہ کریں..... کشادہ دل بننے کی کوشش کریں..... خاک اڑانے کی کوشش نہ کریں..... وہ جیٹھی ہے تو اسے بیٹھا رہنے دیں، البتہ اگر خاک اڑنے لگے تو آستین سے ناک ڈھک لیں اور اپنی زندگی کا لطف اٹھائیں۔

انتخاب: زندگی سے لطف اٹھائیے  
(از عبدالرحمن العریفی)

مرسلہ: ماہ نور خان، بہارہ کھو

آپ ان کی تو بات ہی مت کریں۔ مجھے نفرت ہے ان سے۔“ خدیجہ کی بات پوری ہونے سے قبل وہ بٹ دھرمی سے بولی۔

”روحیل کے ماما یا اس کی شادی اپنے اپنے ریلیٹو میں کرنا چاہتے ہیں اس پر بہت اسٹریس ہے ان کا۔ پلیز ماما مجھے روحیل سے شادی کرنی ہے، آپ ہمارا ساتھ دے دیں۔ اس کے ماما یا کسی ہمارے گھر رشتہ لے کر نہیں آئیں گے۔“ وہ اور بھی کچھ بولتی لیکن خدیجہ کا ایک تھپڑ دیا کو چپ کر وا گیا۔

”میں نے تمہاری ایسی تربیت نہیں کی تھی۔ ایک راہ چلا لڑکا تمہیں جو بکواس کرتا ہے اس کا تم یقین کر لیتی ہو اور میں تمہاری ماں ہو کر سمجھنے سے تمہیں جو سمجھا رہی ہوں وہ تمہیں سمجھ نہیں آ رہی۔

تمہارے پاپا میٹرک کے بعد تمہیں پڑھانے کے حق میں نہیں تھے، یہ میں تھی جس نے تمہارے آگے پڑھنے کی راہ ہموار کی، بریہ نہیں جانتی تھی کہ رسوائی کا ایک گڑھا خود کھود کر تمہیں اس میں چھلانگ لگانے کو

کہہ رہی ہوں۔ اب ان حالات میں، میں بھی تمہارے لیے کوئی اسٹینڈ نہیں لے سکتی۔ اس لڑکے سے کہو اپنے ماں یا پاپا کو لے کر آئے۔ میں ایک بار تمہارے پاپا کو منانے کی کوشش کروں گی۔ اگر نہیں تو اسے ہمیشہ کے لیے بھول جاؤ اور کسی بھی جگہ شادی کے لیے تیار ہو جاؤ جہاں ہم چاہیں گے۔ تمہیں جتنا پڑھانا تھا وہ ہم پڑھا چکے، تم پر اعتبار کرنے کا صلہ بھی مل گیا ہمیں..... آئندہ کے لیے تمہارا کالج جانا بھی بند ہے۔“ خدیجہ نے ایک ساتھ کئی ہم زویا کے حواسوں پر گرائے اور قطعی لہجے میں کہتی اس کے کمرے سے باہر نکل گئی۔

زویا کی آنکھیں ایک بار پھر آنسوؤں سے لبریز ہوئیں اور اس نے کچھ سوچ کر اپنے کچھ دیر قبل کے فیصلے پر حتمی مہر لگا دی۔

”آپ بھی پاپا کی طرح نکلیں۔ ماما ایک بار بھی میری خوشی کا خیال نہیں کیا۔“ پاپا سے تو بچکے تھے ہی

اب ماما بھی بچی نہ رہ سکی تھیں۔ وہ ساری رات زویا کی آنکھوں میں کئی تھی۔ اذانوں کے بعد اس نے وضو کر کے نماز پڑھی اور استقامت اور راہ ہدایت مانگنے کے بجائے محبت مانگی تھی۔ ماما نماز کے بعد تھوڑی دیر قرآن پاک کی تلاوت کرنے کے بعد کچن میں ناشتا بنانے کے لیے آ جاتی تھیں وہ ایسے وقت میں جانا چاہتی تھی گھر سے جب ماما پاپا اپنے کمروں میں ہوں۔ تو اسے یہی وقت مناسب لگا۔ اس نے کالج بیگ کو بکس سے خالی کیا اس میں اپنا ضروری سامان رکھا اور دھڑکتے دل سے بیگ کو تھامے کمرے سے باہر نکل آئی۔ ابھی تک کمروں سے کوئی بھی باہر نہ نکلا تھا ہر طرف ہوکا عالم تھا وہ موقع غنیمت جان کر تیز، تیز قدموں سے چلتی باہر آ گئی۔ شوخی قسمت کہ گیٹ پر چوکیدار بھی موجود نہ تھا وہ چھوٹا گیٹ کھول کر باہر نکل آئی اور گلیوں میں سے گزرتی مین روڈ تک آئی جہاں روجیل گاڑی لیے اس کا منتظر تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی اس نے گاڑی اشارت کر دی۔ ایک حوا کی بیٹی آدم کے بیٹے کے دکھائے ہوئے پرفریپ جال میں پھنسی چلی گئی تھی۔

☆☆☆

خدیجہ نماز و قرآن پاک کی تلاوت سے فارغ ہو کر باہر آئی اور زویا اور سنی کے کمروں کے دروازے بجائے کہ اٹھ کر نماز پڑھ لیں۔ زویا تو اٹھ جاتی تھی لیکن سنی سستی کر جاتا تھا۔ سعید احمد الہت صبح کی نماز کا تکلف ذرا کم ہی کرتے تھے۔ وہ آفس جانے سے بیس منٹ پہلے اٹھتے اور ناشتا کر کے تیار ہو کر آفس سدھارتے۔ خدیجہ کچن میں آ کر ناشتا تیار کرنے میں مصروف ہو گئی۔ اپنے مخصوص ٹائم پر سعید احمد بھی نیپیل پر آ گئے اور خاموشی سے ناشتا کرنے لگے۔ سنی سے ہونے والی رات کی ٹڈ بھڑ کے بعد موڈ ابھی تک گبڑا ہوا تھا۔ خدیجہ نے بھی خاموشی میں عافیت جانی۔ ان کے ناشتے کے لوازمات پورے کرنے

کے بعد وہ ایک بار پھر بچوں کے کمروں کی جانب آ گئی۔ سنی کا دروازہ بجانے پر اس کی نیند میں ڈوبی آواز آئی کہ وہ آرہا ہے جبکہ زویا کے دوازے پر دستک دی ہی تھی کہ بے آواز حرکت کے ساتھ دروازہ کھل گیا انہوں نے یونہی دروازہ کھول کر زویا کو آواز لگائی اور خود بھی آگے بڑھ کر کمرے میں داخل ہو گئی۔ بے شکن بستر اس بات کا گواہ تھا کہ رات اس پر کوئی سویا ہی نہ تھا نہ جانے کیوں خدیجہ کا دل دھک سے رہ گیا، کسی برے خدشے کے تحت اس نے آگے بڑھ کر داش روم کا دروازہ کھولا تو خالی داش روم اس کا منہ چڑھا رہا تھا۔ وہ حواس باختہ واپس لوٹنے لگی جب سائڈ ٹیبل پر رکھے گلدان کے نیچے ایک سفید پرچہ دبا نظر آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر تیزی سے وہ اٹھایا اور اس پر نظریں دوڑانے لگی۔

”ماما“

مجھے نہیں پتا کہ پاپا سے آپ کا کیا اختلاف تھا۔ پاپا آپ کو کیوں ناپسند کرتے تھے پر آپ کی ضد میں انہوں نے اپنی اولاد کو کبھی وہ پیارا، اعتماد اور محبت دی ہی نہیں جو ایک اولاد کا حق ہوتی ہے۔ انہیں راضی کرنے کے چکر میں آپ ہمیں بھی بھول گئیں مگر مجھ میں نہ تو اتنا حوصلہ ہے نہ ہمت کہ آپ جیسی زندگی گزاروں کہ ایک مرد کو خوش دیکھنے اور خوش کرنے میں ساری زندگی اس کے ماتھے کی تیوریاں گنتے، زبان کے تیرول پر سہنے اور ذلت کو اپنی روح پر محسوس کرنے میں گزار دوں۔ زندگی کی خوشیوں پر میرا بھی حق ہے اور میں زندگی سے وہ خوشیاں وصول کرنے نکلی ہوں۔ وہ بہت اچھا ہے، مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ ہم اپنے بچوں کو وہ زندگی کبھی نہیں دیں گے جو آپ لوگوں نے ہمیں دی۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجیے گا اور دعا کیجیے گا کہ میں نے جو خواب دیکھا ہے اس کی تعبیر بھی پاسکوں۔

آپ کی بیٹی زویا“

## اچھا

استاد شاگرد سے۔ ”تم حساب میں کتنے کمزور ہو۔ میں جب تمہارے جتنا تھا میرے سو میں سے سو نمبر آتے تھے۔“  
شاگرد۔ ”یہ ضرور آتے ہوں گے آپ کو کوئی اچھا استاد پڑھاتا ہوگا۔“  
از زین زبیر کوٹھاری، کراچی

ہی ایسا سیاہ نکھڑا تھا یا میری کرنی کے پھل تھے جو نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے کھانے پڑے اور آج ان کی بدولت میں تہی دماغ رہ گیا ہوں۔ ”وہ اس کی تصویر کے آگے کھڑے خود کلامی میں مصروف تھے۔“

”یہ جاننے کے باوجود کہ غلط فیصلے ہمیشہ زندگیوں میں بریادیاں لاتے ہیں۔ میں بے درپے غلط فیصلے کرتا ہی چلا گیا اور آج پچھتاؤں کی فصل کاٹ کر بیٹھا ہوں۔ خدیجہ سے شادی اول تو مجھے کرنی ہی نہیں چاہیے تھی کہ بھی لی تھی تو اسے نبھانے کا حوصلہ بھی اپنے اندر پیدا کر لیتا تو آج تنہائی کا روگ جان کو لگائے اکیلا نہ ہوتا۔ ساری زندگی اپنے بیزار رویے کے باعث اس بھلی مانس عورت کو سولی پر لٹکائے رکھا پھر جس کے لیے میں نے خدیجہ کا دامن خوشیوں سے خالی رکھا مجھے وہ عورت زندگی کے سفر میں دوبارہ ملی تو اب کی بار میں اسے گنوانے کی حماقت نہ کر سکا اور اسے اپنی زندگی میں شامل کر لیا۔ ایک اور غلط فیصلے نے میرے بچے جو پہلے ہی میرے رویے اور میری سخت اور کنھور طبیعت کے باعث مجھ سے دور تھے اور دور ہو گئے۔ پہلے وہ مجھ سے بیزار تھے پر اب ان کے اندر نفرت اور بغاوت کے بیج پھوٹ نکلے تھے۔ اس روز خدیجہ کو امیر جنسی پہنچانے کے بعد میں نے اپنی بیٹی کا خط پڑھا اور خدیجہ کی جان لیوا بے ہوشی کا وجہ جان گیا۔ وہ عورت جو اٹھارہ سال میری بے رخی، تنفر اور بیزاری کو گھونٹ، گھونٹ سال لگانے بیٹھا ہوں تو سوچتا ہوں کہ میرا نصیب

فقط نہیں تھا ایک آتش فشاں تھا جس نے پھٹ کر ان کے وجود کو خاکستر کر ڈالا تھا۔ اپنے سر کو تھام کر خدیجہ وہیں بیٹھتی چلی گئی۔ کاغذ اس کے ہاتھ سے پھسل کر دور جا پڑا۔ اپنے کسی کام کے لیے ماں کو آواز دیتا سنی ڈھونڈتا جب کمرے میں آیا تو حواس باختہ ہو گیا۔ زویا کے کمرے میں اس کے بستر کے پاس گری ہوئی ماماؤہ زور، زور سے پاپا کو آواز دینے لگی۔ سعید احمد بھی پریشانی میں بھاگتے چلے آئے۔ خدیجہ کو بازوؤں میں اٹھاتے ہوئے انہوں نے پاس پڑا کاغذ اٹھا کر سرسری سا پڑھ کر جلدی سے اپنی جیب میں گھسوا اور خدیجہ کو اٹھا کے تیزی سے گاڑی تک آئے۔ اتنا نام نہیں تھا کہ ذرا سیور کو بلا پاتے۔ خدیجہ کو کچھلی سیٹ پر لٹا کر خود ہی ڈرائیونگ سیٹ پر آئے۔ سنی بھی فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گیا۔

”پاپا..... کیا ہو گیا؟ ماما کو کیا ہو گیا؟ وہ ابھی تو ٹھیک تھیں۔ مجھے آواز بھی دی نا شتے کے لیے۔“ سنی تھا تو بچہ ہی ناں ماں کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا اور رو بانے لہجے میں سعید احمد کو دیکھ کر سوال کرنے لگا۔ ”پتا نہیں بنا، آپ حوصلہ رکھو۔ اسپتال جا کر صحیح صورت حال پتا چلتی ہے۔“ انہوں نے ایک نظر پریشان بیٹے پر ڈال کر تسلی دی۔ اس پل وہ دونوں اپنے اختلافات بھول کر صرف خدیجہ کے لیے پریشان تھے۔

”بہنی..... بہنی کہاں ہے پاپا..... اس کو تو بتا دیتے پریشان ہوتی رہے گی۔“ دفعتاً سنی کو زویا کا خیال آیا تو وہ بار بار ماں کی طرف رخ موڑ کر دیکھتے ہوئے باپ سے بولا۔

”گھر میں ہی ہوگی اسپتال پہنچ کر آپ اسے کال کر دیتا۔“ انہوں نے سنجیدگی سے کہا اور گاڑی کی اسپینڈ تیز کر دی۔

”میں سعید احمد آج زندگی کے سودوزیاں کا حساب لگانے بیٹھا ہوں تو سوچتا ہوں کہ میرا نصیب

اپنے اندر اتارتی رہی تھی۔ میرے سبب اولاد کے اٹھائے گئے ایک غلط قدم کا بوجھ نہ سہار سکی اور دو دن کوے میں رہنے کے بعد تیسرے دن زندگی کی بازی ہار گئی۔ میرے کندھوں تک آتا میرا جوان بیٹا اس سارے قصے کی وجہ میری دوسری بیوی فاریہ کو سمجھتا اور موقع پاتے ہی اس نے ہمیں سے لوڈ ریوالتور حاصل کیا اور دو گولیاں فاریہ کو مار کر خود اس نے اقبال جرم کر لیا۔ کچھ عرصے بعد اسے عمر قید کی سزا ہو گئی۔ پے در پے ٹوٹنے والے صدموں کے بعد زویا کا میرے نام آنے والا خط تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔

”بہت ہی پیارے، پاپا اور ماما

میں اپنا گھر، اپنی جنت بنانے نکلی تھی اور انجانے میں جہنم خرید بیٹھی۔ روحیل نے مجھ سے نکاح تو کر لیا پر نبھانہ کر سکا۔ میں جو ایسا گھر بنانے اور بسانے کی خواہش رکھتی تھی جہاں محبتیں ہوں، اعتماد اور اعتبار ہو۔ آج وہاں گالیاں ہیں، کوٹنے ہیں۔۔۔۔۔ بے اعتباری ہے، روحیل نے صرف چھ ماہ ہی محبت کی بارش برسائی پھر اس کے بعد بے اعتباری کے بادل ہمیشہ کے لیے میرے آسمان میں ٹھہرے گئے۔ عام سے بھی عام نکلا وہ مرد جو عورت اس کے لیے سب کچھ چھوڑ کر آئی تھی اسی ایک لغزش کو اس نے اس کی زندگی کا آزار بنا ڈالا۔ وہ کہتا ہے کہ جولوڑ کی اپنے ماں باپ کا وقار اپنے قدموں تلے روند کر ایک انجان کے سنگ نکل آئی ہے اس کا کیا بھروسہ کہ وہ کل کسی اور کی باتوں میں آکر مجھے نہیں چھوڑے گی۔ پہلے اس نے مجھے برقع پہننے کو کہا اب مجھے نہیں باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس کے ماں باپ نے مجھے آج تک قبول نہیں کیا۔ اس نے مجھے ایک الگ گھر میں رکھا ہے۔ باہر جاتے وقت تانا لگا کر جاتا ہے۔ ماں باپ کا دل دکھانے کی میری یہ سزا کم تھی جو اب اللہ نے مجھے ایک بیٹی سے نوازا ہے۔ میرے اس فعل کی بدولت

روحیل اپنی بیٹی سے بے حد نفرت کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ بیٹیاں بہت بری ہوتی ہیں۔ ماں باپ کے سر جھکا کر ان کو زندہ درگور کر دیتی ہیں۔ کل مجھے بتا چلا ہے کہ روحیل کے ماں باپ نے اس کی شادی اپنی مرضی سے کر دی ہے۔ اس بار روحیل آیا تو بہت اکھڑا ہوا تھا۔ اپنے اعمال کی بہت حد تک سزا میں نے پائی لی ہے اب آپ سے گزارش ہے کہ دعا کیجیے گا بھلے نفرت کرے۔ حقارت سے دھتکارے یا ٹھکڑے لگائے میں سب برداشت کر لوں گی۔ بس مجھ سے اپنے نام کی چھت نہ چھینے۔

آپ کی بد نصیب بیٹی

زویا!

خط پڑھ کر مجھے لگا کہ ہوا میں سے آکسیجن کسی نے کم کر دی ہو۔ میرا دم گھٹنے لگا پر نہیں ابھی کہاں۔۔۔۔۔ مجھے مرنا ہے۔ میرے فیصلے کئی زندگیوں کی بربادی کا باعث بنے۔ جب تک وہ لوگ دکھی ہیں مجھے کیسے موت آسکتی ہے۔ جیل میں سستی سے ملنے جاتا ہوں تو وہ نفرت سے منہ پھیر لیتا ہے۔ اپنا سر جیل کی سلاخوں سے ٹکرانے لگتا ہے۔ میں نے اس کی تکلیف کے ڈر سے بہت دن ہوسے وہاں جانا چھوڑ رکھا ہے۔ اتنے بڑے گھر میں، میں ہوں یا میری تنہائی اور آپ سب کو شاید میری آخری بات پر ہلکی آئے کہ قدرت کا ایک اور امتحان ابھی باقی تھا جو مجھے خدیجہ کے مرنے کے بعد اس سے شدید قسم کی محبت ہو گئی ہے۔ میں جو اسے دیکھنا گوارا نہیں کرتا تھا۔ اب اس کی شکل دیکھنے کو ترستا ہوں کہ کہیں سے ایک بار وہ آجائے۔ میں اس کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ دوں۔“

خدیجہ کی تصویر کو دیکھتے دیکھتے ان کے سامنے تصویر دھندلا گئی کہ آنسوؤں کی دبیز تہ نے آنکھوں کے آگے پردہ ڈال دیا تھا۔ مرتے دم تک نار سائی اور پچھتاوے ان کا مقدر تھے۔







## خوابِ آزادی

نسیم احمد بشیر

بیل جی تو میں نے دروازہ کھول دیا۔ کوثر آئی  
تھی اور حسب معمول دیر سے آئی تھی۔  
”ہائیم دیکھا ہے؟ پونے نو بج رہے ہیں۔ تمہیں  
پتا بھی ہے مجھے نو بجے آفس پہنچنا ہوتا ہے پھر بھی دیر  
کر دیتی ہو۔ آج میں پھر لیٹ ہو جاؤں گی۔ بس تو تم  
چھوڑ دو۔ میرا کام، میں کسی اور کو رکھ لوں گی۔“ میں  
نے دروازہ کھولتے ہی اپنی صفائی والی کو اپنا روزانہ کا  
لیکچر پلانا شروع کر دیا۔

وہ ڈھیوں کی طرح سنی ان سنی کر کے جھاڑو ہاتھ میں پکڑ کر زور، زور سے زمین پر پھیرنے لگی۔ روزی یہ تماشا ہوتا تھا۔

”سوری بائی، آج تھوڑی سی دیر ہوگئی۔ آپ دیکھنا میں پندرہ منٹ میں ہی آپ کا سارا کام کروں گی۔ آپ فکر نہیں کریں۔“ میرے غصے کو قطعی خاطر میں نہ لاتے ہوئے وہ معمول کے مطابق جلدی، جلدی ہاتھ چلا کے صفائی کرنے لگی۔ یہ بھی روز ہوتا تھا۔

”آج کیا تکلیف ہوئی تھی.....؟ تم تو کل کہہ رہی تھی میں پورے آٹھ بجے آ جاؤں گی؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”باہی آپ کو پتا ہے ناں... آج کل کا کے لیے لڑکی دیکھنے جا رہے ہیں۔ بس صبح ہی دوسرے گاؤں سے ماسی رحمتاں آئیں، اس نے ایک لڑکی کا اتنا پتا دیا ہے۔ کیا کروں اس کی باتیں ختم ہی نہیں ہونے میں آرہی تھیں اسی لیے دیر ہوگئی۔ سوری باہی۔“ اسے اپنی دو چار لفظ کی انگریزی کو گامیہ بگا ہے استعمال کرنے کا بہت شوق تھا اور وہ اسے سچ اور مناسب وقت پر استعمال کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔

”ایک تو یہ تیرے کا کے نے بڑی جان کھائی ہے۔ کب سے تم اس کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی ہو۔ ہمیں کوئی پسند ہی نہیں آتی۔“ میں اس کے اس کا کے یعنی اس کے بھائی کے لیے لڑکی ڈھونڈنے کے مشن سے بہت تنگ آ چکی تھی۔ جب دیکھو کا کے کے لیے فلاں شہر لڑکی دیکھنے جا رہی ہے یا فلاں گاؤں کا سفر طے ہو رہا ہے۔ کوثر بیگم کو اپنے بھائی کے لیے کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی تھی۔ بڑا اونچا اسٹینڈرڈ تھا ان کا.....

”ہائے باہی میرا بھائی تو شہزادہ ہے شہزادہ..... اس کے لیے لڑکی بھی تو اس کے جوڑ کی ہونی چاہیے ناں.....“ وہ حسب معمول اپنے بھائی پر

صدقے داری ہونے لگی اور میں جلدی، جلدی دفتر جانے کی تیاری کرنے لگی۔

میں کوثر کو کئی بار یہ دھمکی دے چکی تھی کہ میں اسے نکال کر کسی دوسری کام کرنے والی کو رکھ لوں گی مگر وہ جانتی تھی کہ میں ایسا نہیں کر سکتی۔ وہ کئی سالوں سے میرے گھر کام کر رہی تھی۔ ایمان دار، محنتی اور ہمدرد طبیعت عورت تھی۔ میں اور وہ ایک دوسرے کی عادی ہو چکی تھیں۔ بس گزارہ ہو رہا تھا۔ میری ڈانٹ ڈپٹ کا وہ قطعاً برا نہیں مانتی تھی۔

سارے گھر کا کام منٹوں میں پنا دیتی۔ ساتھ، ساتھ ہنستی، باتیں کرتی اور محلے بھر کے قصے سناتی رہتی تھی۔ چھٹی والے دن میرے اور اس کے تعلقات

بہت اچھے رہتے کیونکہ اس دن میں اسے جلدی نہ آنے پر کچھ نہ کہتی تھی۔ وہ بڑے آرام سے ساڑھے نو بجے تک آتی اور مجھے ناشتا بھی بنا کر دیتی۔ میں چائے پیتی، اخبار پڑھتی اور وہ سارے گھر میں پڑے کھارے سمیٹنے لگتی۔

کبھی کبھار اخبار میں چھپی تصویروں، فلمی اشتہاروں کے بارے میں سوال بھی کر دیتی۔ کسی قسم کے ہم دھماکے، زلزلے یا دہشت گردی کی خبر سے اسے بہت دلچسپی ہوتی اور اس کا اصرار ہوتا کہ میں اسے اس کے بارے میں ساری معلومات دوں، تفصیل سے بتاؤں کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا؟

اپنے بھائی کا کے کو اس نے بچپن سے اپنے ہی گھر میں پالا تھا۔ وہ اس کا لاڈلا بگڑا ہوا وہ بچہ تھا جس کی ہر جائز و ناجائز فرمائش پوری کرتا وہ اپنا فرض سمجھتی تھی۔ کا کا کبھی اس سے پیسے مانگ کر لے جاتا، کبھی کام سے بغیر بتائے چھٹی کر لیتا۔ دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی یا سینما دیکھنے چلا جاتا، غرضیکہ جو جی میں آئے کرتا مگر کوثر نے کبھی اس کے بارے میں شکایت نہیں کی تھی۔ وہ ہمارے گھر کے ساتھ ہی ایک کونہی میں مالی کا کام کرتا تھا مگر وہاں سے بھی اکثر غائب

گنتی، اس طبقے میں محبت کی قدریں اب بھی کچھ، کچھ سانس لیتی ہیں۔ یہ لوگ ابھی تک ایک دوسرے کے کچھ نکتے رہنا چاہتے ہیں جبکہ ہم مہذب، پڑھے لکھے لوگ اپنے، اپنے کامیاب کمز میں گرفتار، اپنی، اپنی دنیا کی بھول بھلیوں میں مصروف منہ اٹھائے نہ جانے کس سمت دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ اس طبقے کے لوگوں میں ربط ہے، تعلق ہے، رشتہ نانا ہے، برابری ہے۔ اسی لیے ان میں اب بھی محبتوں کے ریت رواج سانس لیتے ہیں۔

اس روز دفتر سے چھٹی تھی۔ میں ذرا ریلیکس ہو کر صبح سویرے حسب معمول اخبار پر نظر دوڑا رہی تھی۔ ”چج..... چج.....“ یک دم ایک خبر اور تصویر دیکھ کر میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”کیا ہوا باجی.....؟“ کوثر نے ڈسٹنک کرتے کرتے لکھت ہاتھ روک لیا۔

”ہائے بڑا افسوس ناک واقعہ ہے..... توبہ۔“ میرا دل غم سے پھٹنے لگا۔ کوثر میرے بالکل قریب آ کر کھڑی ہوئی اور اخبار میں چھپی تصویر پر نظریں گاڑ دیں۔ تصویر میں کھلے آسمان تلے دو عورتیں کھڑی جلتی نظر آرہی تھیں۔

”ہائے ربا یہ کیا ظلم ہوا؟ باجی پڑھ کر سنائیں کیا ہوا ہے؟“ اس نے اصرار کیا اور میں نے اسے خبر اور تصویر کے بارے میں بتایا۔

جلنے والی عورتوں کے نام حاکم زادی اور زیب النساء تھے۔ یہ سندھ کی دوہاری عورتیں تھیں۔ چند سال پہلے ان کے گاؤں میں ایک بڑا افسر تعینات ہو کر آیا اور اس نے ان کے علاقے کا کنٹرول سنبھال لیا۔ وہ افسر بہت شقی القلب شخص تھا۔ اس نے کام کرنے والے غریب ہاری مزدوروں، کسانوں پر بہت ظلم کیے اور ایک روز غصے میں آ کر نو افراد کو قتل گھڑا کر کے گولی سے اڑا دیا۔ مرنے والوں میں ایک نوجوان ان دو بد نصیب عورتوں کا بھائی تھا۔ یہ

رہتا وہ لوگ کوثر کو بلا کر ڈانٹ ڈپٹ کرتے مگر اس کے ماتھے پر شکن تک نہ آتی۔

”کوثر تم نے اس کا کے کو اتنا سر کیوں چڑھا رکھا ہے۔ کیا دے گا نہیں یہ؟“ ایک دن میں نے تنگ آ کر کوثر سے کہا۔

”لے باجی.....! میں نے اس سے بھلا کیا لیتا ہے، بہن بھائی کے رشتے میں لین دین تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا بچہ ہے ناں ابھی۔ اسی لیے تو اس کی شادی کر دینا چاہتی ہوں اس کو سنبھالنے والی آئے گی تو خود ہی سدھر جائے گا۔“

”اب اتنا بچہ بھی نہیں جوان ہو گیا ہے، تبھی تو تم اس کی شادی کا سوچ رہی ہو ناں۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا کروں جی..... اماں تو بچپن میں ہی اسے اور میری چار بہنوں کو چھوڑ کر مر گئی تھی۔ ابانے فوراً دوسری کر لی اور جلدی، جلدی میرا بھی رشتہ پیری پھوپھی کے ہاں کر دیا۔ اللہ اللہ خیر صلا..... بس ابھی سے میں نے اپنے بہن بھائی کو اپنے پردوں تلے لے لیا۔ آخر میرا ہی فرض بنتا تھا ناں..... سب سے بڑی جو بھی گھر میں۔ شکر ہے بہنیں تو سب اپنے، اپنے گھر کی ہو گئیں بس یہ کلا دیر ہی رہ گیا ہے۔ اب تو اس کے سر پر سہرا سجا دیکھنے کے لیے ہم سب بہنیں تڑپ رہی ہیں۔“ کوثر کے چہرے پر ماتا کا نور ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

میں سوچنے لگی، ہم چار بہنوں کا بھی ایک بھائی ہے جو اپنی بیوی بچوں کے ساتھ سات سمندر پار رہتا ہے۔ اب ہم لوگ آپس میں بہت کم ملتے ہیں، ایک دوسرے کی زندگی سے تقریباً ناواقف ہیں اور جب ملتے ہیں تو آپس میں بات کرنے کے لیے کھوئے ہوئے حوالوں کے سرے ڈھونڈتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا بات کریں۔ مجھے کوثر اور اس کے بھائی سے کبھی، کبھی حسد سا ہونے لگتا۔ میں سوچنے

باتیں۔ خواہ مخواہ بندے کا سارا دن برا رہتا ہے۔“  
اس نے مجھے ٹوکا۔

”اچھا دیکھ، دھیان سے صفائی کرنا..... اور  
ہاں میرے کاغذ ادھر سے ادھر نہ ہوں۔ پتا ہے  
ناں.....“ میں نے اسے اپنے لکھے ان لکھے کاغذوں  
کی احتیاط کرنے کی تاکید کی۔

”پتا ہے جی..... میں نے کبھی آپ کے منہ بلا  
کو چھیڑا ہے بھلا؟ مجھے پتا ہے آپ کو اپنے ان  
کاغذوں سے بڑا پیار ہے مگر باجی جی..... یہ بھی کوئی  
ٹھیک بات نہیں ہے۔ کاغذوں سے اتنا پیار.....  
چھوڑیں جی..... یہ کاغذ آپ کو کیا دیتے ہیں؟ جب  
دل گھبراتا ہے تو آپ کا ہاتھ تو نہیں تھام سکتے ناں۔“  
”اچھا چھوڑو فضول باتیں نہ کیا کرو..... بس  
میرے کاغذوں کا دھیان رکھنا۔“

”یہ کاغذ نہ ہوتے تو شاید..... شاید میں جی نہ  
باتی۔“ میں نے یہ جملہ اپنے دل میں مکمل کیا۔ اس  
بچی کو کیا بتاتی کہ یہ کاغذ ہی تو میرے چھینے کا سہارا  
ہیں۔ زندگی کے اتنے برس گزار لینے کے بعد ایک  
کاغذ ہی تو رہ گئے ہیں جن سے میں سچ بات کہہ سکتی  
ہوں۔ جن سے مجھے ذرا نہیں لگتا، جو میری ہر بات سن  
لیتے ہیں اور اسے اپنے سینے پر رقم کر لیتے ہیں۔ یہی تو  
محبوب ہیں میرے..... انہی کی تو محبوب ہوں میں۔

”باجی..... میں تو سیدھی بات کہوں گی۔ آپ  
کو کاغذوں کی نہیں کسی جیتے جاگتے بندے کی  
ضرورت ہے..... اور وہ آپ کو کاغذوں میں تھوڑا ہی  
ملے گا۔“ ماہر نفسیات نے پل بھر میں میری تحلیل نفسی  
کر کے رکھ دی۔

”چل زیادہ بک، بک نہ کر..... بڑی آئی  
بندے والی..... تو اپنا بندہ سنبھال میری فکر نہیں کر۔“  
میں نے اسے جھوٹ موٹ ڈانٹ دیا۔ مجھے ڈر سا  
لگنے لگا..... یہ گھریلو کام کرنے والی ان پڑھ سادہ  
لوح عورت دلوں کے راز کیسے پڑھ لیتی ہے۔

دونوں بہنیں اور ان کی بوڑھی دکھیااری ماں اس  
صدے سے تقریباً پاگل ہو گئیں۔ اس ظلم پر لوگوں  
نے بہت احتجاج کیا۔

انہوں نے انصاف کے لیے بڑے بڑوں کے  
دروازے کھٹکھٹائے، عدل کی زنجیریں ہلائیں مگر ان  
کی کہیں کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ انہوں نے اخباروں  
میں وہائی دی، فریاد کی، شور مچایا مگر ظالم کے ساتھ  
ہمیشہ یا اثر افراد کی طاقت ہوتی ہے اس لیے اسے  
پکڑنا آسان نہیں ہوتا۔ جج آکر ان دونوں بہنوں  
نے الٹی میٹم دے دیا کہ اگر اس افسر کو سزا نہ دی گئی تو وہ  
فلاں تاریخ کو ہائی کورٹ کے آگے اپنے جسموں پر  
مٹی کا تیل چھڑک کر جان دے دیں گی۔

وہ دن بالآخر آ گیا اور ان دونوں باہمت،  
اصولی، بات کی چکی منظم عورتوں نے اپنے کسے کا  
پاس رکھتے ہوئے مقررہ تاریخ کو ہائی کورٹ کی  
بلڈنگ کے آگے کھڑے اپنے، اپنے معمولی بھٹے  
پچانے کپڑوں میں ملبوس، تن شلختہ پر مٹی کا تیل چھڑکا  
اور موت کے لاؤ میں کود گئیں۔

تصور میں وہ دونوں شعلوں میں لپٹی، جلتی  
ہوئی نظر آ رہی تھیں پاس ہی ان کی بد نصیب ماں اپنی  
لاڈلیوں کو ہولناک شعلوں کی خوراک بننے دیکھ کر  
غائباً سوچ رہی تھی میں نے ایک مٹھی راکھ اور دو مٹھی  
دھواں بھلا اپنی کوکھ سے کب، کیوں اور کیسے جتا تھا؟  
”ہائے باجی انہیں بھی اپنا کا کا بہت پیارا ہوگا

ناں.....؟“ سہماریاں..... اپنے ویر پر سے قربان  
ہو گئیں۔“ کوثر میری زبانی یہ کہانی سن کر کتنی ہی ویر  
آزردگی کی تصویر بنی بیٹھی رہی۔ ”یا اللہ کسی کے ویر کو  
تقی ہوا نہ لگے۔“ وہ دعائیں مانگتی بڑبڑاتی، اپنے آپ  
سے باتیں کرتی اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنا باقی کا کام  
نپٹانے لگی۔

”توبہ باجی..... آپ بھی صبح صبح کیا یہ منحوس  
اخبار لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ نہ پڑھا کریں ایسی



## آؤناں

بادل بن کر چھاؤناں  
پیار کا مینہ برساؤناں  
مستی بھری ان شاموں میں  
مگیت وفا کا گاؤناں  
رنگوں سے آنچل بھر دو میرا  
ست رکتے پھول کھلاؤناں  
پت جھڑ پتا آئی بہار  
گھل کر تم مکاؤناں  
مہک اٹھے میرے من کا آئین  
تم خوشبو بن کر آؤناں  
شاعرہ: یاسمین اقبال، لاہور

زیب النساء کے جسموں سے اٹھنے والے شعلوں نے  
میرا ہاتھ جلادیا اور میں نے بے اختیار اس اخبار کو اٹھا  
کر اپنے سے دور بیچ دیا۔

اگلے روز کوڑا آئی تو خوشی سے زمین پر اس کے  
پاؤں نہ نکلتے تھے۔ کھلی کھلی جا رہی تھی۔ ”بابی کا کے  
کے لیے مجھے ایک لڑکی پسند آگئی ہے۔ بالکل اس کے  
جوڑ کی ہے۔“

”اچھا جی مبارک ہو آپ کو..... شکر ہے آپ کا  
ایک ضروری کام تو نپنا۔ مصیبت ذالی ہوئی تھی تم  
نے۔“ میں نے طنز یہ لکھ میں اسے مبارک باد دیتے  
ہوئے کہا۔

”بابی..... بڑی اچھی ہے لڑکی..... یہ موٹی،  
موٹی آنکھیں بالکل آپ جیسی..... صحت مند گول  
مثول بھرا بھرا جسم، بالکل میرے جیسا..... بڑی گنوں  
والی ہے جی..... اس کی ماں بتا رہی تھی شادو ایک  
ساتھ دو، دو دریاں دھو کر کوٹھے پر سو کھنے ڈال سکتی  
ہے اور پندرہ جنوں کا آٹا منٹوں سنگھوں گوندھ کر  
مارتی ہے پھر سجاؤ اتنا اچھا کہ ہر ایک سے ہنس، ہنس  
کر باتیں کرنا مگر نظریں پنی رکھنا۔“ وہ اپنی ہونے

”نہیں بی بی جی..... میں سیریس ہوں۔“ کوڑ  
نے پھر اپنی پاؤ بھرا مگریزی بگھاری۔  
”آپ کو دیکھ کر بڑا سوچتی ہوں۔ گھر جا کر شبیر  
کو بھی بتاتی ہوں کہ بابی کی زندگی بھی کوئی زندگی  
ہے۔ دفتر جاؤ، گھر آؤ پھر کتابوں کاغذوں سے سر  
کھپاؤ..... میرا شبیر تو آپ کو پتا ہے ناں..... کتنا اچھا  
ہے، وہ بڑی فکر کرتا ہے جی آپ کی۔“  
”اچھا تم اپنی فکریں اپنے پاس سنبھال کر رکھو.....  
میں بالکل ٹھیک ہوں اور ہاں گھر جا کر اپنے میاں سے  
میری باتیں نہ کیا کرو..... سن لیا؟ یہ مجھے بالکل پسند  
نہیں۔“ میں نے اسے جھاڑ دیا۔ لو بھلا اپنے خاوند سے  
نہ جانے کیا، کیا کہتی ہوگی میرے بارے میں۔

”وہ میرا میاں تھوڑی ہے، ہم دونوں تو  
دوستوں کی طرح ہیں۔ آپس میں ساری باتیں  
کر لیتے ہیں۔ جو چاہوں لا کر دیتا ہے، مارتا بھی  
نہیں..... مجھے رانی بتا کر رکھا ہوا ہے اس نے۔“  
ایک چاہی جانے والی عورت انتہائی تمکنت  
سے میرے سامنے کھڑی میرے جھوٹے برتن  
دھو رہی تھی، میرے فرش پر ٹاکی لگا رہی تھی اور مجھے  
اپنے راج پاٹ کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اس  
لمحے میں نے خود کو بہت غریب اور تہی دامن محسوس  
کیا..... وہ میری طرف دیکھ کر شاید جان گئی تھی۔  
”میں اگلے جمعے شاہ جمال کے مزار پر جا کر دعا  
مانگوں گی کہ اللہ آپ کو بھی میرے شبیر جیسا کوئی بندہ  
دے دے۔“ وہ پیار سے بولی۔

میں نے دوبارہ اخبار کے صفحے پر  
نظریں نکا دیں۔ وہ اخبار اب تک سالم کیسے تھا؟ وہ تو  
کاغذ تھا اور کاغذ تو بڑے درد مند ہوتے ہیں۔ آپ  
کے سارے دکھ اپنے اندر سمو لیتے ہیں۔ اس اخبار  
میں تو آپ جگہ جہاں دوزندہ گوشت پوست کی عورتیں  
جل رہی تھیں، سوراخ ہو جانا چاہیے تھا۔ یہ کیسا کاغذ  
تھا جو اتنا بے درد اور بے حس تھا۔ حاکم زادی اور

والی بھابی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے لگی۔

”اچھی بات ہے۔“ میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے تھوڑی سی دلچسپی کا اظہار کر دیا۔

”اور اس کا باپ پتا ہے کیا کہہ رہا تھا، کہہ رہا تھا کہ کا کے کو سبزی کی دکان ڈال کر دیں گے۔ آج کل تنخواہوں میں کیا بنتا ہے بھلا..... میں نے کہا بھی اس سے اچھی بھلا کیا بات ہو سکتی ہے۔ اپنا نکبھس ہوگا، عیش کرے گا عیش.....“

ماہر اقتصادیات نے ٹاکی لگاتے، لگاتے اپنا تجربہ سنا دیا۔

کوثر نے کا کے کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی۔ بڑے چاؤ سے بھابی کو بیاہ کر لائی۔ میرے بھی یہ سنا سنا کر کان پکا دیے کہ کس نے کس کو کیا دیا۔ کون، کون سی رسمیں ہوئیں اور کون سی پوری ہونے سے رو گئیں۔ میں نے سو دفعہ کہا مجھے نہ بتا، مجھے اس تذکرے سے کوئی دلچسپی نہیں مگر وہ گھوم پھر کر بات ہے بات کا کے کی شادی کا قصہ کسی نہ کسی بہانے چھیڑ ہی دیتی اور پھر بولتی چلی جاتی۔

شادی کے بعد کا کا پروگرام کے مطابق علیحدہ ہو گیا اور اپنے سر کے ساتھ سبزی کے نکبھس (بزئس) کے خواب دیکھنے لگا۔ کبھی کبھار وہ پہلے اسے بھی سائیکل پر بٹھا کر چھوڑ جایا کرتا تھا مگر اب دور چلے جانے کی وجہ سے وہ اسے چھوڑنے نہ آ سکتا تھا۔ کوثر پیدل آتی اکثر لیٹ ہو جاتی اور مجھ سے ڈانٹ کھاتی۔

”تو اپنے میاں سے کیوں نہیں کہتی کہ تجھے سائیکل پر چھوڑ جایا کرے۔“ ہانگوں میں درو کی شکایت کرتے سن کر ایک دن میں نے کہا۔

”کیسے کہوں باجی..... وہ بڑا بچی ہوتا ہے، آخر دیکھیں ناں صبح صبح قربان لین سے ڈیفنس پہنچنا آسان تو نہیں ہے ناں..... بیچارے ڈرائیور کی

زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ پہلے سائیکل پہ مجھے چھوڑے پھر اپنے کام پہ پینڈل مارتا جائے۔ مشکل ہوتی ہے ناں.....“ وہ اپنے چہیتے خاندان کو تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی۔

”تو تو کہتی ہے بڑا دیوانہ ہے تیرا..... تیرے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

”کرتا تو ہے..... پر باجی بندے تو بس پھر ایسے ہی ہوتے ہیں ناں..... آپ کو تو پتا ہے آپ تو اتنی پڑھی لکھی ہیں، ویسے پتا نہیں آج کل کیا بات ہے، میرا دل کچھ گھبرا رہا ہے۔ شبیر مجھے کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا ہے۔ جیسے وہ کوئی اور شبیر ہو میرے والا نہ ہو۔“ وہ خلاؤں میں گھورنے لگی۔

”ایسے ہی تجھے واہم ہو گیا ہوگا۔ خود ہی کہتی ہے اس جیسا کوئی ہو ہی نہیں سکتا اور پھر خود ہی اس میں نقص نکالنے لگتی ہے۔“

”باجی..... عورت کو پتا چل جاتا ہے جب اس کا بندہ اس کا نہیں رہتا۔“ اس نے بڑی سیانی بات کی اور میں نے بھی پل بھر کے لیے دل ہی دل میں اس کی تائید کی۔ واقعی عورت کو پتا چلا جاتا ہے جب ایسا ہوتا ہے۔ وہ سارے کا سارا پیار یا تو اپنے آپ سے کرنے لگ جاتا ہے یا پھر کسی دوسری عورت سے..... کچھ تو تبدیل ضرور ہوتا ہے۔

شادی کے بعد بھی کوثر اپنے بھائی کو اکثر اس کوٹھی میں فون کر کے اس کا حال حال ضرور پوچھتی۔ اس کی طرف سے وہ مطمئن تو ہو گئی تھی مگر پھر بھی اس کی خیر خبر رکھنا اس کی عادت بن چکی تھی۔

”بھئی بڑی دیوانی ہے تو اپنے بھائی کی۔ دیکھ لیتا ایک دن تجھے بھول کر سارے کا سارا اپنی بیوی کا ہی ہو جائے گا۔“ میرے اندر کی حاسدہ بن رہ نہ سکی اور کہہ دیا۔

”ہائے باجی..... میرا کا کا ایسا نہیں ہے۔ دیر تو بہنوں کے لیے چھاؤں ہوتے ہیں جی وہ تو میری

لین سے کام کے لیے آنے والی کسی عورت کو پکڑوں اور اس سے گھر کی کم از کم صفائی ہی کروالوں گھر کا برا حال ہو رہا تھا۔ اچانک میری نظر شکیلہ پر جا پڑی۔ شکیلہ، کوثر کی محلے دار تھی اور کبھی کبھار کوثر اور وہ مل کر اپنے گھروں سے کام پر آیا کرتی تھیں۔ میں نے شکیلہ کو ہاتھ کے اشارے سے اور آنے کو کہا اور وہ آگئی۔

”دیکھو شکیلہ! جب تک کوثر واپس نہیں آتی مجھے کسی سے کام تو کروانا ہی ہے تو تم ہی کر دیا کرو۔۔۔۔۔۔ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے اسے؟ چھٹیوں پر چھٹیاں کیسے جا رہی ہے۔ اس کو جا کر بتا دینا باجی بہت غصہ ہو رہی تھی۔ اب کی بار تو میں اس کے پیسے بھی کاٹوں گی۔“ میں نے شکیلہ کو کوثر کے حصے کی سنا ڈالیں۔

”باجی۔ کوثر تو اب نہیں آئے گی۔“ شکیلہ نے عجیب سے انداز میں مجھ سے کہا۔

”نہیں آئے گی کیا مطلب۔۔۔۔۔۔؟ کہیں چلی گئی ہے کیا؟“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”باجی آپ کو نہیں پتا؟“ شکیلہ نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔

”کیا۔۔۔۔۔۔؟ کیا نہیں پتا مجھے؟“

”کوثر تو مر گئی ہے۔“ شکیلہ کی آنکھیں بھگ گئیں۔

”مر گئی۔۔۔۔۔۔؟ کیا مطلب۔۔۔۔۔۔؟ ابھی کچھ دن پہلے تو اچھی بھلی تھی۔۔۔۔۔۔ کیا کہہ رہی ہے تو؟“ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”وہ تو جل کر مر گئی ہے باجی۔۔۔۔۔۔ اس نے اپنے اوپر مٹی کا تیل چھڑک لیا تھا۔“

”کیا، کیا۔۔۔۔۔۔؟ کیسے جل گئی۔۔۔۔۔۔ یہ کیسے ہوا؟ مجھے تو کسی نے نہیں بتایا۔“ مجھے اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین ہسکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ ”لیکن یہ سب ہوا کیسے؟“ میں پوری بات جاننے کو بے تاب تھی۔

”بھڑی قسمت اور کیا جی۔۔۔۔۔۔“ شکیلہ قالین پر میرے سامنے بیٹھ گئی اور ٹھنڈی، ٹھنڈی سائیس بھرنے لگی۔ ”باجی آپ کو تو پتا ہے اسے اپنے

چھاؤں ہے۔ مجھے اس پر بڑا یقین ہے اگر مجھے کوئی مصیبت پڑے گی تو میں اس کے پاس ہی تو جاؤں گی ناں۔۔۔۔۔۔ وہ مسکرا کر بولی۔

اس طبقے میں بہنوں کو بھائیوں پر کتنا مان ہوتا ہے۔ میں نے اپنے دل میں کل کل کل کرتے

صد کے پینو لیے کا گھاد ہانے کی کوشش کی۔

اگلے روز میں کوثر کا انتظار کرتی رہی مگر وہ نہ آئی۔ گندے برتنوں اور کھاروں سے انا گھر بند کر کے دفتر جاتے ہوئے میں نے سوچ لیا۔ اب اس کوثر

کی بچی کی چھٹی کر دوں گی۔ بڑی ڈھیٹ ہے، اس پر کسی بات کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔ صد ہوئی ہے کسی

بات کی۔۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے بڑی ایماندار اور قابل اعتبار ہے مگر ہو سکتا ہے کسی اور کام کرنے والی میں بھی یہ

سب خوبیاں مل جائیں۔ کل آئے گی تو میں اسے صاف، صاف جواب دے دوں گی۔“ میں نے دل

ہی دل میں پکا فیصلہ کر لیا۔ اس طبقے میں ذتے داری نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ میں نے ہزار دفعہ کہا ہے کہ

نہ آنا ہو تو کسی بچے کے ہاتھ پیغام بھجوادیا کرے یا کم از کم کا کے سے کہہ کر فون ہی کروادیا کرے مگر تو بہ

ہے۔۔۔۔۔۔ جب مرضی لیٹ آتی ہے اور جب دل چاہے چھٹی کر لیتی ہے آکر سو بہانے بنائے گی کہ پھوپھی کا

سرفوت ہو گیا تھا یا خالہ کی دیورانی کا بہنوئی دینی جا رہا تھا، اسے الوداع کہنے کی وجہ سے نہیں آئی تھی

وغیرہ، وغیرہ۔“ میں دل ہی دل میں اسے کوستی رہی۔

دوسرا دن اور پھر تیسرا دن بھی گزر گیا۔ کوثر کام پر نہ آئی۔ مجھے کچھ، کچھ تشویش ہونے لگی۔ کہیں خود یا

کوئی بچہ بیمار نہ ہو گیا ہو۔۔۔۔۔۔ ویسے اس طرح وہ کبھی کرتی تو نہیں تھی کہ بغیر بتائے اتنے دن کے لیے

غائب ہو جائے اور کسی کے ہاتھ کوئی پیغام بھی نہ بھجوائے۔ کئی دن میں تذبذب میں گرفتار رہی، نہ جانے کہاں دفعتان ہو گئی تھی۔

ایک صبح کھڑکی میں کھڑی ہو گئی اور سوچا قربان

بندے پر کچھ شک ہو گیا تھا کہ اب وہ کسی دوسری عورت کے پاس جانے لگا ہے۔ وہ آئے دن اسی بات پر اس سے جھگڑا کرتی اور فساد مچائے رکھتی تھی۔ اس دن بھی یہی ہوا۔ اس کے بندے نے پہلے تو اسے آرام سے سمجھایا مگر جب وہ نہ مانی تو اس کو مارنے لگا۔ بس جی وہ تو مار پیٹ کر کے گھر سے چلا گیا مگر اس کے جاتے ہی کوثر نے اپنے اوپر مٹی کا تیل چھڑک لیا اور خود کو آگ لگائی۔ بھڑی بد نصیب اپنے بچوں کے دیکھتے، دیکھتے سڑ کے سواہ ہو گئی۔ "شکیلہ دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

"آف خدا یا۔" میرا سر غم سے پھٹنے لگا۔ میرا دل اس کہانی کو سچ ماننے سے انکار کر رہا تھا۔ "یقیناً اس کے میاں نے یا ساس، دیور، کسی نے اسے آگ لگائی ہوگی۔ کیا پولیس نے تفتیش نہیں کی۔ کوئی اسے اسپتال نہیں لے گیا؟" عورتوں پر جبر و تشدد کے خلاف احتجاج کرنے والی انقلابی عورت یک دم میرے اندر سے باہر نکل آئی اور اس کہانی کو سچ ماننے سے انکار کرنے لگی۔ "اس کے بچوں سے کسی نے کچھ پوچھا؟"

"بچوں نے بھی یہی بتایا کہ اماں نے خود ہی اپنے آپ کو آگ لگائی تھی۔ پولیس پھر کیا کرتی؟ بس رپٹ لکھ کر واپس چلی گئی۔" شکیلہ نے یہ بھی یہ بتایا کہ کوثر کو اسپتال لے جایا گیا مگر وہ اتنی زیادہ جل گئی تھی کہ جانبر نہ ہو سکی۔

کوثر کا غم مجھے چمٹ کر رہ گیا۔ شکیلہ کے جانے کے کتنی دیر بعد تک میں رہ، رہ کر اس کے بارے میں ہی سوچتی رہی۔ "ہائے اس کے بچوں کا کیا حال ہوا ہوگا؟" ایک دم مجھے کا کے کا خیال آ گیا۔ "آف اللہ کا کا کتنا پریشان اور دکھی ہوگا۔ اسے پوری حقیقت کا پتا ہوگا۔ اس سے تو یقیناً پتا چل جائے گا کہ کوثر خود جل مری تھی یا اسے کسی دوسرے نے جلایا تھا۔" یہ سوچ کر میں نے کا کے کو فون کر دیا۔

"کا کے..... میں نے ابھی ابھی کوثر کے بارے میں سنا ہے۔ مجھے بڑا افسوس ہوا ہے۔ مجھے تو یقین نہیں آ رہا۔" میں نے دلگیر لہجہ میں اس سے اظہارِ افسوس کیا۔

"بس بیگم صاحبہ، اللہ کو یہی منظور تھا۔" وہ مختصر آہ بولا۔ "کہیں اس کے ساس، سر یا خاوند نے تو اسے نہیں جلایا اور بچے بھی دباؤ میں آ کر ان کے کہے پر بیان دے رہے ہوں؟ ایسا تو نہیں ہے؟" میں نے اپنے شک کا اظہار کیا۔

"نہیں جی..... ایسا بات نہیں ہے۔ کوثر آپنی نے خود ہی....."

"لیکن خیر..... ایسی کون سی بات ہو گئی تھی، مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔" میں نے کریدا۔

"کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ آپنی اپنے آپ کو ختم ہی کر ڈالے۔ آپنی کا اپنا ہی قصور تھا۔ خواہ مخواہ اپنے بندے پر شک کرنے لگی تھی۔ بھائی نے لاکھ قسمیں کھائیں، بات منوانے کی کوشش کی مگر آپنی تو کچھ سننے کو تیار ہی نہیں تھی۔ آخر وہ مرد ذات تھا اسے غصہ آ گیا اور اس نے آپنی کو مارنا شروع کر دیا۔ لیکن آپنی کی زبان کا تو آپ کو پتا ہی ہے کتنی لمبی تھی۔ آگے سے بولتی جاتی، بولتی جاتی تھی۔ وہ تھک ہار کر گھر سے باہر چلا گیا۔ بس جیہی آپنی نے یہ حرکت کی..... بے وقوفی تھی جی اس کی۔"

"لیکن یہ تو ظلم ہے۔ اس کے میاں نے اسے مارا کیوں؟" میں نے پھر سوال کیا۔

"بیگم صاحبہ، عورت کو بھی تو چاہیے ناں کہ اپنی زبان کو کنٹرول میں رکھے۔" پٹاخ سے جواب دیا۔

"اچھا غلام محمد، خدا حافظ....." میں نے اسے پہلی بار اس کے اصلی نام سے پکارا اور پھر فون رکھ دیا۔ مجھے خیال آیا، کوثر کا کا کا کتنا بڑا ہو گیا تھا، پورا مرد بن گیا تھا وہ۔





# محبت رنگ ہے ایسا

سعدیہ ریس



سب طرف چھائے ایک نامحسوس سے سوگ  
سے گھبرا کر وہ اپنے بند کمرے سے باہر نکل آئی جہاں  
ہر سوا جالا پھیلا ہوا تھا مگر اس کے من میں اندھیروں  
نے بسیرا کیا ہوا تھا۔ وہ تو بس یہ سمجھتی رہی کہ جس  
راستے پر وہ چل رہی ہے وہ درست ہے لیکن دراصل  
وہ درست سمت میں نہیں چل رہی تھی۔ اب من کا  
اندھیرا چھٹا تو اس نے انجان اور اجنبی نظروں سے  
اس جگہ کو دیکھا جہاں اس کا بچپن بیتا تھا جہاں اس



جس کے سر پر کچھ ہٹا ہی نہیں ہو۔ وہ اسے اپنے تمام تر اکھڑیں سمیت اچھی لگتی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ اس کی ساری پریشانیاں اور الجھنیں خود میں سمیٹ کر اسے مطمئن کر دے۔ اسے اپنا یقین اور اعتبار دے کر اپنا اسیر کر لے۔

اس نے جو خود ساختہ قید تہائی سزا کے طور پر اپنے لیے منتخب کی تھی وہ اسے اس سے نجات دلوانا چاہتا تھا مگر فی الحال تو اسے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے کیونکہ وہ ہر شخص کو اپنا دشمن سمجھتی تھی۔ وہ تو جیسے چلتی ہو اؤں سے بھی لڑنے لگتی تھی۔

”وہ ہرٹ ہوئی ہے امی..... اور یہ دکھ محرومی بن کر دل میں جڑ پکڑ لیتے ہیں۔ اس کے اندر بھی جڑیں گہری ہو گئی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ سب کر کے وہ خود بھی خوش نہیں ہے۔“ بلا وجہ ہی اس نے بے اختیار اس کی وکالت کی۔

منصورہ نے چونک کر کچھ شکی نظروں سے بننے کی طرف دیکھا اور خطرے کا الارم ان کے ذہن میں گونجنے لگا۔

”تمہیں کیوں فضول میں اس سے ہمدردی ہو رہی ہے۔ کوئی بچاری نہیں ہے وہ..... ایسی خود پسند لڑکیوں کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ کوئی ظلم نہیں ہوا اس کے ساتھ۔ اسے مظلوم تو وہ بچے ہوتے ہیں جنہیں نہ ماں، باپ کی گود میسر آتی ہے اور نہ گھر کا عیش و آرام ملتا ہے۔ اس کے پاس تو سب کچھ ہے۔ سب رشتوں کے ہوتے ہوئے انہیں ٹھکرار ہی ہے اور اپنی ماں سے بھلا کون ناراض ہوتا ہے، بد نصیب ہے کہ ماں کے ہوتے ہوئے بھی مست سے محروم رہ رہی ہے۔ آفرین ہے سیماب پر جو اتنی ثابت قدمی سے اس کی نافرمانی اور بد تمیزی برداشت کر رہی ہے۔ اس کی جگہ میں ہوتی تو اب تک دماغ درست کر چکی ہوتی اس کا۔ زندگی میں ابھی اس نے دیکھا ہی کیا ہے جو اتنا کڑی رہی ہے۔ اسے کیا معلوم زمانے

جیسے جذبات کا ابال ایک ساتھ ہی اٹھا۔ وہ اپنے پورشن میں آیا تو منصورہ لاؤنج میں فراغت سے جھنجھی اپنا من پسند چینل دیکھ رہی تھیں۔

”کیا آج پھوپھو آئی تھیں امی؟“ اس نے دریافت کیا۔

”ہاں، میرا خیال ہے کہ وہ آئی تھی آج مگر میں اس سے مل نہیں پائی۔ لیکن اس کا آنا ہمیشہ کی طرح بیکار ہی رہا۔ اس کے تو جیسے مزاج ہی نہیں ملے۔ عجیب خبیثی لڑکی ہے جسے اصل رنگوں کی پہچان ہی نہیں ہے۔“ ایمان کے ذکر پر ناگوار سے مل ان کی ہموار پیشانی پر پڑ گئے جو اکثر اسے دیکھ کر بھی پڑ جاتے تھے۔ اس گھر میں قطعی نا پسندیدہ اور اضافی ہستی تھی وہ ان کے لیے۔

”اچھا بھلا اپنا گھر چھوڑ کر کون پرانے گھر میں رہنا پسند کرتا ہے۔ جو سکھ اپنے گھر میں ہے وہ دوسروں کے گھر میں کہاں.....؟ اب ایسی بھی کیا ناراضی اور ضد.....“ اس کے خلاف بولنے کے لیے انہیں موقع مل گیا تھا۔

”امی پلیز..... یہ اس کا معاملہ ہے وہ جانے..... اور ہمارے کہنے کا اس پر اثر بھی کیا ہوتا ہے۔ اسے داد دے چھوٹ دے رہی ہے۔ پھر پھوپھو کی طرف سے بھی کوئی سختی نہیں..... اس طرح تو پھر ایسا ہی ہوتا ہے۔“ اس سے پہلے کہ وہ مزید اس کے متعلق بولتیں اس نے انہیں ٹوک دیا۔

اس کی اس روش سے وہ بھی خاصا مایوس تھا مگر دل ناداں باڈی ہمار اس کی طرف جھکتا تھا۔ خصوصاً جب وہ روشنی ہوئی خفا، خفا سی ہوتی تو اسے لگتا کہ وہ سارے زمانے سے شاکی ایک معصوم اور مظلوم سی خوب صورت گڑیا ہے۔ جس کی آنکھوں میں کسی بے جان گڑیا کی سی سختی جھلکتی ہے۔ جس کے سیاہ چہرے پر اچھے بکھرے رنگوں کے چھینٹے اسے کسی تجریدی آرٹ کا نادر شاہکار ظاہر کرتے تھے۔ ایسا پورٹریٹ

”یہ کیا کر رہی ہیں دادو؟“ اس نے مٹر کی طرف اشارہ کیا۔

”ایمان کا دل مٹر پلاؤ کھانے کو چاہ رہا تھا۔ سوچا کہ مٹر پلاؤ پکالوں، تم کو بھی مٹر پلاؤ بہت پسند ہے ناں..... سوچ رہی تھی کہ تمہیں کسی سے کہلوا بھیجوں گی، اب آگئے ہو تو کہہ رہی ہوں کہ کھانا ہمارے ساتھ کھانا۔“ مٹر کے دانے نکالتے ہوئے انہوں نے رمان سے کہا۔

”کیا ضرورت ہے دادو اتنی محنت کی، امی بھیج تو دیتی ہیں کھانا پکا کر..... پھر کیوں خواہ مخواہ خود کو تھکا رہی ہیں۔“ وہ محبت سے ان کے شانے ہو لے، ہو لے دبانے لگا۔

”ارے بیٹا میں کون سا کوئی کام کرتی ہوں، وہ آجاتی ہے رحمت، سارا وقت تو وہی سنبھالتی ہے سب کچھ۔ بڑے دن بعد کچھ کرنے بیٹھی ہوں، عادت چھوٹ گئی ناں، اب ایسا لگ رہا ہے جیسے انگلیاں جام ہو رہی ہیں.....“ وہ انگلیاں کھول، بند کر کے ورزش کرنے لگیں۔ ان کے برابر سے اٹھ کر وہ ان کے سامنے آ بیٹھا اور ان کا جھریوں بھرا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے کر ہو لے، ہو لے دبانے لگا۔

”یہ کام تو ایمان بھی کر سکتی ہے دادو، اس عمر میں آپ کام کرتی اچھی نہیں لگتیں۔“ وہ ننھی سے بولا۔

”ارے کام ہی کیا ہے..... آدمی پھلیاں تو چھل ہی گئیں باقی بھی اب تم سے باتوں میں چھیل لی جائیں گی۔“ وہ اس کی بات سمجھے بغیر سادگی سے بولیں۔

”دادو۔۔۔ کچھ ایمان کو بھی سکھا دیں۔ وہ تو کبھی کچھ کام کرتی دکھائی نہیں دیتی۔ لڑکیاں اپنے والدین کے گھر ہی سب کچھ سیکھتی ہیں۔ والدین کے گھر رہتا اسے گوارا نہیں اب اگر وہ یہاں سے تو آپ ہی اسے سب کچھ سکھائیں اور سمجھائیں۔ اگلے گھر جائے گی تو دوش تو سب آپ کو ہی دیں گے

کی اونچ نیچ کا، وہ کیا جانے اچھا برا..... کیا وہ ہم سے، سیماب سے یعنی اپنی ماں سے بھی زیادہ عقلمند ہے؟ تمہاری دادو کی وجہ سے چپ ہو جاتی ہوں میں، ورنہ تو ایسی خبر لوں لاؤ ورنہ کی کہ طبیعت صاف ہو جائے۔“ منصورہ جو بولنا شروع ہوئیں تو بولتی ہی چلی گئیں۔ ان کے سامنے ذکر چھیڑ کر وہ الگ پچھتایا۔ دل مجروح پر جیسے کند چھری کے وار چل گئے۔ وہ یہیں اسی گھر کی چھت تلے اس کے آس پاس ہی رہتی تھی مگر اس تک رسائی بہت مشکل تھی۔ منصورہ کو وہ سخت ناپسند تھی اور ادھر وہ خود بھی کچھ کم نہیں تھی۔ وہ دل سے اس کی توجہ اور الفت کا طالب تھا مگر اس کی بے نیازی عروج پر تھی۔

☆☆☆

اسے معلوم تھا کہ وہ ضدی نہیں ہے بلکہ ضدی بن گئی ہے۔ جو زخم اسے ملا تھا اسے بھرنے میں ایک طویل وقت درکار تھا۔ وہ اس کے زخم پر مرہم رکھنا چاہتا تھا۔ اپنی محبت سے اس کی ساری ہڈ گمانوں کو دھونا چاہتا تھا مگر وہ اسے ہی کیا کسی کو بھی درخور افتنا نہ جانتی تھی۔ اسے کسی کے خلوص پر بھروسہ نہیں رہا تھا۔ اس کا نام تو ایمان تھا مگر وہ کسی کی بھی محبت اور خلوص پر ایمان نہ لاتی تھی۔

اور عامر اسے چاہتا تھا، وہ اس کی نظروں کے سامنے رہتی تھی مگر اسے پانا ناممکنات میں سے تھا۔ دل الجھا..... تو اس پر یک دم ہی بیزاری اور..... جڑ جڑا ہٹ چھا گئی۔ وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے چھت پر چلا آیا۔

دیر تک وہ اس کے بارے میں غور و خوض کرتا رہا اور سرگرم پھونکتا رہا لیکن کوئی حل بھی ذہن میں نہیں آیا۔ نیچے اترتا تو بلا ارادہ ہی دادو کے حصے میں چلا آیا۔ وہ منتر چھیلنے میں مصروف تھیں۔ اسے دیکھا تو ایک شیشی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ عامر کو سفید دوپٹے میں لپیٹی اپنی دادی بہت پروقاہ لگتی تھیں۔



وہ اپنی ماں کو نہیں گردان رہی تو میری کیا مانے گی۔  
ارے اگر ابھی میں اس کی سرپرستی سے منع کر دوں تو  
بدگمان ہو کر وہ نہ جانے کیا کر بیٹھے۔ جذباتی بھی تو  
بہت ہے ناں..... میں تو بچاری سیماب کے صبر اور  
حوصلے کی داد دیتی ہوں۔ نیکی بد نصیب ہے کہ اپنی  
امتا بھی اس پر چھادر نہیں کر سکتی لیکن دل میں جو ممتا  
اٹدی ہوئی ہے اس کا کیا کرے۔ اسی لیے تو اس کا  
اتنا خیال کرتی ہے۔ لاکھ منع کیا مگر اس نے رحمت کو  
صبح سے شام تک کے لیے یہاں رکھ چھوڑا۔ منصورہ  
نے برا بھی مانا تھا مگر وہ مانی ہی نہیں اور کہہ دیا کہ اماں  
میری ایمان کی پرورش کر رہی ہیں اور میرا فرض ہے  
کہ میں بھی اپنی ماں کا خیال رکھوں..... ہر ماہ  
باقاعدگی سے خرچہ بھی بھیجتی ہے۔ بہتیرا سمجھایا اسے  
کہ دیکھو ماں تمہارا کتنا خیال کرتی ہے مگر اس اتنی  
کھوپڑی پر اثر ہی نہیں ہوتا۔ ”لالال کے رنگ ان  
کے لہجے میں نمایاں تھے۔

”آج آئی تھیں ناں پھوپھو.....؟“ اس نے  
تصدیق چاہی۔

”ہاں بیٹا آئی تھی وہ حراماں نصیب..... لاکھ  
پچکارا، خٹس، خوشامدیہ کیس مگر یہ کنوڑا اس سے ملے  
بغیر منہ پھیر کر چل دی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس  
کے سینے میں دل ہی نہیں پتھر ہے۔ بھلا بتاؤ، ماں  
سے بھی کوئی ایسے ناراض ہو سکتا ہے اور ماں بھی وہ جو  
اتنی صبر والی اور غم کھاتی ہوئی ہو۔“ اب ان کے لہجے  
میں ہلکا، ہلکا غصہ در آیا تھا۔ بیٹی کی محبت کے سامنے  
تو اسی کا طرز عمل انہیں بالکل غلط دکھائی دے رہا تھا  
ورنہ عمومی طور پر وہ اس کی ہمدردی میں ڈوبی رہتی  
تھیں اور یہی وہ موقع تھا جب لوہا گرم دیکھ کر اسے  
چوٹ بارتی تھی۔

”دادو، دراصل اسے آپ کی حمایت حاصل  
ہے۔ اس لیے وہ اتنا اکڑتی ہے آپ اس پر سختی کریں  
گی تو وہ سدھر جائے گی۔ آپ اسے مجبور کریں گی تو

ناں۔“ بیٹھے ہموار لہجے میں اس نے انہیں سمجھانے کی  
کوشش کی۔

دادو کے دل کے زخم پھر سے اُدھر گئے۔  
انہوں نے اک گہری سانس بھری جس میں مایوسی  
پنہاں تھی۔

”ہاہ..... ہاہ..... نہ جانے کیسی تقدیر لکھوا کر  
لائی ہے، کچھ سختی ہی نہیں ہے۔ زیادہ کہو تو ناراض  
ہو جاتی ہے اور خفا ہو کر بھی خود ہی کو زیادہ نقصان  
پہنچاتی ہے۔ میں نے تو خود کئی بار اس سے کہا کہ  
کو کنگ سیکھ لیے۔ اسی لیے او دن بھی اپنے کچن میں  
سیٹ کروادیا تھا تا کہ شوق میں آکر خود کچھ کرنے  
گئے مگر اپنے دکھ کا بدلہ وہ ہم سب سے ہی نہیں خود  
سے بھی لے رہی ہے۔ نہ اسے کوئی شوق ہے اور نہ  
کسی کی پروا۔ بھلا بتاؤ کون آئے گا اس کا ہاتھ  
تھامنے، لڑکی کی اتنی ہٹ دھرمی آگے چل کر اس کے  
لیے بھی مصیبت بن جاتی ہے۔ جس شاخ میں چک  
نہ ہو وہ بالآخر ٹوٹ جاتی ہے مگر وہ ہے کہ سختی ہی  
نہیں۔“ ایک ہمدرد کو سامنے پا کر دادو نے بیٹی آواز  
میں دل کے سارے دکھڑے کہہ سنائے۔ ان کے  
نورانی چہرے پر ایک گہرا کرب جھلکنے لگا۔ وہ اس کے  
لیے بہت فکر مند تھیں۔ عام کو ان پر بہت رحم آیا اور  
ساتھ ساتھ ایمان پر غصہ بھی آیا جو اپنے سوا کسی کو بھی  
نہیں دیکھتی تھی۔

”دادو آپ اس کی بڑی ہیں، اس پر سختی کر سکتی  
ہیں۔ اسے سمجھائیں اور زمانے کی اونچ نیچ بتائیں  
تا کہ اسے احساس ہو۔ کہ وہ غلطی پر ہے۔ وہ سب  
کے لیے ہی نہیں، اپنے لیے بھی مشکلات کھڑی  
کر رہی ہے اور اسے یہ بھی بتائیں کہ جو خود کو زیادہ  
عقل مند سمجھتا ہے وہ سب سے زیادہ بے وقوف ہوتا  
ہے۔“ ان کا ملائم ہاتھ چھوڑ کر منہ چھیلے، چھیلے اس  
نے سرگوشیاں انداز میں ان سے کہا۔

”کیا کروں..... کیسے سمجھاؤں اسے..... جب

وہ پھپھو سے ملنے لگے گی۔ اس طرح پھپھو کو بھی سکون ملے گا۔ دو چار دن اس سے بے رخی برتیں، لہٰذا پھپھو کرکریں اور فحش دکھائیں ساتھ ہی اسے گھر کے کاموں کی طرف راغب کریں اور اسے مجبور کریں کہ وہ کوئنگ میں دلچسپی لے۔ اس طرح اس کا ذہن بے گاہہ کچھ مصروف ہوگی تو ہر وقت کی الٹی سیدھی سوچوں سے باہر نکلے گی اور پھپھو کی بھی طرف مائل ہوگی۔ وہ جوش میں آکر انہیں مختلف طریقے سمجھانے لگا۔

شاید جوش میں آکر اس کی آواز زیادہ ہی اونچی ہوگئی تھی یا پھر اتفاقاً طور پر ایمان اس طرف آگئی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ آتش فشاں بنی اس کے سر پر کھڑی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ لگائی بجھائی کا یہ کام عورتوں کو ہی سوٹ کرنا ہے، بہت بھر لیے تم نے تانوں کے کان اب اٹھو اور یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔“ وہ تمام تر بدلتا غی سے اس سے مخاطب ہوئی۔ دادو ہائیں، ہائیں کرتی رہ گئیں مگر وہ چپ ہو کر ہی نہ دی اور عامر کچھ شپٹا کر اور کھسکا کر اسے دیکھتا رہ گیا۔ ”ارے وہ تو مجھ سے ایسے ہی بات کر رہا تھا اس کا مطلب تمہاری برائی کرتا تھوڑی تھا۔ خواہ مخواہ اس پر بگڑ رہی ہو۔“ دادو نے تھوڑا گھبراتے ہوئے اس کی طرف سے صفائی دی۔

”خوب سمجھتی ہوں میں اپنا بھلا اور برا اور نہ ہی میں کوئی چھوٹی بچی ہوں عقل ہے میرے پاس۔ انہیں سمجھا دیں کہ آئندہ میرے بارے میں ذرا سوچ سمجھ کر بات کریں۔ کسی کو میری فکر میں دجلا ہونے کی ضرورت نہیں۔“ وہ کسی لڑاکا عورت کی طرح اس پر برس رہی تھی۔

”ہائیں، ہائیں، ایمان... کیا بولے جا رہی ہو۔“ دادو نے اسے ٹوکا۔

”ہاں وہ تو نظر آ رہا ہے کہ تم کتنی عقل مند ہو

اسی لیے دادو سے زبان چلا رہی ہو، بڑے چھوٹے کی کوئی تمیز نہیں تمہیں۔ پوری لڑاکا ڈو کی لگ رہی ہو اس وقت..... یاد رکھو جو لوگ صرف جذبات سے کام لیتے ہیں وہ تمہاری طرح خود ہی کو نقصان پہنچاتے ہیں۔“ بوڑھی دادو کی بے بسی اور ضحیف دیکھ کر وہ بھی میدان میں کود پڑا۔

دونوں طرف بڑے خوفناک تاثرات چھا گئے تھے اور دونوں ہی ایک دوسرے کو کڑے انداز میں دیکھ رہے تھے۔ اس صورت حال سے دادو کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

”تم اندر جاؤ ایمان... چلو یہاں سے۔“ وہ ڈپٹ کر بولیں۔

”اور اسے کچھ نہیں کہہ رہیں..... مجھے نہیں، اسے سمجھائیں آپ اور یہاں سے دفع کریں۔“ وہ ضبط کی آخری حدوں پر جا کر بکھرے لہجے میں بولی۔

”ایمان...“ دادو نے پھر اسے سرزنش کی۔ ”ٹھیک ہے پھر آپ اسے ہی صحیح سمجھتی رہیں اگر میں آپ کو اتنی ہی بری لگتی ہوں تو چلی جاتی ہوں یہاں سے۔ بہت ہانسل ہیں اس شہر میں، کسی میں بھی رہ لوں گی۔“ اچانک ہی فیصلہ سنا کر وہ جھٹکے سے مڑ کر اندر کو چلی گئی۔

مگر اس سے پہلے ہی دو قدم آگے بڑھ کر عامر اس کی راہ میں حائل ہو گیا اور اس کے بازو کو مضبوطی سے پکڑ کر اسے واپس دادو کی طرف دھکیلا۔ اس کے ہٹکے سے دھٹکے سے وہ لڑکھڑا کر دادو کے پاس آگری۔

”تم ہوتے کون ہو مجھے روکنے والے اور مجھ پر ظلم چلانے والے؟“ وہ غصے سے چیخ پڑی۔

”یہ میں تمہیں کچھ دنوں بعد بتاؤں گا۔ ابھی تو تم یہاں بیٹھ کر اپنی بد تمیزی پر دادو سے معافی مانگو..... تمہیں ذرا بھی کسی کا لحاظ نہیں..... وہ تم سے اتنی محبت کرتی ہیں۔ سب کی مخالفتوں کو سہہ کر تمہاری پشت پناہی کر رہی ہیں اور تم نے ایک ہی جیلے میں ان

ایک نئے مشن کا آغاز بڑے ہی دلفریب انداز میں ہوا۔ وہ باقاعدگی سے ہر روز دادو کے پاس حاضری دینے لگا۔۔۔۔۔ اس کی آمد پر وہ لاکھ جھنجھلائی، پاؤں پختی مگر وہ اس کی ناگواری کو بالکل بھی خاطر میں نہ لاتا اور دادو سے باتیں مضارتا رہتا۔ اس دوران کبھی اپنے ذہنی نقروں کی لپیٹ میں اسے بھی لے لیتا تب وہ اور زیادہ جھجھلا جاتی۔

”آخر یہ یہاں روز، روز کیوں آ رہا ہے؟“  
بھنا کر ایک دن وہ نا تو پرالٹ پڑی۔

”اے ہے میرا پوتا ہے، کیوں نہ آئے گا۔۔۔۔۔“

جیسے تم میری نواسی ویسے وہ میرا پوتا۔۔۔۔۔ جتنا مجھ پر تمہارا حق بنتا ہے اتنا ہی اس کا حق بھی بنتا ہے۔“  
دادو نے اسے صاف، صاف جتا دیا۔

”بلکہ میرا زیادہ حق بنتا ہے کیوں کہ میں ان کا پوتا ہوں۔ شرعی لحاظ سے بھی اور خون کے لحاظ سے بھی میرا ذیل حق بنتا ہے۔ دادو کی ہر چیز اور ہر شے پر میرا ذیل حق بنتا ہے۔ میں جب چاہوں وہ چیز لے سکتا ہوں۔“ نہ جانے وہ کب وہاں آیا تھا اسے خبر ہی نہیں ہوئی اور اس کی ساری باتیں بھی اس نے سن لیں۔ اس کے کرارے سے جواب پر ایمان کو بے حد غصہ آیا۔ خواہ مخواہ کا حق جتانے جو آ گیا تھا۔

”ابو یں حق بنتا ہے، منہ دھور کھو اپنا۔۔۔۔۔ یہاں سے کوئی بھی چیز تم بلا اجازت اٹھا کر نہیں لے جا سکتے۔ یہاں میں بھی رہتی ہوں اور میری چیزیں بھی یہاں ہوتی ہیں۔“ اس نے لٹھ مار کر خاصی گرمی سے جواب دیا۔

اور کسی خدشے کے تحت احتیاطاً ٹھیل پر رکھی ڈرائی فروٹ کی برنی اٹھا کر کچن کی طرف چل دی کہ کہیں وہ زبردستی سارا میوہ نہ اڑا لے جائے۔ ویسے ہی اس کی زیادہ آمد و رفت سے وہ چڑھ رہی تھی۔ اب تک نانوکے ساتھ بلاشرکتہ غیرے رہ رہی تھی اور چار روز سے وہ اپنا حق جتانے آنے لگا تھا اسی لیے اسے خدشہ

کی محبت کو پامال کر دیا۔ ”دادو کے بوڑھے کم صم سے چہرے پر ایک نظر ڈال کر وہ ڈپٹ کر اس سے بولا۔ اس وقت اس کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ اپنے بکھرے بال چہرے سے ہٹاتے ہوئے اس نے ایک نظر افسردہ سی نا نو پر ڈالی پھر انہی کی گود میں منہ چھپا کر سسکنے لگی۔

”بے وقوف لڑکی۔۔۔۔۔ کچھ سمجھتی ہی نہیں۔“ اس کے روتے چھکولے لیتے وجود کو دیکھ کر وہ بے چین ہو کر یہ آواز بلند بڑا دیا۔ اس سے اس کی سرخ سی آنکھوں میں چھپا ہوا راز ایمان کے دل کو ڈانواؤں کر گیا۔

☆☆☆

منصورہ کی طرف سے اسے بالکل بھی امید نہیں تھی کہ وہ کسی صورت اس کے اور ایمان کے رشتے کے لیے راضی ہوں گی لیکن اس کا دل یہ گواہی دے رہا تھا کہ اس کی بھرپور محبت اسے بدل ڈالے گی۔ اس کی ضد، خود سری اور بے اعتباری بھی ختم ہو جائے گی۔

اس روز کے بعد ایک دن موقع دیکھ کر اس نے دادو کو اپنے اعتماد میں لے لیا۔ دادو کو اور کیا چاہیے تھا وہ تو پہلے ہی اس کے رشتے کے لیے فکر مند تھیں۔ خوشی کے پُر مسرت احساس سے ان کی آنکھوں میں جھپٹے دیے چمکنے لگے۔ وہ عامر کے فیصلے کو سراہنے لگیں۔

”بس دادو یہ بات ابھی آپ کے اور میرے درمیان رہے گی۔ ابھی امی، ابو کو اس کی خبر نہ ہو۔ ایمان کی عادتوں کی وجہ سے امی بھی اس سے بد دل ہیں اور نہ ہی ایمان سے اس بات کا ذکر کریں ورنہ خواہ مخواہ وہ فساد کھڑا کرے گی۔ میں اسے اپنے پیار اور توجہ سے رام کر لوں گا۔ اس کی عادتیں بدلیں گی تو امی بھی خود بخود مان جائیں گی۔“ اس نے پوری تفصیل سے اپنا منصوبہ انہیں سنایا۔

دادو نے بھی اس کی بات سے متفق ہو کر اس بات کو راز میں رکھنے کی حامی بھری۔

☆☆☆

تھا کہ وہ میوے پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا ہے۔

”تمہاری بھی ہر چیز دادو کی چیز ہی ہوئی کیونکہ تم خود بھی تو دادو کی لائق و فرمانبردار نو اسی ہو، اس لحاظ سے میرا تو تم پر بھی بہت حق بنتا ہے۔“ کیبنٹ کا دروازہ کھول کر وہ مرتبان اس میں رکھ ہی رہی تھی کہ وہ پیچھے، پیچھے چلا آیا۔

اس کی بات پر ایک لمحے کو وہ سن سی رہ گئی جس کا فائدہ اٹھا کر اس نے میوے کی برنی اس کے ہاتھ سے لے کر بہت آرام سے منھی بھر میوہ نکال لیا۔

”کچھ زیادہ ہی خوش نہیں ہے تمہیں.....“ اس نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے برنی لی اور جلدی سے کیبنٹ کا دروازہ بند کر دیا۔

مگر جب آگے بڑھنے لگی تو اس نے اس کی کلا کی تھام لی وہ چاہنے کے باوجود اس کی گرفت سے کلائی نہ چھڑا پائی۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے؟“ وہ جھلا کر بولی۔

”جب کوئی سیدھی طرح بات نہیں سمجھتا تو زبردستی اسے جھڑپیاں لگانا پڑتی ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے الجھ کر نہ سمجھنے والے انداز میں براہ راست اس کی طرف دیکھا مگر پھر اس کی آنکھوں میں ابھرتے جذبوں کو دیکھ کر کچھ خائف ہو کر نظر چڑا گئی۔

”انتا بھی نہیں سمجھتیں کہ میں یہاں روز، روز کس کے لیے اور کیوں آتا ہوں۔“ اس کی گمبیر آواز نے اس کے دل پر باندھے گئے بند کو ایک ہلکے سے جھٹکے سے توڑ ڈالا۔

”فضول باتیں نہ کرو..... ابھی نانو آگئیں تو سیدھا کر دیں گی تمہیں۔“ اس نے خود کو مضبوط ظاہر کرنے کی بہت کوشش کی مگر آواز کی لرزش پر قابو نہ کر سکی۔ ہر لڑکی کی طرح اس موقع پر وہ بھی گنیووز ہو گئی تھی اور فطری مشرقت عود کر آئی تھی۔

”عامر..... عامر بیٹا.....“ اسی وقت دادو کی

آواز نے اسے چونکا کر دیا۔

وہ کچھ گھبرا کر اندر کی طرف پلٹا لیکن یہ نہ دیکھ پایا کہ ایمان کے چہرے پر بڑی خوب صورت سی شکر اہٹ آگئی تھی۔ بڑا ثبت نتیجہ سامنے آیا تھا۔ چند ہی دنوں میں اس کی جھلاہٹ اور چڑچڑاہٹ غلغلے میں بدل گئی۔ دادو تو اس معجزے پر حیران رہ گئیں۔ وہ اپنے پوتے عامر کی صلاحیتوں اور سمجھداری کی معترف ہو گئیں۔

وہ اکثر شام کو چلا آتا۔ دادو سے دیر تک باتیں کرتا ساتھ میں ایمان بھی شامل ہو جاتی۔ بڑے غیر محسوس انداز میں وہ اس کی طرف مائل ہوئی تھی۔ ایمان کے ساتھ مل کر وہ دادو کے بھی بہت سے کام کروادیتا تھا اور دعائیں بھی یونس میں ملتی رہتی تھیں۔ ایمان بھی اب اس کی عاوی ہو گئی تھی۔ اسے بھی عامر کا بدلا، بدلا اور مصالحتی سا روپ اچھا لگ رہا تھا ورنہ تو ہر شخص جیسے اس سے خفا تھا۔ اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر کسی کو اس سے ہمدردی نہیں تھی۔ سب اسے ہی غلط کہتے تھے اور اس سے بیزار تھے۔

☆☆☆

جہاں آرا اس کی نانی تھیں اور اپنے بڑے بیٹے جیل کے ساتھ رہتی تھیں جو اس کے سب سے بڑے ماموں تھے باقی دو ماموں الگ گھروں میں رہتے تھے۔ دو خالائیں شادی شدہ تھیں وہ بھی جہاں آرا سے ملنے آتی رہتی تھیں مگر ایمان سے سب ہی بیزار اور خفا، خفا رہتے تھے۔ اس کا دکھ کسی نے بھی نہ سمجھا بس اس کی یہاں رہائش پر کوئی خوش نہیں تھا۔ ان سب کے انہی رویوں نے اسے مزید سب سے بدگمان اور بد دل کر دیا۔ نتیجتاً وہ بد مزاج ہو گئی اور سب پر سے اس کا اعتبار اٹھ گیا۔

کوئی بھی اس سے ہمدردی نہ کرتا تھا، خالائیں روکھے رویوں کا مظاہرہ کرتیں، مامیاں اسے اچھی نظر سے نہ دیکھتیں۔ کن آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر



### جینا پڑتا ہے

یہاں ہلہ، ہلہ چلنا پڑتا ہے  
ہر رنگ میں ڈھلنا پڑتا ہے  
ہر موڑ پہ ٹھوکر لگتی ہے  
ہر حال میں چلنا پڑتا ہے  
ہر دل کو سمجھنے کے لیے  
خود سے لڑنا پڑتا ہے  
کبھی خود کو کھونا پڑتا ہے  
کبھی چھپ، چھپ کے رونا پڑتا ہے  
کبھی نیند نہ آئے پھولوں پہ  
تو کبھی کانٹوں پہ سوتا پڑتا ہے  
کبھی تو خوشیاں لوٹ آئیں گی  
اسی آس پہ جینا پڑتا ہے

### کیوں

زندگی میں اس قدر تنہائیاں کیوں ملتی ہیں  
انگو حرفِ وفا تو رسوائیاں کیوں ملتی ہیں  
میری سوچ کی حدیں تو مجھ تک محدود ہیں  
پھر لوگوں کو میری ذات میں برائیاں کیوں ملتی ہیں  
میں ستاروں سے روشن اپنی ذات میں اتر کر دیکھوں  
تو اس قدر مجھے دیرائیاں کیوں ملتی ہیں  
ہزاروں لیوں کو مسکرائیں دے کر بھی  
اپنی ذات کی گہرائی میں اداسیاں کیوں ملتی ہیں  
مرسلہ: جگمگاتے بکلیں، کراچی

اشارے کرتیں تب وہ دل برداشتہ ہو جاتی تھی۔ پہلے  
ایسا نہیں تھا جیسے تیسے وقت گزری رہا تھا شاید سب کو  
یہ امید تھی کہ وہ چند دن کی ناراضی کے بعد اپنی  
ماں کے پاس چلی ہی جائے گی مگر جب وہ اپنی ضد پر  
قائم رہی اور سب پر برا بھلا کہنے لگی تو سب کی تیوریوں پر  
مل پڑ گئے۔ چھوٹی موٹی رنجشوں اور کھٹ پٹ کا آغاز  
ہوا تو زندگی بری اور بہت بری لگنے لگی۔ وہ پہلے سے  
بھی زیادہ حساس اور سب سے بدظن ہو گئی۔

کئی کئی وقت بھوکی رہتی، سب کی ناگواری اور  
اپنے دکھ کا بدلہ اس نے اپنی ہی ذات سے لینا شروع  
کر دیا۔ جہاں آرا سے وہ سنبھالے نہ سنبھال رہی تھی  
اس کی صحت بھی روز بروز جھکتی جا رہی تھی۔ سیما ب  
سے تو اسے بات کرنا بھی گوارا نہیں تھا۔ وہ آتی تو یہ  
کمرے میں بند ہو جاتی۔ ہر کوشش نا کام ہی رہی۔

اسے دیکھ، دیکھ کر جہاں آرا کا دل کڑھتا رہتا۔  
سب گھر والے ایک دوسرے سے ملتے اور ایمان  
سب سے الگ تھلگ کمرے میں بند رہتی۔ جہاں آرا  
بھی سب کے روئے دیکھ رہی تھیں۔ اسے نارمل  
زندگی کی طرف لانے کے لیے انہوں نے صرف اس  
کی خاطر اپنا پورشن علیحدہ سیٹ کر لیا تاکہ سکون اور  
چمن سے وہ واپس زندگی کی طرف مائل ہو۔ اپنا بچن  
بھی انہوں نے علیحدہ کر لیا تھا ان کے اس عمل سے  
سب کو بہت اعتراض ہوا خصوصاً ان کی بہو منصورہ  
نے بہت برا مانا چونکہ ایمان کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا  
تھا اس لیے وہ سب اس سے اور بھی گھنچ گئے۔ وہ  
سب ایمان کے زبردستی یہاں برا بھلا کہنے پر پہلے  
ہی خفا تھے اور اس کے سب سے بڑے ماموں بھیل  
ماں پر تھوڑے برہم بھی ہوئے کہ وہ اس کی ضد میں  
اس کا غلط ساتھ دے رہی ہیں مگر وہ بھی تو اس کی محبت  
میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھیں۔ سیما ب ان کی  
لخت جگر تھی تو ایمان ان کی کمزوری تھی اور پھر اگر وہ  
بھی سب کی طرح اس کا ساتھ چھوڑ دیتیں تو نہ جانے

اس کا کیا انجام ہوتا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ وہ یہ سب کچھ اپنی نادانی میں کر رہی ہے۔ انہیں پوری امید تھی کہ کچھ عرصہ ان کے پاس رہ کر وہ سنبھل جائے گی اور ماں سے ناراضی ختم کر دے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس کا غصہ اور ناراضی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اب وہ اسکول گرل نہیں بلکہ کالج گرل تھی لیکن وہ اپنی ضد پر اب تک قائم تھی۔

☆☆☆

رحمت اس روز چھٹی پر تھی اور دادو ہفتہ صفائی منانے پر تلی ہوئی تھیں۔ پوری الماری خالی کر کے نئی ترتیب سے کپڑے رکھ رہی تھیں۔ ان کی اس سب وقت کی صفائی سے ایمان ٹالاں نظر آ رہی تھی۔

”آج تو رحمت بھی نہیں آئی..... پھر بھی آپ یہ بکھیرا پھیلا کر بیٹھ گئیں۔“ وہ زچ ہو کر بولی۔

”یہ کام رحمت کے کرنے کا نہیں ہے، اب میں اسے اپنی الماری میں تو گھسانے سے رہی۔ اس میں میری بہتری ذاتی چیزیں اور پیسے وغیرہ رکھے ہوتے ہیں اور یہ کام تو لڑکیوں کے کرنے کے ہیں تم نہیں کرو گی تو کون کرے گا۔ اس طرح ساتھ لگ کر کچھ نہ کچھ سکھ ہی جاؤ گی۔ اب تو مجھ میں وہ دم نہیں رہا ورنہ پہلے میں اکیلے دم سے اس کام نمٹا دیتا کرتی تھی۔ تمہارے دادا، خدا انہیں کروٹ، کروٹ جنت نصیب کرے، مجھ سے بہت خوش رہا کرتے تھے۔ اور بیٹا مرد بھی انہی بیویوں سے خوش ہوتے ہیں جو آگے بڑھ کر اس کا پورا کنبہ سنبھال لیتی ہیں۔“ وہ اسے لپکھ پلانے لگیں۔ یہ سب عامر کے کہے کا ہی اثر تھا کہ وہ اس کی تربیت کرنے پر تل گئی تھیں یا پھر وہ یہ چاہ رہی تھیں کہ ان میں میخوں سے گھبرا کر وہ سیماب کے پاس چلی جائے گی مگر یہ اتنا آسان نہیں تھا۔

”افوہ نا نو.....! ایک تو آپ مجھے بہت چھوٹی سی بچی سمجھ کر سمجھاتی رہتی ہیں۔ سب آتا ہے مجھے اور پھر ملازم کس لیے رکھے ہوتے ہیں۔ میری سمجھ میں

نہیں آ رہا کہ آج رحمت کے چھٹی کرنے پر آپ نے یہ بکھیرا کیوں پھیلا لیا۔ اب یہ کارپٹ کو ویکيوم کرنے میں ہی اتنا وقت لگ جائے گا۔“ وہ بیچارگی سے بولی۔

”اوہو، تمہیں کچھ نہیں کرنا تو نہ کرو، جاؤ آرام کرو تم، میں خود ہی سب کر لوں گی۔“ وہ مصنوعی ناراضی سے بولیں۔

”اچھا بتائیں مجھے کیا کرنا ہے۔“ ان کی غفلت دیکھ کر اس نے مجبوراً پوچھا۔

”تم ایسا کرو کہ میرے کمرے کے پردے بدل دو۔ اتنے گہرے رنگ سے مجھے الجھن ہوتی ہے وہ جو فان کمرے کے پردے ہیں ناں وہ ڈال دو اور ہاں ریڈنگ کو ذرا جھاڑن سے جھاڑ بھی لینا۔“ دادو نے جھٹ اسے کام بتا دیا۔

”اے یہ اتنے بھاری پردے ہیں.... میرا مطلب ہے اتنے قیمتی اور اچھے ہیں۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکی مگر چہرے پر بے انتہا پریشانی کے آثار آ گئے۔

”اوہ، نانی، تو اسی آج صفائی میں لگی ہیں۔“ عین وقت پر عامر اندر داخل ہوا۔

ایمان کی بیزار صورت دیکھ کر ہنسی تو بہت آئی مگر ضبط کر گیا۔ بڑی کاریگری سے اس نے اسے اس جال میں الجھایا تھا۔

”رحمت کے سامنے یہ کام پھیلاتے ہوئے مجھے الجھن ہوتی ہے، اب تم آگئے ہو تو دو چار کام کر داتے جانا، ایمان غریب کب تک لگی رہے گی میرے ساتھ۔ تمہاری ماں نے جو کھانا بھجوا یا ہے وہ کچن میں رکھ دو۔“ انہوں نے مصروف سے انداز میں اسے ہدایات دیں کیونکہ وہی کھانا لے کر آتا تھا۔

”کھانا کہاں ہے دادو؟ اسی لیے تو میں یہاں آیا تھا۔ امی لوگ تو آج سب خالہ کی طرف گئے ہیں اور کھانا بھی نہیں رکھا۔“ اس کی اطلاع تھی یا دھماکا۔ دادو سے زیادہ ایمان کی صورت دیکھنے والی ہو رہی تھی۔

”اے ہے، یہاں تو پہلے ہی بہت کام پھیلا ہوا

رفتہ زائل ہو رہی تھی۔

”چلو بھئی آلو اہل گئے، پہلے آلو چھیل لو پھر جیسے میں کہوں ویسے ان کو چڑھا دیتا۔“ دادو نے ظالم ملکہ کی طرح آرڈر دیا۔

”ہاں، ہاں ہم مل کر سب کر لیں گے۔“ اس کی صورت دیکھ کر عامر نے پیشکش کر دی۔ وہ دونوں بچن میں چلے گئے۔ آلو کا بھرتا منٹوں میں تیار ہو گیا تھا۔ وہ بچن سے باہر آئی تو عامر نے پائپ لگا کر اگلا برآمدہ دھو ڈالا اس نے بتا پیشانی پر ٹھکن لائے واپر سے سارا پانی سوت دیا۔ زندگی اتنے دلفریب رنگوں سے پُر ہے، یہ اسے آج معلوم ہوا تھا۔ عامر کے سنگ، سنگ ہر کام کرتے ہوئے بڑا اچھا لگا تھا۔

”ہاں بھئی کیسا رہا تجربہ میرے ساتھ کام کرنے کا؟“ کھانے کے بعد وہ از خود ہی چائے تیار کر کے لایا تو پوچھ بیٹھا۔

”آں..... کچھ برا تو نہیں.....“ اس نے کمال صفائی سے سرسری سے انداز میں کہا۔ ورنہ دل کی دھڑکنیں رک، رک سی گئی تھیں۔

”تو پھر کیا خیال ہے بندے کو ساری عمر کا غلام بنانے کے بارے میں؟“ بہت اچانک ہی اس نے بڑی بے باکی سے پوچھ لیا۔

وہ شیشا سی گئی اور اس کے چہرے پر بڑے خوب صورت سے رنگ بکھر گئے۔ عامر کے لبوں پر بڑی جاندار مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس کا مشن کامیاب جا رہا تھا۔

☆☆☆

اس روز وہ گھر میں داخل ہوا تو اسے ماحول پر بوجھل بن محسوس ہوا جیسے کسی کی سرد آہیں فضا میں حلال کر گئی ہوں۔ وہ گھبرا کر ماں کے پاس چلا گیا۔

”خیریت تو ہے، آج گھر میں اتنی خاموشی کیوں ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”یہ ساری اسی کی فحوت ہے جب تک وہ

ہے، کیسے نمٹے گا سب؟“ دادو پریشان ہو گئیں۔

”ارے دادو فکر کی کوئی بات نہیں، میں مل کر سب کروادوں گا۔“ اس نے ایمان کی اتری ہوئی صورت کو کن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے انہیں تسلی دی۔

”میرا خیال ہے کہ کھانا بازار سے آجائے گا۔“ ایمان نے جھٹ تجویز دی۔

”ارے بازار جانے کا وقت کہاں ہے، گھر میں ہی کچھ سادہ سا پک جائے گا۔ ادھر ہنڈیا چڑھے گی ادھر کام بھی نمٹ جائیں گے۔“ دادو نے بھی عامر کا ہی ساتھ دیا۔

”مگر مانو.....؟“ اس نے احتجاج کرنا چاہا۔

”میرا خیال ہے کہ آلو پکا لیں گے، وہ آسانی سے پک جاتے ہیں۔“ دادو نے ڈس بھی تجویز کر دی۔

”آلو کا بھرتا صحیح رہے گا دادو، اسے پکانے کا بھی مسئلہ نہیں ہوتا نہ اتنا پھیلاوا ہوتا ہے۔“ عامر نے فوراً ان کی بات سے اتفاق کیا۔

”ہاں، یہ صحیح ہے، جاؤ ایمان چھپکے میں سے آلو لے کر اچھی طرح دھو کر ابالنے کے لیے رکھ دو۔“ دادو نے بے نیازی سے آرڈر کیا۔

ان دونوں کے سامنے اس کی ایک نہ چلی وہ منہ بناتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ عامر نے بہ مشکل اپنی مسکراہٹ دبائی۔

وہ آلو ابالنے کے لیے رکھ کر آئی تب تک وہ قالین پر ویکیوم کرنے کے بعد دادو کے شاہی گاؤں کے دیوار کے ساتھ سیٹ کر رہا تھا۔ دادو اب تھک تھکا کر اپنے پٹنگ پر آنکھیں موندے بے دم سی لیتی تھیں۔

اس نے ان کی الماری میں بقیہ کپڑے سیٹ کیے۔ عامر نے ان کے کمرے کے پردے اتار ڈالے وہ دادو کی پسند کے پردے لے کر آئی۔ اور ان کے ہک لگا کر عامر کے سپرد کر دیے۔ ان سارے کاموں کے درمیان وہ کوفت کا شکار رہی لیکن عامر کی باتوں نے ذرا بھی ٹھکن نہ ہونے دی اور کوفت بھی رفتہ،

یہاں سے ایسا ہی ہوتا رہے گا، کیسی بے رحم اور نا فرمان لڑکی ہے، ماں کا دل دکھاتے اسے ذرا بھی افسوس نہیں ہوتا۔“ انہوں نے ناگواری سے کہا۔

”اوہ مائی گاڈ.....“ اس نے تاسف سے سر تھام لیا۔ ”اتنی کوشش کے بعد تو وہ سنبھلی تھی اب پھر وہی سلوک اور سب کی طنز یہ نکا ہیں.....“ وہ سمجھ گیا کہ سیماب پھپھو آئی تھیں۔

”پھپھو تمہیں کیا ابھی ہیں؟“ وہ کچھ سوچ کر سوال کرتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ ”رہنے دو..... تم بلا وجہ اس کے معاملے میں نہ بولو۔ ویسے بھی وہ دو منٹ میں آجے سے باہر ہو جاتی ہے اور میں دیکھ رہی ہوں کہ تم کچھ زیادہ ہی ادھر جا رہے ہو۔“ کئی دنوں کی تشویش کو بالآخر انہوں نے زبان دے ہی ڈالی۔

”اوہو امی، میں تو دادو کی وجہ سے وہاں جاتا ہوں۔“ اس نے کھپا کر وضاحت دی اور دوسرے پورشن کی طرف بڑھ گیا۔ وہ سیدھا دادو کے پاس پہنچا۔ حسب توقع جہاں آرام صم فکر مند سی بیٹھی تھیں۔ ”میں نے اسے کئی بار منع کیا ہے مگر وہ ہر بار اس پتھر سے سر پھوڑنے چلی آتی ہے۔“ اضطراب ان کے چہرے کی شکنوں میں نظر آ رہا تھا جیٹ اور نو اسی کی جنگ نے انہیں غمگین کر دیا تھا۔ وہ سیدھا ایمان کے کمرے کی طرف بڑھا اور آوازوں پر چونک کر رک گیا۔

”ایمان بیٹا، میرا یقین کرو میں نے صرف تمہاری خاطر یہ قدم اٹھایا تھا۔ تمہارا مستقبل ستوارنے کے لیے.....“ سیماب بہت لا چاری سے اسے وضاحت دے رہی تھیں۔ مگر وہ کھسور بنی کھڑی رہی۔ ”اپنے مفاد میں مجھے استعمال نہ کریں تو بہتر ہے۔ آپ کو خود اپنی زندگی مجھ سے زیادہ پیاری تھی۔ جبھی تو اتنی جلدی مجھے چھوڑ کر دوسری شادی کر لی آپ نے۔“ وہ سگدلی سے بولی۔

”یہ غلط ہے ایمان، میرے سامنے صرف اور صرف تمہاری بہتری تھی، تم خود مجھے چھوڑ کر یہاں اپنی مرضی سے رہ رہی ہو، تمہارے ڈیڈی کو تمہارے“ میرے ساتھ رہنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ وہ اسے سمجھانے لگیں۔

”مت کہیں اس اجنبی شخص کو میرا ڈیڈی اور پلیز آپ مجھے بھول جائیں، مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ مت آیا کریں یہاں پر..... آپ کی وجہ سے یہاں سب مجھ سے نفرت کرتے ہیں، میرے ڈیڈی تو میرے لیے بہت پہلے مر گئے تھے اب میں ماں کو بھی صبر کر لوں گی اور وہ گھر جہاں آپ رہتی ہیں میرا نہیں آپ کے شوہر کا ہے۔“ وہ نفرت سے بولی۔

”ایمان تم مجھنے کی کوشش تو کرو، یہ سب میں نے تمہارا مستقبل محفوظ کرنے کے لیے ہی کیا ہے، ورنہ میرے تو دونوں ہاتھ خالی تھے۔ کوئی پر اپنی، کوئی بینک بیلنس نہ تھا، جو عزت اپنے گھر کی چھاؤں میں ملتی ہے وہ دوسروں کے در پر نہیں ملتی۔ میں نے انصاف سے شادی صرف اس وجہ سے کی ہے کہ تم دوسروں کے رحم و کرم پر نہ پلو..... انصاف کو بھی تمہارا بہت خیال ہے، تم میری بات پر غور تو کرو۔“ اس کے لاکھ بے رخی برستے کے باوجود وہ اس کے لیے فکر مند تھیں۔

”نہیں کرنی مجھے آپ کے لائے ہوئے کسی بھی شخص سے شادی..... اپنی زندگی تو سیٹ ہو گئی ناں آپ کی، ٹھوکر دوں میں تو آپ نے مجھے رکھ دیا ہے اب پلیز مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔“ وہ انتہائی ترشی اور رکھائی سے بولی۔

اس نئی اطلاع پر عامر بری طرح چونکا۔ یہ نئی اطلاع ابھی ابھی اس کے علم میں آئی تھی۔ لیکن پھپھو کی بچاؤ کی اس سے دیکھی نہ گئی وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ ”ایمان..... یہ کیا حرکت ہے، ماں ہیں وہ تمہاری.....“ اسے بڑا مان تھا کہ اس کی بات وہ مزور سن لے گی۔



بیٹی کے لیے دل ڈنگا تا رہا لیکن کچھ وقت کی آزمائش جان کر اس نے وہ وقت بھی گزار دیا۔

جس وقت اس کی افضال سے شادی ہوئی ایمان دس بارہ سال کی تھی۔ یہ سب کچھ اس کے لیے قطعاً عجیب اور غیر متوقع تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی ماں کسی دوسرے شخص کی بیوی بن کر پرانی ہو جائے گی۔ وہ چپ چاپ خالی آنکھوں سے یہ سب دیکھتی رہی۔ شادی کے شروع دنوں میں جہاں آرا نے مصلحتاً اسے خود ہی سیماب کے پاس نہ بھیجا۔ وہ چاہتی تھیں کہ سیماب اپنے گھر میں سیٹ ہو جائے اور میاں بیوی میں ذہنی ہم آہنگی ہو جائے اور کچھ وقت ایمان کو بھی ذہنی طور پر تیار کرنے کے لیے درکار تھا۔ لیکن ایمان کا ردِ عمل بہت شدید نکلا۔۔۔۔۔ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ ایمان بچی ہے، بھلانے پھسلانے اور سمجھانے سے سمجھ جائے گی لیکن ایمان کی توقعات کو شدید دھچکا لگا تھا۔ پہلے ہی وہ اپنے باپ سے محروم تھی اس نے خود ہی فرض کر لیا کہ وہ اپنی ماں کو بھی کھو چکی ہے، وہ سیماب سے شدید ناراض ہو گئی۔

☆☆☆

”یہ کیا نیا چکر ہے دادو، کیا پھوپھو ایمان کے لیے کوئی رشتہ لائی تھیں؟“ اگلے ہی دن وہ دادو کے پاس پہنچ گیا تھا۔

”یہ سارا ہنگامہ اسی کا تو تھا۔ ارے بھی کب تک وہ اتنی بچی نہیں رہے گی، یوں نہ سکی تو یوں ہی سکی کہ وہ اپنے گھر ہی چلی جائے مگر اس نے تو طوفان کھڑا کر دیا۔“ دادو تو جیسے اسی کی منتظر تھیں کہ وہ آئے تو دل کا غبار نکالیں۔

”تو کیا ضرورت تھی پھوپھو کو اس سے یہ بات کرنے کی۔۔۔۔۔ کیوں اس کے رشتے کے لیے ہلکان ہو رہی ہیں وہ۔۔۔۔۔ کون سا وہ ان کی ہر بات مانتی ہے اور ان کی عزت کرتی ہے۔“ وہ اپنے مطلب کی بات پر جلد ہی آ گیا۔

”سوری مسٹر، یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے، بہتر ہے کہ اس میں تم نہ بولو اور پلیز مسز افضال اب آپ جانتی ہیں۔“ اس نے عامر کو مخاطب کرنے کے بعد افسردہ سی سیماب کو اجنبی لہجے میں مخاطب کیا۔

عامر کو اس سے اس کی سنگ دلی پر بے تحاشا غصہ آیا وہ پھوپھو کو اپنے بازوؤں میں لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

ان کے سب حالات اس کے سامنے تھے۔ وہ مظلوم بھی تھیں اور قابلِ رحم بھی۔۔۔۔۔ جہاں آرا نے اپنی چھوٹی بیٹی سیماب کی شادی بڑے دھوم دھڑ کے سے کی تھی مگر وہ مقدر کی کھوئی تکلیں۔ شادی کے پانچ ماہ بعد ہی ان کے شوہر نے ان پر بد چلتی کا الزام لگا کر انہیں طلاق دے دی۔ سیماب کی جوانی پر داغ لگ گیا۔ وہ ماں بننے والی تھیں۔ واصل یہ تو اس بے غیرت شخص کا ایک بہانہ تھا۔ وہ گھر بسانے والا آدمی ہی نہیں تھا۔ غلط کاموں میں تھا مگر ان لوگوں کو حقیقت پتا نہیں چل سکی۔ ایمان نے اپنی مائیں کے گھر میں ہی جنم لیا۔ اپنا بچپن اور زندگی کے خوب صورت ماہ و سال اس نے سیکنگ گزارے۔ ماموں، خالہ اس پر جان چھڑکتے تھے لیکن سیماب کی بھری جوانی بھی ان سب کے لیے باعثِ تشویش تھی۔ ایک لمبی عمر اسے گزارنی تھی اس طرح تنہا کب تک گزارنی، سیماب تو دوسری شادی کے لیے تیار ہی نہیں ہوتی تھی لیکن آٹھ دس سال گزارنے کے بعد اسے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ اپنا گھر پھر اپنا گھر ہی ہوتا ہے۔ ایک مرد کی سرپرستی بہر حال بہت ضروری ہوتی ہے، سب بھائی بہنوں کے اپنے اپنے گھر آباد تھے۔ سب ہی اس کا بہت خیال رکھتے تھے لیکن کئی مرحلوں پر انہا نے میں ہی اس کی دل آزاری ہوئی تو اسے اپنی بے بسی کا شدید احساس ہوتا۔ اس نے گہرائی میں جا کر غور کیا تو ایمان کا مستقبل کسی گہرے اندھے کنویں کی طرح منہ کھولے نظر آیا۔ افضال کا رشتہ آیا تو اس نے زیادہ چوں چراں نہ کی مگر

”بنا وہ ماں ہے اس کی، وہ نہیں سوچے گی تو کون سوچے گا۔ مجھ بڑھیا میں اتنا دم کہاں ہے کہ اس کی شادی کے لیے ماری، ماری پھروں، افضال بھلا آدمی ہے وہ اسے اپنی سر پرستی دینے پر بھی رضا مند ہے۔ مجھے تو سیما ب کا نکاح اس سے کیا تھا میں نے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ اتنا فساد ڈالے گی، پہلے۔ چوٹی تھی تو چلو میں نے یہ سوچا کہ ابھی اسے سمجھ نہیں ہے مگر اس نے تو ماں سے بیر ہی پال لیا ہے۔ وہ رشتہ بھی افضال کی معرفت آیا ہے لیکن یہ لڑکی..... چچ، چچ.....“ دادو نے دھیرے، دھیرے ساری بات بتادی۔

ان کے بولنے کے دوران وہ بے چینی سے پہلو بدلتا رہا۔ دادو تو ایسے بن رہی تھیں جیسے اس کے اور ان کے درمیان کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔ شاید بڑھاپے میں ان کا حافظہ کمزور ہو گیا ہے۔

”تو دادو آپ بچھو کو میرے بارے میں بتا دیں ناں۔“ ہولے سے کھٹکھٹا کر اس نے ان سے کہا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب اس بات کو منظر عام پر لانے کا موقع آ گیا ہے۔

”اے لو، تم نے خود ہی تو منع کیا تھا کہ ابھی اس بات کو راز رہنے دو اگر سیما ب کو بتا دیجی تو وہ اسی وقت تمہارے لیے حامی بھر لیتی۔ نتیجے سے بڑھ کر کوئی دوسرا کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر ابھی تمہارے اماں، باوا کی طرف سے کوئی سلسلہ شروع نہیں ہوا ان کی رضا مندی کے بغیر یہ بات منہ سے نکالنی غلط ہے اور سیما ب سے تذکرہ کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ وہ افضال سے بھی اس بات کا تذکرہ کر دے گی۔ ابھی ایمان کی مرضی بھی نہیں معلوم..... نہیں بھیجی ایسے نہیں، سب کے علم میں بات لالی جائے گی تبھی کچھ ہوگا ورنہ تمہاری ماں کچھ کم شور نہیں مچائے گی اور میں نہیں چاہتی کہ اس کی زندگی کو مزید عذاب بناؤں۔“ دادو نے بڑی دور اندیشی اور سوچ بوجھ

سے اس کے سامنے حقائق بیان کیے جن پر اس نے ابھی غور نہیں کیا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ آپ امی، ابو سے بات کر لیں اور ایمان سے تو میں خود ہی بات کر لوں گا۔“ اس نے پوری، پوری آمادگی کے ساتھ کہا۔ گزرے دنوں میں وہ ایمان کو پرکھ چکا تھا اور جانتا تھا کہ اپنی محبت سے اس پر اپنا اعتبار قائم کر چکا ہے۔

”نہ بھی! میرے کندھے پر رکھ کر بندوق نہ چلاؤ، میں تو اس کی وجہ سے پہلے ہی بری ہوں کہ اس کی حمایت کر کے اسے سرچڑھا لیا ہے، اب یہ ہوگا کہ زبردستی ہمارے سر لا رہی ہیں، جو بھی کرو خود کرو، چاہے خود ان سے بات کر دیا اپنے کسی چچا یا بچھو کے ذریعے کرواؤ..... میں نہیں بولوں گی خود سے۔“ دادو نے اپنا دامن صاف بچا لیا۔

عامر خنی سوچ میں پڑ گیا، وہ دادو کے کمرے سے باہر آیا تو ایمان اسے لاؤنچ میں ہی مل گئی۔ اسے دیکھا تو بے رخی سے رخ پھیر لیا۔ وہ دو قدم آگے بڑھ کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

”میں نے کیا کہا ہے جو تم مجھ سے بھی ناراض ہو گئیں؟“ اس نے پورے استحقاق سے پوچھا۔ اس کے بیضوی چہرے پر دکھ کی سفیدی سی اڑی اور خفا خفا سے روپ میں خٹکے بین نقوش کچھ اور بھی دلکش لگنے لگے۔

”تم بھی تو انہی کی دکالت کر رہے تھے ناں.....“ وہ ناراضی سے بولی۔

”ایمان وہ ماں ہیں تمہاری..... معاف کر دو انہیں..... انہیں بھی ایک مخلص سہارے کی ضرورت تھی۔ کوئی غلط نہیں کیا انہوں نے، ہمارے مذہب میں تو شوہر کے مرنے کے بعد یا مطلقہ عورت کو دوسری شادی کرنے کی اجازت دی گئی ہے.....“ نرمی سے اسے اس نے قائل کرنا چاہا۔

”بس رہنے دو اپنا یہ لیکچر..... اگر وہ میری ماں ہوتیں تو اتنی خود غرضی کا مظاہرہ نہیں کرتیں۔ انہوں

### بزرگ پالنا

بزرگ پالنا آسان نہیں۔ اہل مغرب ہر جانور پال لیتے ہیں مگر بزرگ پالنے کا ان میں بھی حوصلہ نہیں۔ وہ کہتے شوق سے پالتے ہیں بقول میرے دوست ف۔ ”کتوں کو گھر میں نہیں پالنا چاہیے۔ انسانوں کے ساتھ رہ کر ان کی عادتیں خراب ہو جاتی ہیں وہ مزید کتے ہو جاتے ہیں۔“

یونس بٹ کی شیطانیاں سے اقتباس  
مرسلہ: بابا بلوچ، میر پور خاص

انکار کر دیا، وہ تو اسے پہلے ہی اچھا نہیں سمجھتی تھیں کیا یہ کہ وہ ان کی بہو بن کر ان کے گھر میں دندنا پی پھرنی۔  
”یہ ناممکن ہے۔ قطعاً ناممکن.....“ انہوں نے فیصلہ صادر کر دیا۔

”امی وہ کوئی غیر نہیں ہماری اپنی ہے..... ہماری پھوپھی کی بیٹی ہے، اس کی غلطیوں کو ہم ہی کو درست کرنا ہو گا۔ آپ دیکھیے گا کہ وہ ہم میں کھل کر بالکل صحیح ہو جائے گی۔“ عامر نے انہیں سمجھایا۔

”نہ بابا، جب وہ لڑکی اپنی ماں کو نہیں گردانتی تو ہماری کیا عزت کرے گی حشر نشر کر دے گی سارے گھر کا..... سیما تو اس کے پیچھے خوار ہو کر بیمار پڑ گئی ہے۔ اس دن فون پر بھی بہت رو رہی تھی وہ۔“ وہ تو ایک فیصلہ بھی راضی ہونے کو تیار نہیں تھی۔

”امی، آپ ایمان کو چھوڑ کر اسے اپنے بیٹے کی خواہش سمجھ کر تو غور کریں نا، میں اس کی نادانی اور غلطی کو درست کرنا چاہتا ہوں۔ آہستہ، آہستہ وہ ٹھیک ہو جائے گی اور پھوپھی سے ناراضی بھی ختم ہو جائے گی۔“ اس نے ہر طرح سے انہیں متا نا چاہا مگر ناکام رہا۔

”مجھے ایسی ضدی لڑکی کو اپنی بہو نہیں بنانا.....“

نے صرف اپنا گھر بسالیا۔ اپنی پروا کی..... جب وہ میرے سامنے آتی ہیں تو مجھے لگتا ہے کہ وہ میری ماں نہیں بلکہ کوئی پرانی عورت ہے جو اپنے شوہر کے گھر میں فسی خوشی رہتی ہے۔ ”وہ خود کو زیادہ دیر مضبوط نہ رکھ سکی اور بے اختیار دل کی بات کہہ گئی۔ اس کی اداس آنکھوں میں ستارے چمکنے لگے اور چہرے پر دکھ کی گہری گھنا چھا گئی۔ اس وقت عامر کو وہ بہت مظلوم اور خود ترسی کا شکار لگی۔ وہ اسے اس کیفیت سے جلد سے جلد باہر نکالنا چاہتا تھا اسی لیے اس نے ایمان سے صاف، صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

”اچھا چھوڑو اس بات کو..... یہ بتاؤ کہ اگر میں ساری عمر کے لیے تمہارا ہاتھ تھامنا چاہوں تو انکار تو نہیں کرو گی؟“ بہت اچانک ہی اس نے بڑے سادہ سے انداز میں پوچھ ڈالا اور ایمان نے بری طرح جھینپ کر رخ موڑ لیا۔ دل کے تار بڑے ہو لے سے کسی نے چھوئے تھے۔

”کیا ہوا، کیا میں اتنا ہی برا ہوں کہ دیکھنا بھی گوارا نہیں..... اس کا مطلب ہے کہ تمہیں انکار ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں نے یہ تو نہیں کہا۔“ اس نے جلدی سے اس کی بات نفی کی۔

”اچھا تو تمہیں قبول ہے۔“ وہ ہنس دیا۔ ”تمہیں میرا ساتھ دینا ہو گا ایمان..... ہر حال میں..... ہر طرح سے..... دیکھو ہماری راہ میں بہت رکاوٹیں ہیں۔“ اس نے خاص لہجے میں اسے باور کرایا۔ وہ اسے اس بھنور سے نکال کر ڈھیروں خوشیاں دینا چاہتا تھا اور اس کے اقرار نے عامر کے تن من کو نرم پھوار کے مانند سیراب سا کر دیا۔

آنے والے حالات اچھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ عامر کے منہ سے بات نکلنے کی دیر تھی کہ سارے گھر میں بھونچال سا آگیا۔ منصورہ نے صاف

بس۔" اس کی ہر دلیل کو رد کر کے انہوں نے اپنا قطعی فیصلہ سنا ڈالا۔ اور ان کے ساتھ سب ہی شامل تھے۔ جس نے بھی سنا اس کی بات کی مخالفت کی۔ اس نے باپ کی حمایت چاہی تو انہوں نے بھی معذرت کر لی۔ عامر کو معلوم تھا کہ اسے اسی سخت رد عمل کا سامنا کرنا پڑے گا اس لیے وہ ہر قسم کے امتحان اور صورت حال کے لیے تیار تھا لیکن بات پھیلی تو اس کی لپیٹ میں ایمان بھی آگئی اور سب پہلے سے بھی زیادہ اس کے خلاف ہو گئے۔ سارے گھر میں ایک ناپسندیدہ سی فضا چھا گئی کیونکہ سب کو سیما سے ہمدردی تھی اور ایمان کو وہ سب ہی غلط سمجھتے تھے۔

"عامر تم نے تو مجھے سب کی نظروں سے اور بھی گرا دیا، میں تو پہلے ہی بہت بری تھی۔" وہ عامر سے ملی تو سسک پڑی۔ ان تلخ وترش باتوں نے اسے توڑ ڈالا تھا اور چند ہی روز میں اس کا روپ کھلا گیا تھا۔

"مجھے بھول جاؤ عامر..... میں واقعی اسی قابل نہیں ہوں، میری ماں نے اپنی زندگی سنوار کر مجھے ہمیشہ کے لیے برباد کر دیا ہے، میں واقعی بہت بری ہوں..... بہت بری۔" وہ روئی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا تو اسے لگا جیسے اب سارے دروازے بند ہو گئے، اب کوئی راستہ کبھی نہیں کھلے گا۔ اس بند دروازے نے ایمان کی قسمت اور خوشیوں کو ہمیشہ کے لیے قید کر دیا ہے۔ اس کا جی چاہا کہ اس بند دروازے کو توڑ ڈالے۔

☆☆☆

بالآخر وہ اپنے مشن میں کامیاب ہو گیا..... سب ایک دم ہی راضی ہو گئے۔ جیل احمد نے خود دادو سے عامر اور ایمان کے رشتے کی بات کی، نہ جانے عامر نے اس بار کیا پالیسی اختیار کی تھی کہ وہ سب لوگ مان گئے تھے۔ اسے عامر کے نام کی انگوٹھی پہنا دی گئی۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ معجزہ بھی ہو سکتا ہے۔ آخر یہ سب کیسے ہوا؟ وہ اس سے پوچھ بیٹھی۔

"یہ سب چھوڑو اور اچھی لڑکیوں کی طرح ہیا دیس جانے کی تیاریاں کرو۔" اس کی بات پر وہ شرما کر رہ گئی اور مزید کچھ نہ پوچھ سکی۔

دن ایک دم ہی بہت حسین ہو گئے تھے۔ طبیعت پر چھایا ہوا بوجھل پن رخصت ہوا اور ایک سرشاری سی اس کے پورے وجود میں دوڑ کر اسے شاداب بنارہی تھی لیکن اس روز اس کی ساری خوش فہمی ایک جھماکے سے رخصت ہو گئی۔

"صرف اور صرف سیما کی وجہ سے میں اس جیسی ناخلف اور نافرمان لڑکی کو بہو بنانے کے لیے راضی ہوا ہوں، میری بہن اتنے دکھ سہ چکی ہے کہ اسے مزید دکھ دینا مجھے گوارا نہیں ہوا۔ اسی لیے اس کی بات مجھ سے ٹالی نہیں گئی۔ ورنہ ایمان کے اندر کوئی خوبی نہیں۔" جیل ماموں، ہاتھ کے پاس بیٹھے اپنے دلی جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔

وہ ایک دم ہی آسمان سے زمین پر آگئی۔ وجود میں بھڑکتی چنگاریاں شعلہ بن کر اسے خاکستر کرنے لگیں۔ اسے اپنی نام نہاد ماں کا کوئی احسان لینا گوارا نہیں تھا خواہ اس کے لیے اسے اپنی محبت ہی سے محروم ہونا پڑتا۔ اس کے نزدیک ان کا جرم اتنا بڑا تھا کہ انہیں معاف نہیں کیا جاسکتا تھا۔ صرف ایک لمحہ لگا تھا اسے فیصلہ کرنے میں۔ وہ آندھی طوفان کی طرح اس کے پاس گئی اور انگوٹھی اتار کر اس کے سامنے پھینک دی۔

"نہیں چاہیے مجھے یہ بھیک..... مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس رشتے کے لیے تم نے ان خاتون کو آڑ بنایا ہے جنہیں ہمیشہ اپنی خوشیاں ہی عزیز رہیں، ان کی سفارش پر طے کیے گئے اس رشتے کو میں خود اپنے ہاتھوں ختم کر رہی ہوں۔" وہ انتہاؤں پر جا چکی تھی۔

"ریلیکس ایمان..... آرام سے میری بات



## مصبت رنگ ہے ایسا

اس کی صدا نے دور تک اس کا پیچھا کیا مگر اس نے مڑ کر نہ دیکھا۔

اس نے تو عامر کی بھی آنکھوں اور دھواں، دھواں چہرے کو بھی نہ دیکھا۔ محبت اس کے لیے روگ بن گئی تھی۔ وہ لڑکی اسے زخم دے گئی تھی۔

پھر سب کچھ بہت جلدی میں ہوا..... اس کی ضد کوئی نہ توڑ سکا۔ منصورہ کے توسط سے آنے والے ایک قابل قبول رشتے کو اس کی رضا مندی کے بعد قبول کر لیا گیا۔ وہ ساری یادوں، باتوں اور عامر کے ٹوٹے دل کی خواہشوں کو اپنے حنائی قدموں تلے روندتی ہوئی بڑی سنگدلی سے چل دی۔ پیچھے صرف اڑتے غبار کی دھول رہ گئی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ جرمنی چلی گئی تھی اور عامر بھی دل برداشتہ ہو کر ملک سے باہر چلا گیا۔



اب سات سال بعد وقت نے اسے پھر اسی دلہیز پر لا کھڑا کیا تھا جہاں سے وہ چلی تھی۔ ایک گہرا حزن اس کی شخصیت پر چھایا ہوا تھا..... وقت نے اس کی سوچ، فکر اور شعور کو گہرائی بخشی تھی اور اس اور اک نے اسے اذیت سے ہٹا کر رکھا تھا۔ ہار سنکار کے درخت تلے کھڑی وہ کسی کو ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ بے قرار سراپا جو اس کے لیے دیوانہ وار وہاں آیا کرتا تھا اور اب ماں کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

یہ گھریہ دیوار دور جہاں اس نے ایک مہر بسر کی تھی اسے اب پرانے لگ رہے تھے کیونکہ اب وہاں بھی اس کے لیے وہ گنجائش نظر نہیں آرہی تھی۔ فہد کی حادثاتی موت نے اسے بڑے عجیب حالات سے دوچار کر دیا تھا۔ مشکل دنوں میں فہد کی جائداد ٹھکانے لگ گئی تھی اور اس کی وفات کے بعد اس کا کاروبار اس کے بزنس پارٹنر نے ہڑپ کر لیا تھا۔ اس کے پاس زندگی بسر کرنے کو کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اسے

سنو۔ وہ اسے پکارتے لگا۔

”مجھے کچھ نہیں سنا.....“ وہ سخت لہجے میں بولی۔

”ایمان یہ حقیقی زندگی ہے، کوئی اسٹیج ڈراما نہیں ہے۔ آخر تم حقیقتوں کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ تم نے میری محبت کو جھٹلانے کے بارے میں سوچا بھی کیسے؟ پھوپھی تم سے بہت محبت کرتی ہیں اسی لیے انہوں نے میری خواہش پر ابو سے تمہارے رشتے کی سفارش کی ہے۔“ اس نے اسے سمجھانا چاہا۔

”یہ محبتوں کے ڈھونگ میں خوب جانتی ہوں، جب اپنا مفاد ہو تو لوگ محبتوں کو بھی بدل لیتے ہیں۔“ وہ انتہائی تنفر سے بولی۔

”شفت، اپ ایمان، بہت سن لیں میں نے تمہاری الٹی باتیں، ختم کرو اس خود ترسی کو جس میں تم جی رہی ہو اور اپنے ساتھ سب کی زندگی عذاب بنارہی ہو، ہزاروں بچوں کے ماں، باپ دوسری شادی کرتے ہیں مگر کبھی کوئی تمہاری طرح ری ایکٹ نہیں کرتا۔ افضال انکل کی سگی بیٹیاں تک سیما ب پھوپھی کو اتنی عزت اور احترام دیتی ہیں اور تم ان کے ساتھ کیسا سلوک کر رہی ہو جبکہ افضال انکل کھلے دل سے تمہیں قبول کرنے کو تیار ہیں۔ مگر تم بہت کم ظرف اور تنگ دل ہو اسی لیے آج اکیلی ہو۔“ اس نے ترش لہجے میں اسے حقیقت کا تلخ آئینہ دکھا ڈالا۔ وہ کچھ دیر ششدری سے دیکھتی رہی جیسے اس کے بدلے ہوئے لہجے پر اسے صدمہ ہو رہا ہو۔

”ہاں، میں کم ظرف ہوں، بہت بری ہوں اس لیے مجھے چھوڑ دو۔ مجھے ایسی ماں کی محبت اور سفارش کی کوئی ضرورت نہیں جسے اپنا گھر بسانے سے مطلب ہو۔“ وہ پوری شدت سے چلائی اور ایک جھٹکے سے مڑ کر واپس چلی گئی۔

”تم اچھا نہیں کر رہی ہو ایمان..... محبتوں کو کبھی ٹھکرایا نہیں کرتے..... ورنہ پچھتانا پڑتا ہے۔“

شدت سے اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ اس کی ماں سیماب نے بھی کن حالات میں اور کس وجہ سے شادی کی تھی۔ ان چند سالوں میں اس کا سارا غرور، غصہ اور خناس نکل چکا تھا اب وہ ایک باری ہوئی اور ٹوٹی ہوئی شکستہ حال اسی راہ پر کھڑی تھی جس پر بھی اس کی ماں کھڑی ہوئی تھی۔

برسوں بعد وہ ماں کے درو سے آشنا ہوئی تھی لیکن اس سے اسی قدر شرمسار بھی تھی۔ اپنی نفرت اور غصے میں اس نے بھی ماں کے دکھ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”محبتوں کو کبھی ٹھکرایا نہیں کرتے ایمان، ورنہ پچھتانا پڑتا ہے۔“ عامر کی صدا کی بازگشت بڑی شدت سے اس کی سماعت میں گونج رہی تھی۔

اسی وقت ایک ہمدرد لمس اس کے شانے پر آٹھرا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا تو سامنے کھڑی کمزور اور خستہ حال سی ماں کو دیکھ کر اس کا سارا وجود بھر بھری ریت کے مانند ٹکھرنے لگا۔ ایک لمبے عرصے کی تنہائی اس کے سارے وجود میں اتر آئی۔ وہ کسی محروم ننھے بچے کے مانند اس کی آغوش میں سمٹ کر رو پڑی۔

”مجھے معاف کر دیں ای..... مجھے معاف کر دیں۔“ وہ زار زار رو رہی تھی۔

”میں تو تم سے کبھی ناراض ہی نہیں رہی میری جان..... میں تو تمہارے لیے دعا کرتی رہتی تھی۔“ ممتا نے دل کھول کر اسے خود میں سمالیا۔

زندگی نے کایا پلٹ لی تھی۔ وہ اپنی ماں سے راضی ہو گئی تھی لیکن ایک بے سکونی اور کسک اسے چھین نہیں لینے دے رہی تھی۔ زندگی میں اس نے بے شمار غلطیاں کی تھیں مگر عامر کا دل دکھا کر وہ خود بھی تو خوش نہیں رہی تھی۔ عامر تو ایسا ملک سے باہر گیا تھا کہ پلٹا ہی نہیں تھا۔ منصورہ تو ترس گئی تھیں اس کے لیے۔ لیکن سیماب کے بلانے پر وہ فوراً ہی دوڑا ہوا

آگیا۔ اور سیماب کی انوکھی سی خواہش نے ایمان کو ایک بار پھر بے چین کر دیا۔ سیماب چاہتی تھیں کہ ایمان، عامر سے شادی کر لے لیکن وہ خود کو اس قابل نہیں سمجھتی تھی۔

”نہیں امی، مجھے کوئی حق نہیں کہ میں اپنی زندگی گزارنے کے لیے کوئی سہارا اپناؤں، ساری عمر میں آپ کو کہتی رہی..... میں کتنی خود غرض اور بے وقوف تھی اتنی سی بات بھی نہ سمجھی کہ یہ سہارے ہر عورت کے لیے معتبر ہوتے ہیں۔“ اس کے آنسو نکل پڑے۔

خود احتسابی کے عمل سے گزرنے کے بعد اس کے پاس سوائے شرمندگی اور پچھتاوے کے کچھ نہیں تھا۔ اب تک وہ محبتوں کو ٹھکراتی ہی آئی تھی اسی لیے اس نے سیماب کو سختی سے منع کر دیا لیکن عامر کے دل میں اس کے لیے اب بھی وہی محبت اور جذبہ موجود تھا۔ محبت میں ناکامی کے بعد وہ خود بھی اس ملک میں نہیں ٹھہرا تھا اور اب تو منصورہ بھی رضامند تھیں کہ کسی بھی طریقے سے انہیں بیٹے کی خوشیاں لوٹائی جائیں۔ لیکن ایمان خود کو عامر کے قابل نہیں سمجھتی تھی۔

”بچھے اندازہ ہے ایمان..... کہ تمہاری شرمندگی تم سے ایسا کروا رہی ہے لیکن انسان اپنی غلطیوں سے ہی سبق سیکھتا ہے جو غلطی تم پہلے کر چکی ہو اسے دوبارہ نہ گہراؤ۔ تمہاری بیٹی رطاب ابھی بہت چھوٹی ہے وہ ہم دونوں کے ساتھ یقیناً خوش رہے گی۔ مان لو کہ تمہیں میری ضرورت ہے۔“ ماں کی زبانی اس کا احوال سن کر وہ فوراً ہی آیا تھا اور اس کو محفوظ مستقبل کا یقین دلارہا تھا۔

اس سے ایمان کی آنکھیں تشکر کے موتی اور محبت کی چمک سے لبریز ہو گئیں۔ محبت کو ٹھکرانے کی غلطی وہ اب دوبارہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ زندگی کی حقیقتوں کو سمجھ کر وہ محبت کے سچے رنگوں کو پہچان گئی تھی۔



# ایسی جان

اور جسدِ عقیل



اماں کی ایک منہ بولی بہن کے ساتھ گھر آئیں، بڑی  
گریس فل اور مشفق سی لگیں۔ بہت بردبار اور محبت  
سے گندھا ہوا نرم لہجہ تھا ان کا..... اب تک جتنی بھی  
خواتین اس سلسلے میں آتی رہی تھیں یہ ان سے ذرا

ہماری معافی ہوئی تو دل نے خوشی سے بڑی  
اچھل کود مچائی کہ لو بھی آج ہم بھی اس قابل ہو گئے  
کہ کسی نے پسند کیا۔ ہوا یہ کہ ایک دن معمول کے  
مطابق یہ خاتون میری ہونے والی ساس... ہماری

مختلف سی لگیں۔ والدہ سے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے سادہ سی چائے پیش کی، ہمارے گھر میں اس زمانے میں فرشی نشست ہوا کرتی تھی، اس لیے ان کے آگے دسترخوان بچھا کر تمام چیزیں جن دی گئیں۔ ویسے سلیقہ سارا ہماری والدہ کا ہی تھا کیونکہ ان کے ہاتھ کے بنائے چھوٹے اور وہی بڑوں نے دسترخوان کو سجا دیا تھا۔ میں تو بس چائے وغیرہ ہی بنا کر دے رہی تھی۔

اس سے پہلے کے تجربات خاصے دلچسپ تھے۔ بعض خواتین کا اصرار ہوتا تھا کہ لڑکی پڑھی لکھی ہے یا مزید پڑھنا چاہتی ہے تو کیا ہوا آخر ہے تو لڑکی ذات ہی ناں..... لڑکے کے کاروبار کو دیکھنا چاہیے، چاہے وہ دسویں پاس ہی ہو مگر اس کا تجربہ اور کچھ بوجھ زیادہ ہوتی ہے۔ ایک صاحبہ کا خیال تھا کہ یہ آپ کی لڑکی کی گردن میں کیا ہے، کچھ عجیب سی لکٹی ہے۔ گویا کچھ کو اگر ہم نے رینجیکٹ کیا تو کچھ نے ہم کو چھوڑا۔

میں اس ساری ایکسرسائز سے خاصی پریشان تھی، مگر گو اتنی نہ تھی مگر لوگوں کے خیال میں نکلی جا رہی تھی۔ کچھ لوگ تو باقاعدہ رحم اور ہمدردی کی نظر سے مجھے دیکھتے تھے تو کچھ کے خیال میں ہمارے والدین کی عقل شعیانگی تھی کہ ہر رشتے میں ”نی“ نکال دیتے ہیں۔

ایسے میں یہ خاتون، ان کی گفتگو، سادگی اور خاندانی پس منظر نے ہم سب کو بہت اچل کیا..... ان کے جانے کے بعد پھر ہم سب اپنے، اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ دو، تین دن کے بعد وہی امی کی منہ بولی بہن کا فون آیا اور انہوں نے کہا کہ وہ لوگ پیام لے کر آنا چاہتے ہیں۔ یوں یہ رشتہ جھٹ پٹ طے بھی ہو گیا۔ بہر حال سال بھر کا عرصہ..... ہمیں انہیں سمجھنے یا دوسرے لفظوں میں شادی کی تیاری کے سلسلے میں لگا۔ اس دوران بہت

سے خدشات اور نت نئے خوف سر پر سوار رہے، ایک دفعہ تو میں نے والدہ صاحبہ سے یہی سوال کر ڈالا کہ اگر مجھے ان کے ہاں سب کے ساتھ یعنی بھرے بھرے خاندان میں رہنا پڑا تو کیا میں گزارہ کر لوں گی؟ ہماری والدہ بھی آخر والدہ ہی تھیں کہنے لگیں۔

”یہی تو تمہارا امتحان ہوگا..... شادی کا بندھن صرف ایک شخص کے ساتھ نہیں بلکہ اس کے سارے خاندان کے ساتھ بندھتا ہے اگر تم اپنے دل میں گنجائش پیدا کر دو گی تو وہ سب بھی تمہارے لیے سراپا محبت ہو جائیں گے۔“ اس کے آگے نہ کچھ کہنے کی گنجائش تھی نہ سننے کی، گویا ساری ذمے داری میرے ماتواں کندھوں پر تھی۔ ”اگر میں صحیح سوچوں اور صحیح کروں تو ٹھیک در نہ.....“ میری نیند مجھ سے روٹھ گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ساری ذمے داریاں اور اچھائیاں جن کی لوگ مجھ سے امید کر رہے ہیں وہ میرے اندر ہیں بھی یا نہیں؟

”اپنا گھر چھوٹ جائے گا تو کیا ایک اچھی جگہ پر دل لگ جائے گا؟ وہاں کیا مجھے اپنی مرضی کے مطابق جینے کی اجازت ہوگی یا میں بھی ان بے شمار ”پچکی“ ہوئی لڑکیوں میں سے ایک ہو جاؤں گی۔ جنہیں دیکھ کر دل کہتا ہے کہ اس زندگی سے تو وہ زندگی ہی بھلی تھی۔“

☆☆☆

نئے گھر میں آکر سب سے خوشگوار بات تو یہ تھی کہ ان کی طرح ان کے سارے رشتے دار بھی بہت محبت اور چاہتوں کے ساتھ آؤ بھگت کر رہے تھے۔ کچھ ذرا خوف کم ہوا..... دل کو سکون بھی آیا..... چونکہ ماحول کا فرق بہت تھا اس لیے بہت سی باتوں پر حیرانی شاید میرے چہرے پر نظر آ جاتی تھی۔ آپا (ان کی بڑی بہن) اس کر کہنے لگیں۔

”گلتا ہے بیجاری ہرنی پکڑی گئی ہے۔ حیرانی



# رنگت نکھرے گی تو اب نکھری ہی رہے گی!

## ٹپ ٹریٹمنٹس

ٹی ٹی کی ٹپ ٹریٹمنٹس کو لیموں کی صورت میں کھائی جاتی ہے۔  
 سے رنگت کو نکھار دیتی ہے۔ اس کے ۱۵ روز استعمال سے  
 ہے اور ساتھ ہی چہرے کے داغ و بچہ آنکھوں کے گرد  
 جاتی ہیں۔ غواٹھن کے ساتھ ساتھ ہموار دل کے لئے نکھار  
 کر دہن اور کھینچنے پر بھی لگائی جاتی ہے۔

www.facebook.com/top.treatments

### چھوٹے قد والے دل چھوٹا نہ کریں!!

## گروٹال

ٹی ٹی کی گروٹال ایک ہومیو پیتھک دوا ہے جو معر اثرات سے پاک ہے۔ اس میں شمال  
 اجزاء انسانی جسم میں، سونا ٹروپین (نشوونما کا ہارمون) کی پیداوار میں اضافہ کرتے ہیں جس سے  
 ہڈیوں اور ڈھانچے کو تقویت ملتی ہے اور ان کے بڑھنے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اس کے  
 استعمال سے ہر دوا شخص جس کی عمر 30 سال سے کم ہے اپنے قدمیں ممکنہ اضافہ کر سکتا ہے۔

بگ آؤٹ کے بعد 30 سال سے کم ہے تو



ملک بھر کے بہترین میڈیکل سنٹر، ہومیو پیتھک سنٹر اور دوا خانے پر دستیاب

042-35789145&6, 0334-4266255

Email: toptreatments@gmail.com, Website: www.toptreatments.net

نیلے کی صورت میں یا حریہ  
 معلومات حاصل کرنے کے لیے

II

سے بڑی بڑی آنکھیں کھولے ہر طرف ایسے دیکھتی ہے جیسے سچ سچ کھوئی ہو۔" یہ ان کا انداز تھا compliment دینے کا۔

گھر میں ہم چند ہی افراد تھے امی جان اور ہم دونوں اور بڑے بھائی، ان کی نیگم اور بیٹا۔ رشتے دار اکثر آتے رہتے، اکثر لوگ کئی کئی دن رہ جاتے۔ ہفتے بھر بعد ہی میں نے میٹھا بنایا اور گویا یہ طے کر دیا گیا کہ گھر کے کاموں میں حصہ لینے کی ذمہ داری بھی میرے ناتواں کندھوں پر آ پڑی ہے۔

ایسے میں جب میں تنہا ہوتی، گھر کے کام سارے پنٹ چکے ہوتے تو پھر اپنے بھی سارے کام خود ہی کرنے ہوتے، ٹھکن سے برا حال ہوتا اور چپکے چپکے آنسو بہتے رہتے اور خیال وہیں بھٹکتا رہتا۔ اماں، ابا کے آس پاس، ان کے لاڈ پیار، شفقت صورتیں بار بار نگاہوں کے سامنے آ جاتیں، تصور کی فلم متواتر چلتی رہتی جس کا خاتمہ عموماً والدہ کے اس جملہ پر ہوتا۔ "یہی تو تمہارا امتحان ہے۔"

ایسے میں میری پیاری امی جان (ساس) کی ہستی میرے لیے بڑی دلجوئی کا سبب ہوتی۔ اکثر میں اپنے کام میں مصروف ہوتی تو وہ میرے پاس آ کر کھڑی ہو جاتیں اور خاموشی سے مجھے کام میں لگے دیکھتی رہتیں۔ میں ذرا سی دیر کو ان کے پاس آ کر بیٹھنے کی کوشش کرتی اور وہ کوئی نہ کوئی ادھر ادھر کا قصہ چھیڑ دیتی، ان کا دھیمہ شفقت بھرا لہجہ، مسکراتا چہرہ مجھے ہر لمحہ تسلی دیتا رہتا کہ میرے پاس میری اماں نہیں تو کیا ہوا، اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک اور بے غرض اور شفقت ماں سے نوازا دیا ہے۔

صبح کے وقت ناشتے کے بعد اکثر میں کوئی اپنی پسندیدہ کتاب لے کر بیٹھ جاتی اور اس میں سے دلچسپ حصے پڑھ کر انہیں سناتی، وہ بہت لطف اندوز ہوتی تھیں اور پھر ہم اکثر کہانی کے کرداروں پر رائے

زنی کیا کرتے، اس کے بعد میرے روزمرہ کے کام، معمول کے مطابق شروع ہو جاتے۔

دو سال بعد جب ایک ننھی سی گڑیا میری گود میں آئی تو امی جان کچھ اور کمزور ہو چکی تھیں مگر انہوں نے بچی کی جو خوش منائی وہ مجھے آج تک یاد ہے۔ تین چار ماہ کی طیبہ کو جو خوب گل تھوٹھنی سی تھی وہ اپنے ہاتھوں سے اچھالتے نہ ٹھکسیں اور کیسے، کیسے میٹھے بول اس کے کانوں میں انڈیلتیں۔ (آج طیبہ اور اس کی بہن وہی پیارے، پیارے گیت اپنے بچوں کو گا کر سناتی ہیں) میں چپکے، چپکے مسکرائے جانی اور اللہ کا شکر ہر وقت زبان پر ہوتا۔

"یا اللہ تیرا کرم تو نے میری گڑیا سی بیٹی کو اتنی محبت والی ہستی عطا کی اور یہ خوش نصیب ہے جو یہ کمزور اور ضعیف ہاتھ اس کے نازاٹھا رہے ہیں۔" تین سال اور چپکے سے سرک گئے، پتا ہی نہیں چلا اور طیبہ بی بی اسکول جانے لگیں، ان کی فرمائش تھی کہ انہیں بھائی یا بہن چاہیے۔ اور جب میں نے امی جان کو پھر خوش خبری دی تو انہوں نے حسب توقع بڑی سرت کا اظہار کیا اور دعائیں تو بے شمار۔ کچھ دن بعد میں ایسے ہی بیٹھی ان سے باتیں کر رہی تھیں تو میں نے اپنی الجھن کا اظہار کیا۔

"امی جان، مجھے بڑی فکر ہوتی ہے اگر اس بار بھی لڑکی ہوئی تو.....؟" وہ جیسے چونک گئیں۔

"یہ تم نے کیا کہا.....؟ ارے لڑکی ہو یا لڑکا..... اللہ کی نعمت ہے، تم نے بھلی فکر کی..... لوگ تو اولاد کو ترستے ہیں، ہمارے اوپر تو اللہ کا خاص کرم ہے۔" میری حساس طبیعت کو جیسے پھر حوصلہ ملا.....

اور واقعی اس بار پھر ایک پیاری سی، نازک گڑیا جیسی بیٹی سے اللہ نے مجھے نوازا..... اتنی نازک اور سندر سی بہن کو پا کر طیبہ بی بی بھی آپا کے درجے پر فائز ہو گئی تھیں اور ان کا پاؤں زمین پر خوشی سے ٹکنا نہیں تھا۔ امی جان کے ہاتھوں بھی واقعی ایک اور کھلوٹا آ گیا

سال بھر بعد اللہ کا کرم ہوا اور میں پھر اسپتال میں تھی اور اس دفعہ ”بھائی“ کی آمد کا سب کو انتظار تھا۔ امی جان اور والدہ دونوں ضعیفی کی وجہ سے اسپتال تو نہ آسکیں مگر طیبہ اور شیبہ اپنے بلوا دیہی کے ساتھ روز شام کو منے بھائی کو دیکھنے پہنچی ہوتی تھیں۔ اسپتال سے چھٹی ملی تو پہلے امی جان کے پاس گئی وہ مجسم شفقت اور انتظار تھیں۔ میں نے منے کو ان کی گود میں دیا تو انہوں نے جلدی سے نوکر کو دوڑایا، مٹھائی لانے کو۔ بچے کو پیار سے چمنائے ہوئے کافی دیر تک بیٹھی رہیں۔

”اب آپ تھک گئی ہوں گی، لائیں میں لے لوں۔“ میں نے کہا۔

”بس یہ میرا ہے۔“ انہوں نے جیسے اسے سینے میں بھر لیا اور چمٹا کر بولیں۔

”ضرور۔۔۔“ میں نے کہا اور میرا دل ایک مرتبہ پھر تشکر اور اطمینان سے جیسے بھر گیا تھا۔

”اللہ میاں! میں اس قابل کہاں کہ میرے یہ ننھے منے اور میں محبت کی اتنی دولت سے نوازا جاتا ہوں، مالک حیرا بہت، بہت کرم ہے۔“

لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ امی جان شاید پوتے کا ہی انتظار کر رہی تھیں۔ منے کی پیدائش کے بعد کوئی چھ ماہ ہی گزرے تھے کہ ضعیفی اور بیماری نے ان کی مہلت ختم کر دی اور وہ میری پیاری ہستی جو اپنی شفقتوں اور چاہتوں سے ہماری پور، پور بھگوائے رکھتی جو ہمارے لیے ایک گھنے درخت کے مانند تھی ہم سے رخصت ہو گئیں۔

وہ اب ہمارے پاس نہیں مگر ان کی چیدہ، چیدہ باتیں اور صبر، میرے عزیزوں، رشتے داروں سے ان کا حسن سلوک ہر وقت یاد آتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ اللہ پاک ہمیں بھی اور ہمارے بچوں کو بھی ان کے جیسا بنا دے۔ (الہی آمین)

تھا۔ اب تک میری نظروں سے وہ منظر فراموش نہیں ہوتا جب وہ تین چار ماہ کی شیبہ کو اچھال کر گدگدائیں اور شیبہ کھلکھلا کر ایک قلقاری مارتی۔

سال تو دیکھتے، دیکھتے گزر گئے۔ شیبہ کی قلقاریوں اور طیبہ کی پیاری، پیاری باتیں زندگی گزارنے کا حوصلہ دے جاتیں، اللہ تعالیٰ کا کتنا کرم تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کو کس قدر انجوائے کرتی رہیں۔ طیبہ بیگم تو باقاعدہ بیٹھ کر امی جان سے کہانی کی فرمائش کرتی تھیں اور شیبہ بھی ان کے ساتھ بڑے مدبرانہ انداز میں بیٹھی ہوتی۔

اب کچھ دنوں سے ایک اور بات سننے میں آنے لگی تھی۔ اصل میں طیبہ کی ایک سہیلی کے ہاں

بھائی آیا تو ہمارے ہاں بھی یہ خبر بڑی دلچسپی سے سنی گئی۔ اس نے گھر آ کر شیبہ کو بتایا اور چند دن بعد ہی

”منہ بھائی“ کی فرمائش دونوں کی زبان پر تھی۔

”امی اگر ہمارا ایک منہ سا بھائی بھی ہو تو کتنا مزہ آئے۔“ طیبہ کہتی۔

”ہاں، تم امی کی ہیلپ تو کرتی نہیں ہو، منہ بھائی بھی آگیا تو اتنا کام کون کرے گا۔“ میں جواب میں کہتی۔

”میں اور شیبہ کریں گے ناں آپ کی ہیلپ۔“ وہ اپنی ننھی منی بانہیں میرے گلے میں ڈال کر بڑے لڑنے سے کہتی۔

”یہ کیسے ہیلپ کرے گی، اتنی ذرا سی تو ہے۔“

”امی، بھائی کے آنے تک یہ بھی بڑی ہو جائے گی۔“ وہ کہتی۔ اور ایک دن تو بڑا ہی لطف

آیا میں نے کمرے میں جھانکا تو دیکھا دونوں اپنی چھوٹی سی جانماز فرش پر بچھائے، میرے اسٹائل میں

اپنی دو پنیاں اوڑھے بیٹھی ہیں اور ہاتھ پھیلا کر دعا مانگ رہی ہیں، یہ سین تو میں نے فوراً محفوظ کر لیا

کمرے میں۔ بچوں کو یوں دعا مانگتے دیکھ کر بے انتہا پیار آیا۔



مکمل ناول

بے نقاب

اسمیر وفا

زمزم پبلشرز

تیسرا حصہ

پہلی صبح ہی اتنی خوشگوار تھی، اٹھ کر آیا تو اسے یقین ہی نہیں آیا۔ مکن کا ماحول بہت خوشگوار تھا۔ دانیہ ڈاننگ نیبل پر تاشے کے لوازمات رکھتی بہت بھلی لگ رہی تھی۔ آبی چوڑھے کے سامنے کھڑی تھیں اور آٹھ

بنارہی تھیں مکن، گولڈی اس کے ساتھ، ساتھ گھوم کر بار، بار اسے متوجہ کر رہے تھے۔ اپنی، اپنی پسند بتانے میں دونوں ہی ایک دوسرے سے سبقت لے جانا چاہتے تھے۔





”چاچی..... میں تو فلیور ملک لیتا ہوں، گولڈی کو بلک اچھائی نہیں لگتا.....“ سنی نے یقیناً اس کے سوال کا جواب دیا تھا۔

”گولڈی کو بھی ملک اچھالے گولڈی کو معلوم ہے دودھ پینے سے یون اسٹرونگ ہوتی ہیں، ہائٹ بڑھتی ہے اور بازی میں جراثیم سے قائل کرنے کی طاقت بڑھتی ہے۔“ وانیہ نے گولڈی کو بازوؤں سے اٹھا کر کرسی پر بٹھا کر سمجھایا۔ ”اب گولڈی بھی ملک لے گی ناں.....“ وانیہ جیسے ہی فریج سے دودھ کا ڈبا نکالنے لگی دروازے میں کھڑی مٹی کو دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گئی۔

”میں بھی یہی سمجھاتی ہوں..... مگر بیجے سمجھیں بھی اچھا اب تم بھی بیٹھو میں دیکھتی ہوں عصمی اور نانو ابھی تک کیوں نہیں آئیں..... بلکہ مٹی کو بھی... جھگڑاتی.....“ آپلی بھی مٹی کو دیکھ کر حیران ہوئیں۔ ”واہ وانیہ تم نے تو ایک دن میں اس کی عادت بدل دی۔“

”ہاں تو دیکھ لیں، آپ کی تندگئی ظالم نکلی..... صاف کہہ دیا، پہلی آواز پر نہ اٹھا تو ناشتا نہیں ملا کرے گا۔“ مٹی کی مصنوعی سنجیدگی پر وانیہ نے بھی حیرت سے دیکھا۔ اس نے ایسا کب کہا تھا۔

”ہاں، تم ایسے ہی سیدھے ہونا..... مٹی کے کہے میں آنے والے۔“ نانو اور عصمی بھی اندر آ رہی تھیں۔

”السلام علیکم..... نانو.....“ وانیہ فوراً ان کی طرف بڑھی۔

”وعلیکم السلام..... جیتی رہو، آباد رہو..... یہ کیا پہلے دن ہی مکن میں لگ گئیں۔ کچھ دن تو آرام سے رہیں۔“

”نانو میں نے بھی منع کیا تھا مگر اسے تو کام میں سکون ملتا ہے، مجھ سے پہلے ہی مکن میں آگئی تھی۔“ آپلی نے بھی ہنستے ہوئے جیسے شکایتی انداز میں کہا۔

”یہ آپلی اچھی بات نہیں ہے کہ گھر والی نے گھر کی ذمہ داری سمجھ لی۔ آپ بھی یہی تو چاہتے تھے، مھنگس گاڈ اب میں سارے الزامات سے بری ہو جاؤں گا۔ آئی ہو اب گھر کے کسی معاملے میں مجھے شکایتیں

نہیں سننی پڑیں گی۔“ مٹی اپنے فطری غیر سنجیدہ انداز میں بولتا ڈانٹنگ ٹینل کے پاس گھڑا ہوا۔ آپلی اس کے بولنے پر اسے گھور رہی تھیں جبکہ نانو مسکرا رہی تھیں۔ مٹی کی ہشاشت اس بات کا پتا دے رہی تھی کہ وہ وانیہ کو ذہنی و قلبی طور پر قبول کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

”بھائی..... سنی، گولڈی کی شکایتیں تو پھر بھی آپ کو ہی سننی پڑیں گی..... اُف تو بہ صبح دونوں نے چیخ کرتے ہوئے مجھے جتنا تنگ کیا ہے، میں بتا نہیں سکتی..... یہ دونوں صرف آپ ہی کی سنتے ہیں۔“ عصمی نے نانو کی ڈھیل چیئر میز کے قریب لگاتے ہوئے اسے اس کی بات کا جواب دیا تو مٹی نے دونوں کو پکڑ کر پوچھا۔

”اچھے، بیجے پھوپھو تنگ کرتے ہیں؟“

”نہیں چاچو، پھوپھو تنگ کرتی ہیں ہمیں..... ہے ناں گولڈی۔“ سنی نے تائید مانگی تو گولڈی بھی سر ہلا کر کہنے لگی۔

”ہاں..... پھوپھو نے مجھے آپ سے روم میں جانے نہیں دیا۔“

”میں نے اس لیے روکا تھا تم دانت برش نہیں کر رہی تھیں۔“ عصمی نے اسے یاد دلایا۔ آپلی کو پتا تھا اب ایک لمبی بحث چھڑنے والی ہے اس لیے انہوں نے درمیان میں ہی ٹوکا۔

”بس باقی باتیں بعد میں..... ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے، وانیہ تم بھی اب بیٹھ جاؤ۔ آئندہ دنوں میں تو تمہیں ہی سب کچھ کرنا ہے۔“

☆☆☆

آپلی، مٹی کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی اس کے دن ہونے والے ویسے کے انتظامات کے بارے میں بات چیت کر رہی تھیں۔ باتوں کے دوران آپلی نے اچانک ہی موضوع بدلادیا وہ چونک اٹھا۔

”تم نے وانیہ کو رونمائی میں کیا تحفہ دیا؟“

”رونمائی..... تحفہ.....“ وہ تجالت سے سر کھانے لگی۔ اپنی عجیب کیفیت و احساس کے باعث وہ وانیہ کے

مخاطب کیا۔

”وانیہ..... کل مجھ سے ایک غلطی ہو گئی..... بندہ بشر ہوں بھول چوک ہو سکتی ہے، ہو سکتی ہے ناں.....؟ وہ اس کے سامنے بیٹھا پوچھ رہا تھا اور وانیہ اس کے تاثرات سے پریشان ہونے لگی۔

”ایک بھول ہو گئی..... اور تم نے آپا سے میری شکایت کر دی؟“

”میں نے..... شکایت..... نہیں تو..... میں نے بھابی جان سے کچھ نہیں کہا۔“ وہ شیشا کر بولی۔

”تمہیں شاید معلوم نہیں، تمہیں نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہنے کا فن آتا ہے۔“ مٹی اس کی بوکھلاہٹ سے حلق اٹھا رہا تھا۔

”میرا یقین کریں..... میں نے ان سے کچھ نہیں کہا اور مجھے تو معلوم بھی نہیں ہے کہ آپ کس بارے میں کہہ رہے ہیں۔ صبح سب کی رونمن جاننے سے زیادہ میں نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔“ وہ آنکھوں کی نمی کے ساتھ دیکھتی اپنی طرف سے صفائی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ گہرے اور ہلکے گلابی رنگ کے امتزاج سے بنے ہاتھ کی کڑھائی کے دوپٹے کا ہالہ اس کے چہرے کی ملاحات میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔

”تو پھر انہیں کس نے بتایا کہ میں نے تمہیں رونمائی کا تحفہ نہیں دیا؟“

”ج..... کی..... میں نے نہیں بتایا۔ میرا یقین کریں..... میں ان سے یہ بات کہہ کر خود ہی شرمندہ ہوئی..... آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں نے انہیں..... اس کی آنکھیں ٹپ، ٹپ برسنے لگیں تو ثعلب کو احساس ہوا کہ معاملہ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گیا ہے، ایک دم تاثر بدل کر بولنے لگا۔

”listen وانیہ..... پلیز رونا نہیں..... مجھے یقین ہے تم نے ان سے کچھ نہیں کہا..... انہیں ہی میری جاسوسی کی عادت ہے، میں تو ایسے ہی مذاق کر رہا تھا۔ اوسے، میری طرف دیکھو.....“ ثعلب نے زبردستی ٹھوڑی اوپر کر کے اسے دیکھنے پر مجبور کیا۔

لیے کچھ بھی نہیں ملے پایا تھا اور نہ وانیہ نے اسے احساس دلایا تھا کہ یہ بھی رسم دنیا ہے۔

”تم نے اسے رونمائی میں کچھ بھی نہیں دیا.....؟“ آپا سنجیدگی سے پوچھ رہی تھیں۔

”آپ سے..... وانیہ نے کچھ کہا۔“ اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ اس سے بدگمان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، میرا اپنا اندازہ ہے، مٹی تم اتنے نا بکھ تو نہیں ہو۔ یہ رسم عورت کو سسرال اور میکے میں سبتر کرنے کے لیے بنی ہے۔ شوہر سے ملنے والا چاہت و محبت بھرا تحفہ لڑکی کا مان بڑھاتا ہے۔ آخر ایک انگوٹھی تو خرید سکتے تھے تم اس کے لیے..... کل کو ای جان یا اس کی کزنز اس سے پوچھیں گی تو وہ کیا جواب دے گی۔“ آپا کا سنجیدہ رویہ سرزنش بھرا تھا۔ وہ واقعی جخل ہو گیا۔

”خیال نہیں رہا مجھے، آپ یاد دلاتیں..... اوسے کیا مسئلہ ہو گیا، چلیں میں آج کچھ دے دوں گا۔“

”آگے مسئلہ نہ ہو..... اسی لیے تمہیں سمجھا رہی ہوں..... ابھی جاؤ فوراً اس کے لیے کوئی تحفہ لو..... کیونکہ کل کو نہ میں شرمندہ ہونا چاہتی ہوں نہ ہی وانیہ کو شرمندہ ہوتے دیکھنا چاہتی ہوں۔“ آپا نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

”افوہ..... آپ بھی ناں..... اچھا بابا جارہا ہوں ناں..... نہیں ہوتا کوئی بھی شرمندہ.....“ وہ واضح بڑبڑاہٹ کے ساتھ اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ یقیناً گاڑی کی چابی اور والٹ چپک کر رہا تھا۔

”اب خوش.....“ اس نے معنوی چڑچڑاہٹ سے انہیں بھی چڑانے کی کوشش کی۔

”اصل خوشی تو مجھے اس دن ملے گی مٹی جس دن تم دونوں مجھے ہنستے بولتے دکھائی دو گے.....“ آپا نے اس کے جانے کے بعد جیسے اپنے آپ سے کہا۔

☆ ☆ ☆

مٹی، گولڈی کو سسلانے کے بعد دونوں کمرے میں آئے تو مٹی نے کافی سنجیدہ تاثرات کے ساتھ اسے

آنکھیں نمی سے چپکنے لگیں۔

اور دینے والا.....؟“

”وہ بھی.....“

”اور لینے والی بھی.....“ مہی نے بڑھ کر ایک

شریر جسارت کی تھی۔ وانیہ مزید سٹ مگئی۔

☆☆☆

ویسے کی تقریب بھی بخیر وعافیت گزر گئی تھی۔ ابھی

ان دونوں کی شادی سے خوش اور مطمئن نظر آرہے

تھے۔ سعیدہ خانم نے ویسے کے بعد رسماً اسے ساتھ

لے جانا چاہا تو اس نے خود ہی معذرت کر لی۔

”پھوپھو..... ہم بعد میں آئیں گے۔ ابھی بچے

اسکول جانا شروع ہوئے ہیں اور مجھے بھی گھر میں...

ایڈجسٹ ہونے کے لیے ٹائم چاہیے۔“ انہوں نے

شفقت سے اسے تھپتھپایا۔

”ٹھیک ہے بیٹا..... جیسے تمہاری خوشی..... ہم تو

بس چاہ رہے تھے کہ رسم کے مطابق چلتیں۔ ایک دو دن

رہ کر آ جاتیں۔“

”آؤں گی پھوپھو..... ضرور آؤں گی۔ ابھی مجھے

سب کے دلوں میں جگہ بنانے دیں۔ مجھے آپ کی

دعاؤں کی ضرورت ہے۔“ اس کی آنکھ بھر آئی تھی۔

میکے والوں کی چاہ تو آخر اسے بھی تھی۔ بس مصلحت کے

تحت وہ جانا نہیں چاہ رہی تھی۔ کسی نے اسے منع بھی

نہیں کیا تھا۔ تا نو، آلی حتی کہ مہی بھی اسے اجازت دے

چکے تھے۔

”ہر وقت دعائیں میرے دل سے نکلتی ہیں، اللہ

تمہیں اپنے گھر کی خوشیاں دے، سلامت رہو آباد

رہو۔“ جاتے، جاتے ابھی نے اسے دعائیں دیں۔

ثعلب کی محبت و چاہت کا حصار اس کے گرد

زندگی کے رنگ بکھیرتا، اسے وابستگیوں میں جکڑتا جا رہا

تھا۔ زندگی اتنی خوش رنگ اور حسین بھی ہوگی وہ یقین ہی

نہیں کر پاتی تھی۔ مگر گزرتا ہر لمحہ اسے ایقان بخوشا گزر رہا

تھا۔ گھر کی روٹین جاننے سمجھنے میں اسے کچھ خاص وقت

پیش نہیں آئی۔ آلی بھی اسے سب کچھ سوچ کر سمجھا بجھا

”نہ.....؟“ آپ کے مذاق نے مجھے خود

سے ہی شرمندہ کر دیا۔ آپ کبھی یہ مت سوچیے گا کہ میں

آپ سے متعلق کوئی بات، کوئی شکایت کسی سے کروں

گی۔ خواہ وہ بھابی جان ہی کیوں نہ ہوں۔“

”سوری..... یار..... میں تو بس کچھ شرارت کرنا

چاہ رہا تھا..... اوکے پلیز.....! دیکھو غلطی تو مجھ سے

ہوئی ہے، مجھے کل رات کو تمہیں کچھ گفت تو دینا چاہیے

تھا مگر.....“ مہی نے نارمل ہوتے ہوئے معذرت

کی..... ”مگر..... میں کچھ لے ہی نہیں سکا تھا۔ یونٹو.....

میں ڈرا اپ سیٹ تھا اور.....“

”تو کوئی بات نہیں..... میں سمجھتی ہوں..... آپ

پھر دے دیجیے گا.....“ وانیہ نے انھنے کی کوشش کی تو اس

نے ہاتھ پکڑ کر روکا۔

”یعنی..... تمہیں گفت چاہیے.....؟ وہ بھی

رو نمائی کا.....“ وہ ہلکا سا مسکرائی۔

”جتنے مانگ کر نہیں لے جاتے۔ آپ کا دل

چاہے تو دیں..... دل نہ چاہے تو مت دیں۔“ مہی نے

قد رے حیرت سے دیکھا۔

”مگر مجھے تو مانگ کر لینے کی عادت ہے۔“

”لیکن مجھ سے آپ کو کچھ مانگنے کی ضرورت

نہیں پڑے گی۔“

”اوکے..... ویسے میں سوچ رہا تھا اب تو

رو نمائی بھی ہو چکی بلکہ لب کشائی بھی ہو گئی

اور.....“ وانیہ نے اس کی آنکھوں کی شرارت سے گھبرا

کر منہ پھیر لیا اور وہ ہنسنے لگا۔ مہی نے ایک بار پھر اس کا

ہاتھ تھامنا چاہا۔ وانیہ کی مزاحمت پر وہ چلبلیا۔

”یار اب رو نمائی کا تعذ تو پہنانے دو..... درنہ صبح پھر

کلاس لگ جائے گی۔“ مہی نے تکیے کے نیچے سے ایک

ڈائمنڈ رنگ نکال کر اسے پہنائی تو وانیہ نے حیرت و خوشی

بھرے تاثرات کے ساتھ پہلے اپنے ہاتھ کو دیکھا پھر مہی

کے چہرے کو..... اس کی آنکھوں میں محبت ہی محبت تھی۔

”کیسی ہے؟“

”بہت خوب صورت..... تمہیں کس.....“ وانیہ کی





سب..... اور میرے لیے چائے بنا کر لاؤ۔“ وہ خالی  
ہیگر ایک طرف سنبھالتی معمول کے لہجے میں بولی۔

”بتلاتی ہوں..... بس یہ بتائیں اس کارٹن میں  
آپ کی کوئی اپورٹنٹ چیزیں تو نہیں ہیں۔ ورنہ پھر میں  
اوپر والے اسٹور میں رکھوا دوں.....؟“ وہ مکمل طور پر اس  
کی جانب متوجہ ہو کر اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کے  
اشارے پر مٹی نے نیچے کارپٹ پر پڑے ڈبے کو دیکھا۔  
اس کے تاثرات ایک دم بدلے تھے۔ وانیہ اس کے رنگ  
بدلتے چہرے کو دیکھ کر قدرے پریشانی سے بولی۔  
”آپ کی ضرورت کی چیزیں ہیں تو میں سنبھال  
دیتی ہوں۔“

”نہیں، نہیں اس میں ایسی کچھ خاص چیزیں  
نہیں ہیں۔ بلکہ ایسا کرو، برکت علی (ذرائعور) کو دے  
دو۔ یا میں خود ہی دے دوں گا۔ تم جاؤ میرے لیے  
چائے بنا کر لاؤ۔ پھر کچھ کرنا۔“

مٹی کا الجھا ہوا انداز اور لہجہ وانیہ کو سمجھ نہیں آ رہا  
تھا۔ آج پہلی بار وہ اس کے سامنے اس طرح بیزاری کا  
مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ کچھ سوچتی اس کے لیے چائے  
بنانے مچن میں آگئی۔ ”تا نو کو وہ پہلے ہی ان کے کمرے  
میں ناشتا دے چکی تھی۔ عصیٰ کے ایگزائمز ہونے  
والے تھے وہ بھی رات دیر تک پڑھنے کی وجہ سے اب  
تک سو رہی تھی۔ بچے بھی دیر تک دھینکا مشتی کرتے  
رہے تھے۔ ویسے بھی چھٹی کے دن کی عموماً تمام گھروں  
کی سبکی روشن ہوتی ہے۔ وہ مٹی کے لیے چائے بنالائی  
تو بچوں کو مٹی کے ساتھ مستیاں کرنے میں مصروف پایا۔  
بچوں کا کوئی فرمائشی پروگرام تھا۔“

”سوری..... سوری آج کہیں نہیں جانا۔ آج  
اپنی چاچی سے کہو وہ تمہارے لیے پڑا گھر پر ہی بنا دیں  
گی اور فن لینڈ ہم نیکسٹ سنڈے چلیں گے، اوکے؟“  
”مجھ سے تو آج چائینز کی فرمائش ہے اور وہ میں  
برنج میں بنا رہی ہوں۔“ وانیہ نے اسے چائے کا گلف تھمایا۔  
”تو ہم شام کی بات کر رہے ہیں چاچی۔ چاچو  
نے ہم سے کل پراس کیا تھا۔“ سنی نے قدرے فطی

مٹی بہانوں سے روک دیتا۔ یا پھر بچوں کو پیچھے لگا دیتا  
اور وہ اسے فرمائش کر کے اپنے ساتھ آکس کریم یا برگر  
کھانے کے لیے ساتھ چلنے پر مجبور کر دیتے۔

وانیہ کے ذہن میں آج بھی بہت سے کام تھے  
اور وہ جانتی تھی مٹی اور بچوں کے جاننے کے بعد آج پھر  
کئی کام رہ جائیں گے۔ اس لیے وہ سب کے انھنے  
سے پہلے اپنے ڈریسنگ روم اور اسٹور کی ترتیب بدلنے  
کا سوچ رہی تھی۔ بدلتے موسم کے کپڑے جینز سے  
نکال کر وارڈ روم میں رکھنے تھے۔ گھڑی کی رفتار  
دیکھتے ہوئے اس نے جلدی، جلدی کام سینے کی کوشش  
کی..... اسٹور روم میں اسے کئی بیکار اور بے ضرورت  
چیزیں نظر آ رہی تھیں۔ مٹی کے جوتے، چپلیں، کئی لی  
شرٹس اور خالی ڈبے تھے، ایک بڑا کارٹن کونے میں پڑا  
تھا۔ جسے نیپ کے ساتھ مہربند کیا گیا تھا۔ ہلکا سا بکس  
اس کے ذہن میں ابھرا تو تھا مٹی کی اجازت کے بغیر  
وہ اسے کھولنے کی جرأت نہیں رکھتی تھی۔ وہ ابھی ڈبے  
کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی کہ مٹی اٹھ کر اس کے سر پر  
آکھڑا ہوا۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ نیند سے بوچھل آواز اور  
مندھی آنکھیں اس بات کی غماز تھیں کہ وہ کھٹ پٹ کی  
آواز سے ہی جاگا ہے۔

”اسٹور کی صفائی.....“ وہ ہاتھ جھاڑتی کھڑی  
ہوئی۔

”جسہیں بھی چھین نہیں ہے، صبح، صبح ہی شور،  
کھٹ پٹ.....“

”صبح.....؟ ذرا آنکھیں کھول کر گھڑی دیکھیں  
جناب..... گیرو بجنے والے ہیں۔“

”ایک چھٹی کا دن تو ملتا ہے مرضی سے سونے  
کے لیے۔“

”تو آپ سوئے رہیں، میں نے تو نہیں جگا یا۔“

وہ وارڈ روم کے سلائیڈنگ ڈور کو دھکیلتے ہوئے پلٹ  
کر بولی تو مٹی نے اسے قدرے حیرت سے دیکھا۔

”تو اور کیسے جگایا جاتا ہے۔ بس اب چھوڑو یہ



صفائی دی۔

”میں نے جو فیل کیا کہہ دیا۔ میں تو بہت آرام سے کام کر رہی تھی۔“ اس نے اپنے چھٹکے آنسو دوسرے ہاتھ سے صاف کیے۔ ”آپ کیوں لپ سیٹ تھے؟“

”بتایا تو ہے..... اچھا بھئی سوری۔“ مٹی نے اپنے کان پکڑنے کے بجائے اس کے کان پکڑے تو وہ پہلے تو خفگی سے دیکھے مٹی پھر ایک دم ہنس دی۔

”آپ بھی ناں۔“

”شکر ہے تمہارے چہرے پر ہنسی تو نظر آئی۔ صبح سے سڑی شکل دکھا، دکھا کر بور کر دیا تھا۔“ مٹی نے اسے کندھوں سے تھام کر کہا تو وہ اس کے ہاتھ ہٹاتی اٹھ گئی۔

”میں تو نارمل تھی لفت تو آپ نہیں دے رہے تھے، مجھے ساتھ چلنے کے لیے بھی نہیں کہا۔“ دل میں آیا شکوہ وہ کیے بغیر نہ رہ سکی۔ مٹی نے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”یار تمہیں کہنے کی ضرورت تھی؟ پہلے سے طے ہے کہ ہم سبھی ایک ساتھ جائیں گے تو تم نے کیوں انکار کیا۔ اچھا بس اب یہ مکے شکوے ختم کرو اور ادھر آؤ میرے پاس۔“ مٹی کو بھی احساس ہوا کہ یہ بحث چھڑ گئی تو بہت بکری جائے گی اور بد مزگی کا امکان بھی تھا۔

”میں آپ کے لیے صبح کا ڈریس نکال کر آتی ہوں۔ اسٹور میں بھی کچھ سامان بکھرا ہے وہ ایک طرف کروں۔ آپ اپنا کام کریں۔“

”اوکے۔“ مٹی نے سر ہلا کر اجازت دی۔ اس کے جانے کے بعد مٹی کسی گہری سوچ میں رہا۔ ذہن میں کئی خیالات بالکل بچا رہے تھے جنہیں جھٹک کر بھی وہ جھٹک نہیں پارہا تھا۔ صبح اس ڈبے کو دیکھ کر اسے ماضی کے کئی لمحے یاد آئے تھے۔ کئی خوشگوار یادیں تھیں جنہیں وہ بھلانے کی کوشش میں ناکام ہو رہا تھا۔ رومانہ سے متعلق کئی تحائف اس ڈبے میں بند تھے اور وہ سوچ رہا تھا اگر وانیہ نے وہ ڈبا کھول لیا تو نہ جانے اس کا کیا رد عمل ہوگا۔ یہ چیزیں اب اس کے لیے زندگی کی تمنیوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھیں لیکن وہ تمنیاں اس کی

جاتے ہوئے مٹی سے سوال کیا تو وہ مزے بغیر بولا۔

”ہم نے باہر ہی کھا لیا، بچوں کو بھوک لگی تھی۔“ وہ جواب دے کر چلا گیا تو عصی بھی معذرت کرنے لگی۔

”سوری بھابی..... آپ کا بتایا پڑا کل کھالیں گے ابھی بالکل منجائش نہیں ہے۔“

”کوئی بات نہیں..... ٹھیک ہے تم آرام کرو۔ چلو بچوں جلدی سے چھینچ کر دو، برش کرو اور سو جاؤ۔“ وانیہ نے بھی خندہ پیشانی سے کہتے ہوئے بچوں کو پکپکا را۔ اسے معلوم تھا بچے باہر جا کر ضرور کچھ نہ کچھ کھائیں گے، اس نے پڑا ایک نہیں کیا تھا۔

وہ کمرے میں آئی تو ثعلب اپنے لپ ٹاپ پر کچھ کام کرنے میں مصروف تھا۔ اسے دیکھ کر اپنی مصروفیت ترک کر کے اسے معمول کے لہجے میں مخاطب کرنے لگا۔

”کیا بات ہے آج میرے ساتھ کوئی ناراضی چل رہی ہے؟“ بکھری چیزیں سیٹ کر ان کی جگہ پر رکھتی وانیہ نے قدرے حیرت سے چہرہ موز کر اسے دیکھا پھر اس کی طرف رخ کر کے اپنی حیرت کا اظہار بھی کر دیا۔

”یہ سوال تو مجھے آپ سے پوچھنا چاہیے، صبح سے آپ کا موڈ آف ہے۔“

”میرا موڈ آف..... وہ بھی تمہارے ساتھ.....؟“

یارا تا بڑا الزام تو نہ لگاؤ۔“ وہ سامنے سے لپ ٹاپ ہٹا کر اٹھا اور بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام کر بستر پر اپنے سامنے بٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے مزید بولا۔ ”تمہیں ایسا کیوں لگا کہ میرا موڈ تمہاری وجہ سے خراب ہے؟“

”صبح آپ نے جس طرح ری ایکٹ کیا تھا۔“ اس کی آنکھیں بھرا آئیں۔

”اوہ گاڈ..... ٹوٹل مس انڈر اسٹینڈنگ۔ یا راپ سیٹ تھا سونا چاہ رہا تھا۔ پہلے تمہاری کھٹ پٹ سے آنکھ کھلی پھر سویا تو بچوں نے آکر جگادیا اور تم.....“ ثعلب نے اس کا ہاتھ تھام کر بھرپور انداز میں



وٹا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

# گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسٹمز  
یا کیرنہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ  
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان: کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

بہرہ گرانٹیشن آف پیپلز اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیمت مالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد  
رسالوں کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے  
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے چے پر  
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مینی گرام کے  
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر  
بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 II پکینیشن ڈائریس، ڈسٹ تھارٹی میں ہنگری روڈ، کراچی

فون 021-35895313 فیکس 021-35802551

موجودہ خوشگوار ازدواجی زندگی کی مناس میں گھلتیں تو  
یہ بھی اسے گوارا نہیں تھا۔ وانیہ کے ساتھ وہ اب بھر پور  
اور مطمئن زندگی گزار رہا تھا۔ ماضی کی محبت اس کے  
لیے اب کسی نادانی، تنانت جیسی تھی۔ اسی لیے وہ بے  
جان و بے ضرر چیزوں کو وانیہ کو اذیت دینے کا ذریعہ  
نہیں بنانا چاہتا تھا۔ وانیہ واپس آئی تو وہ اپنی سوچوں  
سے نکل کر اسے دیکھ کر بھرپور انداز میں مسکرایا۔

☆☆☆

نانو کے پاس کوئی رشتے دار خاتون آئی بیٹھی تھیں۔  
وانیہ ان کے لیے چائے اور لوازمات کی ٹرالی لے کر خود  
آئی اور پھر انہیں اصرار کے ساتھ سرو بھی کر رہی تھی۔ نانو  
کی بیٹی اس سے کافی متاثر نظر آرہی تھی۔

”ماشاء اللہ پھوپھی کی دلہن نے بھی گھر سنبھال  
لیا ہے۔ اب تو آپ کو کوئی فکر نہیں رہی ہوگی۔“ وانیہ  
کے سامنے ہی انہوں نے تو صغی انداز میں کہا تو وہ  
جھینپ گئی۔

”الحمد للہ..... اللہ نے ہم پر بڑا کرم کیا....  
ماشاء اللہ سے ہماری بچی بڑی سکھڑ اور سلیقہ مند ہے۔ ہم تو  
اس کے بغیر بالکل اوصورے ہیں۔“ نانو نے بہت  
شفقت و محبت سے پاس بیٹھی وانیہ کو چھتپایا تو وہ شرمناک  
اٹھ گئی۔

”نانو بلکہ میں آپ سب کے بنا اوصوری ہوں۔  
آپ میرا ساتھ نہ دیں تو میں گھر کی ذمے داریاں کیسے  
سنبھال سکتی ہوں۔“ اس کی اکھساری متاثر کن تھی۔  
”آئی پلیز آپ مائنڈ مت کیجیے گا مجھے کچن میں کچھ  
کام ہے۔ میں آپ کے پاس پھر آکر بیٹھتی ہوں۔“  
”کوئی بات نہیں بیٹا، تم جاؤ کام کرو۔ میں بھی  
بس تھوڑی دیر میں چلی جاؤں گی۔“

”بالکل نہیں آپ کھانا کھا کر جائیں گی۔ ساتھ  
بیجے تک ثعلب بھی آفس سے آجائیں گے۔ آپ کو  
ذرا یور گھر چھوڑ دے گا۔ آپ آرام سے نانو کے ساتھ  
بیٹھ کر باتیں کریں۔“ وہ انہیں بہ اصرار کھانے کے لیے  
روکنے پر مجبور کر گئی۔ اس کے جانے کے بعد شکیلہ آنٹی

نے مزید ایسے سراہا۔

”واقعی پھوپھو جیسا سنا تھا مٹی کی دہن اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ تمکین کی کمی ذرا بھی محسوس نہیں ہوتی۔“ نانو نے بھی خورابی تانے کی۔

”ہاں بالکل تمکین کا ہی پرتو نکلتی ہے۔ آتے ہی گھر کو متنبال لیا۔ اللہ میرے بچوں کا گھر اسی طرح شاد و آباد رکھے۔“

”پھوپھو، مٹی تو خوش ہے ناں اس شادی سے۔ میرا مطلب ہے رومی سے تو وہ شدید محبت کرتا تھا۔ اسے دل سے قبول کر لیا؟“ شکلیہ نے قدرے تجسس ظاہر کیا تو نانو کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ جب سے ثعلب کی شادی ہوئی تھی۔ ہر دوسری خاتون یہی سوال دہرائی تھی۔

”اللہ کا شکر ہے دونوں ہی بہت خوش ہیں ایک دوسرے کی رفاقت میں۔ رومی سے محبت کی شدت تو تبھی ختم ہوئی تھی جب وہ ہمیں مشکل گھڑی میں چھوڑ گئی تھی۔ مرد کے لیے وہی عورت اہم رہتی ہے جو اس کے برے وقت کی ساتھی بنے۔“ نانو جان بے انداز میں بات ختم کر دی۔ نانو اپنی بیٹی کی عادت سے واقف تھیں، جانتی تھیں خاندان کی باتوں کی ٹوہ لیتا اور پھر ان کا چرچہ عام کرنا ان کی خصلت میں شامل ہے۔ بھی انہوں نے جلدی سے موضوع بدل دیا تھا۔ شکلیہ آنٹی بہت خوش، خوش رخصت ہوئی تھیں اور جاتے، جاتے انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دے غمی تھیں۔

شکلیہ آنٹی کو ڈرائیور برکت علی چھوڑنے گیا ہوا تھا۔ برکت علی کافی عرصے سے آفس میں ڈرائیور کی پوسٹ پر کام کرتا رہا تھا۔ جب سے نانو یہاں رہائش پزیر ہوئی تھیں ثعلب نے برکت علی کو مستقل گھر کے کاموں کے لیے وقف کر دیا تھا اور اسے رہائش بھی سرونٹ کوارٹر میں دے دی تھی۔ سال پہلے ہی برکت علی کی شادی ہوئی تھی اور وہ اب گاؤں سے اپنی بیوی بھی لے آیا تھا۔ ایماندار اور قابل اعتماد تھا، اسی لیے

بچوں اور عرصی کو اسکول کالج سے لانے لے جانے پر بھی مامور تھا۔ نانو کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا بھی اسی کی ڈیوٹی تھی۔ اس کی فرض شناسی کی پتا پر مٹی اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اپنی بہت سی استعمال شدہ چیزیں کپڑے وغیرہ اس نے پہلے بھی کافی دفعہ برکت علی کو دیے تھے۔ اب بھی وانیہ نے جو کچھ بھی چھانی کیا تھا وہ برکت علی اور اس کی بیوی کو ہی بھجوا دیا تھا۔ خصوصاً وہ بڑا سا کارٹن بھی برکت علی، شکلیہ آنٹی کو چھوڑ کر نانو کے لیے منگوائی ہوئی میڈیسن دینے آیا تو قدرے جھجکتے ہوئے کہنے لگا۔

”بابی..... وہ آپ نے کل مجھے ایک ڈبا دیا تھا، مجھے لگتا ہے وہ مجھے غلطی سے دے دیا ہے۔“

”غلطی سے..... نہیں، نہیں صاحب نے وہ تمہیں ہی دینے کے لیے کہا تھا۔ کیوں کیا ہوا..... کیا بات ہے؟“ وانیہ اس کے بہم سے تاثرات پر قدرے چوکنی سی ہو گئی۔

”وہ..... اس میں صاحب کی کافی قیمتی چیزیں ہیں، اس لیے مجھے لگا کہ آپ پھر بھی صاحب کو ایک بار دکھا دیں۔ مجھے ان کے کام کی چیزیں لگتی ہیں۔“

”اچھا..... ہو سکتا ہے۔ ٹھیک ہے تم لا دو میں دکھا دیتی ہوں۔“ وانیہ کو احساس ہوا کہ شاید وہ غلطی سے کچھ اور سامان نہ دے چکی ہو۔ بعد میں مسئلہ ہونے کا احتمال تھا جتنی دیر میں برکت علی وہ ڈبالے کر آیا وہ وہیں لاؤنچ میں بیٹھی رہی۔ کبھی آرام سے اپنے، اپنے کمروں میں سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ بچوں کو وہ سلا چکی تھی۔ مٹی کمرے میں لیٹائی دی پر حالات حاضرہ کا پروگرام دیکھ رہا تھا۔ وانیہ، برکت علی سے ڈبالے کر اندرونی دروازہ مقفل کر کے کمرے میں آئی تو مٹی اس کے ہاتھ میں پھروٹی ڈبا دیکھ کر پہلے تو حیران ہوا پھر قدرے جھلاتے ہوئے استفسار کرنے لگا۔

”یہ کیا اٹھالائی ہو برکت کو دیا نہیں ابھی تک؟“

”میں نے تو دے دیا تھا مگر وہ کہہ رہا ہے کہ اس میں آپ کا قیمتی سامان ہے۔ میں نے اسے غلطی سے

ایک دوسرے کے ساتھ وابستگی کی شدت کا احساس دلانے کے لیے کافی تھیں۔ اس کے باوجود دونوں کی جدائی..... وانیہ کی آنکھیں بے اختیار چھلک کر بہنے لگیں۔ مہی نے صرف اس سے ایک رشتے کی پائنداری کی خاطر اپنی ساری وفا میں، سارے جذبے، سبھی ارمان مہربند کر دیے تھے۔ اپنی ذات اپنی ہر وفا صرف اس کے لیے وقف کرنے کی خاطر اپنی زندگی کی انمول یادوں کو مہربند کر کے بے وقعت کر دیا تھا۔ احساس تشکر سے اس کے آنسو تسلسل سے بہنے لگے۔ وہ بے اختیار ہو کر اس کی جانب بڑھی اور اس کے بازو سے لپٹ کر اسے یقین دلانے لگی۔

”مجھے تو آپ پر ہمیشہ سے یقین ہے۔ آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں ان چیزوں کی وجہ سے اپنا یقین کھودوں گی۔ جس طرح آپ کے لیے یہ سب کوئی وقعت نہیں رکھتیں، اسی طرح مجھے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پلیز آپ انہیں رکھ لیں۔ استعمال کریں مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے اطمینان کے لیے یہی کافی ہے کہ آپ صرف میرے ہیں..... اور میرے ہی رہیں گے۔“ وہ اتنی شدت سے روئی کہ ثعلب بھی پریشان ہو گیا۔ اسے بھی جیسے سمجھ آئی کہ وہ کیا کر چکا ہے۔

”وانیہ..... چپ کر جاؤ..... بھی اس میں رونے کی کیا بات ہے..... میں نے اپنی خوشی سے کیا ہے یہ سب.....“

”میں نے آپ کو مجبور کیا تھا ناں..... میں بے حد بری ہوں..... آپ کو کس قدر دکھ ہوا ہوگا۔“ وہ اس کے دل کا درد محسوس کر کے ہلک ہی اٹھی تھی۔ مہی نے اسے بازوؤں میں سمیٹ کر سنبھالنے کی کوشش کی..... مگر وانیہ کے احساسات بری طرح چٹختے تھے۔

”ڈونٹ بی سلی..... نیا پلیز اب چپ کر جاؤ..... سنو۔“ مہی نے اسے جھنجھوڑ کر جیسے متوجہ کیا۔ ”سنو..... جب رومانہ سے میرا کوئی واسطہ، تعلق ہی نہیں رہا تو ان بے جان چیزوں کی کیا ضرورت ہے۔ شادی کی پہلی رات تم نے مجھ سے جو باتیں کی تھیں..... میں نے

دے دیا ہے۔“ وانیہ نے ڈبا صوفے کے پاس پڑی میز پر رکھنے کے بعد بستر کی طرف قدم بڑھائے۔

”کچھ خاص جیتی نہیں ہے۔ بس دے دیا تھا تو..... واپس لینے کی کیا ضرورت تھی۔“ مہی مزید جھنجھایا تو وہ پلٹ کر اس کی جانب آگئی۔

”میں نے تو واپس نہیں مانگا..... وہ خود دے کر گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کی کوئی اہم چیز ہو..... آپ ایک بار چیک کر لیں..... پھر اسے دے دیجیے گا۔“

”نہیں چیک کرنا مجھے..... کہہ دیا ہے ناں.....“ مہی کو اپنی جڑ جڑا ہٹ سے خود ہی ابھمن ہوئی۔

”ثعلب..... کیا بات ہے، ایسا کیا ہے اس میں؟ کہیں آپ کی گرل فرینڈز کی نشانیاں اور لو لیٹرز تو نہیں۔“ وانیہ نے تو اسے مذاق سے چھیڑا تھا۔ ثعلب نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

”ہاں..... ایسا ہی ہے..... تم دیکھنا چاہتی ہو تو خود دیکھ لو یا پھر میں دکھاؤں.....؟ اگر حوصلہ ہے تو.....“ ثعلب کی بات اور سنجیدگی اسے حیران کر گئی۔

”میں نے تو تم سے اپنی محبت و وفا کی پائنداری کے لیے ہر اس یاد کو مہربند کر دیا تھا جو ہمارے رشتے میں دراڑ ڈالنے کی کوشش کرتی۔ اب تم یہ پنڈورا کس کھولنا چاہتی ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“ مہی کی آواز کسی کرب کے اثر سے بوجھل سی تھی۔ وانیہ جو مذاق، مذاق میں واقعی ڈبے کو کھولنا چاہتی تھی۔ وہ وہیں ساکت و جاہر رہ گئی جبکہ مہی نہ جانے کس جذبے کے تحت ڈبے کی طرف بڑھا اور اس نے ایک دم سارا ڈبا میز پر الٹ دیا۔ ”دیکھو..... یہ ہے وہ قیمتی سامان جو اب میرے لیے کسی لمبے کے ڈھیر کی طرح ہے، تم یقین کرو نہ کرو یہی حقیقت ہے۔“ وہ حیران نظروں سے بکھرے سامان کو دیکھ رہی تھی۔ کئی ٹاکی ہنر تھیں، گھڑیاں، مگالکڑ، ڈاکریاں، فوٹو البم، سی ڈیز، کیپ، وٹنگ کارڈز، نیم پیڈنٹ، پین، کی پین اور پین سیٹ، کف لکس اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔ اتنی ساری چیزوں کے ساتھ ایک ہی ہستی وابستہ تھی۔ رومانہ..... یہ تمام چیزیں دونوں کی



[illegible]

”شکر ہے تمہاری صورت بھی نظر آئی..... ورنہ میں تو سمجھ رہی تھی تمہاری ناراضی کا ملال دل میں لیے دنیا سے رخصت ہو جاؤں گی۔“ طاہرہ بڑی تندگی بات سن کر قد رے جز بزی ہوئیں۔ ان کے شکوے نے کریم احمد کے چہرے کا رنگ بھی بدلا تھا۔

”کریم ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ اور میری آپ سے بھلا کیا ناراضی..... آپ بہن ہیں تو اپنے بھائی کا ہی ساتھ دینا تھا آپ کو.....“ طاہرہ نہ چاہتے ہوئے شکوہ کر گئیں..... کریم احمد نے بیوی کو گھور کر دیکھنے کے بعد مات کا اثر زائل کرنے کی کوشش کی۔

”نہیں کریم..... اسے کہنے دو..... اپنوں سے ہی شکوے کیے جاتے ہیں۔ اچھا ہے کہہ سن کر دلوں کا غبار نکل جاتا ہے۔“ سعیدہ خانم نے خندہ پیشانی سے اپنی بھانجی کے روتے کو درگزر کیا۔

”آیا... انصاف سے سوچیں... شوہر ساری زندگی بیوی کو دھوکا دیتا رہے اور بڑھاپے میں آکر سوکن کا ہوا سامنے لاکھڑا کرے تو بیوی بچہ ساری کا... تو عمل کیسے ہوگا۔“ طاہرہ ہنوز کبیدہ و شاکا تھیں۔

”تمہاری سونگن کا تو اب وجود ہی نہیں رہا۔ تم کیوں خواہ مخواہ جستی کر رہتی ہو..... ویسے بھی ہم آپا کی مزاج پر سی کے لیے آئے ہیں۔ گھر جا کر اپنے قصے سنالیتا.....“ کریم احمد نے دبے دبے لہجہ میں بیوی کو کچھ باور کرایا۔۔۔ صبحی اسی وقت ٹرائی میں چائے کے لوازمات لیے سعیدہ خانم کے کمرے میں داخل ہوئی تو

☆ ☆ ☆

زندگی کا حسن وانیہ کو اب محسوس ہونے لگا تھا۔  
اپنی ای کی، بابا جان سے چاہت کی وجہ اسے اب سمجھ  
آنے لگی تھی۔ اس کی امی نے جس طرح اس کے بابا  
کے لیے اپنی ذات بچھا کر دی تھی۔ وانیہ بھی خود کو اسی  
مقام پر محسوس کرنے لگی تھی۔ اس کا دل چاہتا وہ بھی کے  
قدموں میں بچھے، بچھے جائے۔ وہ اس کی ہر خواہش بنا  
کہے سمجھنے لگی تھی۔ اس کی آنہیں محسوس کرنے لگی تھی۔  
اس کی ذرا سی تاخیر اس کی جان پر بنا دیتی تھی۔ اس کا  
دل چاہتا کہ وہ ہر دہ عمل کر گزرے جو مٹی کی جان کو  
راحت و سکون دے اور مٹی کی جان کا راحت و سکون تو  
اپنے گھر کے افراد اور سنی، مولوی کی خوشی میں اٹکا ہوا  
تھا۔ اسی لیے وانیہ کے لیے بھی کو خوش رکھنا اور خوشی دینا  
سب سے مقدم تھا۔

سعدیہ خانم کی طبیعت موسم کے زیر اثر کچھ خراب تھی۔ صبحی دل و جان سے ان کی بیمار داری کر رہی تھی۔ وانیہ کو بھی اس نے اطلاع دے دی تھی۔ کریم احمد بھی



میں کھچاؤ کیوں پیدا کرتی ہو..... کریم اپنی ذستے داری پوری کر چکا..... بچی اپنے گھر بار کی ہو چکی..... وہ اپنے گھر میں خوش ہے، تم دونوں بھی اپنے گھر میں خوش رہو..... بہو، بیٹیوں کو تماشا مت دکھاؤ۔“

”یہی بات تو میں بھی سمجھتا ہوں آپا.....“ کریم احمد نے پھر سے لا چاری ظاہر کی۔

”میں بھی بس یہی چاہتی ہوں کہ بار بار اپنی چیتنی اولاد کا روتا رو، رو کر میری جان نہ جلائی جائے..... میں آج آئی بھی اسی لیے ہوں آپا کہ اس لڑکی سے کہیں.... بار بار فون کر کے میرے گھر کا سکون خراب نہ کیا کرے.....“ طاہرہ نے آخر اپنے آنے کا مقصد بیان کر ہی دیا۔ سعیدہ خانم حیرت سے بھائی کو دیکھ گئیں۔ ان کا خیال تھا کہ شاید بھائی کچھ کہے گا ان کی خاموشی محسوس کرے۔ سعیدہ خانم کو ہی وانیہ کا دفاع کرنا پڑا۔

”بچی اپنے باپ کو فون نہیں کرے گی تو کس کو کرے گی..... کریم احمد اس کا باپ ہے، تم یہ پابندی دونوں پر نہیں لگا سکتی ہو۔ تم اسے اپنے گھر میں نہ آنے دینے کا اختیار رکھتی ہو طاہرہ..... کریم سے اس کا رشتہ ختم کرنے کا نہ تمہارے پاس کوئی اختیار ہے نہ حق.....“ ماحول ایک دم تاساز گار ہو گیا تھا..... دونوں بہن، بھائی ایک دوسرے سے نظریں چرائے کچھ دیر خاموش رہے آخر طاہرہ نے ہی وانیہ کے لیے جانے کا قصد کیا۔

✽✽✽

رات کے کھانے پر بھی جمع تھے۔ وانیہ حسب معمول بچوں کو اپنے دائیں بائیں بٹھائے بھی اپنے ہاتھ سے نوالہ کھلاتی، کبھی سب کو کھانے کی ڈش پیش کرتی، وہ سب کے لیے کسی ماں کی طرح فکر مند نظر آتی تھی جو اپنی ذات بھلائے دوسروں کی ضروریات و آرام کا خیال رکھ کر ہی مطمئن و پرسکون نظر آتی ہے۔ نانو اور ثعلب کے ذہن میں بیک وقت یہی سوچ تھی۔ کھانے کے دوران نانو نے ہی ایک بار پھر اسے اسلام

انہوں نے مزید سرگوشیاں انداز میں تنبیہ کی۔  
”بس..... اب آپا کی بہو کے سامنے کوئی گوہر افشانی مت کرتا۔“ طاہرہ نے غصے سے سر جھٹک کر آپا کو دیکھا تو وہ بھی نظروں میں یہی اشارہ کر رہی تھیں۔

”ماموں جان..... آپ نے بہت اچھا کیا آج مای جان کو بھی لے آئے۔“ صہبی نے ماحول کی کشیدگی محسوس کر کے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”اور تم نے تو ہماری طرف نہ آنے کا بہانہ ڈھونڈ لیا ہے..... میری سوکن کی اولاد کو بھالی بنا کر نئی رشتے داریوں میں مجھے نیچا دکھانے کی خوب کوشش کی ہے۔“ طاہرہ بیگم دل کی بات دل میں رکھ لیں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ صہبی کے چہرے کا رنگ لمحے بھر کو متغیر ہوا..... لیکن پھر وہ خود کو سنبھال کر بولی۔

”مای جان اس میں خدا نخواستہ آپ کو نیچا دکھانے والی کیا بات ہے۔ وانیہ کی شادی تو ماموں جان کو کرنی تھی۔ وہ آخر ان کی ذستے داری تھی..... اگر میرے بھائی کے ساتھ اس کا شوگ لکھا تھا تو اللہ کی مرضی..... آپ کو تو وہ ذستے داری اٹھانی بھی نہیں پڑی۔“ صہبی نے کافی رسائیت سے بات کی تھی۔ سعیدہ خانم نے بھابھو کے ماتھے کے بل دیکھ کر صہبی کو بہانے سے اٹھا دیا۔

”صہبی..... بیٹا دیکھنا ڈرائیور میری میڈیسن لے آیا ہے۔“

”جی امی جان..... میں دیکھتی ہوں۔“ صہبی ساس کا اشارہ سمجھ کر فوراً ہی وہاں سے چلی آئی۔

”میں کیوں اٹھاتی پرانی اولاد کی ذستے داری..... جس نے پیدا کیا تھا..... وہ جانے نہ جانے..... میں نیا سرور د کیوں پالتی۔“ طاہرہ نے جیسے بھنے انداز میں کہا تو دونوں بہن بھائی بے بسی کے طور پر سر ہلا کر رہ گئے۔ سعیدہ خانم نے بات ختم کرنے کے سے انداز میں نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔

”بس پھر طاہرہ..... جب تمہارا اس بچی سے کوئی تعلق کوئی واسطہ ہی نہیں ہے تو تم کریم کی اور اپنی زندگی

آباد جانے کا مشورہ دیا۔

”وانیہ! بیٹا اب تو تمہیں جانا چاہیے۔ صہنی فون پر بتا رہی تھی، سعیدہ کی طبیعت کافی خراب ہے۔ تمہاری پھوپھو ہیں تمہیں ضرور جانا چاہیے۔“

”ہاں، میں نے بھی وانیہ سے کہا ہے۔ یہ اپنا پروگرام بنالے، میں نکت کروادیتا ہوں۔“ مہنی نے بھی تائیدی انداز میں کہا۔

”میں اکیلی جاؤں گی؟ میرا مطلب ہے ہم سب کا تو اکٹھے جانے کا پروگرام تھا ناں اور.....“ وانیہ نے قدرے تردد سے کہا۔

”اکٹھے بھی نہیں گے انشاء اللہ..... مگر ابھی تمہارا جانا زیادہ ضروری ہے..... تم اپنی پیکنگ کرلو.....

میں دیکھتا ہوں پرسوں کی کوئی سیٹ مل جائے۔“ مہنی نے مزید کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔ پھوپھو کی ناسازی طبع کا سن کر پریشان تو وہ بھی تھی، جانا بھی چاہتی تھی۔ لیکن گھر کے معمولات میں خلل کا سوچ کر ذہن میں گفتگو بھی تھی۔ اب مہنی اور تانوں کے اصرار نے اس کی ہمت بندھا دی تھی۔

☆ ☆ ☆

گھر واپس جاتے ہوئے طاہرہ کا موڈ بری طرح بگڑا ہوا تھا۔ وہ بولتے ہوئے گاڑی چلاتے ڈرائیور کو بھی فراموش کر چکی تھیں۔

”تم اسی لیے مجھے اپنی بہن کے گھر لائے تھے تاکہ سبھی مل کر مجھے ذلیل کریں۔“

”پہلی بات تو یہ ہے کہ تم اپنی مرضی سے آئی تھیں اور دوسرے تم فضول میں ہر بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتی ہو۔ نہ تم صہنی کو کوئی بات سناؤں نہ وہ تمہیں جواب دیتی۔“

”اس کے جواب پر تم تو بہت خوش ہوئے ہو گے، تمہارا ارمان پورا ہو گیا۔“

”میرے ساتھ بار بار اس موضوع پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے طاہرہ..... تمہاری وجہ سے..... ہاں صرف تمہاری وجہ سے میں نے اپنی بیٹی کو

وہ حق نہیں دیا جس کی وہ حقدار تھی۔ شادی کے بعد ہر لڑکی اپنے باپ کے گھر رہنے آتی ہے مگر میں تو رخصت کرنے کے بعد اسے ایک دن کے لیے بھی نہیں بلا سکا۔ اگر وہ میری خیریت معلوم کرنے کے لیے مجھے فون کر لیتی ہے تمہیں اس کی بھی تکلیف رہتی ہے۔“ کریم احمد کا پٹا نہ صبر جیسے چھلک پڑا تھا۔

”ہاں..... ہوتی ہے مجھے تکلیف یہ سوچ، سوچ کر کہ تم نے میرا ہی نہیں میری اولاد کا بھی حق دوسری عورت اور اس کی اولاد کی جھولی میں ڈال دیا۔ میرے جیتے جی اب تم اسے کچھ نہیں دو گے..... نہ ہی اسے بھی میرے گھر میں آنے کی اجازت ہوگی۔“ طاہرہ بیگم جیسے چیخ اٹھیں۔

”تم نے ہی مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں دوسری عورت کی طرف جاؤں۔“ کریم احمد بھی چڑچڑے پن سے بولنے لگے تھے۔

”تمہاری اپنی نیت میں فتور تھا۔ تم جیسے مردوں کو بیوی سے ہمیشہ دور جانے کے بہانے چاہیے ہوتے ہیں۔ ایک سے دل جو نہیں بھرتا۔“

”بس کرو طاہرہ ایسا نہ ہو تمہاری بکواس بن، بن کر میں کوئی ایسا قدم اٹھاؤں جس پر تمہیں باقی زندگی پھینکانا پڑے۔“ کریم احمد کا لہجہ سنجیدہ ہی نہیں سنگین بھی ہو گیا تھا۔ طاہرہ بہت حیرانی سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ گھر آ گیا تھا۔ ڈرائیور نے جیسے ہی گیٹ پر گاڑی روکی کریم احمد اتر کر اندر بڑھ گئے۔

وانیہ رات کے سارے معمولات سے فارغ ہو کر کمرے میں آئی تو ٹخنہ نے اسے اطلاع دی۔

”نیا صبح دس بجے کی سیٹ کنفرم ہو گئی ہے تمہاری، تم اپنی پیکنگ کرلو..... میں نے آپلی کو بھی انفارم کر دیا ہے۔ وہ خود تمہیں ریسیو کرنے آ جائیں گی، اوکے.....“

”اتنی جلدی کیا تھی آپ کو؟“ وانیہ قدرے جھنجھلائی ارج ہوئی اس کے سامنے آنی لگی۔

”کیا مطلب.....؟ تم جانا نہیں چاہتیں؟“ مہنی نے اسے حیرانی سے دیکھا۔

وہائی دی۔ ”مجھے نہیں پتا تھا کہ تم اتنی گہرائی سے سوچتی ہو۔ آئندہ میں اپنے سر پر الزام لے لوں گا۔ تمہیں اپنی ننھی سی جان پر اتنا بڑا بوجھ لینے کی ضرورت نہیں۔ اب پلیز کچھ مت کہنا۔۔۔۔۔ جلدی سے اپنا سوٹ کیس پیک کر لو۔ مجھے واقعی بہت نیند آرہی ہے اور۔۔۔۔۔ انرپورٹ سے تم چاکلیٹس وغیرہ بچوں کے لیے لے لیتا۔“ مٹی نے اس کے بولنے کی کوشش پر اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے کندھوں سے پکڑ کر ڈریسنگ روم میں دھکیل دیا۔

سب ننھی نیند سو رہے تھے اور وہ کچن میں آئندہ کچھ دنوں کے لیے مختلف ڈشز بنا کر رکھنے میں مصروف تھی۔ اسے معلوم تھا بچے اور مٹی، شبنی بوا کے ہاتھ کے ساوے کھانے رغبت سے نہیں بلکہ مجبوراً کھاتے تھے۔ ناشتے سے پہلے، پہلے وہ فارغ ہونا چاہتی تھی اور آٹھ بجے تک ٹکنا بھی تھا وہ فجر سے اٹھی ہوئی تھی۔ شبنی بوا اپنے معمول سے اٹھ کر آئیں تو کچن میں مختلف خوشبوئیں پھیلی محسوس کر کے سرد ہنسنے لگیں۔

”ارے بیٹا، تمہیں بھی بس خط ہے کام کا۔۔۔۔۔ ارے مجھے جگا لیتیں۔۔۔۔۔ میں کچھ مدد کرواؤ جی۔۔۔۔۔“ ”مدد تو بوا آپ ہی کو کرنی ہے میری۔۔۔۔۔ یہ سب ٹھنڈا ہو جائے تو فریزر اور فریج میں رکھ دیجیے گا۔۔۔۔۔ اور ہلیز نانو کو روزانہ تازہ سوپ اور بچوں کو جوس ضرور دے دیجیے گا۔ یہ کچھ چکن و ٹیٹل کباب بھی بنا دیے ہیں۔ آپ فراکی تو کر لیں گی ناں۔۔۔۔۔ ہڈوانیہ نے مصروف انداز میں کہتے ہوئے پوچھا تو بوا جھٹ بولیں۔

”یہ بھی کوئی مشکل کام ہے، اتنا تو کر ہی لوں گی۔۔۔۔۔ بلکہ تمہارے آنے سے پہلے الٹا سیدھا جیسا بھی بننا تھا میں بنا لیتی تھی۔ اب تم نے انہیں چٹکاروں کی عادت ڈال دی ہے تبھی تو انہیں کچھ پسند نہیں آتا۔“ بوانے شکایت بھرے انداز میں کہا تو وانیہ مسکرا دی۔

”بواجی بچے اب فی دی پر جو چیزیں دیکھتے ہیں۔ وہی مانگتے ہیں، اچھا آپ جلدی سے ناشتا بنالیں۔ میں ذرا جانے کے لیے تیار ہو جاؤں۔“ وانیہ

”جانا تو چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ مگر اس طرح۔۔۔۔۔“ وہ کہتے، کہتے بھجکی۔

”کس طرح۔۔۔۔۔ کیا ہاتھی مھوڑوں کے ساتھ جانا چاہتی تھیں۔“ مٹی نے اس کی خاموشی پر اسے چھیڑا۔

”اس طرح۔۔۔۔۔ کا مطلب ہے، بلا ل اور ظلال کے لیے کسی گفٹ کے بغیر۔۔۔۔۔“ وہ زچ ہو کر بولی۔ ”وہ صرف میری پچھو کا گھر نہیں ہے۔ مہی بھابی، آپ کی بہن کا سرال بھی ہے۔ آپ کے حوالے سے میری اب انگ حیثیت ہے۔ میں خالی ہاتھ وہاں منداٹھا کر چل دوں۔۔۔۔۔ کیا اچھا لگے گا؟“ وانیہ کے چہرے پر پریشانی کے اثرات بالکل حقیقی تھے۔ مٹی کچھ متاثر ہوا پھر اس کے قریب ہو کر کندھوں سے تھامتے ہوئے رسائی سے کہنے لگا بلکہ مصنوعی سنجیدگی سے اسے چھیڑا۔

”اوہو۔۔۔۔۔ یار۔۔۔۔۔ واقعی یہ تو بہت بڑی پرابلم ہے۔۔۔۔۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ سیٹ تو کفرم ہو چکی ہے، اوکے۔۔۔۔۔ ڈونٹ وری۔۔۔۔۔ میں آپلی سے خود ایکسکوز کروں گا۔“

”آپ تو ایکسکوز کر لیں گے۔ مگر میرے حوالے سے ہمیشہ کے لیے بات رہ جائے گی کہ مجھے رشتوں کے حساب سے ملنے برتنے کا سلیقہ ہی نہیں ہے۔“ وہ قدرے سنجیدگی سے کہتی سامنے سے اٹھ کر ڈریسنگ روم کی طرف بڑھی تو مٹی ایک جست میں اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

”سوٹ ہارٹ۔۔۔۔۔ تم ٹینشن کیوں لے رہی ہو۔۔۔۔۔ کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ اوکے، ہاں ایک حل ہے تم وہاں جا کر بلا ل، ظلال کی پسند سے انہیں گفٹ لے دیتا۔“ ”میں ٹینشن نہیں لے رہی۔۔۔۔۔ بس ایک بات کہہ رہی تھی۔ شادی کے بعد بہت سی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ عموماً ملنے برتنے کے معاملات میں مرد بری الذمہ ہی رہتے ہیں۔۔۔۔۔ شکایت پیدا ہوتی ہے تو بیوی کو ہی سوز و اثرام ٹھہرایا جاتا ہے۔“

”اللہ! میری زوجہ محترمہ میں کس صدی کی رورے ڈال دی ہے تو نے۔۔۔۔۔“ مٹی نے اس کی سنجیدگی پر جیسے

نے کہا بول کی نرے کو پلاسٹک کور سے پیک کر کے فریزر میں رکھا اور پھر ہاتھ دھو کر جانے لگی تو بوانے پیچھے سے پکار کر پوچھا۔  
 ”میتا! کتنے دن کے لیے جا رہی ہو..... جو اتنا کچھ بنا دیا؟“

”بواجی! دو تین دن میں آ جاؤں گی میں۔  
 اللہ... اللہ پچھو کو صحت دے۔ میں تو ابھی نہ جاتی مگر کیا کروں جانا بھی ضروری ہے۔“  
 ”ہاں میتا! ضرور جاؤ۔ بلکہ تمہیں تو پہلے ہی جانا چاہیے تھا۔ گھر کی فکر مت کرو، میں سب سنبھال لوں گی۔“

”مجھے معلوم ہے بواجی آپ سب سنبھال لیں گی اسی لیے بے فکر ہو کر جا رہی ہوں۔“ وانیہ کو واقعی ان کی وجہ سے کافی اطمینان تھا اگر وہ نہ ہوتیں تو وہ جلنے کا سوچتی بھی نہیں۔ چلتے، چلتے وہ بار بار ناکوٹھی کو مختلف تانکیدوں سے باندھ رہی تھی کہ وقت پر کھانا اور دو کھانا، مٹی بچوں کو آفس سے آ کر پراپر ٹائم دے..... انہیں رات کو کہانیاں سنائے، اسکول ٹائم پر خود اٹھ کر انہیں دین میں بٹھائے..... جس پر مٹی نے اسے جھینڑا تھا۔

”اتنی بھاری ڈیوٹی میں تو نہیں دے سکتا۔ اپنے لاڈلے، دلاروں کی عادتیں اتنی نہیں بگاڑنی تھیں تمہیں.....“ گاڑی میں بیٹھی ثعلب کے ساتھ... انرپورٹ جاتے ہوئے وانیہ نے خاصی حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

”یہ آپ کہہ رہے ہیں؟ میں نے ان کی عادتیں بگاڑی ہیں؟“

”تو اور کیا.....؟ بچے تمہارے بغیر سوتے نہیں، تمہارے بغیر کھاتے نہیں، اٹھتے نہیں..... تمہارے بغیر میں ادھورا ہوں..... اب بتاؤ بھلا کس کا قصور ہے؟“ وانیہ آخری بات سن کر اسے خفگی سے دیکھ کر بولی۔

”اب ان باتوں کا مقصد..... میں نہ جاؤں؟“  
 ”یار اب کچھ کہوں گا تو لڑائی ہو جائے گی۔ میرے بڑے کہتے ہیں، بیوی میکے جا رہی ہو تو اسے

روکنے کی کوشش ریکارہوتی ہے۔“

”آپ ہی نے insist کیا تھا۔ آپ روک لیتے، میں نہ جاتی.....“ وانیہ اس کی فطرت سے کافی آگاہ ہو چکی تھی۔ اس کی چھیڑ چھاڑ کا برامانے بغیر جواباً خوشدلی سے بولی تو ثعلب بھی مسکرا دیا۔

”ہاں..... تاکہ کل کو تمہارے میکے میں، میں ظالم شوہر کے نام سے مشہور ہو چکا تا..... جو ان کی بیٹی کو ان سے ملنے نہیں دیتا۔“

”کوئی آپ کو میرے سامنے ایسا کہہ کر تو دکھائے..... میں اسے خود جواب دے لوں گی۔“ وانیہ نے فوراً سنجیدگی سے جواب دیا جس پر وہ مصنوعی حیرت ظاہر کرنے لگا۔

”واقعی.....؟ تم کسی اور کے سامنے بھی بول سکتی ہو؟ میں تو سمجھا تھا میری زوجہ محترمہ صرف میرے سامنے ہی بولتی ہے۔“ سبجے میں شرارت بھی وانیہ نے اسے قدرے خفگی سے دیکھا۔

”آپ کے کہنے کا مطلب ہے میں بہت زیادہ بولتی ہوں۔“

”میرے فرشتے گواہ ہیں، میں نے ایسا ہرگز نہیں کہا۔ اچھا چھوڑو، اب جاتے، جاتے ناراضی والا سین مت بناؤ۔ انرپورٹ آ گیا ہے، اب تو تمہیں جانا ہی ہے۔ بس پہنچتے ہی ایک کال ضرور کر دینا۔ اور جلدی آنے کی کوشش کرنا..... آئی مس یو سو چی.....“ گاڑی انرپورٹ کی حدود میں داخل کرتے ہوئے ثعلب نے قدرے جذباتی ہو کر اس کا ایک ہاتھ تھاما تو وہ جھینپ کر جڑ بڑ ہوئی۔

”آپ بھی ذرا دھیان سے گاڑی چلائیں۔ زیادہ رو میٹک ہونے کی ضرورت نہیں۔ لوگ کیا کہیں گے۔“ وانیہ نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے جھینڑا۔

”کیا کہیں گے.....؟ میری وائف پہلی بار اپنے میکے جا رہی ہے، اتنا رو میٹک تو فرسٹ ٹائم پر ہر ہر بینڈ ہوتا ہے۔ ہاں ذرا معاملہ پرانا ہو جائے تو بیچارہ شوہر گھر سے ہی رخصت کر کے شکر ادا کرتا ہے۔“ ثعلب نے



والا تھا، وہ اس سے معذرت کرنے لگی۔  
”میں آپ کو اسلام آباد انٹرپورٹ پر اتر کر کال کروں گی۔“

”او کے ٹیک کیئر... سوئٹ ہارٹ...“ وانیہ کی آواز سن کر ساری کنگ معدوم ہو گئی تھی۔ وانیہ کی محبت اتنی طاقتور ضرور تھی جو یوں بھر میں ماضی کی یادوں کو دھوئیں کی طرح تحلیل کر گئی تھی۔

☆☆☆

”شکر ہے پھوپھا آپ بہتر نظر آ رہی ہیں۔ ہم سب تو بہت پریشان ہو گئے تھے۔“ وانیہ، سعیدہ خانم کے پہلو سے لگی اپنی فکر و چاہت کا ثبوت دیتی انہیں بے حد پیاری لگی۔

”بیٹا تم سچے تو یونہی پریشان ہو جاتے ہو بڑھاپا آ گیا ہے ذرا سا مسکمی نزل، زکام بھی جان کو آ جاتا ہے۔ باحق سب کو فکر مند کر دیا صہیلی نے۔“

”ای جان! ہم صحیح فکر مند تھے۔ آپ کو وودن تو ہوش ہی نہیں تھا اپنا... شہو نے بھی وودن آپ کے سر ہانے بیٹھ کر گزارے ہیں۔“ صہیلی چائے کی ٹرالی ملازمہ کے ہمراہ لے کر آئی تو سعیدہ خانم کی بات کا بڑی رسانییت و اپنائیت سے جواب دیا۔

”ہوا کیا تھا پھوپھو کو...؟“ وانیہ نے جائے کا کپ لیتے ہوئے پوچھا تو صہیلی بھی تفصیل بتانے لگی۔

”ای جان نے پچھلے دنوں کچھ زیادہ ہی پریز کر لیا تھا۔ ہمیں پچا ہی نہیں چلا ان کی شوگر لو ہو گئی۔ بھی یہ بے ہوش ہو گئیں... وہ تو اسپتال لے کر گئے تو معوم ہوا۔“

”پھوپھا آپ اتنا بھی پریز نہیں کیا کریں... تھوڑا بہت میٹھا لے لیا کریں۔ بابا کو بھی یہی پراہم ہے۔ میں تو بابا جان کو ای جان کے منع کرنے کے باوجود سوئٹ ڈشز کھلا دیتی تھی۔“ وانیہ، پھوپھو کو مشورہ دے کر اپنی یادیں بانٹنے لگی تھی۔ سعیدہ خانم نے بھی کوقدرے ملال سے دیکھا۔ باپ اسی شہر میں موجود تھا مگر باپ، بیٹی کے ملنے پر پابندی تھی گزشتہ روز ہی کریم احمد نے

کار پارکنگ میں لگا کر اس کا چھوٹا سا سفری بیک ڈی سے نکالا۔

”تو آپ میرے جانے کے بعد شکرانہ ادا کریں گے؟“ وانیہ اس کے ہم قدم چلتے ہوئے اس کی بات سے محکوم ہوئی تھی۔

”ابھی مجھ پر وہ وقت کہاں آیا ہے۔ ابھی تو میں تمہاری واپسی کی دعاں کر رہی ہوں گا... ہاں ایسا کچھ عرصے بعد ہو سکتا ہے کہ تمہارے جانے کے بعد میں بھی شکرانہ ادا کیا کروں۔“

”بے فکر رہیں، میں آپ کو ایسا موقع ہرگز نہیں دوں گی... آئندہ آپ کے ساتھ جاؤں گی ورنہ نہیں جاؤں گی۔“ وانیہ نے جواباً اسے حیران کر دیا۔

”رنگی! کرو وعدہ...“ ثعلب نے چلتے چلتے رک کر اپنا ہاتھ اس کے آگے پھیلا یا تو وانیہ نے بھی فوراً اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”وعدہ...“ ایک یاد کی کنگ لمحے بھر کو ثعلب کی آنکھوں میں لہرائی تھی۔ رومانہ نے بھی کبھی اسی طرح کچھ وعدے کیے تھے، قسمیں کھائی تھیں، جن کا وہ امیر ہوا تھا۔ وانیہ بیک لے کر ڈیپارچم لائونج کی طرف بڑھ کر الوداعی ہاتھ لہرائی تھی۔ ثعلب نے بھی میکا کی انداز میں ہاتھ لہرا کر رخصت کیا تھا... واپسی پر اس کا دل بھی بو بھل تھا اور ذہن بھی... ایک یاد کی کنگ تھی دوسرے وانیہ کی جدائی کا احساس... اپنی یادوں کے خیال پر وہ واپسی پر خود کو ملامت کر رہا تھا۔

”ثعلب فاران یہ تم کیا کر رہے ہو... تمہاری شگت میں تمہاری بیوی بھی اور تم رومانہ کو سوچ رہے تھے... اگر وانیہ جان جاتی تو کیا ہوتا... وہ تمہارے لیے تمہارے گھر کے لیے اس قدر خلص و فکر مند ہے اور تمہیں اس کے خلوص و محبت کے بجائے وہ لمحے یاد آ رہے تھے، جن کا تعلق زندگی کی حقیقتوں سے نہیں ہے۔ تم پھر سے کسی سراب کے گرداب میں گھسنے رہے ہو۔“ وہ خود کو سرزنش کرتا ڈرائیو کرتے، کرتے اپنے سیل فون پر وانیہ کا نمبر ڈائل کر بیٹھا... جہاز اڑنے

بہن کو طاہرہ کے جھگڑے کا قصہ سنایا تھا۔

”بد بخت شوگر بھی کوئی بلا ہے، ڈاکٹر بھی تو ڈراستے رہتے ہیں۔ خیر..... دفعہ کرو میری بیماری کو..... اب تو میں بھلی چکی ہوں، تم بتاؤ ثعلب تمہاری نانوسب ٹھیک ہیں۔“

”سب خیریت سے ہیں پھوپھو..... نانو تو بہت فکر مند تھیں۔ انہوں نے ہی مجھے اصرار کر کے بھیجا ہے۔ ورنہ میں تو بچوں کی چھٹیوں میں آ جاتی۔“

”ہاں تو پھر آ جانا چھٹیوں میں، تمہارا اپنا گھر ہے، ابھی کتنے دن رکو گی؟“ سعیدہ خانم نے اس کا کندھا تھپتھا کر جیسے اپنے ساتھ کا احساس دلایا۔

”دو تین دن کا کہہ کر آئی ہوں پھوپھو.....“

”صرف دو، تین دن.....؟ اتنی جلدی ہم تمہیں نہیں جانے دیں گے۔“ مہیلا آپنی نے اس کی طرف بلسکت بڑھاتے ہوئے خاصی اپنائیت سے کہا تو سعیدہ خانم بھی تاسف اُبولیں۔

”ہاں بالکل..... کچھ دن تو رکو..... میں کریم کو بھی فون کرتی ہوں۔ وہ بھی تم سے ملنا چاہ رہا تھا۔“

”بابا جان سے بھی مل لوں گی مگر مجھے دو دن بعد ضرور جانا ہے۔ میری غیر موجودگی سے بھی ڈسٹرب ہوں گے..... سنی، گولڈی تو مجھے آنے ہی نہیں دے رہے تھے۔“

”بچوں کو مھی سنبھال لیتا ہے، تم فکر مت کرو۔ میں خود بات کروں گی..... پہلی دفعہ میٹھے آئی ہو..... آرام سے رہو۔“ مہیلا آپنی نے اس کی ایک ٹیمپل سنی.....

فی الحال وہ بھی خاموش ہو گئی تھی۔ جانے کا پروگرام پہلے سے بتا کر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔

☆☆☆

دانیہ رات کے کھانے کے بعد لان میں نکل آئی تھی۔ مہیلا کچن سمیٹ رہی تھی اسی لیے اسے ٹی وی دیکھنے کا مشورہ دیا تھا مگر وہ لان میں چلی آئی تھی۔ اسے بچوں سے بات کرنی تھی۔ ثعلب کا نمبر ملا کر اس نے کان سے لگا لیا تو اگلے ہی لمحے اس کی کال کاٹ دی

گئی۔ دو تین بار کی کوشش کے بعد بھی نتیجہ یہی رہا تو دانیہ کو پریشانی لاحق ہوئی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ ثعلب اس کی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ دانیہ کو سو طرح کے وہم و خیال پریشان کرنے لگے تھے۔ سب سے پہلا خیال تو نانو کی طبیعت کے حوالے سے آیا تھا یا پھر سنی، گولڈی کے بارے میں..... دونوں بہن بھائی لڑنے پر آتے تھے تو کسی کی نہیں سنتے تھے۔ سنی تو گولڈی کی چیزیں توڑ پھوڑ دیتا تھا۔ یہ تو دانیہ نے ہی انہیں کافی سکھایا۔ بجھایا تھا تو وہ دونوں منع ہوئے تھے۔ وہ اپنی پریشان سوچوں میں غلطیاں تھی اسی لمحے ثعلب کی کال آ گئی۔

”سوری یار..... تمہاری کال ڈسکنیکٹ کر دی تھی۔ یہاں ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔“ وہ کال ریسیو ہوتے ہی بولا۔

”کیسا ہنگامہ..... خیریت ہے ناں.....؟“ دانیہ حقیقی طور پر پریشان ہو گئی تھی۔

”خیریت کہاں..... تم نے دونوں کے لیے جو..... سر پرانز رکھا تھا۔ وہ گولڈی کے ہتھے چڑھ گیا..... اس آفت کی پرکالہ نے سنی کے حصے کی چاکلیٹ بھی کھالی اور اس کی اسٹوری بک پر لائنز بھی لگا دیں۔ اب سنی بھی بدلے لیے بغیر اسے بخشے پر تیار نہیں ہے۔ کہتا ہے کہ اس کے ڈول ہاؤس کو توڑ کے سوئے گا۔“ مھی اسے وجوہات بتانے لگا۔

”یہ تو بہت برا ہوا۔ حالانکہ میں نے دونوں کے الگ، الگ پکٹ بتائے تھے۔ میں اسی لیے کہتی ہوں کہ بچوں کو الٹے سیدھے کارڈون نہیں دیکھنے چاہئیں۔ پنچے اگیر یہ ہونے لگتے ہیں۔“

”ہاں صحیح کہہ رہی ہو..... مگر بچوں کو بھلا نا اسی طرح آسان لگتا ہے..... دلیل پلیز تم بس آ جاؤ..... پھوپھو جان اب ٹھیک ہیں ناں.....“

”کیا.....؟“ مھی کی بات پر وہ حیران ہوئی۔

”آپ نے کیا کہا.....؟ میں آج ہی تو آئی ہوں۔“

”یار..... نہیں سنبھل رہے یہ شیطان مجھ سے۔ یونوکل فن لینڈ جانے کے وعدے پر بڑی مشکل

”تم جو چاہے سمجھو..... مگر یہ میری محبت ہے۔“  
 دونوں دیر تک اسی طرح چھینر چھاڑ کرتے رہے۔ شہود  
 کافی دیر سے کھڑکی کا پردہ ہٹائے سگار پیتے ہوئے لان  
 کا نظارہ کر رہے تھے۔ کھڑکی سے ذرا فاصلے پر بیچ پر  
 تینھی وانہیہ کے چہرے پر پڑتی پولیسپ کی روشنی اس  
 کی اندرونی ویرانی خوشی کو چھلکانی اسے بے حد حسین  
 دکھا رہی تھی۔

”وانہیہ کو دیکھ رہے ہیں.....؟“ غمی سے بات کر رہی  
 ہے۔ ”صہبی ذرا دیر میں متوجہ ہو کر دیکھنے لگیں۔  
 ”ہوں.....“ شہود نے گہری سانس لے کر پلٹ  
 کر بیڈ تک آتے، آتے اپنے اطمینان کا اظہار کیا۔  
 ”شکر ہے، ہمارا فیصلہ درست رہا۔“ سچ پوچھو تو امی جان  
 نے جب یہ ذمے داری اپنے سر لی تو میں زیادہ مطمئن  
 نہیں تھا۔ غمی کی رومانہ سے نمٹتھی..... مجھے زیادہ  
 یقین نہیں تھا کہ وہ اپنی زندگی میں کسی دوسری لڑکی کو دل  
 سے جگہ دے گا..... مگر وانہیہ کو خوش دیکھ کر لگتا ہے کہ  
 دونوں میں اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔“  
 ”صرف انڈر اسٹینڈنگ ہی نہیں..... دونوں میں  
 بے حد محبت اور ایک دوسرے کے لیے احترام بھی ہے اور  
 مجھے یقین ہے دونوں کی یہ محبت ہمیشہ قائم رہے گی۔“  
 ”آمین.....“ شہود نے بے ساختہ کہا تو صہبی  
 نے بھی دل سے تائید کی۔

☆☆☆

کریم احمد، سعیدہ خانم کے بلانے پر آفس  
 ٹائمنگ میں وانہیہ سے ملنے آئے تھے..... سعیدہ باپ،  
 بیٹی کو تنہا چھوڑ کر ظہر کی نماز کے بہانے اپنے کمرے  
 میں چلی گئی تھیں۔ جبکہ صہبی دوپہر کے کھانے کے  
 انتظام میں لگی ہوئی تھی..... کریم احمد کو سمجھ نہیں آ رہی تھی  
 کہ وہ بیٹی سے کیا بات کریں..... وانہیہ کو بھی ان کی  
 خاموشی کھل رہی تھی آخر اسی نے ابتدا کی۔  
 ”بابا جان..... کیا آپ مجھ سے یہ بھی نہیں  
 پوچھیں گے کہ میں کیسی ہوں..... اپنے گھر میں خوش  
 ہوں یا نہیں..... اور.....؟“

سے مانے ہیں۔“  
 ”سچ، سچ بتائیں، بچے نہیں سنبھل رہے  
 یا..... آپ.....“ وانہیہ نے بھرپور شرارت سے کہا تو غمی  
 نے یک دم بے ساختہ تہقید لگایا۔  
 ”نیا..... یہ تم ہی ہوتا.....؟ آئی کانت  
 بلیو.....“ غمی کافی محفوظ ہوا تھا۔ ”v e r y  
 pleasant change یہ سارا اکمال میری  
 صحبت کا ہے نا؟“

”لے لیں آپ سارا کریڈٹ.....“ وانہیہ نے  
 مصنوعی خفگی ظاہر کی۔

”میں کیا غلط کہہ رہا ہوں.....؟ شادی سے پہلے  
 تمہیں بولنا بھی نہیں آتا تھا، کچھ یاد ہے جب میں آپلی  
 کی طرف آیا تھا تو محترمہ کی بولتی بھی بندھتی۔“  
 ”وہ تو میں شرم سے نہیں بول پاتی تھی..... ورنہ  
 اپنے کانچ کی بیسٹ ڈیسٹر رہی ہوں۔“

”بھئی میں تو ہوں ہی تم سے امپرئیس..... مزید  
 ضرورت نہیں ہے، بس یہ بتاؤ کل آ رہی ہوتا.....“  
 ثعلب نے بہ اصرار پوچھا تو وہ یک دم سنجیدہ ہو کر  
 معمول کے انداز میں بولی۔

”ثعلب..... اتنی جلدی؟ ابھی تو میں بابا جان  
 سے بھی نہیں ملی ہوں..... اور صہبی بھابی تو مجھے کافی دن  
 روکنے کا پروگرام بنائے بیٹھی ہیں۔“

”ان کے پروگرام ان کے ساتھ رہنے دو، تم کل  
 اپنے بابا سے مل لو اور پلیز پرسوں تک آ جاؤ۔“ وہ ہنسی ہوا۔  
 ”میں دیکھتی ہوں..... اگر پھپھو اور بھابی نے  
 اجازت دے دی تو..... میں آ جاؤں گی ورنہ.....“

”اب زیادہ سرنہ چڑھو..... اتنی فٹیں کوئی شوہر  
 نہیں کرتا..... معلوم ہے ناں تمہیں دیکھے بنا صبح  
 نہیں ہوتی میری..... یہ کرا، یہ بستر کاٹ کھانے کو دوڑ  
 رہے ہیں مجھے..... میں نے کہہ دیا ہے پرسوں تم واپس  
 آ رہی ہو بس.....“ اس کی محبت کا احساس وانہیہ کی  
 سرشاری میں اضافہ کر گیا۔

”اچھی دھونس ہے۔“ وہ بے ساختہ کھٹکھٹائی۔

”بیٹا..... یہ باتیں پوچھی نہیں جاتیں۔ نظر آجاتی ہیں۔ محسوس ہو جاتی ہیں..... ماشاء اللہ تم خوش ہو..... مجھے محسوس ہو رہا ہے۔ آخر باپ ہوں تمہارا..... اتنا تو جان سکتا ہوں ناں.....“ انہوں نے سنجیدگی سے بولتے ہوئے پاس بیٹھی دانیہ کا سر تھپتھپایا۔

”مگر بابا جان مجھے آپ بہت کمزور اور اداس محسوس ہو رہے ہیں۔ کیا آپ اپنا خیال نہیں رکھ رہے..... اپنا چیک اپ تو کروا رہے ہیں ناں.....“

”تمہاری امی کے بعد میرا خیال رکھنے والا کون رہا ہے بیٹا۔“ کریم احمد نے بے ساختہ کہا تو عرصے بعد ان کے منہ سے اپنی ماں کا ذکر اسے حیران کر گیا۔

”بڑی امی آپ کا خیال نہیں رکھتیں؟“

”اس عورت کو میرے ساتھ لڑنے بھگڑنے سے فرصت ملے تو وہ کچھ اور سوچے ناں..... بس گڑے مردے اکھاڑ کر خود بھی پریشان رہتی ہے اور مجھے بھی پریشان رکھتی ہے۔“

”بابا جان..... آپ انہیں اطمینان دلا دیں کہ اب امی تو اس دنیا میں ہی نہیں رہیں..... اور میں بھی آپ کی ذمے داری نہیں رہی..... وہ بے فکر ہو جائیں..... میں کبھی ان کی زندگی میں مخل ہونے نہیں آؤں گی۔“ دانیہ رسائییت سے بولتی آخر میں آزر وہ ہو گئی..... تو کریم احمد نے ایک بار پھر شفقت و محبت سے بیٹی کو تھپکا۔

”مجھے یہی تو دکھ ہے کہ میری بیٹی اپنے باپ کے گھر میں ایک دن کے لیے بھی نہیں آسکتی جبکہ بیٹیوں کا تو مان ہی باپ کا گھر ہوتا ہے۔“ کریم احمد آبدیدہ ہو گئے..... دانیہ سے باپ کی رفیق انقلبی دیکھی نہیں گئی فوراً تسلی آمیز لہجے میں گویا ہوئی۔

”میرا مان تو اب بھی آپ ہی ہیں ناں..... بس آپ زیادہ نہ سوچا کریں، سچ پوچھیں تو مجھے تو خود کہیں بھی رہنے کی فرصت نہیں ہے۔ صرف پچھو جان کی خاطر اپنا گھر چھوڑ کر آئی ہوں۔ سب گھر والے بے حد مس کر رہے ہیں مجھے..... ہو سکتا ہے میں آج رات کو

ہی چلی جاؤں.....“ دانیہ اپنے احساسات ظاہر کر کے اپنے بابا کو مزید پریشان نہیں کر سکتی تھی۔ پچھونے اسے بتا دیا تھا کہ کس طرح ظاہرہ نے ان کا جینا دو بھر کر رکھا ہے۔ اب بھی وہ اس سے ملنے چوری چھپے آئے تھے۔ کریم احمد مزید کیا کہتے بس بیٹی کو دیکھ کر رہ گئے۔

☆☆☆

”ابھی ابھی شعب کا فون سن کر ناراض ہوئی تھیں۔ ان کی جھنجھلاہٹ ان کے رویے سے واضح تھی۔ وہ خفگی سے بولتی ساس کے سامنے بیٹھ نہیں۔ اس وقت دانیہ بھی وہاں تھی۔

”عجیب لڑکا ہے، دو دن نہیں ہوئے تمہیں آئے ہوئے اور کہہ رہا ہے کہ تمہیں واپس بھجوا دوں..... شادی کے بعد پہلی بار آئی ہو تم..... اس طرح کیسے جانے دوں تمہیں۔“

”وہ بھابی دراصل سنی، گولڈی بہت یاد کر رہے ہیں..... ہم سب نے ایک ساتھ آنے کا پروگرام بنایا تھا تو اس لیے وہ زیادہ ہی پریشان کر رہے ہیں۔“ دانیہ نے اپنے طور پر صفائی دینے کی کوشش کی تو وہ مزید جھلائی۔

”بچوں کا کیا ہے، ضد کرتے ہیں پھر بہل جاتے ہیں۔ اب اتنی دور آئی ہو تو چار دن تو رہو..... امی جان بھی تمہارے آنے سے کافی بہتر نظر آ رہی ہیں۔ ماسوں جان بھی یہاں تم سے ملنے آسکتے ہیں..... اپنے گھر میں تو وہ ممانی جان کی وجہ سے نہیں بلا سکتے۔“

”بھابی جان! بابا جان کو مزید شرمندگی سے بچانے کے لیے بھی میرا جانا بہتر ہی ہے..... میں جتنے دن یہاں رہوں گی وہ مجھ سے ملنے آئیں گے اور پھر بڑی امی ان سے بھگڑتی رہیں گی۔ میں نہیں چاہتی بابا جان کے گھر کا سکون میری وجہ سے خراب ہو۔“ دانیہ نے بڑی رسائییت سے بات ختم کرنا چاہی تو صہمی بھابی قدرے زچ ہو کر بولیں۔

”ممانی جان کے جھگڑے تو تاحیات رہیں گے۔ تم ماسوں جان کی جائز اونا دو..... اس طرح اپنا حق چھوڑ کر اپنی ہی زندگی مشکل بناؤ گی..... اور کسی وقت



”ٹھیک ہے میں پھر بھی احتیاطاً ڈرائیور سے کہتی ہوں کہ وہ بھی تیار رہے۔ دس منٹ میں ہمیں نکل جانا چاہیے۔“ صہبی بھائی سے لاؤنج میں چھوڑ کر گئیں تو اس نے پھر سے کال ملائی۔ اسی اثنا میں سعیدہ خانم بھی وہاں چلی آئیں۔ فیل سلسل جاری تھی مگر..... کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا..... اسے فکر لاحق ہو گئی۔

☆☆☆

وانیہ کی فلائٹ صبح گیارہ بجے کی تھی۔ کریم احمد کا ارادہ تھا کہ وہ ناشتا کیے بغیر وانیہ کو لینے نکلیں گے مگر ان کے ارادوں پر طاہرہ نے پانی پھیر دیا تھا۔ انہیں جانے کیسے سن گئی گئی تھی۔ وہ صبح سے شوہر کا سیل فون سائلنٹ پر کرنے کے بعد فون بھی غائب کیے بیٹھی تھیں۔ دونوں میں کافی دنوں سے بات چیت بند تھی اسی لیے کریم احمد خود ہی پریشان ہو کر فون ڈھونڈنے کی کوشش کے ساتھ جھنجھلا تے، بڑبڑاتے پھر رہے تھے۔

”ہزار بار منع کیا ہے، میری چیزوں کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ رات کو سر ہانے رکھ کر سویا تھا کہاں چلا گیا میرا فون..... راتوں رات اس کے پیر لگ گئے یا پر نکل آئے تھے۔“ وہ اب ملازموں کو جمع کیے ان پر چلا رہے تھے۔ ”جس کا بھی یہ کام ہے مجھے بتادے ورنہ پھر مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“

”صاحب..... ہم سے قسم لے لیں..... ہم سب نے آپ کا نمک کھایا ہے، ہم کیوں چوری کریں گے۔ ہم نے تو کبھی آنکھ اٹھا کر بھی کسی چیز کو نہیں دیکھا۔“ شرفو میاں سب ملازمین کی گواہی دیتا کھٹکھٹا کر بولا۔

”شرفو میاں، جاؤ اپنا کام کرو..... انہیں تو اپنی چیزیں رکھ کر بھولنے کی عادت ہو گئی ہے۔ فون گھر پر لاتے تو گھر پر ملتا..... کل گئے ہوئے تھے خاص ملاقات پر وہ ہیں چھوڑ آئے ہوں گے۔“

”تم..... تم میری جاسوسی کرتی رہی ہو.....؟“

طاہرہ بیگم نے درمیان میں مداخلت کی۔ طاہرہ کے طے کئے انداز پر وہ ایک دم چونک کر سڑے۔

پر پچھتاؤ گی..... ارے بیٹی باپ سے نہ ملے اس کے گھر نہ جاسکے یہ کہاں کا انصاف ہے۔ میں تمہاری جگہ پر ہوں تو شادی کے اگلے دن ہی ان کے سر پر پہنچ جاتی۔“

”بھابی جان، جہاں دل سے قبول نہ کیا جائے وہاں مسلط ہونے کا فائدہ..... میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ سبھی نے مجھے دل سے قبول کر کے اپنی محبتیں اور مان دیا ہے۔ بابا کی مجبوری اگر میں نہیں سمجھوں گی تو مجھ میں اور ان میں کیا فرق ہے۔“ سعیدہ خانم جو بالکل خاموشی سے دونوں کی باتیں سن رہی تھیں اسے سراہتے ہوئے بولیں۔

”بالکل صحیح کہہ رہی ہو..... بیٹیاں ہی والدین کی مجبوریاں سمجھتی ہیں۔ تم دل پرست لو ایک دن طاہرہ کو بھی عقل آ ہی جائے گی۔ ٹھیک ہے ابھی اگر ثعلب تمہیں بلارہا ہے تو جاؤ..... اپنے گھر میں خوش رہو، آباد رہو، میں اب بالکل ٹھیک ہوں.....“ سعیدہ خانم نے اسے اجازت دے دی تھی۔ صہبی کچھ کہتا چاہتی تھی مگر انہوں نے اشارے سے منع کر دیا۔

☆☆☆

کریم احمد نے وانیہ کو فون کر کے کہہ دیا تھا کہ وہ اسے خود اتر پورٹ چھوڑنے جائیں گے۔ وانیہ نے منع بھی کیا تھا مگر وہ بضد تھے۔ سو وہ اپنا سامان پیک کیے انہی کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

”وانیہ! ماموں جان آرہے ہیں یا میں تمہیں ڈراپ کراؤں؟“

”میں نے کال تو کی تھی مگر انہوں نے ریسیو نہیں کی..... شاید بابا جان راستے میں ہوں۔“ وہ ایک دم سنبھل کر بتانے لگی صہبی نے بھی غور نہیں کیا ورنہ اس کی..... آنکھوں کی نمی انہیں پریشان کر دیتی۔

”ایک بار پھر ٹرائی کر کے پوچھ لو..... ایک گھنٹا تو راستے میں لگ جائے گا۔ اگر رش ہوا تو مشکل ہو جائے گی۔ کہیں فلائٹ مس نہ ہو جائے۔“ صہبی نے فکر مندی سے مشورہ دیا تو وہ سر ہلانے لگی۔

”میں فون کرتی ہوں۔“

”جوانی میں تو تم پر نظر نہ رکھ سکی، اب بڑھاپے میں تمہاری کیا جاسوسی کرواؤں گی۔ ویسے بھی تم جیسے گتے مرد اپنے پکڑائی دیتے کہاں ہیں۔“

”تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئی ناں..... شرافت سے میرا فون لا دو..... وانیہ کا فون آ رہا ہوگا..... مجھے اسے اتر پورٹ چھوڑنے جانا ہے۔“ کریم احمد کو اندازہ ہو گیا تھا کہ فون بہرہ کے پاس ہے۔

”بھئی اپنی باقی اولاد کی ذمہ داری بھی اس طرح اٹھائی تھی۔ جس طرح اپنی جیتی کے لیے بے چین ہو رہے ہو۔“ طاہرہ کا زہر خند لب دلچہ کریم احمد کو بھی زہر لگ رہا تھا۔

”ساری زندگی تمہاری اولاد ہی کی تو ذمہ داری اٹھائی ہے، اس مسکین کو تو میں چار دن اپنے گھر میں نہ رکھ سکا۔ تمہاری اولاد کے لیے کیا کچھ نہیں کیا، آج دونوں بیٹے تنہا چھوڑ کر گھر اور کاروبار الگ کر کے بیٹھے ہیں۔ صرف اور صرف تمہاری شہ پر۔“

”اچھا..... اب سارا الزام میرے سر پر رکھ دو..... وہ بھی تمہاری اولاد ہی ہیں۔ انہیں جب پتا چلا کہ باپ نے ایک اور حصے وار پیدا کر رکھا ہے تو وہ اپنا اپنا حق لے کر الگ ہو گئے۔ تو کیا برا کیا۔“

”اس حصے دار کو میں نے کیا دیا.....؟ اپنی محبت تو میں اسے دے نہیں سکتا۔ دیکھو طاہرہ میرے ساتھ اس معاملے میں خدمت لگاؤ ایسا نہ ہو تم اپنی ضد کے ساتھ تنہا رہ جاؤ۔“ کریم احمد بھڑک کر بولتے، بولتے یک دم سرد لہجے میں کہہ کر وہاں سے چلے آئے۔ طاہرہ کے تن بدن میں آگ سلگ اٹھی۔ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وانیہ ان کے سامنے آئے اور وہ اسے خاکستر کر دیں۔ اپنے جوش میں وہ کمرے میں آئیں اناری سے فون سیٹ نکال کر وانیہ کا نمبر نکال کر ڈائل کرنے لگیں۔ وانیہ اور صہبی پورچ میں کھڑی تھیں۔ ذرا نیور اس کا سامان ڈکی میں رکھ رہا تھا۔ بھی وانیہ کے سیل فون کی ٹیون بجنے لگی۔ صہبی بھی متوجہ ہو گئی..... وانیہ فون سننے لگی۔

”اسلام علیکم بابا جان.....! آپ ٹھیک تو ہیں، آپ کال ریسیو کیوں نہیں کر رہے تھے؟“ وانیہ کی بے چینی دیدنی تھی۔ دوسری طرف طاہرہ کاٹ دار انداز میں جودل میں آ رہا تھا بولے جا رہی تھیں۔

”بات سنو لڑکی! آئندہ کریم احمد کو فون کرنے کی یا ملنے کی کوشش مت کرنا..... سمجھ لو کہ جس طرح تمہاری ماں مر گئی اسی طرح تمہارا باپ بھی..... سن رہی ہو ناں میں کیا کہہ رہی ہوں۔“ وہ مزید کچھ کہہ رہی تھیں مگر وانیہ نے فون بند کر دیا تھا..... وہ جیسے شدید صدمے کے اثر میں تھی۔ صہبی اس سے کچھ پوچھ رہی تھی۔ بتا رہی تھی مگر وہ تو کم صم سی ہو گئی تھی۔ صہبی نے اسے بازو سے پکڑ کر گاڑی میں بٹھایا۔

کریم احمد ذرا نیور کے ساتھ گھر سے نکلے غصے نے ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو جیسے ماؤف کر دیا تھا۔ گھر سے ذرا دور جانے کے بعد ان کے ذہن نے کام کیا پھر انہوں نے اپنے ذرا نیور سے اس کا سیل فون لے کر وانیہ کا نمبر ملایا تو اس کا سیل فون بند جا رہا تھا۔ انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اتر پورٹ کے لیے نکل چکی ہوگی۔ انہوں نے پھر بھی اپنی تسلی کے لیے سعیدہ خانم کے گھر کا نمبر ملایا تو انہیں معلوم ہو گیا کہ وہ ان کا انتظار کرتے، کرتے صہبی کے ساتھ جا چکی ہے۔ کریم احمد عجیب سی کشمکش محسوس کر رہے تھے۔ وانیہ سے محبت فطری تھی..... طاہرہ ان کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کر رہی تھی جو ان سے برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

ہم ہوا ہوا

صہبی کے اصرار پر آخر روتے ہوئے وانیہ نے طاہرہ بیگم کی باتیں دہرائیں تو صہبی بھی دنگ رہ گئی۔

”ممائی نے تم سے یہ سب کہا.....؟“ آف کتنی بے حس عورت ہیں..... تم فکر نہ کرو..... میں امی جان سے کہوں گی..... خوب خبر لیں گی۔ استغفار..... اپنی ضد میں اپنے ہی شوہر کو مردہ کہہ دیا۔“ صہبی کی حیرت کم نہیں ہو رہی تھی۔ جبکہ وانیہ کا روٹا کم نہیں ہو رہا تھا۔ صہبی نے بڑی مشکل سے اسے کندھے سے لگا کر

نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ اور دیکھو اپنا حق لینے سے انکار نہ کیا کرو۔۔۔۔۔ تمہارا یہ گریز تم سے تمہارا سب کچھ بھی چھین سکتا ہے۔“ کریم احمد نے اس کے سر کو تھکتے ہوئے رندھے گھٹے سے کہا تو اس کی آنکھیں پھر سے چمک پڑیں۔

”بابا جان۔۔۔۔۔ مجھے واقعی کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے اگر کچھ چاہیے تو صرف آپ کی زندگی، سلامتی، آپ کا سکون، پیار بابا جان آپ بڑی امی کو خوش رکھیں۔ وہ جو کہتی ہیں مان جائیں۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے کوئی حق نہیں چاہیے۔ آپ میرے بابا ہیں، میرے لیے یہی کافی ہے۔“ کریم احمد کو اس کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ظاہرہ نے اس سے کچھ نہ کچھ ضرور کہا ہے۔ وہ اسے تسلیم کرنا چاہتے تھے مگر آخری اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی۔ صہبی بھالی نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے جاتے ہی صہبی بھالی نے ظاہرہ ممانی کی کہیا بات بتا کر انہیں پریشان کر دیا۔

”ماموں جان۔۔۔۔۔ ممانی جان کی نیچر تو آپ جانتے ہیں۔ ایسا نہ ہو وہ ہمارے خاندان میں جا کر انی سیدھی باتیں کر کے وانیہ کو شرمندہ کروائیں۔ وہ مجھے بھی کئی بار فون کر کے عجیب و غریب باتیں کرتی رہی ہیں۔ وہ تو میں حقیقت سے آگاہ ہوں اسی لیے۔۔۔۔۔ پلیز آپ پہلے ظاہرہ ممانی کو کسی طرح قائل کر لیں کہ وانیہ بھی آپ کی اولاد ہے۔ اس کے بھی آپ پر حقوق ہیں۔ اگر وہ قائل نہیں ہو رہی ہیں تو میری مائیں۔۔۔۔۔ فی الحال وانیہ کو اپنے ہونے کا احساس نہ دلایا کریں۔ وہ اپنے گھر میں ایڈجسٹ ہو چکی ہے۔ ممانی جان کا رویہ اسے ڈسٹرب کر سکتا ہے۔“ صہبی کافی سنجیدہ تھی۔ اسے واقعی اپنے بھائی کے گھر کا سکون بھی درکار تھا۔ اسے ڈر تھا ظاہرہ ممانی کی باتیں وانیہ کے رویے اور اخلاق کو متاثر نہ کریں۔ کریم احمد کے پاس فی الحال کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ صہبی کو کیا خدشات لاحق تھے اور وہ ایسے بے جا بھی نہیں تھے۔

☆☆☆

وانیہ جہاز میں بیٹھتے ہی پھر سے بے اختیار ہو گئی

سنبھال لیا تھا۔

”بس کرو وانیہ۔۔۔۔۔! کیوں اپنا خون جلارہی ہو۔۔۔۔۔ ان کی تو عادت ہی ہے۔ ساری زندگی ماموں جان کو سکون نہیں لینے دیا۔۔۔۔۔ بہوؤں، بیٹوں کو اکسا، اکسا کر خود سے ہی دور کر دیا۔۔۔۔۔ حتیٰ کہ اپنی بیٹیوں کو بھی ورغلائی رہتی ہیں کہ اپنے شوہروں کی ہر حرکت پر نظر رکھیں مگر خود کو بدلنے پر تیار نہیں۔۔۔۔۔ تمہیں ان کی باتوں کا زیادہ اثر لینے کی ضرورت نہیں۔“ صہبی رسائیٹ سے بولتی اسے تھپک رہی تھی۔

”مگر بھالی جان۔۔۔۔۔ وہ اس طرح تو نہ کہتیں۔۔۔۔۔ میری عمر بھی بابا جان کو لگ جائے۔ وہ تا قیامت سلامت رہیں۔۔۔۔۔ انہوں نے میرا کتنا دل دکھایا ہے وہ بس کہہ دیتیں۔۔۔۔۔ میں ان سے ہرگز نہ ملتی مگر۔۔۔۔۔“ ان کے کہنے سے تم اپنے بابا جان سے اپنا رشتہ تو ختم نہیں کر سکتی ہو۔۔۔۔۔ خود کو سنبھالو۔۔۔۔۔ اپنے گھر جاری ہو خوش، خوش جاؤ۔۔۔۔۔“

”ہوں۔۔۔۔۔“ صہبی بھونی نے اس کے آنسو خود صاف کیے تو وانیہ کو بھی مجبوراً سنبھل جانا پڑا۔

☆☆☆

وہ اپنا سامان لے کر ڈیپارچر لاونج کی طرف ابھی بڑھ ہی رہی تھی اسی لمحے کریم احمد اس کے قریب چلے آئے اور پھر اسے پکار کر روکا۔۔۔۔۔ وانیہ ایک بار پھر بے اختیار ہو گئی۔ ان سے گلے لگ کر ایسا پھوٹ، پھوٹ کر روئی جیسے پہلی بار رخصت ہو رہی ہو۔۔۔۔۔ کریم احمد بھی آبدیدہ تھے۔ ظاہرہ بیگم کی باتیں بتا کر وہ انہیں پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔ جانے سے پہلے کریم احمد نے ایک لاکھ کا چیک جیب سے نکال کر اسے دینا چاہا تو اس نے انکار کر دیا۔

”بیٹا رکھ لو۔۔۔۔۔ میں تمہیں شاپنگ نہیں کروا سکا۔ اپنی مرضی سے جو چاہے جا کر خرید لیتا۔“

”نہیں بابا جان، مجھے آپ کی دعاؤں کے سوا آپ سے اور کچھ نہیں چاہیے۔“ وانیہ نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

”بیٹا والدین کو دعا کے لیے کہنے کی ضرورت

تھی۔ اتر ہوئیں دو بار اس کے پاس آکر وجہ جاننے کی کوشش کر چکی تھی۔ وہ سرور کا کہہ کر ٹال گئی تھی۔ ساتھ بیٹھی معمری خاتون نے بڑی شفقت سے پوچھا تھا۔

”بیٹا اگر آپ برائے مانیں تو میں جان سکتی ہوں آپ کے رونے کی وجہ۔“ ”وانیہ ایک دم چونک کر متوجہ ہوئی تھی۔ بے اختیار اس نے اپنے آنسو صاف کیے۔ اسے اپنے دکھ میں موقع محل کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔

”نہ..... نہیں..... اچھو نکلی..... وہ بابا..... میرا مطلب ہے سسرال جاری ہوں ناں.....“ وہ خجالت سے ہوتی خاتون کو مسکراتے پر مجبور کر گئی۔

”آئی سی..... ہرینڈ نے جلدی آنے کے لیے کہا ہوگا اور آپ ابھی اپنے پیرنس کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں گی۔“

”نہیں، یہ بات نہیں ہے آنٹی جی..... میرے ہرینڈ نے مجھے نہیں کہا..... میں خود اپنے گھر کو مس کر رہی ہوں۔“

”یہ تو اچھی بات ہے، آپ اپنے گھر اور ہرینڈ کو مس کر رہی ہیں۔ ورنہ تو بچیاں زیادہ میکے کو مس کرتی ہیں۔“ خاتون نے اسے سرائتی نظروں سے دیکھا۔

خاتون کو بھی اس کے گریز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اصل بات بتانا نہیں چاہتی..... وہ اس سے دوسری باتوں میں لگ گئیں۔ وانیہ بھی ان کے ساتھ باتوں میں لگی تو اس کے ذہن سے بہت سارا بوجھ ہٹ گیا۔ ثعلب اسے۔

ایئرپورٹ لینے آیا ہوا تھا۔ وانیہ اسے دور سے دیکھ کر ہی مٹھنجل گئی تھی۔ بھائی نے اسے پہلے ہی سمجھایا تھا کہ میکے سے متعلق شوہر سے کوئی بات نہ کرے۔

”بھینکس فلاٹ مائی ڈیر..... مجھے معلوم تھا کہ تم میری بات نہیں ٹالو گی۔“ سامان کی ٹرال اس کے ہاتھ سے لے کر پارکنگ کی طرف بڑھتے ثعلب نے بڑی وارستگی سے دیکھ کر کہا تو وہ مسکرا دی۔

”میرے پاس آپ کی بات ٹالنے کا کوئی جواز ہی نہیں تھا۔“

”ماشاء اللہ..... سبحان اللہ..... بڑی تابعداری دکھائی جا رہی ہے۔ خیر تو ہے۔“

”ہاں..... آپ کی محبت نے وہاں ٹھہرنے ہی نہیں دیا۔“ ”وانیہ دھیمے لہجے میں اسے یقین دلاتے ہوئے اسے مزید حیران کر رہی تھی۔

”ایک منٹ..... ایک منٹ۔“ ”مھی ایک دم اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔“ ”تم..... وانیہ ہی ہوتاں.....؟“

”نہیں، میری روح آپ سے ہم کلام ہے۔“ وہ قہرے مسکرا کر ایک طرف سے آگے بڑھی۔

”بالکل..... تمہاری روح ہی ایسا اعتراف کر سکتی ہے۔ ورنہ تم تو اس معاملے میں بے حد کنبوس ہو۔“ مھی نے بھی مذاق میں بات بڑھائی۔

”اور آپ تو جیسے بہت دریا دل ہیں ناں.....“ دونوں نوک جھوک کر تے گاڑی تک آگئے۔ اتفاقاً وانیہ کے ساتھ سفر کرنے والی خاتون کی گاڑی بھی

ساتھ ہی پارک تھی۔ بیس ایکس سالہ نوجوان ان کا سامان گاڑی میں رکھتا بات چیت کر رہا تھا۔ وہ خاتون، وانیہ اور مھی کو قریب آنا دیکھ کر دونوں کی طرف بڑھی چلی آئیں۔

”اوہ..... تو بیٹا یہ ہیں آپ کے ہرینڈ..... جنہیں آپ جہاز میں بیٹھی مس کر رہی تھیں۔“ ثعلب کا جواب منہ کے اندر ہی رہ گیا تھا۔ وہ معمر خاتون کو حیرت سے دیکھنے کے بعد وانیہ سے آنکھوں میں استفسار کر رہا تھا۔

”یہ..... آنٹی..... میرے ساتھ جہاز میں تھیں۔ اپنی بیٹی کی طرف آئی ہیں تو اسی کی شادی کے سلسلے میں۔“ وانیہ نے تفصیلی تعارف کروایا۔

”اور میں نے وانیہ بیٹی سے وعدہ لیا ہے کہ آپ دونوں اپنی فیملی کے ساتھ شادی میں ضرور شرکت کریں گے۔ میں فون پر انو-ٹیشن سینڈ کر دوں گی۔ بیٹا آپ نے ضرور آنا ہے۔“ وہ بڑے خلوص سے دعوت دے رہی تھیں۔ وانیہ صرف تائیدی طور پر سر ہلا رہی تھی۔

”آپ بھی ضرور آئیے گا ہمارے گھر..... ایک ہی تو ایریا ہے۔“ آخر وانیہ مرد و نابولی۔



اچانک موڈ بدل کر اس کا ہاتھ تھام کر پوچھا تو دانیہ بھی قدرے سنبھل گئی۔

”پھوپھو اب ٹھیک تھیں۔۔۔ سوری۔۔۔ واقعی مجھ سے غلطی ہو گئی۔۔۔ مجھے آپ سے اجازت لیے بغیر کسی کو بھی نمبر وغیرہ نہیں دینا چاہیے تھا۔“

”بس اب اس ٹاپک کو چھوڑو۔۔۔ دراصل ان کی انٹری سے میرا love scene تو خراب ہو گیا تھا ناں۔۔۔ میں کیا کہنا سننا چاہ رہا تھا تم سے۔۔۔ دہلی رات کو سنوں گا قصہ ہجر۔۔۔ اور سناؤں گا بھی۔“ مٹی نے اس کا ہاتھ لبوں سے قریب کر لیا۔

”رات کی رات کو دیکھی جائے گی۔ ابھی روٹیلک ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔ وہیان سے ڈرائیو کریں۔۔۔“ وہ جھینپ کر ہاتھ سمجھ کر بولی۔

”ایک تو تم۔۔۔ ہمیشہ مجھے غلط وقت پر ٹوکتی ہو۔۔۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے۔ میں نے کیسے یہ دو دن گزارے ہیں۔۔۔ you know what مجھے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ میں تم سے اتنی شدید محبت کرتا ہوں۔ تمہارے جانے کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ ساری دنیا خالی ہو گئی ہے۔“ وہ بول رہا تھا اور دانیہ کی روح سرشاری کی نئی کیفیت سے گزر رہی تھی۔ زندگی تو ثعلب کے ساتھ ہی سے خوب صورت تھی۔ بڑی امی کی باتیں اور رویے تو بے معنی اور بے حقیقت سے لگنے لگے۔ اس کا شوہر اس کے ساتھ تھا تو اسے اب کسی اور رشتے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ یہ بات اسے جلد ہی سمجھ آ گئی تھی۔

ثعلب اسے گھر چھوڑ کر خود بچوں کو اسکول لینے چلا گیا تھا۔ کیونکہ یہ بھی اس نے وعدہ کیا تھا کہ آج وہ انہیں خود اسکول سے پک کرے گا۔ نا تو اسے غیر متوقع طور پر دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔ مٹی نے کسی کو بھی نہیں بتایا تھا وہ آج واپس آرہی ہے۔ دانیہ سیدھی ان کے کمرے میں چلی آئی تھی۔

”السلام علیکم یا نو۔۔۔“ محبت احرام، اپنائیت بھی کچھ اس کے لہجے سے عیاں تھے۔ وہ ان کے

”ہاں کیوں نہیں۔۔۔ اگر یہ میرا باڈی گارڈ ملے آیا تو۔۔۔“ انہوں نے منہ بنائے کھڑے نواسے کو دھپ لگائی تو وہ جلے بھنے انداز میں بولا۔

”اتنی عزت افزائی کی ضرورت نہیں ہے نا تو۔ صاف کہیں یہ ڈرائیور لے آیا۔“

”باسط۔۔۔!“ انہوں نے نواسے کو سرزنش کی پھر مسکرا کر بولیں۔ ”اکھوتا ہے۔۔۔ چار بہنوں کا بھائی۔۔۔ بڑی ذمے داری ہے میرے بچے پر آپ برا نہیں مانتا۔“

”آئی انڈر اسٹینڈ۔۔۔ اکھوتوں پر واقعی بڑی ذمے داری ہوتی ہے۔ اوکے۔۔۔ ہم چلتے ہیں۔ بچوں کو اسکول سے پک کر رہا ہے۔“ ثعلب نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے معذرت کی۔۔۔ دونوں الوداعی سلام کر کے بیٹھے تو ثعلب نے خاصی سنجیدگی سے پوچھا۔

”ان خاتون کو تم پہلے سے جانتی ہو؟“

”نہ۔۔۔ نہیں کیوں۔۔۔؟“ دانیہ نے اپنا بیگ اپنے پہلو میں لگایا۔

”تو وہ اتنی فریگ کیوں ہو رہی تھیں؟“ ثعلب کی سنجیدگی میں ایسی بات ضرور تھی جو دانیہ کو چونکا گئی۔

”وہ۔۔۔ آج ہی تو پلین میں۔۔۔ ملاقات ہوئی ہے۔ ایکچوئٹلی میں کچھ اپ سیٹ تھی تو انہوں نے مجھے کافی مورل سپورٹ دی۔۔۔ اپنی بھی باتیں کیں۔ وقت کا ہاتھ نہیں چلا۔۔۔“

”یار۔۔۔ تم اتنی بے وقوف ہو تو نہیں۔۔۔ اپنا ایڈریس، اپنا نمبر تک انکس دے دیا؟ جانتی نہیں ہو، دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔“ ثعلب نے ڈرائیو تک کرتے کرتے اسے اسی ٹون میں سمجھانے کی کوشش کی تو دانیہ مزید حیران ہوئی۔ مٹی پہلی بار اتنا سنجیدہ ہوا تھا۔

”وہ اچھی خاتون ہیں۔ اچھی فیملی سے تعلق لگ رہا تھا ان کا۔ آپ نے دیکھا تھا کہ۔۔۔“

”ہر کسی پر ٹرسٹ نہیں کرتے میری جان۔۔۔ اوکے چھوڑو اور مجھے بتاؤ تم اپ سیٹ کیوں تھیں۔ پیپو کی طبیعت ابھی ٹھیک نہیں تھی کیا۔۔۔؟“ مٹی نے

سامنے جھکی کھڑی تھی۔

”علیکم اسلام..... تم..... یوں اچانک.....؟“

”آپ کو انہوں نے بتایا نہیں.....؟“

وانیہ کو نانوکی حیرت مسکرانے پر مجبور کر گئی۔ مٹی نے یقیناً انہیں بے خبر رکھا تھا۔

”یہ لڑکا بھی من موچی ہے۔ ہمیں بتا دو تا.....“

تمہیں بھی وہاں سکون نہیں لینے دیا..... خود بھی یہاں منہ بسورے رہا ہے۔ ایک وقت بھی کچھ ڈھنگ سے کھایا ہو..... آنے دو ذرا..... بچی چارون کو میکے چلی گئی تھی تو رہ لینے دیتا۔“

”نانو آپ انہیں کچھ مت کہیے گا۔ میں اپنی مرضی سے اپنے گھر میں آئی ہوں۔ وہاں زیادہ دن رو کر کیا کرتی..... پھوپا ب کافی بہتر ہیں۔“

”پھر بھی بیٹا تمہاری پھوپا کیا سوچتی ہوں گی کہ.....“ نانو نے رواداری سے کہا تو وہ ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں یقین دلانے کی کوشش کرتے ہوئے ان کی شرمندگی دور کرنے لگی۔

”انہیں معلوم ہے میرا دل اپنے گھر کے علاوہ نہیں لگتا..... آپ ٹیشن نہ لیں..... یہ بتائیں آپ کی طبیعت تو ٹھیک رہی؟“

”شکر ہے بیٹا میں بھی ٹھیک رہی..... اور تم جیسی پیاری بچی کے ساتھ رہنے کے لیے ٹھیک رہتے کو دل چاہتا ہے۔ اللہ میرے بچوں کی خوشیاں سلامت رہیں۔“ نانو کی پُر غم آنکھوں میں اس کے لیے وہ جذبے وہ دعائیں تھیں جو دنیا بھر کے خزانوں کے عوض بھی نہیں مل پاتے۔ وانیہ نے انہیں مسنون نظروں سے دیکھا..... اسی لمحے شہنی بوا بھی..... ”آمین“ کہتی اندر داخل ہوئیں۔

”شکر ہے بیٹا تم آگئیں..... ورثہ بچوں نے تو میرا..... ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اب اسکول سے آنے والے ہیں اور سمجھ نہیں آرہی کیا بناؤں؟“

”آپ چلیں..... میں آکر ان کے لیے نوڈلز بنا لیتی ہوں۔ آپ روٹیاں بنا لیں۔ ٹھیک بچوں کو لینے

گئے ہیں وہ بھی آج گھر پر پہنچ کریں گے۔“ وانیہ انہیں کہہ کر ان کے پیچھے ہی نکل گئی۔ نانو جان اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگیں۔ ان کے لبوں پر اس کے لیے دعائیں ہی دعائیں تھیں۔ بچے گھر میں آئے تو وانیہ فوراً کچن سے نکل کر دروازے میں چلی آئی۔ بچے اسے دیکھ کر پہلے تو حیران ہوئے پھر ایک دم چلا تے ہوئے اس کی طرف لپکے۔

”ہر..... رے..... ہماری چاچی آگئیں۔ چاچو، چاچی آگئیں..... آہ..... اب مزہ آئے گا۔“ دونوں ہی آکر اس سے لپٹ گئے..... وانیہ نے جھک کر دونوں کو اپنے دائیں بائیں پہلوؤں میں سمیٹ کر پہلے چوما پھر قدرے غلطی سے بولی۔

”یہ کیا.....؟ پہلے آکر سلام کرتے ہیں ناں.....“ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر اس کی جانب دیکھا۔ چاچی کی ناراضی سے دونوں ہی ڈرتے تھے فوراً ایک زبان ہو کر بولے۔

”سوری چاچی السلام..... علیکم.....“

”چلو..... پھر آکر کھانا کھاتے ہیں۔“

”ہاں بھئی جلدی سے آؤ، مجھے بھی بہت بھوک لگی ہے۔“ ٹھک نے اندر آتے ہوئے کہا۔ وانیہ تائیداً مسکرا کر دیکھتی بچوں کے کمرے کی طرف بڑھ گئی جبکہ مٹی بھی فریش ہونے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

”میرے جانے کے بعد تم دونوں نے چاچو کو بھی شک کیا اور شہنی بوا کو بھی.....؟“ گولڈی کی شرٹ اتار کر پہناتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا تو گولڈی بڑی معصومیت سے بولی۔

”نہیں..... چاچی..... ہم نے تو شک نہیں کیا..... ہے ناں سنی.....“

”جھوٹ بولنا بری بات ہے..... پتا ہے ناں جھوٹ بولنے والے بچوں کی زبان کالی ہو جاتی ہے اور منہ سے بیز اسمل بھی آنے لگتی ہے۔“ وانیہ نے بڑی

نری سے سرزنش کی۔  
 ”چاچی..... گولڈی نے سب کو بہت تنگ کیا۔  
 میری چاکلیٹ بھی کھائی تھی اور میری اسٹوری بک پر  
 لائنز بھی لگا دی تھیں۔“ سنی بڑی چالاکی سے بولتا  
 سامنے آیا۔ اس کی شکایت پر گولڈی نکلی۔  
 ”چاچی سنی نے بھی میرا ڈول ہاؤس توڑ دیا.....  
 چاچو نے پراس کیا ہے۔ وہ مجھے نیا اور بڑا ڈول ہاؤس  
 لے کر دیں گے۔“  
 ”جھوٹی بات.....؟“ سنی تقریباً چیخا۔  
 ”تم جھوٹے ہو..... ڈرلی ہوئے ہو..... چاچی  
 تمہیں کچھ نہیں لے کر دیں گی۔ چاچو بھی نہیں لے کر  
 دیں گے۔“ وانیہ نے دونوں کو پہلے حیرت سے دیکھا  
 پھر تقریباً خفگی و غصے سے بولی۔  
 ”تم دونوں کو ہی اب کچھ نہیں ملے گا..... اس  
 لیے کہ تم دونوں میری بات نہیں مانتے ہو..... تم دونوں  
 نے مجھ سے پراس کیا تھا کہ دونوں کبھی نہیں لڑو گے  
 مگر..... اوکے اگر تم دونوں کو لڑنا ہے تو میں واپس چلی  
 جاؤں گی اپنی پھوپھی کے پاس۔“  
 ”چاچی..... آپ نہیں جائیں ناں..... ہم نہیں  
 لڑیں گے۔“ دونوں ہی ایک دم سہم سے گئے تھے۔  
 چاچی انہیں چھوڑ کر جائیں یہ انہیں منظور نہیں تھا۔ سنی  
 فوراً ہی اس کے کندھے پر آکر جھول گیا۔ اس کا منانے  
 کا یہی انتہا تھا۔  
 ”سوری..... میں بھی نہیں لڑوں گی۔ پلیز  
 چاچی.....“ گولڈی نے معصومیت سے کہتے اپنے کان  
 پکڑ لیے تو وانیہ کو بے اختیار اس پر پیار آیا۔ خود سے  
 چمٹاتے ہوئے بڑی محبت سے بولی۔  
 ”اوکے..... اگر آپ دونوں اب نہیں لڑے تو  
 میں نہیں جاؤں گی..... اور جس نے اب اپنا پراس  
 توڑا تو میں اس سے بات نہیں کروں گی۔“ وانیہ نے  
 دونوں کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلا یا تو دونوں نے ہی وعدہ  
 کر لیا۔ درمیانی دروازے سے جھانکتے ثعلب نے  
 خاصی دلچسپی سے سارا منظر دیکھا۔ وانیہ کے لیے اس

☆☆☆

رات کو وہ اس سے تجدید عہد محبت کر رہا تھا۔  
 وانیہ اس کے پہلو میں نیم دراز اس کی محبت کی جدت  
 سے نئی توانائی پاتی خود کو مزید مضبوط محسوس کر رہی تھی۔  
 ”نیا..... تمہارے جانے کے بعد میں نے جس  
 طرح دو دن گزارے ہیں، اس کا اندازہ صرف تم ہی لگا  
 سکتی ہو۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا کچھ گم ہو گیا  
 ہے۔ سب کچھ تھا مگر تمہاری کمی پلیز آئندہ، مجھے چھوڑ کر  
 مت جانا..... ورنہ.....“

”آپ تو ایسے بے قرار ہو رہے تھے جیسے میں  
 ہمیشہ کے لیے آپ کو چھوڑ کر چلی گئی ہوں.....“  
 ”شٹ اپ.....“ وانیہ کی مسکراہٹ سے  
 واضح تھا کہ وہ مذاق کر رہی ہے مگر مٹی کی سنجیدگی نے  
 اسے حیران کر دیا تھا۔

”آئندہ مذاق میں بھی مت کہنا یہ بات.....  
 اب مجھ میں کسی کو کھونے کا حوصلہ نہیں ہے..... پلیز.....  
 ایسا مت کہنا۔“ ثعلب شدت جذبات میں بولتے  
 ہوئے اس کے ہاتھ اپنی گرفت میں لیے وانیہ کو مزید  
 حیران کر رہا تھا۔ ”یونو..... سب کہتے تھے شادی کے  
 بعد اپنی بیوی سے ہونے والی محبت سچی اور کھری ہوتی  
 ہے۔ میں نہیں مانتا تھا..... مگر.....“

”ر..... و..... مانہ کی وجہ سے.....؟ میرا.....  
 مطلب.....“ وانیہ کو نہ جانے کیسے رومانہ کا خیال آ گیا  
 تھا اور وہ بے ساختہ کہہ بھی گئی تھی۔ ثعلب ایک دم ایسے  
 چونکا تھا جیسے کسی نے گہری نیند سے جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو۔  
 ”وہاٹ..... کیا مطلب ہے یہاں اس کا کیا  
 ذکر.....؟“ مٹی کے تاثرات فوراً بدل گئے تھے۔ وہ سیدھا  
 ہو بیٹھا۔ وانیہ سے بات کرنا مشکل ہو گئی۔ اسے

احساس ہو گیا تھا کہ وہ نادانستگی میں اس کے جذبات کو نہیں لگا بیٹھی ہے۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم مجھ سے یہ بات کہو گی۔“ وانیہ کے چہرے پر شرمندگی، خجالت، سبے کی سبکی کچھ تھا۔

”میں شرمندہ ہوں۔۔۔۔۔۔ واقعی میں اس طرح بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔۔۔۔۔۔ وہ تو بس اچانک۔“

”اچانک۔۔۔۔۔۔؟ اچانک تم نے مجھے احساس دلادیا کہ تمہارے دل میں میرے لیے کتنی بدگمانی اور شک ہے اب تک۔۔۔۔۔۔ میں نے کب سے اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں اور۔۔۔۔۔۔“ وانیہ نے اس کے ہوتنوں پر ہاتھ رکھ کر اسے مزید کچھ کہنے سے روکا۔

”کہہ رہی ہوں ناں مجھ سے غلطی ہو گئی میں آپ سے بدگمان ہوں نہ ہی میرے ذہن و دل میں کسی قسم کا شک ہے۔۔۔۔۔۔ میرا تو اس بات پر ایمان پختہ ہے کہ اصل محبت تو شادی کے بعد ہی ظاہر ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔ اور آپ کی محبت بھی صرف میرے لیے ہے۔۔۔۔۔۔ پلیز میری پہلی غلطی سمجھ کر معاف کر دیں۔“

بولتے بولتے وانیہ کی آنکھیں چھٹک پڑیں، ثعلب کو بھی احساس تھا کہ اس نے جان بوجھ کر نہیں کہا تھا۔

”جرمانہ دیتا پڑے گا۔“ کچھ توقف کے بعد اس کا موڈ ذرا بدل گیا تھا۔

”ج۔۔۔۔۔۔ ی۔۔۔۔۔۔؟“

”نیکسٹ ویک اینڈ پر نہیں میرے ساتھ ایک پارٹی میں چلنا پڑے گا۔۔۔۔۔۔ میرے سارے فرینڈز تم سے ملنا چاہ رہے ہیں۔“

”مگر۔۔۔۔۔۔ میں بچے۔۔۔۔۔۔ بھی ساتھ ہوں گے ناں۔۔۔۔۔۔؟“ وہ ڈرتے، ڈرتے پوچھ رہی تھی کیونکہ بچے اس کے ساتھ جانے کی ضد کرتے تھے اور اسے انہیں چھوڑ کر جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔

”نو۔۔۔۔۔۔ ناٹ ایٹ آل۔۔۔۔۔۔ صرف ہم دونوں۔۔۔۔۔۔ اور تمہیں میری چوائس پر ڈریس اپ ہونا پڑے گا۔ بچوں کو بھی خود ہی ہینڈل کرنا ہوگا۔۔۔۔۔۔ کہو

منظور ہے؟ ورنہ پھر میں ناراض ہوں تم سے۔۔۔۔۔۔“ ثعلب نے بچوں کی طرح اس کی طرف سے رخ موڑا تو وہ بے بسی سے نور آہا می بھر بیٹھی۔

”مجھے منظور ہے، آپ مجھ سے ناراض نہ ہوں۔۔۔۔۔۔ آپ جیسا کہیں گے میں ڈریس اپ بھی ہو جاؤں گی پلیز۔۔۔۔۔۔“ وانیہ نے اس کے سامنے ہو کر ہاتھ جوڑے تو ثعلب بے اختیار ہو کر قہقہہ لگا اٹھا۔ اور اس کے ہاتھ گرفت میں لے کر ہنستے، ہنستے بولا۔

”یار دیکھا کیسے تمہیں نریپ کیا ہے۔۔۔۔۔۔ ورنہ کیا تم مان لیتی میری بات۔۔۔۔۔۔ ہر بار بہانہ ہر بار بہانہ۔۔۔۔۔۔“

”خیر۔۔۔۔۔۔ بہانہ تو نہیں کرتی میں۔۔۔۔۔۔ آپ جانتے ہیں، بچے میرے پتار رہتے نہیں ہیں اور انہیں چھوڑ کر جانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔“ وانیہ نے اپنے ہاتھ اس کی گرفت سے نکال کر چہرے پر آئی لٹ کو ہٹایا تو ثعلب شرارتی ہوا۔

”رہ تو میں بھی نہیں سکتا تمہارے پتا۔۔۔۔۔۔ پھر مجھے کیوں چھوڑ کر گئی تھیں۔“

”اب نہیں جاؤں گی۔۔۔۔۔۔“ ممی اس کی طرف جھکا تو وہ جھینپ کر بولی۔

”اور میں جانے بھی نہیں دوں گا۔“ وہ مزید رو میٹھک ہوا۔۔۔۔۔۔ وانیہ کو اور کیا چاہیے تھا۔۔۔۔۔۔ وہ خود بھی کب اس کی محبت کے دائرے سے باہر جانا چاہتی تھی۔

☆☆☆

زندگی کے معمولات میں وانیہ کے ذہن و دل سے جلد ہی بڑی امی کی باتیں تقریباً محو ہو گئی تھیں۔

بچوں کے ساتھ ان کی شرارتوں میں ان کا ساتھ دیتا۔۔۔۔۔۔ عصی کو چھوٹی بہنوں کی طرح روزمرہ کی باتوں میں زندگی کے اتار چڑھاؤ پر صبر و قناعت کا سبق پڑھاتا۔۔۔۔۔۔ مانو کی خدمت گزاری میں راحت و سکون پاتا۔۔۔۔۔۔ جیسے اس کی زندگی کا مقصد بن گیا تھا۔ خصوصاً ثعلب کے آرام و سکون اس کی ضرورتوں کا خیال رکھنا تو اس کا نصب العین تھا، ممی آدمی رات کو بھی کوئی فرمائش کرتا تو وہ اپنی نیند، اپنا آرام قربان کر کے اس



کے کمرے میں آگئی۔ اس کی عجیب سی طبیعت ہو رہی تھی۔ عمو نے اسے تیار رہنے کے لیے کہا تھا جبکہ وہ سرے سے جانا ہی نہیں چاہ رہی تھی۔

”نانو..... آپ سے ایک بات کہوں.....؟“  
چائے کا کپ ایک طرف رکھ کر وہ ان کے قدموں میں وکیل چیر کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

”ہاں، ہاں ہو میرے بچے..... میری جان..... کیا بات ہے؟“ نانو نے بڑی نرمی و شفقت سے اسے پچکارا تو وہ سر اٹھا کر کچھ گفتگو میں بولی۔

”نانو..... وہ دراصل میں آج پارٹی میں جانا نہیں چاہتی..... پلیز آپ مجھے روک لیں..... میرا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا۔“

”تو تم اس سے خود کہہ دو وہ زبردستی تھوڑی کرے گا۔“ نانو نے ذرا الجھن سے اس کی طرف دیکھا..... وہ صبح سے ہی تھکی تھکی سی نظر آ رہی تھی۔

”نانو آپ کو چاہتا تو ہے ان کا.....“  
”نہ جانے کی کوئی وجہ ہے؟“ انہوں نے پاس بیٹھی وانیہ کے کھڑے ہال ہاتھ سے سنوارے۔

”بس کہیں بھی جانے کوئی نہیں چاہ رہا..... گھر پر رہنا چاہ رہی ہوں۔“  
”طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری.....؟“ انہوں نے خاصی تشویش سے اسے دیکھا بھی اور پوچھا بھی۔

”آپ پریشان نہ ہوں..... میں ٹھیک ہوں، بس یونہی.....“

”بیٹا جب طبیعت ٹھیک ہے تو پھر چلی جاؤ..... ویسے بھی تم لوگوں کو تنہا کہیں جانے کا موقع ہی کب ملتا ہے، اس کے دوست نے پوچھ کر بلایا ہے اب نہیں جاؤ گی تو کیا سوچے گا..... وہ سمجھے گا کہ تم دونوں

میں کوئی ان بن رہتی ہے جو تم کہیں بھی جانے سے انکار کر دیتی ہو۔“ نانو نے کافی رسائی سے سمجھانے کی کوشش کی۔

”ایسا کیوں سمجھے گا کوئی..... میں بیمار بھی تو ہو سکتی ہوں۔“ وہ اٹھ کر کاؤچ پر جا بیٹھی۔

کی خواہش پوری کرنے پر کمر بستہ ہو جاتی۔

دیکھ اینڈ تھا، ٹھلب آٹس جانے سے پہلے اسے یاد دل رہا تھا۔

”یاد ہے ناں آج حسن (دوست) کی طرف پارٹی میں جانا ہے۔“ مٹی اپنی ٹانگی کی ٹانگ سیدھی کرنا اس کی طرف پلٹا تو کمالی اداکاری سے انجان بن کر بولی۔

”اچھا..... آج جانا ہے..... میں کبھی ٹیکسٹ دیکھ اینڈ پر.....“ مٹی نے اسے مزید بولنے سے پہلے ٹوکا۔

”بس..... نو ایکٹنگ..... میں مان ہی نہیں سکتا کہ تمہیں یاد نہ رہا ہو کہ آج جانا ہے..... میں نے تمہارے لیے جو ساڑی لی تھی آج وہی پہنی ہے، اوکے؟“ ٹھلب نے اس کے چہرے پر پھیلی مصنوعی بیزاری کا ذرا بھی ٹوٹس نہیں لیا۔

”آج میرا سوڈ نہیں ہے ساڑی پہننے کا..... میں کوئی شلوار سوٹ پہنوں گی۔“ وانیہ نے اس کا تو لیا وغیرہ بیڈ سے اٹھاتے ہوئے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

”ہرگز نہیں..... میں کہہ رہا ہوں ساڑی پہنی ہے تو ساڑی پہنی ہے بس..... اور میرے آنے سے پہلے ریڈی رہنا..... چلو اب میرے لیے ناشتا بناؤ.....“

ٹھلب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر لے جاتے ہوئے کچھ دھونس سے کہا..... تو وانیہ مصنوعی خفگی سے اسے دیکھ کر بولی۔

”اب ہر معاملے میں آپ کی مرضی نہیں چلے گی۔“ مٹی نے قدرے چونک کر اسے دیکھا۔ اسی لمحے شہنی بوا کچن سے نکل کر آئیں۔

”بیٹا..... سب کے لیے چائے تو تم ہی بناؤ..... ورنہ میاں گل کی طرح چائے ہے بغیر چلے جائیں گے۔“

”ہاں تو بوا جی آپ بھی تو چائے میں جو شائدہ ملا دیتی ہیں جیسے.....“ بوا اور مٹی کی نوک جھوک جاری تھی۔ وانیہ انہیں وہیں چھوڑ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

بچے ٹیوٹر سے پڑھ رہے تھے..... وانیہ معمول کے کام نمٹا کر اپنے اور نانو کے لیے چائے بنا کر ان

”اللہ نہ کرے..... جو تم پر پڑو.....“ نانو نے بے ساختہ اسے ٹوکا۔

”سمجھنے میں کیا حرج ہے نانو.....“

”بس میرے بچے..... بری بات منہ سے نہیں نکالتے..... تم تو رونق ہو ہمارے گھر کی..... تمہاری وجہ سے تو ہمیں زندگی کا احساس ملتا ہے۔“

”نانو..... آپ کو نہیں پتا..... کتنا بڑا ہوتا ہوں میں پارٹیز میں جا کے..... نہ مجھے فیشن کا پتا ہے، نہ مجھے جیولری ڈیزائن پر باتیں کرنا آتی ہیں۔“

”تو بیٹا سیکھو ناں تم بھی دنیا داری کے تقاضے..... ویسے بھی دانیہ بچے..... تم مٹی کو سمیٹ رہی ہو..... ابھی سے اس سے پہلو بچاؤ گی تو وہ بکھر سکتا ہے،

بھٹک سکتا ہے اسے اپنی گرفت سے نکلنے مت دو..... مرد کو بیزاری نہیں دکھاتے، یہ میرا تمہیں مخلصانہ مشورہ ہے۔“ نانو اور بھی مفید مشوروں سے اسے نوازا رہی تھیں اور دانیہ بڑی سعادت مندی سے سننے میں مصروف تھی۔

جبھی اسے وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ وہ تو عرصی نے کمرے میں جھانک کر اسے احساس دلایا۔

”بھابی، بھالی آگے ہیں۔ آپ کا پوچھ رہے ہیں۔“

”اتنی جلد ی.....؟“ دانیہ کی نگاہ دیوار گیر گھڑی پر گئی..... اس سے پہلے کہ وہ باہر نکلتی..... مٹی خود ہی نانو کے کمرے میں چلا آیا۔

”السلام علیکم..... تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟“ اسے کھڑے دیکھ کر مٹی نے ذرا خفگی سے پوچھا۔

”بس جارہی ہوں۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

”ناٹم دیکھو..... تمہاری تیاری میں بھی دیر لگے گی۔“

”صرف ساڑھے چھ..... اور وہاں نو بجے سے پہلے کوئی نہیں پہنچے گا..... میں چندرہ منٹ میں تیار ہو جاتی ہوں۔ آپ تب تک چائے پی لیں میں بھجواتی ہوں۔“ وہ اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے نورانگل مٹی۔ وہ جھنجھلا تا ہوا نانو کے سامنے آ بیٹھا۔

”دیکھ لیں آپ اپنی لاؤ لی کے نگرے..... صبح کہہ کر گیا تھا کہ میرے آنے سے پہلے تیار رہنا..... مگر

نہیں..... اپنی مرضی چلائیں گی محترمہ.....“ ثعلب نے اپنی بھڑاس نکالی تو نانو نے جھٹ اس کا دفاع کیا۔

”تیار ہونے تو گئی ہے، غصہ کیوں کرتے ہو..... صبح تو کہہ رہی ہے اتنی جلدی کون پہنچے گا..... شکر کرو وہ جارہی ہے حالانکہ اس کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کچھ..... سستی ہے کل سے۔“

”آپ کو بتا دیا اس نے..... کوئی طبیعت و بیعت خراب نہیں ہے، آپ نہیں جانتیں ساری لڑائی واسٹ ساڑی کی ہے..... کہتی ہے ساڑی نہیں..... سوٹ پہنے گی۔“ ثعلب واقعی جھنجھلایا ہوا تھا۔ نانو نے اسے تعجب سے دیکھا۔

”تم دونوں میں لڑائی ہوئی ہے؟ اور اس نے مجھے بتایا ہی نہیں..... مٹی تم ہمیشہ اپنی منواتے ہو..... کبھی اس کی مرضی کا بھی خیال کیا کرو..... اس کی بھی کوئی پسند ہوگی۔“ انہوں نے سمجھانے کی کوشش کی..... وہ مزید جھنجھلایا۔

”تو پہن لے وہ سوٹ، کر لے اپنی مرضی..... میں کیا کہہ رہا ہوں..... آپ ہمیشہ اسی کی سائنڈ لیس گی..... دیکھتا ہوں جا کر کتنی تیاری رہ گئی ہے۔“ وہ جانے لگا تو نانو اس کے پیچگانہ رویتے پرسکرا دیں۔

”اب اس کے سر پر جا کے سوار مت ہو جانا کہ اس کے ہاتھ پاؤں پھول جائیں..... بات سنو جانے سے پہلے مجھے مل کر جانا، میں بھی تو دیکھوں اس سفید ساڑی میں ایسی کیا خاص بات ہے جو تم میری بیٹی سے اچھ پڑے ہو۔“

”میری لائی ہوئی ساڑی میں کوئی بات کیسے ہو سکتی ہے۔ ساری خصوصیات تو آپ کی بیٹی میں ہیں۔“ وہ بچوں کی طرح روٹھ کر چلا گیا تو نانو مسکرا دیں۔ جانتی تھیں اس کی ناراضی چند لمحوں کی ہوگی۔ دانیہ خود اس کے لیے چائے بنا کر لائی تو نانو نے اسے کمرے میں جانے کے لیے کہا۔

”اُف..... آج میری خیر نہیں ہے۔“ وہ وہاں سے کمرے کی طرف آئی شکر کیا سنی، گولڈی اس سے

258

2015

258

سے پراس کر لیا تھا۔ اس لیے ہمیں جانا ہے۔  
 ”تو آپ ہم سے بھی پراس کریں..... آپ ہم  
 کو بھی کل لے کر جائیں گے.....“ گولڈی نے اسے  
 بڑی معصومیت مگر چالاکی سے گھیرا تو مٹی قہقہہ لگا اٹھا۔

”ہونہ..... تو اصل چکر یہ تھا..... او کے میری  
 جان..... ہم سب کل چلیں گے۔ مگر ابھی تو ہمیں تیار ہو  
 کر جانے دو..... جاؤ آپ دونوں جا کر کھیلو..... ہم  
 جلدی گھر آ جائیں گے۔“ مٹی نے دونوں کو باری،  
 باری چوم کر لپٹایا۔ دونوں چپے گئے تو ثعلب انھ کر  
 ڈریسنگ روم میں آ گیا۔ وانیہ ڈریسنگ روم میں نصب  
 آئینے کے سامنے کھڑی اپنے گھٹنوں تک لمبے بالوں کو  
 سمجھانے میں مصروف تھی۔

”کیوں مجھے تنگ کر رہی ہو؟“ مٹی اس کے پاس  
 جا کر اس کے بالوں کی ایک مٹ مٹھی میں لے کر کھینچتے  
 ہوئے بولا۔

”آہ..... میں آپ کو کب تنگ کر رہی ہوں  
 چھوڑیں ناں..... ارے درد ہوتا..... مت کھینچیں۔“

”صبح سے منہ بنا کر پھر رہی ہو..... سیدھے منہ  
 بات ہی نہیں کر رہی ہو.....“ مٹی نے آئینے میں دیکھتے  
 ہوئے ڈراخشی سے پھر اس کے بال جھٹکے..... وہ اس  
 کے جھوٹ پر حیران ہوئی۔

”میں..... ہاں..... نہیں تو؟“ آپ کو غلط فہمی  
 ہوئی ہے۔ پیڑ میرے بال نوٹ رہے ہیں۔“ وانیہ  
 نے کراہتے ہوئے بال چھڑانے کی کوشش کی مگر مٹی کے  
 ارادے کچھ اور تھے۔ اس کے مزید قریب ہو کر اپنے  
 ہاتھ پر اس کے بال پینتے ہوئے ایک دم موڈ بدل کر  
 بولا۔ ”جب میں نے ہاتھ کہ تیار رہنا تو..... سوچا تھا  
 تمہیں تیار دیکھ کر ساری ٹھکن اتر جائے گی مگر تم..... آج  
 ارادے کیا ہیں؟“

”ارادے تو آپ کے خطرناک نظر آرہے  
 ہیں..... میرے بالوں کے دشمن بنے ہوئے ہیں.....  
 پارٹی میں جانا بھی ہے یا..... نہیں۔“

”جانا ہے، جانا ہے مگر پہلے بتاؤ کیا پہنوں گی.....؟“

پہلے کمرے میں جا رہے تھے اسے ڈرا تسلی ہوئی ثعلب  
 ان کے سامنے کھلی نہیں دکھا سکتا تھا۔ اسے دروازے  
 سے اندر آتے دیکھ کر وہ قدرے برہمی سے بولا۔

”تم.....! میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم ڈریسنگ روم  
 میں ہو؟“

”اتنی جلدی کس بات کی ہے..... ابھی آپ کو  
 بھی تو فریش ہونا ہے۔ گرم، گرم چائے، جنس اور فریش  
 ہو جائیں، میں بھی بس ابھی آئی۔“ اسے کپ تھما کر اس  
 نے چٹکی بھائی اور فوراً ہی ہاتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔  
 پشت پر مٹی کی گھورتی نگاہیں تھیں..... سنی اور گولڈی نے  
 فوراً اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

”چاچو! آپ چاچی کو لے کر کہاں جا رہے  
 ہیں۔“ گولڈی نے بڑے رعب سے پوچھا تو چائے  
 کے گھونٹ بھرتے ثعلب نے اسے مسکرا کر دیکھا۔

”اپنے دوست کے گھر پارٹی میں، حسن انگل  
 ہیں ناں ان کے گھر.....“ بات کرتے ہوئے مٹی نے  
 اسے ایک بازو میں سمیٹا۔

”انہوں نے ہمیں نمٹ بڈایا؟“ اس کی معصومیت  
 میں بھی بڑی سنجیدگی سی تھی۔

”نہیں..... میری لعل فیرو..... حسن انگل نے  
 مجھے اور تمہاری چاچی کو ہی بلایا ہے۔“ مٹی نے کپ  
 ساؤٹ نیمل پر رکھتے ہوئے اسے اپنے گھٹنوں پر بٹھا کر  
 اس کی پیشانی پر بکھرے بال ہٹا کر محبت سے چوما تو سنی  
 کو جلن سی ہوئی۔

”چاچو..... یہ گولڈی کہہ رہی تھی، چاچو کے دوست  
 بہت گندے ہیں۔ ہم بچوں کو پارٹی میں لے  
 نہیں دلاتے۔“ اس بار گولڈی انھنے کے بجائے تائید آہولی۔  
 ”ہاں، ناں سنتے برے ہیں حسن انگل..... ان کے  
 بچے بھی تو ہمارے گھر آتے ہیں، ہمیں کیوں نہیں بلایا۔“

”بری بات ہے سنی، گولڈی..... بڑوں کو ایسا  
 نہیں کہتے..... آپ کو اچھا نہیں لگتا ناں کہ میں آپ کی  
 چاچی کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں تو ٹھیک ہے آئندہ  
 نہیں لے کر جاؤں گا مگر آج تو چاچو نے اپنے فرینڈز





# سائیکھڑہ مبارک

پاکستان بھینس

ایک تو آپ لوگ فوراً غلط اندازے لگا لیتے ہیں۔ اصل بات عام کمانے کی ہی ہوتی ہے پانی تو ابویں..... چلیں اب تھوڑا سا تعارف سرگودھا کے لوگوں کا بھی کروا دیتے ہیں۔ نہایت اکھر، بدمزاج، خوشامی، جھگڑالو، تعویذ گنڈے پر اعتقاد رکھنے والے..... ہر کوئی نہیں یہاں ہماری طرح کے معصوم سیدھے سادے ہیں لوگ۔ یہاں ایک عدد یونیورسٹی کے علاوہ میڈیکل کالج بھی ہے اور اسکولوں کی تو بہتات بکد یوں کہیں کہ اسکولوں اور اسپتالوں کا گڑ ہے سرگودھا۔ یہ تو تھا پاکیزہ سالگرہ کے لیے ہمارے سرگودھا کا تھوڑا سا تذکرہ اب ہمارا ہو جائے تو جناب چار عدد شریں بچوں کی اماں جو اپنی ساری چوکڑی بھول گئی ہے۔ کوانٹیفیکیشن نی ایس سی، ایم اے پو لیٹیکل سائنس + ایل ایل بی ہیں۔ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ ہیں گھر کی عدالت میں بولتی بند ہے۔ بچے موقع ہی نہیں دیتے ہیں مجھ سے زیادہ کراس کو سمجھنے پرے بچے کرتے ہیں۔ آج کل وزن کم کرنے کے چکر میں بہت بھاگ دوڑ رہے ہیں۔ اس دوران ملتان کی فیسک سے بھی گپ لگاتے ہیں۔ سالگرہ منانے میں تو میں کر رہی ہوں، نقش بھی لیتی ہوں یہ دور بات کہ صرف ہسپتال سے گفٹ لینا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے گفٹ لینا کیش سے سخت نفرت ہے۔ اپنے بچوں کی بھرپور سالگرہ مناتی ہوں اور انہیں سر پر از گفٹ بھی دیتی ہوں۔ جس کی برتھ ڈے یاد ہو اسے ضرور دس کرتی ہوں۔

اس بار بھی خزاں میں پتے بکھر گئے ہیں  
انجام گلستاں سے ہم لوگ ڈر گئے ہیں

سرگودھا ہماری جہنم بھومی ہے۔ جہاں کے کینو ایکسپورٹ کوالٹی کے ہیں۔ سرگودھا کے اطراف میں کوٹ موہن، بھلووال، جہاں کا کینو خاص شہرت رکھتا ہے۔ سلاٹوالی جوکڑی کے کام کے حوالے سے مشہور ہے۔ خوشاب، جہاں کا ڈھوڑا پورے ملک میں پسند کیا جاتا ہے۔ میانوالی بہت نامور لوگوں کی وجہ سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ اور شاہ پور جہاں کے شیر کمال کے ہوتے ہیں، انانے میں نہیں کھانے میں اور باں



ادب کے حوالے سے جی سرگودھا کی زمین بڑی زرخیز ہے، بڑے، بڑے معروف شعرا اس دھرتی سے رہائیدہ ہیں جن میں سرفہرست مشہور و معروف شاعرہ سعدیہ ہاشمی ہیں (یہ تو خیر مذاق ہے) میرے فیورٹ شکیلہ جلالی، سرگودھا کے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا، حمد نیر، قاسمی، آصف مرزا، ممتاز عارف، وحشی شاہ سبھی سرگودھا کے شاہین ہیں۔ جو خوب کمار ہے ہیں نام

دل میں ہے کوئی جذبہ نہ ہما چاہتیں ہیں  
دیر یا چڑھے ہوئے تھے آخر اتر گئے ہیں  
سعد یہ ہوشیخ، سرگودھا

☆☆☆

بیاری، بیاری پاکیزہ بہنوں! میرا نام عصمت  
اختر ہے، میں ضلع سرگودھا کی تحصیل کوٹ موہن کے  
نزدیک ایک گاؤں چک 19 جنوبی میں پیدا ہوئی۔  
میرا پیارا گاؤں کینو... اور کینو... کی فیکٹریز کے لیے  
بہت مشہور ہے۔ میں نے ابتدا کی تعلیم گاؤں سے اور  
بی اے کی ڈگری گورنمنٹ گرلز کالج سرگودھا سے  
حاصل کی۔ ہم چھ بہن، بھائی ہیں، میرا نمبر تیسرا ہے۔  
میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر سرور چوہدری بچوں کے  
اسپیشلسٹ ڈاکٹر ہیں۔ جون 75ء میں میری شادی  
اوکاڑہ کے ایک گاؤں میں ہوئی۔ میرا تعلق پاکیزہ  
سے شادی سے پہلے کا ہے، میں نے اس کا بھی کوئی  
شمارہ من نہیں کیا۔ پاکیزہ میں لکھنے والی ساری  
بہنیں مجھے بہت پسند اور عزیز ہیں۔ انجم انصار اور ذکیہ  
بگرامی سے ملنے کا بہت شوق ہے۔ ان سے دعاؤں  
کی درخواست ہے۔ میں بہت سادہ مزاج اور سادگی  
پسند ہوں۔ کپڑوں میں شلواری قمیص، رنگ سفید، کالا اور  
بادامی پسند ہے۔ کوٹنگ میں خود کرتی ہوں اور  
سادے، سادے کھانے بناتی ہوں۔ مثلاً ساگ، قیر  
کر لیے، گو بھی گوشت، گز کے چاول بہت پسند ہیں۔  
مجھے اپنے بہن، بھائی اور ان کے بچے بہت پیارے  
ہیں۔ خاص طور پر قاسم، عبداللہ اور حمزہ۔ میری  
بہت سی دعائیں پاکیزہ کے ہر فرد کے لیے... اور  
خاص طور پر معراج رسول اور عذرا رسول۔ انجم  
انصار اور ان کے بال بچوں کے لیے سنا ہے نایاب  
جیلانی بھی میرے گاؤں کی ہیں۔

میرا سلام تمام پاکیزہ بہنوں کو پہنچے

عصمت اختر، اوکاڑہ

☆☆☆

مابدولت کو غیر وسیم کہتے ہیں۔ چونکہ پورا نام  
نہیں لکھ سکتے کہ اپنی بھاری بھر کم شخصیت کی پہچان نہ  
ہو جائے۔ نہیں... نہیں ڈریں مت... بھی اگر  
پہلوانوں کے شہر سے تعلق ہے تو اس کا یہ مطلب تو  
نہیں کہ ہم بھی ان کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔  
البتہ کھانا اتنا کھاتے ہیں جتنا کہ معدہ برداشت  
کرے... تعلیمی قابلیت کے کیا کہنے کہ یہ کسی ڈگری  
کی محتاج نہیں... البتہ اتنا ضرور کہتا ہے کہ ابھی طفل  
کتب ہیں... عبداللہ بن وسیم اور حریم فاطمہ اور نور  
فاطمہ جیسے پیارے، پیارے چوڑوں منوؤں کی اماں  
جان ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ بفضل خداوند  
کریم کھانے میں دریائی، پائے، دبی بڑے، آکس  
کریم بہت پسند ہیں۔ مشاغل میں، مہانی، بک  
ریڈنگ اور بچوں کو ڈانٹنا (کہ آج کل یہ کام بڑے  
زور شور سے جاری ہے جیسے عبداللہ چوٹ نہ لگ  
جائے، نور فاطمہ سیرھیوں پر نہ چڑھو اور حریم فاطمہ  
ضد مت کرو وغیرہ وغیرہ) پڑھنا، پڑھانا چونکہ  
ہماری فطرت میں شامل ہے اس لیے چاہتے ہیں کہ  
عبداللہ، حریم، سارا دن بس کتابیں سینے سے لگائے  
رکھیں اور ہمارا نام خوب روشن کریں مگر حوال ہے کہ  
آج کل کے بچوں کی... عبداللہ بول دن میں ہے  
اور حریم مونیٹوری میں... مگر ناک میں دم کر رکھا  
ہے۔ ماما ogy دیکھنے ہیں... ماما کاسیٹ بنانی ہے  
اور حریم فاطمہ تو سارا دن بکس اور کاپیاں کلرز اور  
پنسلز سے بھرتی رہتی ہے۔ اسے گزیا کے ساتھ نہیں  
کھیلنا مگر اپنی بکس پر کلر کرتی رہتی ہے کہ اس میں  
مستقبل کی آرٹس ہونے کے جراثیم پائے جاتے  
ہیں۔ اور نور فاطمہ چونکہ سوا سال کی ہے... سارا  
دن ناک میں دم کیے رکھتی ہے۔ سادون مجھے بے حد  
انریکٹ کرتا ہے اور بارش میں بھینگنے کو بے تحاشا من  
مچھلنے لگتا ہے۔ بہت حساس ہوں... کمری ایتھو کام  
کرنے کی لگن ہر سورتی ہے۔ شاعری اور آکس کریم

نہ سمیٹ زندگی کی رعنائیاں دلکشیاں شاد  
یہ تو فانی ہے یہ تو فانی ہے  
شبم کنول، پاپا مگری

☆☆☆

میر انام میر احمد ہے اور تک نیم ایس اصول  
ہے۔ ماشاء اللہ ہم دس بہن بھائی ہیں۔ مابہ دولت کا  
سب سے پہلا نمبر ہے۔ ہم سب بہن بھائیوں میں  
کافی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ امی جان، ابو جی، دادی  
ماں، میں، آسیہ احمد، صائمہ احمد، صاعقہ جہیں، نور  
فاطمہ، (سسرز) اے آر چاند ساگر اور محسن رضا  
آفتاب (برادر) اور میری جان سے پیاری بہنیں



مریم احمد، تانکہ احمد، عزا احمد اور کرن مارون عباس ہم  
سب مل کر رہتے ہیں۔ پاکیزہ سے وابستگی 2008ء  
سے ہے اور پاکیزہ سے بہت کچھ سیکھا ہے جس کے  
لیے میں پاکیزہ فیملی کی شکر گزار ہوں۔ میں سب سے  
پہلے انجم آئی کی ادارہ پر پڑھتی ہوں جو ہمیشہ سبق آموز  
ہوتا ہے اور جلت رنگ میرا فیورٹ سلسلہ ہے۔ خوبیاں  
اور خامیوں کا حسین امتزاج ہوں۔ خوبیاں یہ ہیں،  
سادہ مزاج اور خوش اخلاق ہوں۔ غرور نام کو  
نہیں..... حسد بالکل نہیں کرتی..... کسی کی انسلٹ

اور ہارش کا کبھی نیشن تو جان نکال لیتا ہے۔ عظیم  
کتاب قرآن پاک اور عظیم ہستی حضرت محمد ﷺ پسند  
ہیں کہ زندگی کے تمام کرائسز اور ایونٹس میں ان کی  
ذات پاک کو توجہ نظر رکھ کر انہیں ترتیب دینے کی ادنیٰ  
سی کوشش کرتی ہوں۔

غبر و سم، گوجرانوالہ

☆☆☆

ٹھک، ٹھک، ٹھک دروازہ تو کھولے پاکیزہ کی  
جان شبم کنول تشریف لارہی ہے۔ 20 اپریل کی  
شام کو مابہ دولت نے اس دنیا میں قدم رکھا۔ میرا  
تعلق حافظ آباد کے چھوٹے سے خوب صورت گاؤں  
پاپا مگری سے ہے۔ کتابوں سے دوستی ہے اور بہت  
سنجیدہ کر رکھتی ہوں اسی لیے تمام پاکیزہ بالکل نئی  
حالت میں میرے پاس موجود ہیں۔ شاعری کرتے  
اور پڑھنے کا بہت شوق ہے، میرے فیورٹ شاعر  
پروین شاکر، وحسی شاہ، بشری اعجاز ہیں۔ پاکیزہ  
میں لکھنا شروع کیا ہے، آنٹی نے کافی حوصلہ افزائی  
کی ہے۔ انشاء اللہ ایک اچھی لکھاری بنوں گی۔  
کوکنگ کا بڑا شوق ہے، میرے فیورٹ کلر فیروزہ  
اور بلیک ہیں، کھانے میں دال چاول اور بریانی پسند  
ہے۔ جیولری میں لاکٹ، رنگ اور چوڑیاں پسند  
ہیں۔ نماز پابندی سے قائم کرتی ہوں۔ بہت شوخ و  
چٹکل لڑکی ہوں۔ رونے والوں کو ہنسا دیتی ہوں۔  
سالگرہ کے تحفے میں کتابوں کا لین دین مجھے بہت  
پسند ہے۔ اپنی ماں سے بہت محبت کرتی ہوں۔  
رات کو سوتے وقت دوسری بہت سی دعاؤں کے  
ساتھ یہ دعا کرتی ہوں کہ خدا میری ماں کو سلامت  
رکھے، آمین۔ آخر میں چھوٹا سا پیغام..... بہتر زندگی  
وہ ہوتی ہے جو آپ اپنے لیے گزارتے ہیں اور  
بہترین وہ جو دوسروں کے لیے گزارتے ہیں۔  
زندگی بہترین گزارنی چاہیے..... شعر کے ساتھ  
اجازت.....

نہیں کرتی اور دوسروں کی پرائیوی میں انٹرفیر نہیں کرتی۔ (ج کہہ رہی ہوں یا۔۔۔۔۔) اور خامیاں۔۔۔۔۔ دوسروں پہ بہت جلد اعتبار کر لیتی ہوں اس وجہ سے کئی مرتبہ نقصان بھی اٹھا چکی ہوں۔ چھوٹی، چھوٹی باتوں پر ادا اس ہو جاتی ہوں۔ مجھے منافقت، جھوٹ اور طعنے گفتگو پر بہت غصہ آتا ہے۔ بے ہودہ مذاق بالکل پسند نہیں۔۔۔۔۔ مجھے اپنی عزت بہت عزیز ہے، اس لیے دوسروں کی عزت کا بھی خیال رکھتی ہوں۔ میں باقاعدگی سے نماز پڑھتی ہوں اور اپنی ہر بات اللہ تعالیٰ سے شیئر کرتی ہوں۔۔۔۔۔ کسی سے زیادہ دیر مارا غش نہیں رو سکتی۔

مجھے چھوٹے بچے بہت اچھے لگتے ہیں اور خوب صورت گھر بہت انریکٹ کرتے ہیں۔ گفٹ لینا اور دینا دونوں پسند ہیں اگر کوئی گفٹ میں کتاب دے تو بہت اچھا لگتا ہے۔ مجھے جوائنٹ فیملی سسٹم پسند ہے۔ تعارف میں اپنی آنٹی کا ذکر نہ کروں یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔۔۔۔۔ آنٹی تسمیرہ کو دیکھ کر مجھے پردے کا خیال آیا۔ پردے کی اہمیت کا پتا چلا۔۔۔۔۔ میرے نزدیک رشتوں کی بہت اہمیت ہے اپنی ذات سے وابستہ ہر رشتے کا خیال پوری ایمانداری سے کرتی ہوں۔ میری نظر میں قابل احترام اور خوب صورت رشتہ ماں اور لائف پارٹنر کا ہے۔ میری فیورٹ کتاب قرآن مجید اور فیورٹ شخصیت نبی کریم ﷺ کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان کی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق دے، آمین اس کے بعد مولانا۔۔۔

عبد الستار ایدھی اور ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایڈیٹر ماہنامہ سفید چھتری سرگودھا سے بہت متاثر ہوں۔ مطالعہ کرتے میرا فیورٹ مشغلہ ہے، ماہنامہ پاکیزہ، سپینس، تعلیم و تربیت اور ماہنامہ سفید چھتری ریگولر پڑھتی ہوں۔ انجم انصار میری موسٹ فیورٹ رائٹر ہیں۔ فیورٹ شاعر وحی شاہ اور ڈاکٹر آصف۔۔۔۔۔ میری شدید خواہش ہے کہ خانہ کعبہ کی زیارت کروں اور اپنے ملائے میں غیر فعال بچوں کے لیے اسکول کھولوں اور دنیا میں

ایسے کام کر کے جاؤں کہ لوگ میرے مرنے کے بعد بھی مجھے یاد رکھیں۔

کھانے پینے کے معاملے میں زیادہ غرے نہیں کرتی، دال، ہنری جو بھی ہو شوق سے کھا لیتی ہوں۔ چائے نہیں پیتی اور میٹھی چیزیں کچھ خاص پسند نہیں۔۔۔۔۔ بریانی، پلاؤ اور گوشت فیورٹ ہیں۔ سبزیوں میں بھنڈی اور گو بھی زیادہ پسند ہیں۔ فیورٹ پھل آم اور انار۔۔۔۔۔ مشروب میں دودھ، میٹوہیک اور سوٹ ڈرنک پسند ہیں۔ لباس میں شلوار قمیص پسند ہے۔ بلیک، پنک اور ڈائنٹ کلرز فیورٹ ہیں۔۔۔۔۔ موسم سارے ہی اچھے ہوتے ہیں مگر سردیاں اور بارش مجھے بہت پسند ہیں۔ نومبر اور دسمبر میرے فیورٹ مہینے ہیں۔ پسندیدہ وقت شام کا۔۔۔۔۔ شام کے وقت چھت پر کھڑے ہو کر غروب آفتاب کا منظر دیکھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ جیولری میں برسلیف اور رنگر بہت پسند ہیں۔ مہندی اور چوڑیاں بھی پسند ہیں۔ خوشبوؤں میں بلیولیدی فیورٹ ہے۔ پسندیدہ ملک پاکستان ہے، اللہ تعالیٰ میرے پیارے وطن کی حفاظت فرمائے۔

پسندیدہ شہر کے بارے میں کیا بتاؤں یا رہا بڑا بھی ٹھیک سے نہیں دیکھا ہوا (جی میں) اسلام آباد اور کوئٹہ دیکھنے کی شدید خواہش ہے۔ اب بات ہو جائے دوستوں کی تو دوستی ایک مقدس رشتہ ہے مگر کچھ لوگ اس پاکیزہ رشتے کو بدنام کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے۔

آخر میں فرینڈز کے لیے ایک نصیحت ہے کہ انسان ہو کر ایسے کام نہ کرے جس سے انسانیت کا دامن داغدار ہو جائے۔

اس شعر کے ساتھ اجازت۔۔۔۔۔

یاو رکھو تو دل کے پاس ہیں ہم

بھول جاؤ تو فاصلے ہیں بہت

ہم ہمارے ہمارے ہمارے ہمارے

سب سے پہلے تو میرے خوب صورت پاکیزہ کو



نہیں ہوتا بلکہ اندر کی آدھی ٹھن ختم ہو جاتی ہے۔  
خوب صورت اور حسین ترین لمحات جو کہ ٹرپ کی  
صورت میں خوب صورت مناظر کے بیچ بلند و بالا پہاڑ  
بالکل نیلے آکاش کو چھوتے ہوئے جھیلوں کے کنارے،  
اپنی زندگی سے بہت مطمئن ہوں اور اپنے بنانے  
والے رب کا شکر ادا کرتی ہوں، عبادت سے بے حد  
لگاؤ ہے، صبح پانچ سے لے کر آٹھ بجے تک اپنے رب  
کے ساتھ رہتی ہوں، کوئی دن چھوٹ جائے تو اندر سے  
تشنگی رہ جاتی ہے، میرے پسندیدہ شہر اسلام آباد ایٹ  
آباد ہیں، ملک سوئزر لینڈ اور مارشس میں ...  
بروین شاہ فرحت عباس احمد فراز اور رائٹر انجم اللہ،  
عظمیٰ آفاق، فرحت اشتیاق، صائمہ اکرم، مایا ب  
جیلانی، نمر احمد، عیسرہ احمد، سمیرا امید، نگہت سیما ہیں۔  
میں مہوش سمرن راجپوت، سیالکوٹ

☆ ☆ ☆

ماں، باپ نے تو نام رکھا گمشاد مگر کیا اسکول و  
کالج، گھر، خاندان، محلے، غرض ہر جگہ جانی، جانو کہلائی،  
شاید کہ میں واقعی سب کی جانی ہی تھی کہ ہر جگہ بے  
تخت شاپار ملتا کہ کوئی تشنگی نہ رہی۔ اسکول و کالج میں والی  
بال کی ٹیم کی کھلاڑی رہی کہ 5.5 کے قد کا کچھ تو فائدہ  
ہوا۔ چنگ بازی بھی جی بھر کے کی، گرمیوں کی لمبی  
دوپہرو جب گھر والے سو جاتے تو میں چنگ لے کر  
چھیت پر چھ نزار تھی ہوتی۔ مطالعے کی عادت بچپن  
سے تھی کہ بچوں کا کوئی رسالہ ایسا نہیں جو نہ پڑھا ہو۔  
پاکیزہ سے رشتہ بہت پرانا ہے۔ پہلے پڑھن آنٹی سے  
لے کر پڑھن شروع کیا۔ پھر دس روپے کا خریدنا شروع  
کر دیا اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ پاکیزہ میں بھی  
نقصیں، غز میں نقصیں۔ تبصرے بھی بہت کیے۔

لکھنے کا شوق بھی بچپن سے تھا۔ آئی پاکستان  
مقابلہ مضمون نویسی میں انعام حاصل کیا۔ خواتین کے  
موضوع پر لکھ کر سیکند پرائز حاصل کیا۔ اپنا ایک شعر  
مجھے اچھا لگتا ہے۔

سالگرہ مبارک ہو اور جو اسے ہمارے لیے سنوارتے  
ہوں گے وہ ہاتھ کیسے ہوں گے ان خوب صورت  
ہاتھوں کو اللہ تعالیٰ اور تندرست اور خوب صورت  
بنائے۔ مجھے مہوش کہتے ہیں 15 مئی کو اس پیاری سی  
دنیا کی رونق بڑھانے کے لیے اس دھرتی پر قدم رکھا۔



بی اسے پاس ہوں اور اپنا پچھونا سا بڑا ہنس مری ہوں۔  
پڑھنے کا اور لکھنے کا کریز ہے۔ غزل لکھی اور بے شمار  
مشاعروں میں شرکت کی۔

میرا اشار ثور ہے اور اپنے اشار کی ساری  
خوبیاں میرے اندر موجود ہیں۔ حد سے زیادہ صاف  
گو ہوں ادب سے بے انتہا لگاؤ ہے، مجھے کلیاں پسند  
ہیں کیونکہ کلیاں صبح ہیں اور پھول دوپہر۔ صبح کے  
بعد زندگی آگے بڑھتی ہے اچھی کتابیں میری دوست  
ہیں خوشبو بہت پسند ہے اور ہر کوئی مجھے کتابوں اور  
پرفیوم کا گفت دیتا ہے۔ مجھے برستی بارش میں لاٹک  
ڈرائیو پہ جانا، چاندنی رات کا انتظار کرنا اچھا لگتا ہے  
موسم بہار پسند ہے۔ جب ہر طرف پھولوں کی بہارات  
ہوتی ہے اور خوشبو خوشبو ہوتی ہے۔

میوزک کا بے حد شوق ہے۔ کشور کی ایکشن ہے  
انتہا خوب صورت ہے جس کو سنتے ہوئے ڈپریشن

جاتے ہوئے کتنا مکھڑا ہوا لگتا تھا وہ شخص جس کو سینے میں مجھے ایک عمر لگی اپنے خاندان کی پہلی گریجویٹ ہوں کہ ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو زیادہ نہیں پڑھایا جاتا تھا مگر مجھے تو خود کو منوانے کا جنون تھا۔ لی اے کے بعد اسٹیٹ لائف انشورنس میں بطور آفس منیجر جاب کی۔ ساتھ ہی انشورنس کا کام بھی کیا کہ کسی کو اسے سے آگے



نہیں جانے دیا۔ آفس میں فرسٹ پوزیشن پر میری تصویر لگی رہتی تھی۔ پیسہ بھی بہت کمایا کہ پیڑوں کا جنون تھا۔ خود ہی ڈیزائننگ کی، خود ہی سلائی اور زبردست سوٹ تیار۔ ٹیکسٹائل سینٹر اول چندی سے کالج لائف سے وابستہ رہی کہ تقریر کرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ اور میرے اس شوق کو ٹیکسٹائل سینٹر وائوں نے خوب پورا کیا۔ پھر ایک تنظیم قدرت نگر، کی کئی سال صدر رہی۔ بحیثیت تنظیم کی صدر ریڈیج پاکستان سے انٹرویو نشر ہوا۔ جس کا چیک چالیس روپے ملا جو آج تک پیش نہیں کر لیا۔ میرے اندر کچھ کرنے کا جذبہ بہت تھا بلکہ اب بھی ہے۔ 1986ء میں امر ہوسٹس کے لیے ایلانی کیا۔ کامیاب انٹرویو کے بعد خاندان والوں کی باتیں ابو کو نہ سنی پڑیں۔ اپنے اس شوق کو بھی مار دیا۔

کالج میں ہمارا گروپ بہت پاپولر تھا۔ فری پیریڈ میں گراؤنڈ میں کمر سے کمر جوڑ کر ہمارا گروپ بیٹھ جاتا، گانے کے لیے اور پھر پورا کالج ہمارے چاروں طرف ہوتا۔ اور الحمد للہ ہماری کالج کی دوستی بلکہ پورا گروپ آج بھی اکٹھا ہے۔ ہم دوستوں کے دوست ہیں۔ اسی لیے آج تک بچپن کی تمام فرینڈز سے رابطہ ہے۔

14 دسمبر 1990ء کو اپنے کزن ڈاکٹر نذیر خان سے شادی ہوئی پھر ڈاکٹر صاحب نے اتنا چاہا کہ چاہے جانے کی خواہش ہی نہیں رہی۔ مگر 14 اکتوبر 2008ء میں ڈاکٹر صاحب مجھے اکیلا چھوڑ کر چھ مہینے کبھی نہ آنے کے لیے۔ جو شخص میرے بغیر ایک دن نہیں رہ سکتا تھا وہ میرے بغیر ہی لمبے سفر پر چلا گیا۔ میرے دل کو ویران کر کے۔ اللہ تعالیٰ نے تین بیٹوں سے نوازا ہے، بڑا بیٹا شہر یار خان BS کر رہا ہے۔ اسفندیار، میسرگ کے پیپرزدے رہا ہے اور وقار خان سکسٹھ میں ہے۔ شادی کے بعد مری آگئی اور یہاں سے کشمیر کے بہت ہی خوب صورت قصبے ریڑھ میں اپنا گھر بنا کے شفٹ ہو گئی۔ جس کو اپنے پیار و شوق سے واقعی جنت بنا دیا کہ لوگ مجھ سے ملنے اور گھر کو دیکھنے کے لیے دور دور سے آتے ہیں۔ میں نے اپنے علاقے کی ترقی خاص کر خواتین کے لیے بہت کام کیا اور اپنا ایک مقام بنایا کہ دگ میرے کام کی وجہ سے میری اتنی عزت کرتے ہیں کہ داد کی عمر کے لوگ بھی نام نہیں دیتے جتنی باجی کہتے ہیں۔

میں نے اپنے علاقے میں سب سے پہلے لڑکیوں کے لیے کونگ کلاسز شروع کیں پھر نائن اسیدمی کے نام سے سٹائی سینٹر شروع کیا۔ رٹرنے کے بعد ہمارے علاقے میں بہت این جی اوڈ آئیں تقریباً سب کے ساتھ کام کیا۔ سب سے زیادہ اسلامک ریف کے ساتھ کام کیا۔ نئی روشنی کے نام سے سات اسکول قائم کیے جس میں بڑی عمر کی خواتین کو تعلیم دی جاتی تھی۔

گشتا نذیر کشمیر

# ہنسفیہ محبت پاکیزہ ڈائجسٹ قارئین پاکیزہ کی نظر میں

شائستہ زریں

کے رضوانہ برنس کے ہلکے پھلکے انداز میں لیے فنون لطیفہ سے متعلق شخصیات کے انٹرویوز اور سماجی موضوعات کا احاطہ کرتی مجھ ناچیز کی "سروس رپورٹس" قارئین کی دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔ پاکیزہ کی آن اور شان "بہنوں کی تحفل" کا آغاز کسی انجمنی اہم موضوع پر انجمن باجی کی قارئین بہنوں سے جامع گفتگو سے ہوتا ہے، اسے آپ پاکیزہ کا ذیلی ادارہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد مین مرتبہ درود ابراہیکی اور آیت کریمہ پڑھنے کی تلقین مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں، دعائے صحت کے لیے التماس، انتحاب پر ملال کے بعد مضبوط اور ان کے جواب۔ پاکیزہ کی سالگرہ کے موقع پر پاکیزہ کی دنیا سے رخصت ہو جانے والی مصنفات، شاعرات اور قارئین بہنوں کو یاد کرتے ہوئے دعاؤں کے گجرے پیش کرنا بھی پاکیزہ کی دیرینہ اور اچھی روایت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ادروں کے ساتھ، ساتھ بحیثیت قاری، افسانہ نگار اور صحافی میں نے بھی پاکیزہ سے بہت کچھ سیکھا۔ بے حد ممنون ہوں عذرا باجی کی حوصلہ افزائی، انجمن باجی کی رہنمائی اور بے لوث محبت، سروس رپورٹ کے سوال تیار کرنے سے تیاری تک کے مراحل میں مشاورت کے ضمن میں نزہت امیر کے مخلصانہ تعاون کی۔ پاکیزہ... بلاشبہ تمام بہنوں کے لیے تربیت گاہ کے مانند ہے جہاں سے تربیت حاصل کرنے والے شاد کام رہتے ہیں۔

مطالعہ نہایت کم سنی سے بیک وقت میری کمزوری ہی نہیں طاقت بھی بنارہا۔ خواتین کے لیے شائع ہونے والے ڈائجسٹوں میں سب سے پہلے پاکیزہ ڈائجسٹ پڑھا۔ سرورق سے پس ورق تک پڑھنے کے بعد پہلا تبصرہ یہی تھا کہ واقعی پاکیزہ اسم باقمی ہے اور یہ تاثر آج تک قائم ہے۔ ماضی سے حال تک کا سفر طے کرتے ہوئے یہ احساس اور فخر ہو رہا ہے کہ بڑھتے ہوئے وقت کے ساتھ، ساتھ پاکیزہ خوب سے خوب تر کی جانب رواں دواں ہے اس کی شادابی اور جاذبیت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ باعتبار مجموعی قارئین اور بالخصوص مصنف تازک کے لیے پاکیزہ کی انسائیکلو پیڈیا سے کم نہیں کہ اس میں شامل مختلف النوع تمام مواد خواتین کے لیے رہنما ثابت ہوتا ہے۔ "اداریہ" جو کسی بھی رسالے کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ گرم فخر، نسیرت افروز، ہاکم ل اور قارئین کے دل میں گھر کرنے والا۔ اگر "دین کی باتیں" اور روحانی مشورے قلب و رون کو تقویت بخشتے ہیں تو شعری و نثری تخلیقات سے ذوق مطالعہ کی تسکین ہوتی ہے، افسانوی ادب کے چشم کشا حقائق قارئین کو ذہنی بیداری کی موجات دیتے ہیں۔ حسن و نعت کے بارے میں آج بھی ہو جاتی ہے۔ "جلترنگ" کے ساز نہجتے ہیں تو بصارت ہی نہیں سماعت بھی منور و معطر ہو جاتی ہے۔ "وہ" کے بزم میں "نزہت اصغر کے لٹریری رٹھ اور "فسانہ نہیں حقیقت ہے یہ"

۳: ہر وہ شاہکار افسانوں میں سے ایک منتخب افسانہ شائع کریں۔

### ڈاکٹر شہلا عامر

اپا کیزہ سے جو بھی سیکھا اس نے اپنے مثبت اثرات مجھ پر چھوڑے۔ مثلاً ”مجھے کچھ کہنا ہے“ جسے پڑھ کر زندگی گزارنے سے متعلق چھوٹی، چھوٹی مگر بہت کارآمد باتیں سیکھیں۔ ان کو اپنی زندگی میں



ڈاکٹر شہلا عامر

شامل کر کے صرف میری زندگی ہی نہیں سنوری بندہ اللہ! اللہ آخرت بھی سنور جائے گی، آمین۔ جزاک اللہ... انجم پائی۔

۲: ”بہنوں کی محفل“ جس کا کوئی جواب ہی نہیں اور جسے میں نے ”اپا کیزہ کی فیس بک“ کا نام دیا تھا۔  
۳: اگر اپا کیزہ میں کوئی انعامی سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا جائے تو اس خوب صورت پرچے میں مزید چار چاند لگ جائیں گے۔

### شازیہ افتخار خان

۱: ”جلت رنگ“ میں مجھے طرح، طرح کی ایشیا کی بالخصوص پاکستانی عورتیں نظر آئیں، ان کے رویے

ڈائجسٹ کا ادب تفریحی ادب کے زمرے میں آتا ہے لیکن پاپکیزہ ڈائجسٹ سے مقبولیت حاصل کرنے والی مصنفات بشری رحمن، سیما سراج، شکیلہ رفیق، عنایت گل اعزاز اور نرگس احمد بشیر اولی جرائد کی کامیاب قلم کار ہیں۔ خواتین کے دیگر رسائل کو مد نظر رکھیں تو پاپکیزہ کو ایک نہیں کئی ایک امتیاز حاصل ہیں۔ اس گرم کے لیے ہم اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہیں اس دعا کے ساتھ کہ اپنی رحمتوں اور برکتوں کے سائے میں اپنے شکر گزار بندوں میں شام رکھے اور پاپکیزہ ڈائجسٹ کی آب و تاب میں ماہ بہ ماہ اضافہ ہوتا رہے، آمین

اسی مناسبت سے ہم نے چند قدری بہنوں سے معلوم کیا کہ.....

- ۱۔ پاپکیزہ سے آپ نے کیا سیکھا اور آپ کی زندگی پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟
- ۲۔ پاپکیزہ کا وہ کون سا خاص وصف ہے جو اسے خواتین کے دیگر رسائل سے ممتاز بناتا ہے؟
- ۳۔ پاپکیزہ میں کون سی دلچسپ تبدیلی کی خواہشمند ہیں؟

### ڈاکٹر ممتاز ضیا

۱: پاپکیزہ کا ادب میرا ساتھ پاپکیزہ کے پہلے شمارے سے ہے۔ اس کا معیار ہمیشہ سے اچھا ہے اور انجم کی ادارت نے اس میں چار چاند لگا دیے۔ یوں تو پاپکیزہ سے بہت کچھ سیکھا لیکن سب سے بڑھ کر یہ سیکھا کہ کیسے غیروں کو اپنا بنا دیا جاتا ہے اور اس کو کس طرح بھایا جاتا ہے؟ عذرا اور انجم کا دیا ہوا یہ احساس بہت خوشی کا باعث بنتا ہے کہ ہم ان کے اپنے ہیں۔ پاپکیزہ کی تحریروں سے حقوق العباد کی اہمیت کو نہ صرف سمجھا بلکہ جہاں اس میں کمی رہی اس کو پورا کیا۔

۲: اپنی مصنفات، قارئین، تبصرہ نگار سب کو یکساں اہمیت دی جاتی ہے اور اپنی مصنفات کی بھرپور حوصلہ افزائی سے نیا ٹیلنٹ سامنے آ رہا ہے۔



## غزل

میں انتظار کروں گی سحر ہونے تک  
میں سانس بھی نہیں لوں گی سحر ہونے تک  
رقم کروں گی مسلسل ستم کی تحریریں  
تمام ظلم سہوں گی سحر ہونے تک  
تو آئینہ نہ سہی آئینے سے کم بھی نہیں  
میں تیرا عکس پڑھوں گی سحر ہونے تک  
جسے چراغ تو سوچوں گی روشنی کیا ہے  
کسی سے کچھ نہ کہوں گی سحر ہونے تک  
ہوا میں تیز چلیں یا چمن میں پھول کھلیں  
میں اپنے گھر میں رہوں گی سحر ہونے تک  
سحر ہونے کے بعد آئینہ میں دیکھوں گی  
فرنی میں سب کی سنوں گی سحر ہونے تک  
کلام: فریدہ فری یوسف زئی، لاہور

طالب علمی کے سنہری زمانے میں جب کچے  
ذہن پہ چکی سوچوں کا راج تھا اس وقت زندگی کے  
اتار چڑھاؤ میں جذباتی، احساساتی اور نفسیاتی...  
ترہیت میں پاکیزہ ڈائجسٹ نے ناپختہ ذہن کو ایسا رخ  
دیا کہ کم عمری میں ہی فہم و ادراک کے دروازے کھلتے  
گئے اور میں عقل و شعور کی سیر ہیاں چڑھتی چلی گئی  
لیکن ان اثرات کا اندازہ اس وقت ہوا جب سب  
نے ہاشعور اور سمجھ دار بچی کا لیبل لگا دیا۔

۲۔ ڈائجسٹ کی دنیا اتنی وسیع ہو چکی ہے کہ فی  
زمانہ اسے ڈائجسٹوں کا جمود بازار بھی کہہ سکتے ہیں  
لیکن اس بازار میں بھی اپنا مقام بنائے رکھنا، پاکیزہ  
ڈائجسٹ کا ایک خاص وصف ہے۔ کہتے ہیں کہ لفظ  
میں قوت ہوتی چاہیے کہ وہ نہ صرف دل و دماغ بلکہ  
سنگلاخ تحریری معیار جو صرف اور صرف مدیرہ اعلیٰ  
اور معاونین کی فکر و کاوش کا آئینہ دار ہے۔ خوب سے  
خوب تر بنانے کے لیے تمام تحریروں کو اس طرح  
جانچا جاتا ہے کہ حقیقت اور تخیل میں کوئی بُعد نظر نہیں  
آتا۔ متنوع اور اچھوتے موضوعات کے پردے میں

نظر آئے۔ جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور اس  
کے مثبت اور خوشگوار اثرات ہی مرتب ہوئے۔ مجھے  
یہ معنوم ہو گیا کہ کس قسم کے لوگوں سے کیسا برتاؤ کرنا  
چاہیے۔ راستوں کا تعین کرنا سیکھا اور پھر اس پر عمل  
بھی کیا۔

۳۔ ”جلت رنگ“ جس میں مزاح کے توسط سے  
زندگی اور معاشرے کے بہت سے سبق مل جاتے ہیں۔



## شاذیہ افتخار خان

یہ سبق تو خواتین کے دیگر مسائل میں بھی مل جاتے  
ہیں لیکن اس طرح ہلکے پھلکے انداز سے نہیں یہ صرف  
اور صرف پاکیزہ میں ہے۔

۳۔ ادبی جرائد میں چھپنے والی کہانیوں کے لیے  
دو تین صفحات مختص کر دیے جائیں۔ نئی چھپنے والی  
کتابوں پر تبصرہ بھی ہر ماہ شائع ضرور کریں۔

## عمرانہ شہناز

۱۔ پاکیزہ ڈائجسٹ جب میرے ہاتھ میں آیا تو  
یہ شعر میرے ذہن پہ دستک دینے لگا۔

چہرہ ہوا میں اور میری تصویر ہوئے سب  
میں نفل ہوا مجھ میں زنجیر ہوئے سب

اور پھر پاکیزہ وہ پہلا خواتین کا رسالہ جو میں نے پڑھنا شروع کیا میری زندگی پر اسی لیے پاکیزہ کے اثرات گہرے ہیں کیونکہ پاکیزہ میں ایسی کہانیاں شائع ہوتی ہیں جو زیادہ تر حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں۔ خوابوں خیالوں سے ذرا دور زندگی کی حقیقتوں سے روشناس کرانے کا سہرا پاکیزہ کے ہی سر ہے اور ادبی دنیا میں میری پہلی پہچان ہے۔

۲: میں تو بر ملا یہی کہوں گی دوسرے رسائل سے ممتاز بنانے میں سب سے اہم کردار پاکیزہ کی مدیرہ کا ہے جنہوں نے ہر خاص و عام کو ایک لڑی میں



میرا شہناز

زندگی کی تلخیوں کو ایک ہلکے پھلکے انداز میں بیان کرنا اور قارئین کو اپنے سحر میں جکڑے رکھنا صرف پاکیزہ کا ہی طرہ امتیاز ہے، اسی لیے فنون لطیفہ میں ادب کا جو مقام ہے پاکیزہ ڈائجسٹ اس کا عکس ہے جو زمینوں کو بھی سیراب کر دے اور اس خوبی کے لیے تحریر کا معیار بہت ضروری ہے۔

۳: پاکیزہ کے تمام سلسلے اپنی، اپنی جگہ اس طرح فن ہیں کہ جیسے ایک مرصع انگلی مختلف آبدار تھیموں سے مزین ہو اور اس میں کم اور نہ بیش کی گنجائش ہو۔ فی زمانہ ہم جدید تحقیقات، ایجادات اور مفروضات سے آشنا ضرور ہیں لیکن اپنی اسلامی تاریخ سے بے بہرہ ہوتے جا رہے ہیں اگر کوئی اسلامی تاریخی سلسلہ شروع کر دیا جائے تو یقیناً ایک گرانقدر اضافہ ہوگا۔

### ایڈووکیٹ سعدیہ تما شیخ

۱۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں نے رشتوں کو برتن پاکیزہ سے سیکھا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ رسالوں کی چاٹ اپنی مدر سے ملی بچوں کے رسالوں سے اخبار جہاں



ایڈووکیٹ سعدیہ تما شیخ

پرو رکھا ہے۔ فی زمانہ خود کو پیچھے رکھ کر دوسروں کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا انجم انصار کا ہی وصف ہے۔ تنقیدی خطوط لگانا، سب سے برابری کا سلوک کرنا۔ سچ پوچھیں تو ہماری مدیرہ کو تو تنظیم انصاف کی چیر پر سن ہونا چاہیے۔ پاکیزہ سب کی تحریروں سے انصاف کرتا ہے۔

۳۔ بھی ہم Aquarian تو ہیں؟ ہمیں یہی تبدیلی کا سائن کہ محبوب ہر حال میں ہی اچھا لگتا ہے۔

اور میزبانی کرتی ہیں اس سے تمام مصنفات کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ یہ ایک مثال ہے۔  
۳: پاکیزہ میں انعامی کہانی کے سلسلے سے صحت مند مقابلے کا رجحان سامنے آ سکتا ہے۔ اور پھر یہی اعتماد ہر فنڈ میں ترقی کے لیے مفید ہے۔

### شمالیہ سہیل جاوید

۱: میری اولین تربیت گاہ، میرا حوصلہ، میری خود اعتمادی، میری لگن، میری جستجو، تخیل کی پرواز، صلاحیتوں کا قدردان۔ میری پہچان۔ ان سب کا نام ہے ”پاکیزہ ڈائجسٹ“ ہے۔  
سب سے زیادہ مثبت اثر تو یہ ہوا کہ میری خود اعتمادی میں اضافہ ہوا۔



### شمالیہ سہیل جاوید

۲: ”بہنوں کی محفل“ جس کے توسط سے انجم انصار صاحبہ نے تمام قارئین، مصنفات، تجربہ نگاروں اور شاعرات کو باہم ایک لڑی میں پڑوایا ہوا ہے۔ اس مالا کو صرف اور صرف انجم نے طریقے اور قرینے سے سنبھال رکھا ہے۔ اس محفل میں ہم سب ایک گھر کے کینوں کے مانند ایک دوسرے سے اپنے

مگر ہم شاعروں کے لیے تھوڑی تشنگی ہے۔ ایک دو صفحات شاعرات کے لیے مخصوص کر دیے جائیں تو بے دوسرا وہی پرانا مطالبہ ایوارڈ حاضر کیے جائیں ورنہ ہم غدار رسول کے گھر کے سامنے دھڑا دیں گے۔ آپ سب میرے ساتھ ہم آواز ہیں ناں۔

### صائمہ قیصر ہاشمی

۱: سچ تو یہ ہے کہ پاکیزہ میری پرائمری کلاس ہے۔ جہاں سے میں نے اڑان بھری اور پھر چل سو چل۔ انجم آپ کی جلتنگ سے متاثر ہو کر لکھنا



### صائمہ قیصر ہاشمی

شروع کیا۔ پرنٹ میڈیا سے الیکٹرانک میڈیا تک کا سفر کامیابی سے طے کیا۔ پاکیزہ سے شروع ہوئے سفر اور بنیاد نے میری زندگی کو اعتماد اور معاشی سہارا دیا۔ پاکیزہ میری تحریر کا سرچشمہ ہے۔

۲: خواتین کے جذبات و احساسات کا بہترین نمائندہ پاکیزہ ہے۔ نئی مصنفات کو پلیٹ فارم مہیا کرتا ہے، جہاں وہ اپنی صلاحیتوں کو آزماتی ہیں۔ غدار آپلی، انجم آپلی اور نزہت اصغر جس بیٹھے لہجے، محبت اور اپنائیت سے بات کرتی ہیں، مدعو کرتی ہیں

کی پہچان کروائی۔ پاکیزہ میں شائع ہونے والی ہر تحریر ہمیں کچھ سوچنے پر مجبور ضرور کرتی ہے۔ پاکیزہ کے اثرات مجھ پر یوں مرتب ہوئے کہ اب میں منظم طریقے سے زندگی بسر کرنے لگی۔ مجھ میں پڑھنے کا جذبہ اور شعور بیدار ہوا۔ میری خود اعتمادی میں اضافہ ہوا۔

۲. پاکیزہ اپنے نام کی طرح پاکیزہ سے اس میں کبھی کوئی غیر اخلاقی تحریر نہیں پڑھی، بہنوں کی محفل جسے انجم باجی نے اپنے اخلاق اور محبت سے بہت وسعت دی ہے۔

۳. انعامی سلسلے اور ایوارڈ دوبارہ جاری کیے جائیں تاکہ قارئین اپنی پسندیدہ مصنفات سے ملاقات کر سکیں۔

### عاصمہ طارق

۱. سسرالی رشتے نباہنا اور ایڈجسٹ کرنا اور ہونا سیکھنا۔ اس سے زندگی میں اچھی تبدیلی آئی جس کی بنا پر زندگی زیادہ پرسرت اور خوشگوار ہو گئی۔

۲. روحانی مشورے جو اور کہیں نہیں۔

۳. بیوٹی کلینک اور فیشن کے رنگین صفحات وہ بارہ



عاصمہ طارق

دکھ سکھ بانٹتے ہیں، انجانے لوگ بھی اپنے اپنے گتے ہیں۔ ایک دوسرے کا احوال، سماجی زندگی، سرگرمیاں بھی ہم گھر بیٹھے ہی جان لیتے ہیں۔

۳. انعامی سلسلہ دوبارہ شروع کریں۔ ہماری وہ قلمکار جو اب ہمارے درمیان نہیں ان کا کوئی افسانہ یا کلام ہر ماہ پاکیزہ کی زینت ضرور بنائیں۔

### ریحانہ حسن

۱. پاکیزہ نے مجھ میں لکھنے کا شعور اور چھپنے کا حوصلہ دیا۔ میرے اندر آگے بڑھنے کا جذبہ اجاگر کیا۔ اس کا اثر مجھ پر یہ پڑا کہ میں ہمت نہیں ہارتی بلکہ کامیابی کے حصول کے لیے جدوجہد کرتی ہوں۔



### ریحانہ حسن

۲. جلتیگت جس میں معاشرے کی تلخ سچائیوں کو مزاح کے پردے میں بیان کیا جاتا ہے۔ بہنوں کی محفل کے آغاز میں کی جانے والی گفتگو، مصنفات اور قاری بہنوں کی سرگرمیاں۔

۳. ہر ماہ ایک راکٹر کا انٹرویو ضرور شائع کریں۔

### نگینہ ضیا بنگش

۱. پاکیزہ نے اپنی پاکیزہ تحریروں سے اچھے برے



## رائی بھابی

کچھ لوگ دنیا میں ایسے ہوتے ہیں جو دنیا سے جانے کے بعد بھی یادوں کے اٹھتے نقشوں میں چھوڑ جاتے ہیں۔ انہی میں شمار میری رائی بھابی کا بھی ہوتا ہے۔ نندہ بھابھ کا رشتہ ہمیشہ ہی منفی شمار ہوا ہے۔ بلکہ محاورہ مشہور ہے نندہ افضل گند۔ مگر اللہ کا شکر ہے ہمارے درمیان اس کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ میری امی، بھائی جان کو شہزادہ کہتی تھیں، لہجے چوڑے سرخ سفید تو رائی بھی ترو تازہ گلاب کا پھول۔ بھائی جان نے انٹر کیا اور رائی بھابی نے ننھویں پاس اور شادی ہو گئی کیونکہ آپس میں گزرتے تھے۔ دونوں میں ایسی مثالی محبت اور رنگت گنت کہ دیکھی اور نہ سنی مگر اس محبت کی عمر اتنی مختصر تھی کہ چار بچوں کے ساتھ صرف آٹھ سال بعد رائی بھابی سبائیکس سے دیوہ ہو گئیں۔ جس عمر میں آج کل لڑکیوں کی شادیاں نہیں ہوتیں۔ صابر و شاکر، شرم و حیا کا پیر بھائی جان سے محبت ایسی بھائی کہ کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھا۔ نہ کسی کو انگی اٹھانے کا موقع دیا۔ اللہ نے اتنی نیک اور عبادت گزار بھابی کو اتنی مہلت ضرور دی کہ اپنے چاروں بچوں کو اپنے گھروں میں خوش آباد رکھے ہیں۔ نیک اتنی کہ اپنی محبت کی خواہش نے بھتیگیوں کے ہمراہ نبھاتے ہوئے کہا۔ اتنا پاکیزہ اور مقدس جنازہ۔ ان کو آب زم زم میں ڈوبا ہوا کفن ہم اپنی طرف سے پہنا میں گئے۔ بھی، بھی میں سوچتی ہوں اللہ تعالیٰ نے ان کو کیا صرف آزمائش کے لیے ہی دنیا میں بھیجا تھا۔ جس پر وہ پوری امتیں اور چودہ دسمبر 2014ء کو بغیر کسی کو تکلیف دینے دنیا سے منہ موڑ گئیں۔ ان کی زندگی پر پوری کتاب بھی جاسکتی ہے جو جوان پیواؤں کے لیے مشعل راہ ہو مگر نجات کی کمی مانع ہے۔ پاکیزہ بہنوں سے ان کی مغفرت اور درجات کی بندی کے لیے دعا کی درخواست۔

تحریر سہلی غزل آراچی

شروع کریں۔ انٹرویوز اور سروے میں رہنمائی تصویریں شائع کریں ساتھ ہی کوئی انعامی سلسلہ بھی۔

✽ ✽ ✽

قارئین! آپ نے پاکیزہ کے حوالے سے سروے کے شرکاء کی آرا پڑھیں بلاشبہ جلت رنگ اور بہنوں کی محفل پاکیزہ کی امتیازی صفات ہیں اور یہ اعزاز مدیرہ پاکیزہ انجم انصار کے حصے میں آتا ہے۔ مدیرہ اعلیٰ عذرا رسول صلابہ نے گزشتہ برس پاکیزہ بہنوں کو پیغام دیجے ہوئے کہا تھا کہ ”ہماری یہ پوری کوشش ہوتی ہے کہ ایسی تحریریں شائع کی جائیں جو خیر کی نمائندہ ہوں اور جس کے ذریعے زندگی پاکیزہ اصولوں کے تحت گزاری جائے۔“ بلاشبہ عذرا باجی اپنی مصنفات کے تعاون سے اپنی اس کوشش میں کامیاب رہیں۔

سال رواں بھی محترمہ عذرا رسول نے اپنے پیغام میں کہا کہ ”پاکیزہ کا مقصد بھی یہی ہے کہ ہم ایسی تحریریں شائع کریں جو نہ صرف عورت کے مقام کو بلند کریں بلکہ اس کے توسط سے خاندان کی تعمیر و تشکیل بھی مثبت انداز میں ہو۔ الحمد للہ ہماری تمام مصنفات بڑی محنت، توجہ اور انتہائی محبت اور چاہت کے ساتھ پاکیزہ کے لیے مہیتی آرہی ہیں۔“

اور اس کا ثبوت تو آپ کو سروے میں شامل جوابات سے بھی مل گیا ہو گا کہ کس طرح پاکیزہ، خواتین کی گھریلو اور سماجی زندگی میں رہنما ثابت ہوا۔ پاکیزہ کے لیے ہماری دعا یہی ہے کہ

خدا کرے کہ چمکے شانی انجم تم  
جو ہر سو کروے اجال وہ آفتاب رہو  
پڑھے جو تم کو وہ تم کو نہ بھونے پائے  
محببتوں سے جو مہکے وہ تم گلاب رہو  
(آمین)

✽ ✽ ✽



## بہنوں کی محفل

عزیزِ دل جان پہنچو! اسلام کی رستہ نور ہے۔

ہر حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانہ قائم کیا جو دنیا کی ترقی اور رواداروں و مسلمان حضرات محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر

میں نے تو یہ میں حق کا یوں بال کیا۔

ہر پہاڑی سہنوا آج میں چند چھوٹی، چھوٹی، چھوٹی باتیں آپ سے کرتے چاہوں گی۔ یہ بد چلوگوں سے اٹھنے کی بات ہے۔

چند قسمی گھڑائے میں سرگھڑ کی بازی لگایا کہ یہ درمیں عات اور التا رہتے وہی ذات صرف البدولی کی ہے یا نہ

نہ کسی پرستان گم نہیں گئی تو اللہ کے غضب و آواز دیں گی۔ اہم یہ تو اکثر دیکھتے ہیں۔ اب لہجہ و ترجمہ انہوں میں نہیں

میں سے مشورہ کیا کرتی ہیں اور یہ ایسی کوئی خط بات بھی نہیں ہے مگر ہمیں بہت سی ماؤں نے سب یہ کہہ دیا۔ "اے بی بی"

میں نے تو کیا ان کی بیٹیوں تک کر لی ہیں تو ان سے مراد ہوں ہماری مائیں جو مل جہول ازماء شفا سے ہیں بہت کئے کی بھونٹ

میں نے اس کی تائید کی۔ جب ایک ماہ کے بعد یہ بتایا کہ وہ اپنی ایک بیٹی مرحوم کے خیر

کی شدہ بنیوں کو اپنے گھر میں بلا بھیجیں۔ کس سنی تو سنی پر سخت ان ہونا۔ محمد بن مسیح جہاں ہے ہیں ان کو اور بھی دے دے۔

میں نے جو جہنم سے تھے ہیں تو وہ بھائے نہیں ہیں اور نہ رشتے ہیں۔ یہاں ان لوگوں کے لئے ہے جس کو اللہ تعالیٰ چاہے کہ اس کی طرف سے اپنے آپ کو

روبو بھرجو جاتا ہے۔ ادا کوک بہت خوش قسمت ہیں کہ وہ دین مروت میں اور پیش و باز میں خوش بھی ہیں۔ انہیں یہ

پھونکی بات آپ سے یوں کہ اپنی حیثیتوں میں مست ہوں یہ آپ وانگاہوں کے ماپن میں ہی جوسی کے ہوں

برادر علی جے اور آپ نے اللہ کی آپ سے تہا۔ اسی میں

۱۰۰

— — — — —

مصنوعات اشاعت اور قارئین یا پیرزہ مہنوں کی تازہ و جہاں رو بہ درمیاں

ہر پیر کو تھوڑا سا کھانا کھاتے ہیں۔

ہو منصفہ انہا ایمان تو خلی موت پہنچے مرنے کی صورت حاصل کرے جاں بخشی ہیں۔ (مہرِ دیں)

یہودی مسلمانوں کے درمیان جو اختلافات تھے ان پر ایک کتاب لکھی گئی اور اسے "دستور" کہا گیا۔

(ممبر: ۱۱۱)

وہ کہتا ہے کہ جو لوگ اللہ سے محبت کریں، اللہ ان کی ساری باتیں سن لے گا۔

سینٹ نے اپنے منہ سے یہ جملے نکلے کہ: یہ بڑی بات ہے، ایک غلطی ہے۔

ن۔ (ہاشمہ) ۱۰۰

عمر کا یہودی مسلمان تھی۔ اس کی عمر، شریف باجوہ، "ہوا" کے دن بھی پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کس

منفرد رہی ہے۔ (میرکبیر)

اس وقت کے محکمہ خزانہ کے ایک افسر نے کہا کہ ان کے پاس اس وقت کوئی رقم نہیں ہے۔ (مبارک پور)

[illegible]

\_\_\_\_\_

... ..

بیتا سیف اللہ رحمہ اللہ اور ان کی بھانجی فائزہ کی شادی ہوئی۔ (مبارک)

✽ مصطفیٰ غزل اپنے بھائیوں کے پاس امریکا جا رہی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

✽ فائزہ کی مستقل تبصرہ نگار رانیل شاہ کے پاس بیاری کی بیٹی ہوئی ہے جس کا نام انہوں نے

انابیل رکھا ہے اور اس بار رانیل شاہ کی شادی کی ساغرہ بھی ہے۔ (مبارک)

✽ فائزہ کی مستقل قاری مس زبیرہ مبارک نے بیورو انجوشن میں ایک ممبر کلب بنایا

ہے۔ (ماشاء اللہ مبارک)

✽ فائزہ کی مستقل تبصرہ نگار گلینہ ضیا بنگش، کراچی اپنی شاعری کا مجموعہ جلد لے کر آئیں

گی۔ (ماشاء اللہ)

✽ گلشن وندریہ میری ان دنوں اپنی یادداشتیں جمع کر کے ان کو شائع کرتے والی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

✽ مصطفیٰ رفاقت جاوید، اسلام آباد کی اس ماہ دو کتابیں آئی ہیں اور آئندہ ماہ ایک اور آئے

والی ہے۔ رفاقت تو تحریروں کی سپر مارکیٹ بنیں۔ (ماشاء اللہ مبارک)

✽ مصطفیٰ اختر شجاعت اپنے گھر کو جانے اور سوارے میں مصروف ہیں۔ (ماشاء اللہ)

✽ مصطفیٰ اقبال بانو کالی دی سوپ سسرال میری بہن کا بہت پسند کیا جا رہا ہے۔ (مبارک)

✽ مصطفیٰ سیما منٹو، شکاگو سے واپس کراچی آچکی ہیں اور جوں سالہ بھانجی کی رحلت پر انتہائی

نزدہ ہیں۔

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

✽ فائزہ کی ناول نگار رفاقت جاوید، اسلام آباد ان دنوں بستر عیالت پر ہیں۔

✽ فائزہ کی مستقل تبصرہ نگار المیس جبار، آزاد کشمیر کی آنکھوں کی روشنی کھردر ہوئی ہے۔

✽ مصطفیٰ شاعرہ عالیہ بشیر، اسلام آباد ان دنوں علیل ہیں۔

✽ فائزہ کی مستقل قاری شہلا ظفر، کراچی کو مستقل چکر آتے ہیں اور معدے کی بھی پرانی ہے اور ڈپریشن بھی۔

✽ ناول نگار و ناول نگار اقبال بانو کی چھوٹی بہن جمیرا عباس بیمار ہیں۔

✽ شاعرہ مصطفیٰ نیر رانی شوق، ڈی جی خان بیمار ہیں۔

✽ فائزہ کی مستقل قاری عصمت، اوکاڑہ کے بازو کی ہڈی کرک رہی ہے۔

✽ فائزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ اجیتہ عندلیب، سواتوالی ان دنوں شدید علیل ہیں۔

✽ فائزہ کی مستقل قاری عذرا بی بی، راولپنڈی ہنوز علیل ہیں۔

✽ فائزہ کی مستقل تبصرہ نگار کل شاپین، ڈی جی خان کی آنکھوں میں تکلیف ہے۔

✽ مصطفیٰ شاعرہ فریدہ جاوید فری، لاہور کی طبیعت ناساز ہے۔

انتقالِ مرغل

✽ فائزہ کی تبصرہ نگار و کمالیوب، کراچی کی لاہور میں شہر چھوٹی بہن راحت مسیح انتقال کر گئیں۔

✽ فائزہ کی مستقل تبصرہ نگار مسرت رانی حلیل، کراچی کی جواں سال بھانجی طوبی اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئیں۔

✽ اس ماہ عذرا پروین کے شوہر جناب سید خالد جیلانی کی بڑی ہے۔

✽ ڈاکٹر ایلا اعجاز جو پشاور سینٹر لی وی کی آرٹسٹ بھی تھیں انتقال کر گئیں۔

✽ معروف بی بی سی براڈ کاسٹر شاہدہ احمد کراچی میں انتقال کر گئیں۔

✽ مصطفیٰ سیما منٹو کی شکاگو میں مقیم جواں سال بھانجی حرارومی راہی ملک عدم ہو گئیں۔

✽ مصطفیٰ غزالہ رشید کی بھائی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس ضمن میں غزالہ گزشتہ دنوں و شجاعتی ہوئی تھیں۔

✽ نوت کے تمام مرحومین کی مغفرت کی دعا کے ساتھ صرف تین مرتبہ سورہ اخلاص پڑھ کر ان کے درجات کی بلندی کے





لیے دعا کریں۔

آئیے اب ایک نظر اپنے کئے چٹھے خطوط پر ڈالتے ہیں

بھو رو بہ و سیم فنی، ضلع لوہراں سے۔ "پاکیزہ ہے ہندوستان کی تحریروں سے اور خصوصاً انجم باجی کی باتوں سے بہت کچھ سیکھتی ہوں اپنی بہنوں سے یہی کہنا ہے کہ مقدر سے کوئی نہیں لڑ سکتا۔ جو مقدر میں ہوتا ہے وہ ضرور ملتا ہے۔ آپ زندگی کی تکلیفوں کو مسکرا کر جیتنا سیکھیں۔" (بہت پیارنی بات بتائی ہے آپ نے)

بھو عصمت، اوکاڑہ سے۔ "میں اپنے گھر میں رہتی۔ دارا میں چوتھی ہے مگر پھر بھی پاکیزہ پر جا۔ مہذرا رسول کا پیغام بہت پیارا لگا اور بہنوں کی محفل اس دفعہ خوب بڑی تھی اور میں اس محفل کو بہت زیادہ پڑھتی رہی۔" (خاطر ہے آپ کی اپنی محفل جو تھی)

بھو ناسید بنت نور، واہ سیٹ اور کس سے۔ "بے حد مصروفیات ہیں اور زندگی نے بہت کچھ عطا کیا ہے اور میں اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں وہ کر نہیں سکتی۔ خاص طور پر جب میرے بچے کا کیڈٹ کان میں داخلہ ہوا۔ سامرو ٹیمر کی خاص چیز اس مرتبہ کا جلتی رنگ رہا ہر سطر پر حراج تھی۔ ہمیں عظمیٰ آفاق کے اللہ نے کا اظہار ہے اور شادی کے احوال کا بھی۔" (اس ماہ آپ شادی کا آنکھوں دیکھا حال پڑھ رہی ہیں)

بھو کل شاہین، ڈی جی خان سے۔ "اب تک پڑھنے والے انٹرویوز میں مجھے عزیز و سید کا انٹرویو بہت زیادہ پسند آیا ہے۔ پڑھ کر بہت لطف آیا ہے۔ مہذرا رسول جی کا پیغام تو کوزے میں دریا بند تھا، انہوں نے بہت پیار سے انداز میں سب بہنوں سے خطاب کیا اور سب کو عزت دی۔ اس ماہ بہنوں کی محفل خوب بڑی تھی بہت ساری بیٹیاں شامل تھیں جس سے لطف بھی زیادہ آیا۔ انجم باجی اس ماہ سب کو ایوارڈ دے کر سب کو خوش کر دی۔ واقعی اب کوئی ایسا ناراض نہیں ہوگی۔ عظمیٰ آفاق کی تحریروں میں بہت پسند آتی ہے اور اس کی کتاب بھی ضرور خریدیں گے۔ دیگر تحریروں میں ہمیں رضوانہ پرش کی تحریروں پر بھی۔ ماشاء اللہ باتی تحریروں آہستہ آہستہ پڑھ رہی ہوں۔" (آپ کی محبت رائے پہنچانی جاری ہے اور مصنفات شکر یہ بھی ہیں)

بھو سکی رضوی، گراچی سے۔ "شادی سے پہلے تو بڑی بات چیت کی تھی مگر اب گاہے گاہے ہی پڑھ پاتی ہوں۔ دو بیٹوں کی مامان بن چکی ہوں مگر جب بھی پاکیزہ پڑھتی ہوں وہی محبت اور حمایت ملتی ہے جس طرح بھی آپ سے فون پر بات کر کے مجھے ایسا لگا کر تھا کسی بے حد اپنے سے بات ہوئی ہے اسی طرح بہنوں کی محفل پڑھ کر اب بھی ایسا ہی لگتا ہے کہ اپنے سیکے میں آگئی ہوں۔ جلتی رنگ کی وجہ سے جہاں سسرال کی باتوں پر مجھے رونا چاہیے وہاں بھی آتی ہے اور آگئی ایسا

سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔ لڑکیوں کی سسرال کے ماحول معاشرتی میڈیا کی ترقی کے باوجود ویسے ویسے ہیں۔ جب میرے شوہر مذاق میں مجھ سے کہتے ہیں کہ تم ایک مختلف ماہول میں اس وجہ سے آئی ہو تاکہ زندگی کے سبق حاصل کرو تو میں ان سے اسی ٹیون میں کہتی ہوں آپ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ میں سب کو سبق دیتے آئی ہوں تاکہ ان لوگوں کو بھی تبدیلی کا کچھ احساس ہو۔" (گڑبہ مذاق میں ہے شک سب کچھ ادا کر دیے کچھ نہ کہو اسے گیت پر عمل کرتی ہی سکون وطنیت کی بھی ہے)

بھو قمر النساء، گوجرانولہ سے۔ "جہاں مرتبہ آپ سے رابطہ کر رہی ہوں۔ میں سب رسائل پڑھتی ہوں۔ سب بچوں کی شادیوں سے بھی فارغ ہو چکی ہوں میں۔ مگر مہذرا رسول کے پیغام کی حمایت کرتے ہوئے اتنا ضرور کہوں گی کہ پاکیزہ کا حراج عینکدہ ہی ہے اور اس میں محبت کا ہر رنگ موجود ہے۔ مجھے آپ کی تحریروں دل سے پسند ہیں۔" (اس محفل میں خوش آمدید۔ ہمیں اپنے ہر قاری کی شرکت بھی دل سے پسند ہے)

بھو فیروزہ بیگم، گراچی سے۔ "اب تو عرصہ دراز ہو گیا ہے پاکیزہ کو پڑھتے ہوئے اور اس میں تبصرہ دیتے ہوئے۔ اس کو بہنوں کی محفل، جلتی رنگ اور پھر روحانی مشوروں کی وجہ سے پڑھا اور پھر اس کے گرد یہ ہو گئے۔ گزشتہ ماہ روحانی مشورے کے صفحات قاری تھے اور بہنوں کی محفل میں شہلا کا خط پڑھ کر آپ سے اور مہذرا رسول سے یہ کہنا چاہوں گی کہ آپ مارکیٹ سے تمام رسائل لے کر دیکھ لیں کبھی کسی ایڈیٹر یا مصنف کے لیے اس طرح کے جٹ آئیں خطوط شائع نہیں کیے جاتے تو آپ لوگ کیوں شائع کرتے







ہیں۔ اگر کسی کو کسی وجہ سے کوئی جھج ہو رہی ہے تو وہ خود ہمیں ہمیں ایسی تکلیف میں پلیر مبتلا نہ کریں (بہتر) میری دعاؤں میں نہ صرف پاکیزہ کی تمام باتیں بندہ ہونے والی باتیں یعنی عروج و مرجع کا تذکرہ نہ کرنا بلکہ جو بددیوانہ چاندنی عمران وغیرہ سب رہتی ہیں۔ (جزاک اللہ)

بہتر گلزار محبوب، گراہی سے۔ پاکیزہ کا ساگرہ نمبر بہت خوب صورت لگا۔ اس کی فحش تو صرف روحانی مشورے نہ کہنے کی تھی۔ ہم یہ صفحات نوٹواٹھ کر داکے آگے بھی تقسیم کیا کرتے ہیں۔ میری فرمائش ہے کہ باتیں ایسی ہی کا انٹرویو کیا جائے اور رائٹرز کے انٹرویو میں سوالات ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں بھی پوچھے جائیں۔ (بہتر سترہ اکثر رائٹرز ذاتیات کے بارے میں جواب دینا نہیں چاہتیں تو ہم زیادہ اصرار نہیں کرتے)

پاکیزہ بابا بلوچ، میر پور خاص۔ گریڈ اپنی نظمیں اور مراسلات ایک ساتھ بھیج دو۔ میں انہیں شامل کرتی رہوں گی۔ ہاں تمہاری دلہن بنی ہوئی تصویریں ایک پر بھیجی گئی ہیں بہت پیاری تھیں۔

پاکیزہ بابا بلوچ، میر پور خاص۔ اس محفل میں خوش آمدید۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے اپریل 1998ء کے پاکیزہ کے سرورق کی ماڈل ایلا ایڈز کے انتقال کی خبر دی۔ ہمیں دلی دکھ ہوا اور ہم سب پاکیزہ قارئین ان کی محفرت کے لیے ضرور دعا بھی کریں گے۔

سید فرخندہ لطیف، رحیم یار خان سے۔ "ساگرہ نمبر ملا اور تمام مصروفیات کو پس پشت ڈال کر رسالے کا جائزہ لیا۔ سرورق کو سراہا پھر مجھے کہتا ہے کہ پرائز اور حقیقت پر مبنی آپ کی تحریر پر مبنی۔ غلط فہم سچائی پر مبنی اور پرائز۔ محترمہ ہزاروں صلہ کا یہ کام عورت کے حوالے سے جو تحریر کیا وہ متاثر کر گیا اور غدار اب آپ نے بالکل ٹھیک کیا کہ انجمن آئی کو اللہ پاک نے ایسا محبت بھرا دل دیا ہے کہ بہت جلد دوسروں کو اپنا کر دیا کر لیتا ہے۔ نئے آنے والوں کو کھیل سے ذرا بھی جواہریت کا احساس ہو اور شادی کا احوال وہ بھی غلطی جی کے قسم سے مجھے تو سوچ کر ہی مزہ آ گیا ہے۔ اعتباراً قاضی حائل کے ساتھ باہمی سے شناسائی ہوئی۔ ارتقا کا رویہ عجیب ہے وہ اتنی چھوٹی نہیں ہے جو رشتوں کی پیچان نہ کر سکے۔ رفعت سراج صلیب کی تخلیق کی دکھی تو مجھے بیوہ کی متاثر کرتی ہے۔ اچھی تھی تحریر۔ مستاحول میں بارہ نے شاہ زیب کو ٹھیک سے کاٹھ کا الو بنایا ہے۔ گہمت اٹھنی نے ایک تلخ حقیقت سے پردہ اٹھایا۔ واقعی ہمارے معاشرے میں کالے رنگ کی وجہ سے انسانی ذات کے بقیہ تمام پہلو اور خوبیاں فراموش کر دی جاتی ہیں۔ تم میرے کون ہو میں راجیل اور اس کی بیوی کا فیصلہ درست تھا کیونکہ عورت اپنے شوہر کی بے وفائی کو بھی معاف نہیں کرتی۔ صبیحہ شاہ کی خواب زاوی نے متاثر کیا۔ جلد تک میں آپ کی فحش تصنیفیں تحریریں بہت مزہ دیتی ہیں۔ اس بات پر اتنا مزہ آیا کہ بتا نہیں سکتی۔ گل بدل جائیں گے۔ بی بی بی۔ پاکیزہ ڈائری غلطی جی نے خوب صورت نگہ سے کی طرح سچائی جس میں ہر رنگ اور خوشبو کا پھول تھا۔" (بھر پور تبصرے کا شکریہ)

سید حسنین غزل، کراچی سے۔ "سب سے پہلے بہنوں کی محفل پر مبنی سب سے زیادہ بہنوں کے تبصرے اور آراء اچھی گئی ہیں پھر آپ کی جسر تک مباحث کا تو جواب ہی نہیں۔ میں خود 3 مئی کو امریکا جا رہی ہوں اس لیے اس کی تیاریاں پھر دونوں بیٹوں کی فرمائشیں۔ میاں صاحب تو صرف آرڈر دے دیتے ہیں اور بندی بازاروں میں دوڑتی رہتی ہے اوپر سے شدید گرمی لیکن زندگی کا حسن یہی ہے۔ مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ غصہ بھی ہوا کہ لوگ کسی کی خوشی میں خوش نہیں ہوتے حسد کرنے والے کو جو برا خدا دینا میں تو مت کا لائیکن اللہ کے مگر بھی خدا ب۔ دیئے جی سے کہیں کہ بھی ایسا تو ہوتا ہی ہے اس طرح کے کاموں میں بقول شاعر ہوئی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں۔ فحش کو بھی اندازہ ہوا ہوگا کہ ان راہوں میں پھول کے ساتھ خار بھی ہیں اور نادیہ اور انجمن نے غلطیوں کے تیر بھی (اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں) رفعت سراج کا میں شانزے ہوں مختصر اور بلی پھلتی تحریر لیکن اس میں رفعت سراج کی تحریر کی جھلک نہیں۔ محبت اٹھنی نے بھی خوب لکھا ہے حقیقتاً گورا رنگ خوب صورتی کا معیار نہیں مگر ہماری آدمی سے زیادہ دنیا گورے رنگ پر مبنی ہے۔" (ہاں یہ تو ہے۔ گورے رنگ کو پسند کرنے والے بہتر زیادہ ہیں)

سید حسنین غزل، کراچی سے۔ "سب سے پہلے بہنوں کی محفل پر مبنی سب سے زیادہ بہنوں کے تبصرے اور آراء اچھی گئی ہیں پھر آپ کی جسر تک مباحث کا تو جواب ہی نہیں۔ میں خود 3 مئی کو امریکا جا رہی ہوں اس لیے اس کی تیاریاں پھر دونوں بیٹوں کی فرمائشیں۔ میاں صاحب تو صرف آرڈر دے دیتے ہیں اور بندی بازاروں میں دوڑتی رہتی ہے اوپر سے شدید گرمی لیکن زندگی کا حسن یہی ہے۔ مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ غصہ بھی ہوا کہ لوگ کسی کی خوشی میں خوش نہیں ہوتے حسد کرنے والے کو جو برا خدا دینا میں تو مت کا لائیکن اللہ کے مگر بھی خدا ب۔ دیئے جی سے کہیں کہ بھی ایسا تو ہوتا ہی ہے اس طرح کے کاموں میں بقول شاعر ہوئی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں۔ فحش کو بھی اندازہ ہوا ہوگا کہ ان راہوں میں پھول کے ساتھ خار بھی ہیں اور نادیہ اور انجمن نے غلطیوں کے تیر بھی (اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں) رفعت سراج کا میں شانزے ہوں مختصر اور بلی پھلتی تحریر لیکن اس میں رفعت سراج کی تحریر کی جھلک نہیں۔ محبت اٹھنی نے بھی خوب لکھا ہے حقیقتاً گورا رنگ خوب صورتی کا معیار نہیں مگر ہماری آدمی سے زیادہ دنیا گورے رنگ پر مبنی ہے۔" (ہاں یہ تو ہے۔ گورے رنگ کو پسند کرنے والے بہتر زیادہ ہیں)







ہوتی ہے۔ آئی۔ اعجاز میسر و سید و صاحب سے۔ میسر و نے سونوں کے جوابات بہت جانتے اور مل رہے۔  
 بہت اصرار کے بہت خوب صورت میرا کے میں میں اور یہ کہا ہے کہ یہ ایک بھر پر انگریز سے تو ہے جانتے  
 ہوگا۔ جلتی میں تہی بہت پسند آئے۔ غلطی آفاق ن محنت فاقی میں نظر آ رہی ہے۔ غرض سارہ و سید  
 ایک بھر پر میسر سے تھک کر اسے منور نے واسے ہاتھ سے اٹھا کر لیں۔ (محبت سے ہرگز تھکے۔  
 کے ہے چراگ اللہ)

سید مازنین آفریدی، پٹہ اور سے نہ ناکل میں ٹھیک تھا۔ روحانی مشورے کی فیضیت سے  
 محسوس ہوئی۔ میسر و سید کا ترو و دوہا پر چھ مگر کی محسوس ہو رہی سے مزید پچھ جائیگا تھا۔ اور وہ بتاتے پسند  
 کرتے تو فاقی کو الٹ بھی پچھ سے جاتے تو اچھا رہتا۔ (میں تو بہت سے نہیں۔ غرض کی فاقی پسند تھیں کہ  
 خیال رکھ رہے جو وہ ضروری سمجھیں۔) تصاویر کی بھی۔ تھبت سید کی اعتبار و فاقی سے روئی کا شکر  
 ہے۔ رنگ غلط زبردست ہے۔ سارہ پر ترس آتا ہے وہ پانچوں کے کچھ سینڈ وچ ہوئی۔ متاع دل بھی  
 اچھا چار ہے۔ سواد ہو تو ایسا بہت زبردست لگا۔ رضوانہ پرش کا ناوت بھی بہت اچھا با اینڈ تک سمجھتی  
 نہ آئی کہ پھر فرمان صاحب کا ہوگا۔ مدد و مدد لینے بھی اچھا لگا۔ زینتی اور زینتی میں زینتی پر ترس آئے۔ خوب  
 زوئی اور سر پران بھی اچھے رہے۔ شیریں حیدر تو ہمیشہ ہی یونیک موضوع کے ساتھ آتی ہیں جیسی میری آتی  
 ناظر قیامت میں لیکن آف لڈ بھی پڑھا نہیں۔ باقی رسالہ بھی تک نہیں پڑھا۔ پڑھا تو ختم ہو جائے گا اور  
 اگلے رسالے کا انتظار شروع ہو جائے گا۔ دے سے زور سے گادقت پھر اگلے پانچ لڑکے کے انتظار میں۔  
 (میرزا تھک رہے تھے کے حوالے سے نکلا کرو اس پر تو تھکے چنا منا سا خط لکھا ہے)

سید نسیم میسر علوی، دہلی سے۔ "غرضانہ تھبت کا اللہ نہ اچھا تھا مگر طوفان نے انجام کی خبر پہلے  
 ہی دے دی۔ خوابوں کا شیرازہ موصوف ہیر و صاحب کی ہو سکتے تھے۔ ایم ٹی ایم کا اللہ نہ سرکس والی ایک مت شکنی تحریر تھی۔ سرکس کی  
 ایسا اس کی زبان اور معاشرتی لوازمات ہر جہاں موجود تھے۔ اچھی تصویر بھیجی کہانی کے انجام نے سوچنے پر مجبور کیا۔ شیریں حیدر  
 اور دلی پسند یہ ہر اکثر ہیں اور وہ ہمیشہ معاشرے کی دکھتی روں پر ہاتھ رکھتی ہیں۔ وہ بڑی نفس شناس ہیں۔ بقول خوار بارہ بنگلوی  
 جب کسی پر ہاتھ کیجیے۔ سامنے آئندہ رکھنا یا کیجیے۔ انسان کو عقل اس وقت آتی ہے جب اس کی اولاد پر دلوں در آتا ہے۔ طوفان  
 کے بعد فرحت احمد کی ایک خوب صورت تحریر ہے ماں کو ایک طوفان نے آنے والے طوفان کی وجہ سے بے حد حواس بٹا دیا تھا۔  
 سبق آموز کہانی ہے۔ اکثر ماں میں بچوں کو تھبت بھیج دیتی ہیں لڑکوں کے ساتھ گاڑی میں روانہ کر کے مطمئن ہو جاتی  
 ہیں۔ اس سلسلے میں بہت سے خوف ناک حادثے جنم لے سکتے ہیں۔ سحر فاطمہ کے میسر کی عدالت میں سوال جواب خوب  
 تھے۔ انٹرنیٹ اور فیس بک کی مہربانیاں اور بے باکیاں رنگ ملی ہیں۔ نظیر فاطمہ نے چراغ تلے اندھیرا لکھ کر ثابت کیا کہ  
 ہمارے یہاں اکثر و بیشتر ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہاں یہاں سب سے خاصہ عرصے کے بعد آئیں مگر ایک گڑا اثر افندہ ہمراہ تھا انہوں نے کے اینڈ  
 نے سب کو ضرور چونکا دیا ہوگا۔ سید مازن والے خواتین کے عالمی دن کے حوالے سے تحریر اور فاضل کی خواتین پر اچھا لکھا صورت کو  
 یقیناً اب جاگ جاتا چاہیے۔ ہاں غلطی بیٹی کے سفر نامے پر کچھ نہ کہنا اس کے ساتھ تا انسانی سے خوب جہم کر لکھا۔ انداز ہو بہو نقش با  
 کا تھا۔ وہی تازہ کاری جزئیات اور منظر کشی پورے وقت ماحول کو اپنی گرفت میں رکھا۔ اب انشاء اللہ کتابی صورت  
 میں ملاقات ہوگی۔" (جی ضرور)

سید خولہ عرفان، کراچی سے۔ "پہلے اپنی خوشی آپ کے ساتھ ہانت لوں جو آپ ہی کی محفل میں مجھے اپنا خط دیکھ کر  
 حاصل ہوئی۔ آپ کے مختصر سے جواب میں پشیدہ خصوص و محبت نے یقین بنائیں مالا مال کر دیا۔ اس عزت افزائی کا انجم بہت  
 بہت شکر ہے۔ سب سے پہلے آپ کا مجھے کچھ کہنا ہے کا مطالعہ کیا۔ خوب صورت انداز بیان کے ساتھ کہی گئی بلند حوصلہ باتیں پڑھ کر  
 امید اور یقین کو تازگی اور نئی زندگی متی محسوس ہوئی۔ اللہ آپ کو محبتوں اور یقین کے اوراق کے ساتھ پانچ لڑکے کی ادارت پر  
 کامیابیوں سمیت سلامت رکھے۔ آمین۔ این کی باتیں اپنی جگہ مستند ہیں۔ تھبت سید صاحب کا اعتبار و فاقی اچھے انداز میں آگے بڑھا  
 رہا ہے۔ مجس برقرار ہے کیونکہ کہانی جانہ ا رہے۔ غرضانہ تھبت صاحب کا گزر بھی ہے فضل بہار اچھی ملکی و بنگلوی تحریر تھی۔ نیلہ اور



















کے کسی بھی حصے میں باوجود کسی قوت کا متنازعہ ہوتا ہے اور قوت کے عنصر پر غصہ بھی ملتا ہے۔ اگر ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ  
حصہ میں نہیں پڑا کہ کسی شخص پر اور ہر پڑا کہ سب سمجھ آ گیا۔ اچھی کہانی ہے۔ اس سترہ درجہ اس دور پر ایک ایسے ہی  
مرد کے ساتھ کہ غلط آج اور اس شمارے کی بہت کم بات اور ان کی بہت ہی خاص چیز وسیع کی خاص  
مذاقت تھی۔ قاری کے لئے اس دور پر سب سے اہم باتوں کے حوالے کے ساتھ مجموعی طور پر یہ ہیں جو قابل  
مذمت کا نشان ہے۔ سچا بہت اچھا رہا۔ اس دور میں ہی آئینوں کا اس نے دو دو چوتھوں اور چھٹوں کے ساتھ  
کاٹنے کا کام کیا (اسی طرح اور آپ کی آگاہی پڑی ہو گی ہے)

[illegible][illegible]

آپ کی اپنی بات  
التماس

## سانحه ارتحال

مدیر ویاکٹیز ڈائجسٹ محترمہ انجمن انصاری والدہ ماجدہ 16 اپریل جمعرات کی شام پر ضلع رقبہ انتقال فرمیں۔ اللہ دانا اللہ راجعون۔ قورمیں کرام سے دعا ہے مغفرت کی درخواست ہے۔ اراستین ادارہ ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔



## پاکستان کے ذرا کریم

عظمت کی آفتاب سعید

میں دو اہل آفتاب کا رہا ہوں، رہوں گا  
زمانہ بنے گا مگر میرے آفتاب  
مجھے آپ اپنا بنا لیجیے گا  
مجھے اپنے قدموں میں رکھ لیجیے گا  
از: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی

### قرآن کریم

یہ کتاب اللہ کا فضل ہے، مذاق نہیں ہے جس ظالم  
نے اس کو چھوڑا اللہ نے اس کو تباہ ویراں کر دیا۔ جس نے  
اس کے سوا کسی اور سے ہدایت چاہی اللہ نے اس کو گمراہ  
کر دیا۔ یہ اللہ کی مضبوط رکی ہے۔ یہ ذکر حکیم ہے۔ یہی  
مراط مستقیم ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس سے خواہشات  
میں بگاڑ نہیں آتا۔ علما اس سے سیر نہیں ہوتے۔ یہ اتنی  
کثرت سے پڑھے جانے کے باوجود پرانا نہیں ہوتا۔  
اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوتے۔ یہی وہ کتاب  
ہے کہ جب جس نے اس کو سنا تو وہ یہ کہنے سے باز نہ رہ  
سکے کہ ایک عجیب قرآن ہم نے سنا ہے جو راہ ہدایت کی  
طرف رہنمائی کرتا ہے سو ہم اس پر ایمان لے آئے  
ہیں۔ جس نے اس کے مطابق کیا اس نے بچ کیا۔ جس  
نے اس پر عمل کیا اس کا اجر اسے ملے گا۔ جس نے اس  
کے مطابق فیصلہ کیا اس نے انصاف کیا۔ جس نے  
لوگوں کو اس کی طرف بلایا اس نے صراط مستقیم کی طرف  
بلایا۔ اسے امور اسے تمام لو۔

(جامع ترمذی: ۱۱۸۱۲)

مرسلہ: ام ایمان قاضی، کوٹ چٹھہ

### خوش نصیب

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے

### حمد باری تعالیٰ

ہے واحد و یکتا تمہاری ذات  
سجائی ہے خوش رنگ یہ کائنات  
محمدؐ ہوں گوتم ہو عیسیٰؑ کہ اور  
کبھی کی زباں پر ہے تیری بات  
رحیم و کریم و غفور تو  
ذرا اب مٹا دے میری مشکلات  
مجھے اپنی یادوں میں رہنا سکھا  
مخالف لگائے ہوئے ہیں گھات  
یہی روز محشر کرم چاہیے  
کہ اعمال نامہ ہو دائیں ہات  
شاعرہ: فریدہ جاوید فری، لاہور

### نعت رسول مقبول

اگر چھوڑ دے مجھ کو سارا زمانہ  
ملے جب نہ مجھ کو کہیں بھی ٹھکانہ  
تو عاصی پہ اپنا کرم کیجیے گا  
مجھے آپ اپنا بنا لیجیے گا  
میں عاشق نبی کا بتا دوں گا سب کو  
فن میں بقاء ہے دکھا دوں گا سب کو  
میں سہ لوں گا ہر غم مگر پیارے آفتاب  
مجھے آپ اپنا بنا لیجیے گا  
گناہوں کی چادر میں لپٹا ہوا ہوں  
چھپایا ہے چہرہ کہ سہا ہوا ہوں  
مجھے دستہ شفقت عطا کیجیے گا  
مجھے آپ اپنا بنا لیجیے گا  
مدینے کی گلیوں میں پھرتا رہوں گا

میری اڑان بھی ہو پروانہ دار یا نصیب  
عشقِ نئی میں ہوش نہ آئے ابھی مجھے  
محبوب کا سار قصہ دیوانہ دار ہو نصیب  
شاعرہ: فریدہ افتخار، اسلام آباد

### ماں

ماں کے لیے سب کو چھوڑ دینا لیکن سب کے  
لیے ماں کو مت چھوڑنا کیونکہ ماں جب روتی ہے تو  
فرشتوں کو بھی رونا آ جاتا ہے۔

### باپ

باپ کی موجودگی سورج کی طرح ہوتی ہے۔  
سورج گرم ضرور ہوتا ہے لیکن یہ اگر نہ ہو تو اندھیرا چھا  
جاتا ہے۔

از: ناظمہ شاہین اعوان، واہ کینٹ

### میری ماں کی دعائیں

اپنی بیمار ماں سے  
فون پر بات کرتے ہوئے  
اکثر میں یہ سوچتی ہوں  
ان کی دعاؤں کی یہ تسبیح  
ابھی نہ ٹوٹے

شاعرہ: غلطی آفاق

مرسلہ: نوشین ساجد، ڈی جی خان

### ذرا سی بات

ذرا سی بات کہنے کو تو ذرا سی بات ہوتی ہے مگر  
اکثر لوگوں کی زندگی میں ہلچل مچا جاتی ہے، کوئی اپنی  
زندگی ذرا سی بات کے لیے ختم کر لیتا ہے تو کوئی ذرا  
سی بات سننے کے لیے برسوں انتظار کرتا ہے۔

از: منور شہزادی، گوجرانوالہ

### غلطی

ڈاکٹر نے پہلوان سے پوچھا: ”جناب آپ کا  
کدھا کیسے اتر گیا؟“

فرمایا: ”اللہ کے بندوں میں کچھ ایسے خوش نصیب  
بھی ہیں جو نبی یا شہید تو نہیں ہیں لیکن قیامت کے  
دن بہت سے انبیاء اور شہداء ان کے خاص مقامِ قرب  
کی وجہ سے ان پر رشک کریں گے، صحابہؓ نے عرض  
کی: یا رسول اللہ ہمیں بتا دیجیے کہ وہ کون بندے  
ہیں؟ آپ نے فرمایا: ”وہ لوگ ہیں جنہوں نے بغیر  
کسی رشتہ اور قربت کے اور بغیر کسی مالی لین دین  
کے محض خوشنودی خداوندی کی وجہ سے باہم محبت کی،  
پس قسم ہے خدا کی ان کے چہرے قیامت کے دن  
نورانی ہوں گے بلکہ سراسر نور ہوں گے اور نور کے  
بندوں پر ہوں گے۔“

(سنن ابی داؤد، معارف الحدیث)

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلاٹوالی

### رحمت کا سایہ

جب آپ کے ماں باپ بڑھاپے کی طرف  
ماں ہوں تو ان سے اپنی طاقت اور ساتھ ساتھ نہ کرنا،  
ان کے لیے رحمت کا سایہ بنے رہنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ  
ہر چیز حاصل ہو جائے لیکن یہ حسرت رہ جائے کہ ان  
کی خدمت نہیں کی پھر اس کا مداوا نہیں ہوگا۔

واصف علی واصف

از: ناظمہ شاہین اعوان، واہ کینٹ

### یانصیب

حسرت ہے نئی جی ترا دیدار ہو نصیب  
مرقد پہ حاضری مجھے ہر بار ہو نصیب  
شہرِ نئی کے موسم ہیں جیسے کل جہان سے  
جا کے وہاں پہ روح بھی سرشار یا نصیب  
دنیا کے جھمیلوں سے فرصت جو پاؤں میں  
پھر حاضری وہاں کی ایک بار ہو نصیب  
نظروں سے لوں میں گنبدِ خضریٰ کی بلاتیں  
حسرت مری ہو جائے شہرِ بار یا نصیب  
پنچھی اڑان بھرتے ہیں گنبد کے آس پاس

پہلوان نے شرمندگی سے کہا۔ ”جناب میں نے غلطی سے بچے کے اسکول کا بستہ اٹھا لیا تھا۔“  
از: شہزادی، فیصل آباد

### وجہ خاص

ایک شخص میڈیکل اسٹور پر گیا اور بولا۔ ”مجھے زہر چاہیے۔“

میڈیکل اسٹور والا بولا۔ ”میں آپ کو اس وقت تک زہر نہیں دے سکتا جب تک کہ آپ کے پاس اجازت نامہ نہ ہو۔“

آدمی نے اسے اپنے دو نکاح نامے دکھائے۔  
تب میڈیکل اسٹور والا حیرت سے کہنے لگا۔ ”پو پتر وڈی بوتل دے پائی توں۔“

از: شہناز جاوید، کراچی

### سب کے سب

ان کی کالی آنکھوں میں ہیں اتر مگر سب کے سب  
چوتو دانو چھریاں وریں خنجر و خنجر سب کے سب  
جس دن سے دور دھڑکے مجھ سے یہ بھی روٹھے، روٹھے ہیں  
چادر واد، کتے، ہلکے ہنر و ہنر سب کے سب  
مجھ سے ہنجر کے وہ بھی کہیں اب یہ دن پہلے جیسا ہے  
پھلکے پڑ گئے کپڑے و پڑے، زور شور سب کے سب  
آخر میں کس دن ڈوبوں گا فکرین کرتے رہتے ہیں  
دریا دریا، کشتی کشتی، لنگر و لنگر سب کے سب  
دکھ کے شہر کے باقی ہیں یہ درد شہر کے بانی سب  
محسن و حسن، غالب و غالب، ساغر و ساغر سب کے سب  
مرسلہ: تازنین آفریدی، پشاور

### محبت

ایک کنیز آدھی رات کو کھڑی دعا کر رہی تھی۔  
”اے اللہ! اس محبت کے صدمے کو مجھ کو مجھ سے ہے، میری دعا قبول کر لے اور میرے گناہ معاف کر دے۔“

مالک کی آنکھ کھل گئی۔ اپنی کرخت آواز میں

کہا۔ ”تو یہ کیسے دعا کر رہی ہے کہ اللہ تجھ سے محبت کرتا ہے۔“

کنیز نے عاجزی سے جواب دیا۔ ”مجھ سے محبت نہ کرتا تو مجھے رات کو نماز تہجد پڑھنے کی توفیق نہ دیتا۔ میں بھی تیری طرح سو رہی ہوں۔“

مرسلہ: سہما ممتاز عباسی، لاہور

### بیٹیاں

بیٹیاں تو وہ ہیں تم جس کے ہاتھ میں ان کا ہاتھ  
دے دو آف کیے بغیر تمہاری پگڑیوں، داڑھیوں کی  
لاج رکھنے کے لیے ساتھ ہو جیتی ہیں۔ سرال میں  
میسے کی یاد آئے تو چھپ، چھپ کے رو جیتی ہیں۔ ابھی  
دھوئیں کے بہانے تو ابھی پہاڑ کاٹنے کے بہانے آنسو  
بہا کر جی ہکا کر لیا تو ابھی آٹا گوندھتے بہتے آنسو آنے  
میں جذب ہوتے ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ ان  
نکسین روٹیوں میں ان بیٹیوں کی آنکھوں کا بھی کتنا  
پانی شامل ہوتا ہے سو ان کی قدر کرو کہ یہ آگینے  
بڑے نازک ہیں۔ باہل کے گھر میں نازک  
آگینوں، کول منہ بند کلیوں، ازلی پھرتی رنگ برنگی  
تہنیوں جیسی بیٹیاں ماں، باپ کی خدمت کرتی یہ  
کلیاں جب سرال چلی جائیں گی تو تمہیں بہت یاد  
آجائیں گی۔

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

### نظم

اے بیٹ فرینڈ سید حافظ طلحہ نعیم ہاشمی  
(مرحوم) کی سالگرہ پر لکھی گئی نظم آپ سب کی نذر۔  
سبھی دوست مل کے

تمہارے لیے  
ایک کیک بناتے  
اپنی دعاؤں کی  
کینڈل سے اس کو سجاتے  
شرارت سے مھر پور



## ماں

میں  
میرا ہست  
میری کاپی  
میرا فنن  
میرے کپڑے  
کچھ بھی نہیں چھوڑا  
یہ کیسے درندے تھے  
اسے بھی مار ڈالا تھا  
مجھے بھی مار ڈالا تھا  
سبھی دیواریں کالی ہیں  
سبھی دیواریں سرخ بھی ہیں  
سبھی ہیں خون میں رنگی  
میں تو سانس لے رہا ہوں  
مگر جو

میرے اوپر تھا وہ اب رہا نہیں باقی  
میں بے آواز رہتا ہوں  
میں اب رو بھی نہیں سکتا

شاعرہ: صائمہ سجاد بگلش، کوہاٹ

## سنہری باتیں

ہم کمزور ہے وہ شخص جو دوست نہ بنا سکے اور  
اس سے بھی کمزور ہے وہ شخص جو بنا ہوا دوست  
کھو دے۔

ہم دوستی پیاز کی طرح ہوتی ہے جس کا ہر پردہ  
دوسرے پردے کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ اس کو جدا  
کرو گے تو صرف آنسو ملیں گے۔

ہم احساس ہمیشہ وہ انسان کرتا ہے جو خود غرض  
نہ ہو کیونکہ احساس ہی وہ چیز ہے جو رشتوں کی بنیاد  
ہوتی ہے۔

از: مہرین ضیا بگلش، کراچی

ہم دوستی پیاز کی طرح ہوتی ہے

ڈراک چاکلیٹ سے بنا

ایک پھول آپٹشل

تمہارے لیے اس پر سجاتے

اس پھول کے علاوہ

سارا ایک ہم خود ہی

کھا جاتے

اسے کاش ہم تمہاری سالگرہ

کچھ اس طرح مناتے

شاعرہ: سیدہ علیشاہ، بہاول پور

## اندازہ

عورت کی دیریری کا اندازہ مرد کو اسی وقت  
لگ لینا چاہیے جب ایک بندہ اسے لینے 500 آدمی  
کی بارات کے ساتھ جاتا ہے اور اُدھر سے وہ شیرنی  
اکیلے ہی آ جاتی ہے۔

از: حمیرا نوشین، منڈی بہاؤ الدین

## غزل

اب آیا ہے خوشیاں منانے کا موسم  
بساطِ محبت بچھانے کا موسم  
گلستاں، گلستاں چمکتی ہیں کلیاں  
یہ موسم ہے غنچے کھلانے کا موسم  
فضاؤں میں مستی سی چھائی ہوئی ہے  
ہے پھولوں سے آگن سجانے کا موسم  
بڑی نرم رو ہے یہ باؤ بہاری  
سے صحرا میں سبزہ اگانے کا موسم  
کھنکتے ہیں ننگن بھرے بازوؤں میں  
ہے پاؤں میں پائل سجانے کا موسم  
میں آہٹ پر تیری سٹ سی گئی ہوں  
ہے گستاخیوں سے ستانے کا موسم  
میں چن، چن کے کلیاں شفق رکھ رہی ہوں  
پھر آیا ہے گجرے بنانا کا موسم

شاعرہ: نیرانی شفق

مرسلہ: صبا نورانیہ

# جلیزنگ احسن انصار

## آپ کی اپنی

”پیارے میاں جانی!“

محبت بھر اسلام!

یہ کیا کہ جانتے ہی آپ نے مجھے ڈرافٹ بھجوا دیا۔ ایسا نہ کریں پیسہ اپنے پاس ہی جمع رکھیں بعد میں کام آئے گا۔ آپ مجھے ڈرافٹ بھیجتے ہیں تو سب کو ہرا ہرا سو جیسے لگتا ہے۔ آپ کی آپ ادھار مانگنے آ جاتی ہیں اور بھائی فوری ضرورت کا پورہ اٹھا لیتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے خرچ کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کے لیے آپ میری امی کے گھر پر ڈرافٹ بھیجا کریں اور اس کا کسی سے تذکرہ بھی نہ کیا کریں۔ آپ جو جانے سے پہلے پلاٹ خرید گئے تھے، وہ میں نے بیچ دیا ہے۔ میرے بھائی کی شادی تھی سونے کے سیٹ خریدنے میں گھر میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ میں نے کہا میں خرید کر دے دیتی ہوں۔ پلاٹ کا ہمیں کیا کرنا وہ تو ویسے بھی آپ کی آپا کے پردوس میں تھا بعد میں ہمیں بہت مصیبت ہوئی۔ کل میں اپنی بھانجی کی سالگرہ میں جاؤں گی۔ چار جوڑے اور ایک سونے کی انگلی دے رہی ہوں۔ آخر وہ مجھے پیاری خالہ کہتی ہے۔ آپ کی جانب تحفہ ادھار رہا۔ آپ جو دل چاہے میری بھانجی کو دے دیجیے گا۔

آپ اس سال جب چھٹیوں پر گھر آئیں تو یہ سوچ کر آئیے گا کہ اسلام آباد میں رہنے کے بجائے ہم جہلم شفت ہو جائیں۔ کراچی سے جتنے بھی رشتے دار گرمیوں میں گھومنے کے لیے مری جاتے ہیں ان کا پیلا اسٹاپ اسلام آباد میں ہمارا گھر ہوتا ہے۔ جس کی شادی ہوتی ہے وہ بھی مون منانے مری کی

سڑک پر بعد میں قدم رکھتا ہے پہلے وہ ہمارے گھر آتا ہے۔ گھر کا بجٹ ستنا زخمی رہتا ہے۔ اس کا تو آپ کو کبھی اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ آپ نے جا کر مجھے ڈرافٹ بھیجا تھا۔ اس کو دیکھ کر تو میں کھول ہی گئی تھی۔ اتنے خرچے پر یہ اونٹ کے منہ کا زیرہ آپ اپنے پاس ہی رکھیں۔

گزشتہ ہفتے آپ کے رشتے دار پندرہ دن کے لیے آئے تھے۔ ان میں چھینچ آیا ہو یا نہیں اس کا پتا نہیں مگر مجھ میں چھینچ ضرور آ گیا ہے۔ ڈھیروں ڈھیر روٹیاں پکانے سے ہاتھ شل ہو گئے ہیں اور کمر میں درد رہنے لگا ہے۔ ڈریسنگ فیل کا شیشہ ان کی چھوٹی پچی توڑ گئی ہے، گاڑی کا دروازہ پہلے ہی بیمار تھا اب وہ ختم ہو گیا ہے۔ آپ کی چار شرٹس آپ کے کزن کو پسند آ گئی تھیں وہ لے کر چلتا بنا ہے اور بھی گھر کی چھوٹی موٹی چیزیں گھر سے غائب ہیں وہ یا تو ماسی لے گئی ہے یا مہمان بھولے سے اپنے بیگزمین رکھ کر لے گئے ہیں۔

مجھے سمجھ میں یہ بات نہیں آتی جب آپ گھر میں نہیں ہوتے تو آپ کے رشتے دار میرے پاس کیوں آتے ہیں؟ اب آپ آئیں تو سب کو بتادیں کہ ہم اسلام آباد سے شفت کر رہے ہیں۔ ہاں جہلم کا فون نمبر بھی کسی کو دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ورنہ باقی روڈ آنے والے مہمان ہمارے گھر کو ہوٹل سمجھ کر جہلم میں ٹھہرنے لگیں گے۔

میں جج کہہ رہی ہوں اگر مجھے پہلے پتا ہوتا کہ آپ کا خاندان ایسے سیاحوں کا ہے جو دوسروں کے گھروں پر وزن رکھ کر سیاحت کرتا ہے تو بھی آپ

بڑے جوائنٹ فیملی سسٹم میں پھنسی ہوئی ہے۔ اس کی مالی حالت بہت زیادہ اچھی نہیں ہے اس لیے اسے ایک اسکول میں جاب بھی کرنی پڑتی ہے (مگر اسے اپنا جاب کرنا کبھی مشکل نہیں لگتا اور نہ ہی وہ اس کا احسان اپنے میاں پر دھرتی ہے) اس کے باوجود اس کا ذہن بہت شارپ ہے وہ ٹیلی فون کرتے ہوئے کروڑوں کی تیل بھی بنتی رہتی ہے۔ پیر سے اپنے دو بچوں کو مار بھی لیتی ہے۔ ٹی وی کے پروگرام کا بھی مزہ لیتی ہے۔ اس کے کان دور صحن میں باتیں کرتی خندوں کی جانب علیحدہ لگے ہوتے ہیں کہ اس وقت وہ کس کی برائی کر رہی ہیں۔ گھر کا کوئی فرد اس سے اس سچوٹھن میں کوئی بات پوچھے تو ان کو بھی تسلی بخش جواب دیتی ہے۔ منہ میں پان چبانے کا عمل علیحدہ چل رہا ہوتا ہے۔ پاس رکھے جامن یا پیر ہوں تو پان کی گھوری کو وہ دوسرے کٹے میں رکھ کر ان سے بھی خوب انصاف کرتی ہے۔ کروڑوں کی انگلی روک کر دوران فون کسی کے ایمر جنسی لپ اسٹک بھی لگا دیتی ہے۔ (مجھ سے زیادہ خوش مزاج اور مجھ سے زیادہ خوش اخلاق میری بڑی بہن ہے جسے لوگ زیادہ پسند کرتے ہیں)

اور فون پر اس کا دماغ بھی غائب نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ اس کی باتوں میں ایسے، ایسے تہقق لپٹے ہوتے ہیں جو مجھے کئی دن تک باغ و بہار رکھتے ہیں۔ تب میں سوچتی ہوں ایسا چوکس دماغ رکھنے والیاں بڑی عظیم ہوتی ہیں۔ جن کا دماغ ایک مشین کی طرح کام کرتا ہے۔ وہ کسی بھی ماحول میں ہوں کسی بھی ہوں وہ خود بھی خوش رہتی ہیں اور اپنے وجود سے دوسروں کو بھی خوش رکھتی ہیں۔ مجھے جیسی شخص عورتیں نہ خوش رہنا جانتی ہیں اور نہ ہی کسی کو خوش رکھنا کہ مجھ جیسی عورتیں ہر کام میں مختلف تاویل میں جوڑھوڑتی ہیں اور سب سے بڑی بات کہنا شکاری بھی ہوتی ہیں اور جو نا شکر اہودہ بھی خوش نہیں رہ سکتا۔

سے شادی نہ کرتی۔ باں ایاجی کی گاڑی بننے کے لیے مکنک کے پاس بھی ہوئی ہے اس لیے آپ کی کروڑا ان کو دے رکھی ہے۔ چھوٹے ماموں کینڈا اجار ہے ہیں۔ آپ کا سوٹ کیس انہیں دے دیا ہے۔ آپ کے کپڑے ایک بڑی سی چادر میں باندھ کر اسٹور روم میں رکھ دیے ہیں۔ آپ کہہ رہے تھے کہ اگر اس سال گھر کا چکر نہ لگائیں تو میرے لیے ڈائمنڈ کے بڑے والے ٹاپس لا سکتے ہیں۔

میں نے اگر آپ دو سال نہ آئیں تو پورا سیٹ ہی آجائے گا ناں؟ دیکھیں میں کیسی قربانی دینے والی بیوی ہوں۔

ڈائمنڈ کے سیٹ کی شدت سے منتظر آپ کی اپنی شگفتہ حیات!“

### ناشکری

کاش میری شادی کسی امیر کبیر گھرانے میں ہوئی ہوتی تو میں خوش رہتی مگر افسوس.....!

میری عمر پچیس سال ہے۔ دو چھوٹے بچے ہیں۔ ہاؤس وائف ہوں بچوں کو سنبھالنا اور گھر کے کام کا جیسی طرح کرتی ہوں جیسے عام خواتین کرتی ہیں۔ شوہر بھی بس اچھا ہی ہے اور ساس سسر بھی بس ہمدرد سے ہیں۔ میرا اور میرے بچوں کا خیال رکھتے ہیں اس کے باوجود میرا دماغ اتنا نہیں چلتا ہے۔ وقت پر بھی جواب نہیں سوچتا کوئی چیز زیادہ سنبھال کر رکھ دوں تو بھول جاتی ہوں۔ فون پر کسی سے بات کروں تو مجھے مکمل خاموشی چاہیے۔ دوسرے کمرے کا ٹی وی تک بند کر دیتی ہوں۔ اس کے باوجود بات کرنے کے درمیان اگر کوئی گھر میں کسی سے مخاطب ہو تو منہ پر انگلی رکھ کر اسے خاموش کر دیتی ہوں وجہ یہ ہے کہ میں ایک وقت میں ایک سے ہی بات کر سکتی ہوں۔ میرے برعکس میری بڑی بہن ہے، پچیس سال اس کی عمر ہے چار اس کے بچے ہیں۔ اس کا شوہر ایک مشکل شخص ہے۔ وہ ایک

## وجوہات

جہاں دیدہ آنکھیں چہرہ دیکھتے ہی بھانپ جاتی ہیں کہ ظاہر و باطن میں کتنا تضاد ہے مگر مسز تو قیر کا چہرہ تو بالکل ساٹ سا ہو جاتا تھا۔ کبھی ان کے چہرے کا ہر زاویہ ٹھیکے لگا رہا ہوتا اور دوسرے سے ایسی حسرت و مایوسی کے نریر نظر آتے کہ گھٹا بھی یہ چیخ مار کر رونے کا آغاز کریں گی مگر ان کی یہ حسرت و مایوسی ملی بھرم میں غائب بھی ہو جاتی اور قوس قزح سے چہرہ گلزار ہو جاتا اور تجربہ کار نگاہیں شیشا سی جاتیں۔

”ہائیں کس تلاش کی عورت ہے یہ۔ مجاں ہے کہ کسی کو اپنا چہرہ جو پڑھنے دے۔“ بڑی خالہ جو نفسیات کی کئی ڈگریاں سمیٹے بیٹھی تھیں ان کو دیکھ کر جھنجھلا سی جاتیں۔ مسز تو قیر جب بھی رقیہ منزل میں آتیں۔ ہمارے گھرانے میں شادمانی کا سا احساس چھا جاتا۔

”مجھے آپ کی شگفتہ بہت پیاری لگتی ہے۔ ہنسی کہتے اچھے انداز میں ہے۔ گال کے اوپر کا عمل کتنا نمایاں ہو جاتا ہے۔“

”شگفتہ جیسی خوب صورت کانچ جیسی آنکھیں میں نے کہیں نہیں دیکھیں۔ اندھانے لے بال بھی ہوا کرتے ہیں۔ بچی میں نے تو آنکھیں نہیں دیکھے۔ شگفتہ تو خوب صورتی کا مرقع ہے۔“ وہ مجھے دیکھ کر سرشار لہجے میں ہمیشہ کہا کرتیں۔

”آنتی آپ تو بس یونہی اتنی زیادہ تعریف کر دیتی ہیں۔“ میں زبردستی شرماتے ہوئے ہوتی۔

”نہیں جان، میں خواہ مخواہ میں تعریف نہیں کرتی ہوں۔ بس تم مجھے حد سے زیادہ پسند ہو۔“ وہ قدرے بلند آواز میں کہتی۔

تب اماں ان کی خاطر بدارت مزید امی کر دیتیں اور وجہ بھی خاص الخاص بھی وہ اپنے ڈانٹر بیٹے کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی تھیں۔ مسز تو قیر جب بھی آتیں گھر والے یہی سوچتے گھٹتے کہ اب وہ رشتہ

دیں گی تب وہ وہیں کی گردہ منہ سے کچھ نہ کہیں مگر گھر والے اچھی آس کے سہارے ان کے آنے کو اپنے بھاگ جاگ اٹھے سمجھا کرتے پھر یوں ہوا کہ اباجی رشوت لینے کے الزام میں پکڑے گئے۔ گھر میں سوکھی تنخواہ آئی تو خاطر مدارت کی منزیں بھی ڈھے سی گئیں۔ تب مسز تو قیر ہمارے بڑے ماموں کے ہاں جانے لگیں۔ ان کی راشدہ انہیں اچھی لگنے لگی اور وہ جان کر بلند آواز میں کہنے لگیں۔

”مجھے آپ کی راشدہ حد سے زیادہ پسند ہے۔“

بعد میں وجوہات معلوم کی گئیں تو ہوتا چلا کہ ماموں جان کا ذہنی کردار کا انعام نکلا ہے۔ اب وہ مہاراجہ اس قابل تو ہو گئے ہیں کہ اپنے ڈانٹر داماد کو کھینک کھواسیں۔

## میری ہم جولیال

شارفہ میری بچپن کی دوست ہے۔ اسکول، کانچ میں ہم ایک ساتھ پڑھے ہیں۔ ہم دونوں ہی اوسط ذہن کے تھے۔ زیادہ پڑھنے اور نوٹس بنانے کے شوقین بھی نہیں تھے۔ میں ہمیشہ سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوتی تھی۔ شارفہ کی ڈویژن بھی یہی ہوتی تھی مگر ہمیشہ اس کے دس بیس نمبر مجھ سے زیادہ آتے تھے۔ اس لیے اگر کوئی اس سے رزلٹ پوچھتا تو وہ یہی جواب دیتی تھی۔

”تا صرہ کی سیکنڈ اور میری گڈ سیکنڈ۔“

شادی ہوئی تو یہ بھی عجیب اتفاق رہا۔ ہم دونوں ایک ہی علاقے میں بیاہ کر آئے۔ شادی کے بعد اس میں چالاکی اور مکاری کے اثرات اتنے بڑھے کہ میں اس سے کٹنے لگی پھر میل ملاپ صرف فون تک ہی رہ گیا اور اب حالات کی ترقی یا تنزلی کچھ بھی سمجھیں۔ شارفہ کا فون جب بھی آتا ہے میں اسے رسیو کرنے سے ہچکچاتی ہوں۔ میری یہ پوری کوشش ہوتی ہے کہ اس سے بات نہ کی جائے حالانکہ وہ جب بھی فون کرتی ہے تو یہی کہتی ہے کہ



کون سا ایک کرواؤ گی، کوئی جان پہچان ہے اگر سستا کرواؤ تو مجھے بھی بتا دینا۔“

”ہاں، تمہاری بچی کا داخلہ سینٹ جوزف میں ہوگا یا نہیں کسی ٹیچر سے تیاری کروا رہی ہو؟ بچی پڑھنے خود جاتی ہے یا ڈرائیور لے کر جاتا ہے۔ اگر ڈرائیور لے کر جاتا ہے تو اس سے کہو میری بچی کو بھی لے لیا کرے۔ اچھا ہے دونوں بہنیں ایک ساتھ پڑھ لیں گی۔“

”مگر شارفہ ان دنوں تو تم اپنی، اپنی کے گھر ہو اور میں ڈیفنس میں۔ کیا تم بھول گئی ہو کہ ڈیفنس اور فیڈرل بی ایریا کے مابین کتنا فاصلہ ہے۔ جیم ٹریفک کے مسائل بھی شامل کر لو تو آدھا حیدر آباد کا راستہ ہے کراچی سے۔“

”ارے ناصرہ! پھر وہی چھوٹی بات کی۔ میں تو تنگ آ گئی ہوں تمہاری چھوٹی باتوں سے۔ شرم آتی ہے مجھے یہ کہتے ہوئے کہ تم میری بچپن کی سہیلی ہو۔ انسان جب گاڑی میں بیٹھ جائے تو فاصلے کہاں رہتے ہیں۔ کوئی دوسرا شہر تو نہیں ہے فیڈرل بی ایریا۔ یوں بھی میں صرف چند ماہ کے لیے امی کے گھر ہوں۔ بھائی کی شادی ہو جائے گی تو آ جاؤں گی۔“

”کس درزی سے کپڑے سلواتی ہو؟ کیا لیتا ہے وہ سلائی؟“

”میں تو بھی بسم اللہ نیلر سے سلواتی ہوں سادہ سوٹ چھ سو میں اور ڈیزائن والے کے تو ہزار ہارہ سو تک ہوتے ہیں۔“

”اچھا بڑی سستی منٹ جاتی ہو میرا درزی تو پلین سوٹ ڈھائی ہزار میں بیٹتا ہے۔ شام کو میرا درزی آئے گا میرے چھ سوٹ گرمیوں کے سلوا دینا۔ سلائی بعد میں دے دوں گی۔“

”ارے کوئی آگیا ہے میں تم سے بعد میں بات کرتی ہوں۔“ تب مجھے قصد آفون کا منا پڑ جاتا ہے۔



اس نے میری خیریت معلوم کرنے کے لیے فون کیا ہے۔ اس کے ہاں چونکہ فون سرکاری طور پر لگا ہوا ہے اس لیے وہ بار بار فون کرنے سے ہچکچاتی بھی نہیں ہے۔ شارفہ کی باتوں سے مجھے بے حد وحشت سی ہوتی ہے۔ اس کی چالاکی اور مکاری سے مجھے اب چڑھی ہوئی لگی ہے۔ اسی لیے میں نے اپنے گھر میں کہہ رکھا ہے۔ شارفہ کا فون آئے تو کہہ دو ناصرہ گھر پر نہیں ہے۔ باہر سے کب آئیں گی یہ بھی معلوم نہیں۔ ناصرہ نیلر کے پاس گئی ہوئی ہے۔ ناصرہ شاپنگ پر گئی ہوئی ہے۔ ناصرہ اپنی خالہ اماں کے ہاں گئی ہوئی ہے۔ یہ وہ بہانے ہیں جو اس کو ٹالنے کے لیے گھر والے روار کھتے ہیں مگر اس کے باوجود بار بار ایسا ہوتا ہے کہ میں اس کا فون خود ریسیو کرتی ہوں (ہمارے گھر کے فون پر سی ایل آئی نہیں ہے)

”ناصرہ یاد رکھاں! کیاں رہتی ہو لٹی ہی نہیں ہو؟“ وہ ہمیشہ پیار بھرا شکوہ کرتی ہے۔

”ہاں مجھے پتا چلا تھا مگر میں بہت مصروف تھی تمہیں رنگ بیک نہیں کوسکی۔“ میں ہمیشہ ایسے ہی بہانے بناتی ہوں۔ اب اس کی باتیں شروع ہوتی ہیں۔

”ناصرہ تمہارے دیور کی بری بن گئی؟“

”نہیں، دو چار جوڑوں کے سوا تو ابھی کچھ نہیں بنا۔“ (مجھے معلوم ہے کہ وہ بھی اپنے بھائی کی بری بنا رہی ہے)

”اچھا جو جوڑے تم نے بنائے ہیں وہ کیسے ہیں؟“

”غرارے ہیں، فٹس لہنگا ہے اور پٹیا لہنگا۔ سوٹ ہے کام والے۔“ میرے منہ سے نکلا۔

”کام کہاں سے کروایا ہے جو ملی سے، پاپوش سے یا حیدری سے؟“

”حیدری سے۔“

”حیدری آگے والی یا پیچھے والی۔ دکان کا فون نمبر بھی دے دو۔ ہاں تمہارے نام کا حوالہ دوں گی تاکہ ریٹ بھی مجھے وہی ملے جو تمہیں ملا ہے۔ پارلر



علیت قتل



صغریٰ زیدی

## میں کا سر کٹا کر لیاں

ایمان چوہدری ..... فیصل آباد

تم نے زمانے کے دُور سے دوست ہمیں چھوڑ دیا  
ہم بھی تو دنیا والوں کی ہر بات گوارا کرتے تھے

ہم شہانہ ملک ..... ذی جی خان

میری خواہش ہے کہ لوگوں کی چرا کر آنکھیں  
اپنی آمد کا تماشا سرِ محفل دیکھوں

ہم نرگس نسیم ..... صابہ موہڑہ

وہ لوگ ہم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیے  
دھوڑا تھا آسمان نے جنہیں خاک چھان کر

ہم ارم کمال ..... فیصل آباد

تہا سمجھ رہا ہے میرے دل کو چارہ گر  
دنیا بکی ہے اس میں کسی کے خیال کی

ہم اریبہ آرزو ..... سکھر

اے مضور تجھے استاد جیسی مانوں گا  
درد بھی کھینچ لے تو میری تصویر کے ساتھ

ہم سیما ممتاز عباسی ..... لاڑکانہ

محبت کا سفر ہے اور میں ہوں  
اک ابھی راہ گزر رہے اور میں ہوں

کہاں لے جاؤں اپنے خواب سارے  
کہ پتھر کا ٹکڑا ہے اور میں ہوں

ہم عرشہ جنید ..... کراچی

ہوا ہے تجھ سے بچھڑنے کے بعد اب معلوم  
کہ تو نہیں تھا تیرے ساتھ ایک دنیا تھی

ہم فردوس شاہی ..... لاڑکانہ

نوٹ جاتا ہے ذرا سی جو ہوا تیز چلے  
تیرا وعدہ بھی تو خوشبو کا بدن ہو جیسے

ہم صبا کمال ..... فیصل آباد

عمر بھر کا حساب کر ڈالا  
اس نے پھر لا جواب کر ڈالا

ہم خزاں کا اجازت منظر تھے  
چھو کے اس نے گلاب کر ڈالا

ہم جبین نیاز ..... مٹان

غم کے سانچے میں ڈھل سکو تو چلو  
تم مرے ساتھ چل سکو تو چلو

دور تک تیرگی میں چلنا ہے  
صورتِ شمع جل سکے تو چلو

ہم نرگس نسیم ..... کراچی

بے ساختہ نگاہیں جو آپس میں مل گئیں  
کیا منہ پراس نے رکھ لیے آنکھیں چرا کے ہاتھ

ہم خراہ تول ..... نواب شاہ

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایاں شوق  
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

شرحِ غم تو مختصر ہوتی گئی اُن کے حضور  
لفظ جو منہ سے نکلا داستاں بنتا گیا

ہم ثوبیہ ظہور ..... ضلع انک

محرابیوں کا ہم نے گلہ تک نہیں کیا  
لیکن یہ کیا کہ دل میں یہ ارمان بھی نہ ہو

روتہ کی تو ہے کہ اسے چاہتے ہیں ہم  
اے سعد جس کے ملنے کا ارمان بھی نہ ہو

ہم نگہت زیدی ..... اسلام آباد

یہ کس کے آستاں پر مجھ کو ذوقِ جدہ لے آیا  
کہ آج اپنی جہیں، اپنی جہیں معلوم ہوتی ہے

☆ حمیرا نوشین ..... منزی بہاؤ الدین

خواہشوں کا بھی کوئی معیار ہوا کرتا ہے  
کیسی خواہش ہے کہ مٹھی میں سمندر ہوتا

☆ فصیحہ آصف خان ..... ملتان

وہی چھن گیا ہم سے جس کی تمنا کی  
کچھ اپنی قسمت کچھ لوگوں کی رضا تھی

☆ ساجدہ ظفر ..... کمالیہ

ہجر کی دھوپ میں چھاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں  
آنسو بھی تو ماؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

رنگ سے خوشبوؤں کا ناتا ٹوٹتا جاتا ہے  
پھول سے لوگ خزاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

☆ کوثر خالد ..... جڑانوالہ

اے دوست اک غریب سے اتنا خفا نہ ہو  
شاید تو کل بلائے تو یہ بے نوا نہ ہو

☆ بشری رضوی ..... کراچی

تلاوت سے سب نے دکھ نہیں دکھا ایک نے بھی  
کس کی آنکھ سے آنسو نپکا کس کا سہارا ٹوٹ گیا

☆ طیبہ عبید ..... کراچی

سرخ آنکھوں کی قسم کا بیتی پلوں کی قسم  
تھر تھراتے ہوئے آنسو نہیں دیکھے جاتے

☆ ماریہ فراز ..... لاہور

دل تو کہتا ہے نہیں مفت میں جاں بھی دے دیں  
اتنے معصوم خریدار سے کیا لینا ہے

☆ تسنیم قیصر ..... نیویارک

میں گرا تھا تو بہت لوگ رکے تھے لیکن  
سوچتا یہ ہوں کہ آئے تھے اٹھانے کتنے

بھینر لگ جاتی ہے جلتے ہوئے گھر کے آگے  
لوگ آتے ہیں مگر آگ بجھانے کتنے

☆ صبا سجاد ..... دہلی

اب نہ کوئی بھی برا ہم کو زمانے میں لگا  
جب سے ہم اپنی خطاؤں پہ نگاہ کرنے لگے

☆ کائنات حلیم ..... میرپور خاص

گھر چھوڑ کے جاتے نہیں خود اپنا پرندے  
سازش کوئی اس نقل مکانی میں ملے گی

☆ ماہم مراد ..... لاڑکانہ

بھگی ہوئی اک شام کی دہلیز پر بیٹھے  
ہم دن کے سگنے کا سبب سوچ رہے تھے

☆ عروہ ناز ..... کوٹلی

نوح کا طوفان بھی اس کو غرق کر سکتا نہیں  
جو برائے خلق بیٹا ہو وہ مر سکتا نہیں

☆ عزیز وسیم ..... گوجرانوالہ

جن میں خصوص و جذبہ ایثار بھی نہیں  
ہم ایسے دوستوں کے طلب گار بھی نہیں

☆ مدیحہ نورین ..... برہائی

میری تو عمر اسی کے خیال میں گزری  
میرا خیال جسے عمر بھر نہیں آیا

☆ ناز ہمایوں ..... دہلی

ہماری جان جائے گی تو پھر تم جان جاؤ گے  
کہ وصل کچھ نہیں ہوتا کسی کو آزمانے سے

☆ عتیقہ انا ..... چکوال

ہزاروں عیب تھے مجھ میں مجھے معصوم تھا یہ بھی  
مگر اک شخص تھا تاواں مجھے انمول کہتا تھا

☆ مسرت گہت غفار ..... کراچی

میری محبت اک گوہر ہے تیری وفا ہے کروں سمندر  
تو پھر بھی مجھ سے عظیم تر ہے کہل ہے گوہر کہل سمندر

یقین ہے ہوس کے میں آخر تل چھاپم پنی کی سڑن میں پر  
بلندیوں سے دکھائی دیتا ہے ہو ہو آسمان سمندر

☆ حمیرا طارق ..... کراچی

اس زندگی کے حسن کی تابندگی نہ پوچھ  
جو وہ دٹوں کی دھوپ میں تپ کر نکھر گئی

☆ ☆ ☆



لیں) آدھی چائے کا چمچ۔ سرخ مرچ و نمک، حسب ذائقہ۔ پیادھیا، ایک چائے کا چمچ۔ لہسن، اورک، ایک، ایک چائے کا چمچ۔ پپ ہوا۔ بادام کا پیسٹ بنالیں۔ ذرا سے دودھ میں دو چائے کے چمچ جاگنل جاؤتری پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ۔ پیاز، براؤن کر کے پیس لیں۔ ایک کپ۔ دہی، ایک کپ۔ ملک پیک کریم، آدھا کپ۔ تیل، حسب ضرورت۔ عرق کیوڑا، ایک چائے کا چمچ۔

ترکیب: پھلے گوشت کو صاف کر کے خشک ہونے رکھ دیں۔ سارے خشک مسالے بھون کر پیس لیں اور دہی میں ملا دیں۔ مسالے دہی کو مرغ میں اچھی طرح ملا کر پندرہ سے بیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ ایک دیکھی میں بھی گرم کر کے پیاس لپھوں میں کاٹ کر بادامی رنگ پر تل لیں۔ جب پیاز تل جائے تو مرغ کا گوشت اس میں ڈال دیں اور اتنا بھونیں کہ مسالے میں سرخی آجائے پھر ایک پیالی پانی ڈال کر اسے گلنے کے چھوڑ دیں۔ جب گوشت گل جائے اور پانی خشک ہو جائے تو چٹلی بھر پیس ہوئی زعفران ڈال دیں۔ اب اسے گرم اوون میں کچھ دیر دم کے لیے رکھ دیں تاکہ بھی اوپر آجائے۔

مرسلہ: فلفلہ، تول، بہارہ، کبوتر

### انڈا اسپیکٹی

اشیا: اسپیکٹی، دو سو گرام۔ مکھن، دو کھانے کے چمچ۔ نمائو پیسٹ، چار کھانے کے چمچ۔ چلی گارلک ساس، آدھا کپ۔ لہسن کے جوئے، چار سے چھ چوہ کر لیں۔ نمک، سیاہ مرچ، حسب پسند۔ اوریکا نو پاؤڈر آدھا چائے کا چمچ۔

ترکیب: کھ ساس چین میں مکھن گرم کر کے لہسن ڈال کر فرائی کر لیں۔..... شہرہ ہونے پر نمائو پیسٹ ڈالیں اور چمچ چلائیں۔ روغن الگ ہو جائے تو ایل ہوئی اسپیکٹی، چلی گارلک ساس، نمک، کالی مرچ اور اوریکا نو شامل کر

### بارہ مسالے کا مرغ

اشیا: کھ گوشت، مرغی، ایک کلو۔ (بڑے پیس) بنا سیتی بھی، ایک پیالی۔ پیاز، ایک درمیانی۔ دہی، ایک پاؤ۔ اورک، لہسن، پپ ہوا دو چائے کے چمچ۔ بادام، گھو پر، تل، خشخاش، دھیا، سفید زیرہ، یہ سب مسالے تین، تین چائے کے چمچ۔ زعفران، چٹلی بھر۔

ترکیب: پہلے گوشت کو صاف کر کے خشک ہونے رکھ دیں۔ سارے خشک مسالے بھون کر پیس لیں اور دہی میں ملا دیں۔ مسالے دہی کو مرغ میں اچھی طرح ملا کر پندرہ سے بیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ ایک دیکھی میں بھی گرم کر کے پیاس لپھوں میں کاٹ کر بادامی رنگ پر تل لیں۔ جب پیاز تل جائے تو مرغ کا گوشت اس میں ڈال دیں اور اتنا بھونیں کہ مسالے میں سرخی آجائے پھر ایک پیالی پانی ڈال کر اسے گلنے کے چھوڑ دیں۔ جب گوشت گل جائے اور پانی خشک ہو جائے تو چٹلی بھر پیس ہوئی زعفران ڈال دیں۔ اب اسے گرم اوون میں کچھ دیر دم کے لیے رکھ دیں تاکہ بھی اوپر آجائے۔

نوٹ: مرغ بھونتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ مسالا بالکل سوکھ نہ جائے۔ اوون نہ ہو تو دیکھی گرم تو سے پر رکھ کر ہلکی آنچ کر دیں۔ پانچ منٹ بعد اتار لیں بہترین مرغ تیار ہے۔ چاہے تو ثابت مرغ بھی اسی ترکیب سے بنالیں۔

مرسلہ: نازنین آفریدی، پشاور

### خوشبو دار پسندے

اشیا: کھ گائے یا مرغ گوشت، ایک کلو، سبز الائچی، دس عدد۔ آدھی کا پاؤڈر بنالیں۔ گرم مسالا، (دو روپ پیس)



آنے پر آٹھ ملکی کریں۔ آخر میں روز وائر اور کیوڑ اڈال کر چو لھا بند کر دیں۔ بیکنگ ٹرے کو اپنے وقت پر نکال کر ٹھنڈا کر لیں اور سر ونگ ڈش میں نکال کر اس کے اوپر شوگر سیرپ اچھی طرح پھیلائیں اور الگ سے شہد اور کریم کے ساتھ سرو کریں۔ مزید ذائقے کے لیے ذرائی فروٹ کاٹ کر ڈال دیں۔

مرسلہ: نیلو فرخان، بہارہ کبہ

## کو کوٹ بریڈ یڈنگ

اشیا: کھن، دو کھانے کے کچھ۔ آکٹنگ شوگر، ایک تہائی کپ۔ کیسٹ شوگر، ایک کپ۔ انڈے، چار عدد۔ انڈے کی زردی، ایک عدد۔ کوکوٹ ملک، دو کین۔ وار چینی پاؤڈر، ایک چائے کا کچھ۔ جانتل پاؤڈر، ایک چوتھائی چائے کا کچھ۔ نمک، ایک چوتھائی چائے کا کچھ۔ کوکوٹ انسٹنس، دو کھانے کے کچھ۔ کھوپرا (کدو کش کیا ہوا) ڈیزھ کپ۔ تازہ ناریل، آدھا کپ۔ فرنیج بریڈ، ایک عدد۔ (ایک ایک کچھ کیوڑ میں کاٹیں)

ترکیب: کھن، اور انڈے کی زردی، جانتل پاؤڈر، کوکوٹ انسٹنس اور نمک کو ایک ساتھ ملا کر اچھی طرح مکس کریں۔ اب ایک کپ کدو کش کیا ہوا کھوپرا اور آدھا کپ تازہ ناریل لے کر اس آمیزے میں مکس کریں اور پھر اس میں ذیل روٹی کے ٹکڑوں کو اچھی طرح پیسٹ لیں۔ اس کے بعد ایک بیکنگ ڈش کو پیکن کریں اور اس میں تمام آمیزہ پھننے کے بعد آکٹنگ شوگر چھڑے کر آدھے آدھے کھن کے لیے ایک جانب رکھ دیں۔ اب پہلے سے گرم کیے ہوئے اوون میں بیکنگ ڈش رکھیں اور 165 ڈگری سینٹی گریڈ پر 25 منٹ کے لیے بیک کریں۔ اب باقی بچا ہوا آدھا کپ کھوپرا اوپر چھڑکیں اور مزید 25 سے 30 منٹ بیک کریں۔ درمیان سے پھوں کر گرم ہو جائے تو نکالیں۔ مزید ار کوکوٹ بریڈ پڈنگ تیار ہے۔

مرسلہ: انیسو زئی، کراچی

کے چلائیں اور کچھ دیر میں چو لھے سے اتار لیں۔ سر ونگ ڈش میں نکال کر ابے انڈوں کو لمبائی میں کاٹ کر سجادیں۔ ٹماٹو کچپ کے ساتھ پیش کریں۔

نوٹ: اسٹیکٹی یا پاستا بہترین طور پر ہالنے کے لیے پانی میں نمک اور آٹھ ڈال کر گرم کریں پھر ہ چیزیں ڈالیں، گل جانے پر جالی، (چھنا) میں چھان میں اور چھنا ٹھنڈے پانی میں رکھ دیں کہ یہ تیرتے رہیں۔ اس طرح جڑیں گے نہیں۔ اور استعمال کرتے وقت چھان کر نکال لیں اور بلکے سے آٹھ، مکھن میں فرالی کریں۔

مرسلہ: رابعہ شاہد، اس الخیمہ

## بیک اونتھالی سیمولینا کریم

اشیا: دو دو، دو کپ۔ سوئی، آدھا کپ۔ (آدھے دو دو میں بھجوریں) ملک، چیک کریم، ایک کپ۔ پف، شری ڈو dough، چار سو گرام۔ (یہ بازار سے منڈھے ہوئے آٹے کی شکل میں ملے گی مگر موٹی، موٹی پیٹوں کی صورت) گھی، آدھا کپ۔ کنڈنڈ ملک، ایک کپ۔

## شوگر سیرپ کے لیے اشیا

چینی، دو کپ۔ پانی، ایک کپ۔ لیموں کا رس، ایک کھانے کا کچھ۔ عرق، گلاب، ایک کھانے کا کچھ۔ کیوڑا، چند قطرے۔

ترکیب: پف، شری ڈو کو دو حصوں میں تقسیم کر کے گہری بیکنگ ٹرے کے سائے مطابق تیل میں اب ٹرے کو مکھن اگا کر چکنا کریں اور اس ڈوکو بھجائیں۔ ایک برتن میں دو دو گرم کریں اس میں بھجولی ہوئی سوئی ڈالیں اور کچھ چٹائی رہیں۔ اب کریم شامل کریں۔ آمیزہ گاڑھا ہونے لگے تو بیکنگ ٹرے میں ڈو کے اوپر پھیلا دیں۔ تھوڑا کچھ ڈالیں پھر اس پر کنڈنڈ ملک ڈالیں اور نیلی ہوئی ڈو کے دوسرے حصے کو اس پر ڈال کر آمیزے کو اچھی طرح کور کریں۔ تھوڑا کچھ اس کے اوپر بھی لگا لیں۔ اب اس ٹرے کو گرم اوون میں 200 سینٹی گریڈ پر کر کے تیس منٹ تک بیک کریں۔ شوگر سیرپ بنانے کے لیے بتائی گئی اشیا ایک ساس چین میں ڈال کر گرم کریں۔ اہل



### پاکیزہ کے نام

نئے برس کا آغاز ہو چلا جاناں  
تمہیں مبارک ہو سالگرہ کا دن اپنا  
سدا رہو محبتوں اور مسرتوں کے بیچ  
یہی دعا ہے، یہی آرزو یہی پسنا  
مرسلہ: امینہ عندلیب، سلا نوالی

### بھول

میں اور میرا خدا  
روز بھول جاتے ہیں  
میں اس کی عطاؤں کو  
وہ میری خطاؤں کو

مرسلہ: نور افشاں، شکارپور

### وجہ خاص

لڑکی: "میں جب بھی تمہیں فون کرتی ہوں تم  
شیو گر رہے ہوتے ہو۔ آخر تم دن میں کتنی بار شیو  
کرتے ہو؟"

لڑکا: "تمہیں چالیس مرتبہ۔"

لڑکی: "کہیں تم پاگل تو نہیں ہو؟"

لڑکا: "نہیں میں تو نائی ہوں۔"

مرسلہ: تسنیم رضا ذوالفقار، فیصل آباد

### ماں جیسی

ناکھ گرد اپنے حفاظت کی لکیریں کھینچو  
ایک بھی ان میں نہیں ماں کی دعاؤں جیسی  
از: کوثر خالد، جزا نوالہ

### اپنے بھائی ملک جید پرویز کے نام

آپ کی زندگی کی خوشیوں کے لیے

### بیاری بات

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا۔  
ہٹا اس سے ضرور معافی مانگو جسے تم چاہتے

ہو۔

☆ اسے مت چھوڑ دو تمہیں چاہتا ہے۔  
ہٹا اس سے کچھ نہ چھپاؤ جو تم پر اعتبار کرتا

ہے۔

از: ممتاز خانم، کراچی

### دیکھو تو سہی

ماں کی دعا خالی نہیں جاتی  
اس کی بد دعا بھی ٹالی نہیں جاتی  
برتن ہانچ کر بھی ماں  
تین چار بچے پال ہی لیتی ہے  
مگر تین چار بچوں سے  
ایک ماں پالی نہیں جاتی

از: نجمہ اصغر، کراچی

### اپنے ڈاکٹر کے نام

تشخیص بجا ہے کہ مجھے عشق ہوا ہے  
سنجے میں نکھو ان سے ملاقات زیادہ  
از: عکینہ ضیا بخش، کراچی

### حقیقت

ہم بہت سے رشتوں کو ٹوٹنے سے بچا سکتے  
ہیں۔ اگر ہم اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ لوگ غلط نہیں  
ہوتے بس وہ مختلف ہوتے ہیں ان توقعات سے جو  
ہمیں ان سے ہوتی ہیں۔

مرسلہ: فریحہ شبیر، شاہ کلڈر





خاتمہ بالخیر کے لیے بھی ہر عالم دین، امام مسجد  
بمقام مسلمان کو نماز کے بعد اس دعا کا پڑھنا ضروری  
ہے اور جو شخص ہر نماز کے بعد ایک مرتبہ اس دعا کو عمر  
بھر پڑھتا رہے تو اس کا خاتمہ بالخیر ہوگا۔

بزرگان دین اور اولیاء کے معمول کے مطابق  
اگر کوئی شخص اس دعا کو عشاء کی نماز کے بعد گیارہ  
مرتبہ اول آخر و درود شریف اکتالیس روز تک پڑھے تو  
اس کی ہر وہ مشکل آسان ہو جائے گی جس کا وہ  
خواہشمند ہوگا۔

### حضرت یوسف کی دیگر دعا

ترجمہ ”اے میرے رب! قید مجھے اس سے  
نزدیک محبوب ہے جس کی طرف وہ مجھے دلاتی ہیں اور  
اگر تو مجھ سے ان کے مرنے نہیں پھیر دے گا تو میں ان کی  
طرف جھٹک جاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں  
گا۔“ (پ ۱۲، یوسف، آیت ۳۳)

حضرت یوسف علیہ السلام نے حضرت زلیخا سے  
بچنے کے لیے جب یہ دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی  
اس دعا کو قبول فرمایا اور اس دعا کے پڑھنے سے حضرت  
زلیخا کے مکر کے اثرات ختم ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے اس  
دعا کی خیر و برکت سے عصمت نبی کی حفاظت کی۔

اسرار، صوفیاء اور اللہ کے فقیروں نے اس دعا  
کے بارے میں کہا ہے کہ جب کوئی نیک اور پاک باز  
مرد یا عورت ایسے لوگوں کے فریب میں پھنس جائے  
جو اس نیک باز کو زبردستی زنا و شراب، جوا یا کسی اور  
کیسے و گنہگار میں مبتلا کرنا چاہیں تو اس صورت میں ان  
خالدوں کے مکر و فریب اور ظلم سے بچنے کے لیے یہ دعا

### حضرت یوسف کی دعا

قرآن پاک میں حضرت یوسف علیہ السلام کا  
پورا قصہ سورہ یوسف میں بیان ہوا ہے اور اسی سورہ  
میں اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی اس  
دعا کے الفاظ بھی بیان کیے ہیں جو انہوں نے مانگی  
تھی۔ اس دعا کا موقع محل یہ تھا کہ جب حضرت  
یوسف علیہ السلام مصر میں حکومت کے سربراہ بن گئے  
اور آپ کے والد جب عرصہ دراز کی جدائی کے بعد  
مصر میں آپ سے ملے تو آپ نے اس وقت اللہ  
تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور اللہ کے حضور یہ دعا مانگی۔

ترجمہ ”اے آسمانوں اور زمین کے بنائے  
والے! دنیا اور آخرت میں تو ہی میرا کارساز حقیقی  
ہے۔ (پس تجھ سے اتنی غرض ہے کہ) مجھے مسلمان  
ہوتے ہوئے وفات دے اور نبیوں سے جائز۔“  
پارہ ۱۳ سورہ یوسف آیت ۱۰۱

اسرار دعا، حضرت یوسف علیہ السلام کی اس  
دعا کے بھی بے شمار فوائد ہیں اس کا سب سے پہلا  
فائدہ تو یہ ہے کہ اگر کوئی سالک جو روحانی منزل پر  
رداں و دال ہو تو وہ اس آیت کو کثرت سے پڑھے تو  
خواب یا مراقبے میں اس پر زمین اور آسمان کے  
اسرار ظاہر ہوں گے۔ آسمانوں کے اوپر اللہ کی جو  
مخلوق رہتی ہے اس کا دیدار ہوگا اور جس طرح  
آخرت برپا ہوگی اس کے مشاہدات نظر آئیں گے  
لیکن اس آیت کے ان اسرار کے حصول کے لیے  
مردہ کامل کی باطنی توجہ کا ہونا از حد ضروری ہے کیونکہ  
توجہ کے بغیر بات نہیں بنتی۔



### اعمال خیر و برکت

۱۔ مغرب کے وقت جھڑو دینے سے پرہیز کریں۔  
 ۲۔ گھر میں داخل ہوں تو دایاں پاؤں رکھیں اور  
 ۳۔ آواز میں السلام علیکم رحمۃ اللہ و برکاتہا کثیرہ۔  
 ۴۔ پنجگانہ نمازوں کی پابندی خود بھی کریں۔  
 ۵۔ کوشش کریں ہر وقت با وضو رہیں اور کلمات  
 خیر زبان سے جاری ہوں۔  
 ۶۔ بات بے بات قسمیں کھانے سے پرہیز کریں۔  
 ۷۔ ہر کھانے سے قبل اور بعد میں ہاتھ دھوئیں  
 اور آٹھونہ تسبیہ ضرور پڑھیں۔  
 ۸۔ مسلسل نوشتہ گلزار، بھکر

حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے وہ  
 عقل اور قوت عطا کی تھی کہ آپ تمام مخلوقات ذی روح  
 کی زبان جانتے تھے۔ اس کے علاوہ ہوا بھی حضرت  
 سلیمان علیہ السلام کے تابع تھی۔ آپ نے جہاں جانا  
 ہوتا آپ ہوا کو حکم دیتے تو ہوا آپ کو وہاں پہنچا دیتی۔

### حضرت سلیمان کی دعائیں

قرآن مجید میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے  
 حالات و واقعات کے ضمن میں کئی دعائیں مذکور ہیں۔  
 ۱۔ ترجمہ: "اے میرے رب! مجھے توفیق  
 دے کہ تیری نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور  
 میرے والدین کو عطا کی ہیں اور یہ کہ میں وہ تمام  
 اچھے کام کروں جس سے تو راضی ہو جائے اور مجھے  
 اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں شامل  
 کر لے۔" (پ۔ ۱۹ سورہ نمل آیت ۱۹)  
 ۲۔ ترجمہ: "اے میرے رب! مجھے معاف کر  
 اور مجھے ایسا ملک دے جس کی مثال میرے بعد بھی نہ  
 ملے۔۔۔ بے شک تو بہت دینے والوں میں سے  
 ہے۔" (پ۔ ۲۳ سورہ ص آیت ۳۵)

☆☆☆

پڑھنی چاہیے اور اس دعا کے اثر سے اللہ تعالیٰ کی  
 طرف سے ایسی صورت حال پیدا ہوگی کہ نیک مرد یا  
 عورت کی عصمت محفوظ ہو جائے گی۔

ایسی عورتیں جنہیں لوگ مجبور کر کے زبردستی  
 بدکاری کر دائیں بلکہ انہیں بدکاری کے پیشے  
 میں ملوث کر دیں تو وہ اس بدکاری سے خلاصی پانے  
 کے لیے اس دعا کو تہجد کے وقت ایک سو مرتبہ روزانہ  
 اکتالیس دن تک پڑھیں تو ان کے لیے اس پیشے سے  
 خلاصی پانے کے لیے ضرور کوئی تدبیر نکل آئے گی۔

اس آیت کا اس صورت حال میں بھی بڑا فائدہ  
 حاصل ہوتا ہے جب کوئی نوجوان کسی لڑکی کو مختلف قسم  
 کے سبز باغ دکھلا کر اپنی ہوس پرستی کے لیے اسیر کرتا  
 ہے اور بے سمجھ اور انجام سے بے خبر بیچاری معصوم  
 بچیاں مکار اور شریر لوگوں کے جال میں پھنسن کر اپنی  
 عاقبت خراب کر لیتی ہیں تو جب کبھی ایسی صورت  
 حال پیدا ہو تو بچیوں کو خود یا ان کے سمجھ دار والدین کو  
 اس آیت کو سوا لاکھ مرتبہ پڑھ کر یا پڑھا کر اللہ کے  
 حضور حفاظت عصمت کی دعا مانگنی چاہیے تو میرا اللہ  
 ضرور قبول فرما کر بہتر صورت نکال دے گا۔

### حضرت سلیمان

حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی وہ  
 برگزیدہ ہستی تھی جو بیک وقت حاکم وقت اور نبی بھی  
 تھے۔ آپ کے والد ماجد حضرت داؤد علیہ السلام بھی  
 پیغمبر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسی حکومت دی تھی  
 جو انسان کے علاوہ جانوروں، پرندوں اور جنات پر  
 بھی تھی۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے مثل  
 دانائی سے نوازا تھا۔ آپ کے دور حکومت میں ملک  
 بلقیس کا واقعہ بڑا مشہور ہے۔ اس کے علاوہ سورہ نمل  
 میں چوہنیوں کا واقعہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام  
 کے ساتھ پیش آیا۔



# شوابعے ہومیوکلینک



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیار صحت ہند ہو لہذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لیمنڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کر رہے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

ہے۔ پیٹ پھول جاتا ہے اور گیس خارج ہوتی ہے۔ میں نے انٹراساؤنڈ کراویا تو ڈاکٹر نے بتایا کہ پتے میں پتھری ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ہومیو پیتھک میں پتے کی پتھری کا علاج ہے۔ پلیز آپ میری مدد کریں۔ میری عمر تقریباً 70 سال ہے۔ امید ہے کہ آپ مجھے علاج بتائیں گے۔

جواب: کھانا اچھی طرح چبا کر کھائیں اور کھانے کے ساتھ پانی، شربت یا گولڈ ڈرنک کا استعمال نہ کریں۔ آردانتوں کا مسئلہ ہے تو روئی کو سالن میں ڈبو کر یا اگر بھٹنا سالن ہے تو اس میں پانی یا دہی شامل کر کے روئی کو بھگو کر نرم کر لیں۔ پھر اس کو میٹش کر کے کھائیں گیس نہیں ہوگی۔ انٹراساؤنڈ کی رپورٹ بھی چاہیے تھی تاکہ پتا چلتا کہ پتھری کتنی بڑی ہے۔ آپ 3 ماہ تک ڈاکٹر ولسا شوابعے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات دو ماہ تک استعمال کریں پھر انٹراساؤنڈ کرا کر دوبارہ اپنا حال بتائیں۔  
Carbo veg30, Lycopodium-30  
کے 5-5 قطرے جبکہ Chelidonium-Ø کے

## گیس و پتے کی پتھری

### مسز آغا شاہ رخ۔ راولپنڈی

عرض ہے کہ مجھے تقریباً 5 سال سے گیس کا مسئلہ

## ٹوکن

### برانے شوابعے ہومیوکلینک

جون 2015

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

م: \_\_\_\_\_

پ: \_\_\_\_\_



اکتوبر میں میری شادی ہے۔ میں نے پہلے بھی لکھا تھا مگر جواب نہیں ملا۔ اس دفعہ آپ مہربانی کر کے ضرور جواب دیں۔ آپ برائے مہربانی میرا سوال اور جواب نام کے ساتھ ضرور شائع کریں تاکہ میری مشکل دور ہو جائے۔ سدا خوش رہیں آپ۔

جواب: مہواری کے متعلق نہیں لکھا کہ وہ کیسی ہے؟ لیکوریا کی شکایت تو نہیں ہوتی؟ قہ کتنا ہے؟ کوئی اور جسمانی بیماری تو نہیں؟ ہارمونز کی خرابی کو بھی جانچنا ہے۔ آپ لوگ اشتہار پڑھ کر یہ سمجھتے تھے ہیں کہ ہنس ہم اب اس مرض سے متعلق بتائی ہوئی دوا استعمال کریں گے تو ٹھیک ہو جائیں گے۔ یہ نہیں سوچتے کہ سبب جانے بغیر ایک دوا سب پر کیسے کام کرے گی؟ متوازن غذا استعمال کریں، ورزش کریں اور ڈاکٹر ولہار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 2 ماہ استعمال کے بعد کیفیت سے مطلع کریں۔ ہمیں پہلی بار آپ کا خط ملا ہے۔ Thyroidine-30, Sabal serrulata-30 کے 7-7 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔

چہرے پر دانے اور بالوں کا گرنا

شمن خان۔ بدین

عرض یہ ہے کہ میں نے پاکیزہ میں آپ کا کالم پڑھا جس کی وجہ سے مجھے اپنا مسئلہ پیش کرنے کا خیال آیا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ میری بیٹی کے ڈیڑھ سال پہلے چہرے پر لال لال مولے مولے دانے نکلنے شروع ہوئے اور ساتھ ہی بالوں نے بھی گرنا شروع کر دیا۔ اس کے بال جو بالکل سیاہ کالے اور گھنے تھے، نیچے تک اس کی چٹائی لگتی تھی اب شانوں تک پال رہ گئے ہیں۔ چہرہ بد نما لگتا ہے۔ دانوں اور بالوں کی وجہ سے خوبصورتی متاثر ہو رہی ہے۔ ہم نے بدین میں ہومیو پیتھک اور ایلو

10 قطرے آدھے گلاس پانی ڈال کر دن میں 3 مرتبہ کسی بھی وقت پیئیں۔

نسوانی کمزوری اور عمر میں کم نظر آنا

فائزہ عرفان۔ راولپنڈی

میری بیٹی دیکھنے میں 15 سال کی لگتی ہے۔ اس کی ڈائنٹ بھی اچھی ہے جس جسم کو نہیں لگتی ہے۔ اس میں نسوانی کمزوری ہے۔ آپ پلیز کوئی دوا تجویز کریں کہ نسوانی خوبصورتی آجائے میں ہر مہینے پاکیزہ شوق سے پڑھتی ہوں۔ میرا پیٹ بڑھ رہا ہے اس کے لیے بھی کوئی دوا تجویز کریں۔ میری عمر 50 سال ہے۔

جواب: عمر لکھ دی قہ لکھ دیا وزن نہیں لکھا کہ کتنا ہے؟ ماہانہ ایام کے متعلق بھی نہیں لکھا کہ اس کی کیا حالت ہے؟ ویسے جتنا آپ نے بیان کیا ہے اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں جن میں ہارمونز کی خرابی، ڈپریشن، گھریلو ماحول، خوف یا بہت زیادہ فستے داریاں۔ کوئی بیماری جسمانی تو نہیں ان سب چیزوں کا صحیح علاج کرنے کے لیے رول آؤٹ کرنا ہوگا۔ اس تفصیل تک پہنچنے کے دوران آپ بیٹی کو متوازن غذا، اچھا ماحول دیں۔ صبح سویرے ورزش کرائیں اور ڈاکٹر ولہار شوابے جرمنی کی Natr. mur-30, Iodium-30 کے 7-7 قطرے آدھے گلاس میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پلائیں۔ ایک ماہ بعد تفصیل سے لکھیں۔ آپ کے پیٹ بڑھنے کی بھی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ وزن اور قہ بھی آپ نے نہیں لکھا۔ اپنے بارے بھی تفصیل سے لکھیں۔

نسوانی کمزوری

مروا۔ پاکپتن

محترم! میں پاکیزہ بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا نسوانی حسن بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے جس وجہ سے مجھے بہت شرمندگی ہوتی ہے۔



From Nature  
for Health

پیشک دونوں ڈاکٹروں سے علاج کروایا ہے لیکن فرق نہیں آیا ہے۔ دانے چہرے پر لال لال اور اس میں پیپ بھی ہوتی ہے۔ پہلے چھوٹا اور بعد میں بڑا ہو کر

چہرے پر بد نما گڑھا چھوڑ دیتا ہے۔ ان دونوں مسائل کا علاج بتائیں یقیناً آپ کا ہم پر احسان ہوگا۔

جواب: صبح سویرے سورج نکلنے ہوئے 15 منٹ کے لیے بچی کو دھوپ میں لینے یا بیٹھنے کو کہیں۔ اس طرح کہ جسم کا زیادہ سے زیادہ حصہ دھوپ کے اثر میں آئے۔ تازہ ہوا میں چہل قدمی کریں۔ اللہ سے دعا بھی کریں۔ شفا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ ایک دن چھوڑ کر بالوں کو ہمارے والے شیپو سے دھوئیں اور ہمارے والے فیس واش سے منہ 5 مرتبہ دھوئیں۔ دانوں کو کھجائیں نہیں بلکہ کائن کے کپڑے سے ہلکے ہلکے سہلائیں۔ کھانے میں تیز مرچ مصالحوں اور مرغن غذاؤں سے پرہیز کریں۔ شور بہ چپاتی بہتر رہے گا۔ مہزیوں اور پھلوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال کریں۔ مرغی بالکل بھی استعمال نہیں کرنی۔ خصوصاً فارم کی۔ کوئی کولڈ ڈرنک اور کسی بھی قسم کا کوئی شربت استعمال نہ کریں۔ ستو، لٹی اور تازہ پھلوں کا جوس لے سکتی ہیں۔ ڈاکٹر ومارشوا بے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ استعمال کے بعد دوبارہ حال بتائیے گا۔  
Calc. sulph-30, Belladonna-30 اور Graphites-30 کے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔

### چربی کی گلیٹیاں

#### عقیدہ فاطمہ شیخوپورہ

سب سے پہلا مسئلہ میری امی کا ہے۔ ان کو تقریباً 12 یا 13 سال پہلے اپنے بازوؤں پر گلیٹیاں ہی محسوس ہوئیں۔ گلیٹیاں گوشت کے اندر ہیں۔ مطلب ہڈیوں میں نہیں ہیں۔ پہلے وہ صرف بازوؤں میں تھیں

پھر تقریباً سارے جسم میں بن گئیں اور وقت کے ساتھ ساتھ بڑی ہوتی گئیں۔ ان کو دبانے پر کوئی درد محسوس نہیں ہوتا لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ برائے مہربانی یہ بتا دیجئے کہ ان کے بننے کی کیا وجہ ہے؟ دوسرا... مسئلہ میرا ہے۔ میرے بہت سے چھوٹے چھوٹے مسئلے ہیں۔ پچھلے کچھ مہینوں سے میرے بائیں بازو پر گلیٹیاں بن گئی ہیں اور اس وقت وہ آہستہ آہستہ اوپر کو ابھر آتی ہیں۔ اب بائیں کے ساتھ دائیں بازو میں بھی چھوٹی چھوٹی مزید گلیٹیاں بن رہی ہیں۔ مجھے ان کے متعلق بتائیے کہ ان کے بننے کی وجہ آخر کیا ہے؟ اور ان کا علاج بھی تجویز کر دیں۔ مجھے لیکوریا کا مسئلہ ہے جو کبھی کم اور کبھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ تقریباً 5 سال سے ہے۔ میں گوشت بہت ہی کم کھاتی ہوں۔ صرف چکن کبھی کبھار۔ میرے ہاتھ، پیروں اور باقی جسم بہت جلدی سن ہو جاتا ہے اگر ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی رہوں۔ 2 سال پہلے تک میری جلد (Skin) بہت فریش ہوا کرتی تھی لیکن اب ہر وقت خشک رہتی ہے اور عجیب سی الرجی سی رہتی ہے چہرے پر۔ بال بھی بہت خشک رہتے ہیں اور خشکی کی وجہ سے گرتے بھی ہیں۔ برائے کرم مجھے تفصیلاً علاج بھی بتائیں اور غذا کے بارے میں بھی رہنمائی کریں۔

جواب: ہمارے جسم میں چربی بعض اوقات گلیٹیوں کی صورت میں جمع ہونے لگتی ہے جسے Adipose Tissue کہتے ہیں۔ اگر ان میں درد نہیں ہے تو ایک اچھی بات ہے۔ یہ سائز اور تعداد میں بڑھتی بڑھتی رہتی ہیں۔ چکن خصوصاً فارم کی نہ ہونے کے برابر استعمال کریں جبکہ گائے بکرے اور مچھلی کا گوشت کھایا جاسکتا ہے۔ مہزیوں اور فروٹ کا استعمال زیادہ کریں۔ کھانے میں آئیوڈین والا نمک ضرور استعمال کریں۔ لیکوریا کے متعلق یہ نہیں لکھا کہ وہ کب زیادہ ہوتا ہے اور اس کی حالت کیسی ہوتی ہے؟ تفصیلات لکھیے تاکہ صحیح دوا تجویز کی جاسکے۔ فی الحال گلیٹیوں کے لیے والدہ اور آپ Calc. lod-30 ڈاکٹر ومارشوا بے





آپ ڈاکٹر ولما رشوا ہے جرمنی کی  
ادویات ایک ماہ تک استعمال  
کریں پھر انٹراسونڈ کی  
رپورٹ کے ساتھ

Urine Berberis کی رپورٹ کرا کر بھیجیں۔  
Chelidonium-0.vulg-0 کے 10-10  
قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ اور  
Mere-car-30 کے 5 قطرے آدھے گلاس پانی  
میں دن میں 3 مرتبہ پلائیں۔ پانی کم از کم 12 گلاس  
پلائیں۔ پیشاب فوراً کریں روئیں نہیں۔ پتھریوں کی  
وجہ سے گردے دھتلا کر خراب ہو رہے ہیں۔ یہ معاملہ  
کنٹرول ہو تو پھر پراسٹیت و بکتر کو بھی دیکھیں گے۔

نظر کی کمزوری

لبنی رشید۔ کراچی

گزشتہ دس سال سے 4 نمبر کے گلاسز استعمال  
کر رہی ہوں۔ نمبر میں کمی یا عینک سے چھٹکارا ممکن ہے تو  
پلیز دو تجویز کر دیجئے۔ میرے ہونٹ سیاہی مائل ہیں  
اور ابھی تو بالکل کالے نظر آتے ہیں جبکہ خوراک مارل لیتی  
ہوں۔ پیٹ بھر کر کھانا میسر ہے مگر روزانہ پھل کھانا ممکن  
نہیں۔ میں نشہ نہیں کرتی ہوں۔ رنگت گندمی اور چہرے  
پالکی ہے۔ میرا بنیادی مسئلہ چہرے پر اضافی بالوں کا  
ہونا ہے۔ ہونٹوں کے اوپر مونچھوں کی طرح زیادہ اور  
موٹے بال ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ٹھوڑی پر بھی  
موٹے بال ہیں اور قمقمیں لمبی ہیں اور سر میں 12،10  
غلیظ بال ہیں جن میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہو رہا  
ہے۔ اپریٹس کے لیے اسکن اسپیشلسٹ کے پاس گئی  
تھی۔ انہوں نے رپورٹ کر دینے کے بعد لیڈر زرنیٹ  
کے لیے کہا تھا جو کہ نہیں کروایا انہوں نے کوئی دوا نہیں دی  
تھی۔ رپارٹس بھیج رہی ہوں۔ میری صحت مجموعی طور پر  
اچھی ہے مگر قہقہہ رہتا ہے۔

جواب: متوازن غذا کا استعمال کریں، ورزش

جرمنی کی 5-5 قطرے دن میں 3 مرتبہ آدھے کپ پانی  
میں ڈال کر پیئیں۔

گردے و بکتر کی خرابی اور

بچے دھتلا کر پتھریاں

زریب النساء۔ راولپنڈی

میں عرصہ دراز سے ماہنامہ پاکیزہ کی قاری  
ہوں۔ آپ ہر ماہ مریضوں کو مشورہ دیتے رہتے ہیں  
اور لوگ شغلیاب بھی ہو رہے ہیں۔ میرے والد بھی  
ضعیف ہیں۔ عمر 86 سال ہے۔ مٹانے میں پتھریاں  
ہیں۔ آج سے سات آٹھ سال پہلے چھوٹی چھوٹی تھیں  
مگر اب بڑی ہو گئی ہیں۔ البیوٹھمی میں علاج آپریشن  
ہی ہے۔ کئی سول اور فوجی ہسپتالوں میں گئے۔ مگر  
دل کی کمزوری کی وجہ سے آپریشن نہیں ہو سکا۔ اب  
ہومیو علاج یا یونانی علاج رو گیا تھا۔ یونانی علاج سے  
کوئی فائدہ نہ ہوا تو ہومیو کا شروع کر دیا ہے۔ سات  
سال سے ہومیو علاج کروا رہے ہیں۔ پتھریاں نہ نکلتی  
ہیں اور نہ رکتی ہیں، بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں لہذا بہت  
مشنکر ہیں۔ کوئی ایسی دوا تجویز فرمائیں جس سے  
پتھریاں ریت بن کر نکل جائیں۔ اگر یہ نہ ہو تو رک  
جائیں زیادہ بڑی نہ ہوں۔ طبیعت سردی کو برداشت  
نہیں کرتی، گرمی میں ٹھیک رہتے ہیں۔ خوراک میں  
میںھی اور خشکین دونوں غذا میں پسند کرتے ہیں۔  
بزرگوں میں کسی کو یہ تکلیف نہیں رہی۔ مہربانی فرما کر  
کوئی مناسب دوا تجویز فرمائیں۔ میں نو ارش ہوگی۔

جواب: تمام قارئین نوٹ کریں کہ رپورٹیں  
بیشری کے ساتھ بھیجنے کا سکہ فائدہ ہوتا ہے۔ زریب  
آپ نے صرف مٹانے کی پتھریوں کا ذکر کیا تھا جبکہ  
رپورٹ کے مطابق انہیں بکتر و گردے کا بھی مسئلہ  
ہے۔ پراسٹیت بھی بڑھا ہوا ہے۔ گردے میں بھی  
پتھریاں ہیں۔ علاج ان کا آپریشن قطعاً نہیں بلکہ ہومیو  
بھی نہیں سکتا۔ علاج کی ڈائریکشن بھی صحیح نہیں ہے۔

تب سے ان کا ماہانہ نظام خراب ہے۔ 4 سال پہلے چیک اپ کے بعد پتا چلا کہ یوئیرس میں رسولی ہے۔ کچھ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ رسولی نہیں ہے۔ لیکن ان کے پیرینڈ کا دورانیہ ڈیڑھ ڈیڑھ ماہ تک چلتا ہے۔ تب کچھ دوائیں لیں تو دو سال گزر گئے مگر اب چھ ماہ سے پھر وہی حال ہے۔ اب دوائی لینے سے بھی فرق نہیں پڑتا جس دن دوائی کا ٹاڈہ ہو جائے اسی دن طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ ان کا بلڈ پریشر کبھی بہت لو تو کبھی بہت پانی ہو جاتا ہے اور ان کا معدہ جلتا رہتا ہے۔

جواب: علاج کے سلسلے میں بے پروائی اچھی نہیں۔ باقاعدگی سے علاج کرانا چاہیے۔ اسی وجہ سے آپ اور والدہ اب تک بیماریوں کا شکار ہیں۔ مروجہ طریقہ علاج سے فائدہ نہیں ہوا تو بہت پہلے ہی ہومیو پیتھک علاج شروع کر دینا چاہیے تھا تا کہ جسم بیماریوں کا گھرنہ بننا۔ علاج کے سلسلے میں سب سے پہلے تمام دوائیوں کا استعمال ترک کر دیں۔ کھانے کو اچھی طرح چبا کر کھایا کریں اور کھانے کے ساتھ یا آخر میں پانی نہ پیئیں۔ پانی ہمیشہ کھانے سے پہلے یا کھانے کے دو گھنٹے بعد پیا کریں۔ کھانے میں مرغن چیزوں سے پرہیز کریں۔ مریچ، مصالحے، اٹھی، تیل کا استعمال کم کریں۔ صبح سویرے یا شام کو چہل قدمی کیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات دو ماہ تک استعمال کریں۔ Pulsatilla 30, Calcarea carb 30, Kali Phos 30, 5-5 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں کسی بھی وقت۔ امی کی مکمل علامات کی تفصیل رپورٹوں کے ساتھ بھیجیں۔

\*\*\*\*

کیا کریں، ذہنی دباؤ سے نجات حاصل کریں، خون کا ٹیسٹ Blood Hb% کرائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات دو ماہ استعمال کے بعد دوبارہ حال بتائیں یا آکر ملیں۔ Natr. mur-30, Calc flour-30, Calc. phos-30 Physostigma-30 کے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔

## نسوانی مسائل

### راحت اکرم۔ ضلع خانیوال

میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے 12 سال کی عمر سے سر کے درد کی بیماری لاحق ہے۔ نظر کمزور ہے لیکن اس کے لیے (1.75) پونے دو نمبر کا چشمہ لگاتی ہوں۔ مسلسل دوائیاں کھا کھا کر معدہ خراب ہو چکا ہے۔ کھانے کے بعد اچھارا ہو جاتا ہے۔ پیٹ میں اور آنٹوں میں درد ہونے لگتا ہے۔ پیٹ اور کولے بڑھتے جا رہے ہیں۔ چہرے اور پورے جسم پر کالے موٹے بال آگئے ہیں اس کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ یادداشت بہت کمزور ہے جو بھی یاد کرنی ہوں.... سب بھول جاتی ہوں۔ سر کے بال جڑ سے نکل رہے ہیں۔ چہرے پر پھنسیاں بنتی ہیں اور رنگ روز بروز کالا ہوتا جا رہا ہے۔ دونوں گردوں میں درد رہتا ہے اور ہلکا کھنچاؤ تو ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔ ماہواری کا نظام بھی خراب ہے۔ اس کی وجہ سے ٹانگوں میں درد رہتا ہے۔ ہر وقت سستی، گھبراہٹ ہوتی رہتی ہے۔ نسوانی حسن بالکل نہیں ہے۔ ہڈیوں میں درد اور اچانک کرنٹ دوزتا ہے۔ دوسرا مسئلہ میری امی کا ہے۔ ام چار ماہن بھائی ہیں۔ چھوٹے بھائی کی پیدائش چودہ سال پہلے بڑے آپریشن سے ہوئی تھی



**Dr. Willmar Schwabe Germany**

**Available at All Medical & Homoeopathic Stores**

شوابے سنگل ریمیڈیز گھر بھر کی صحت کے لیے کلاسیکل ہومیوپیٹی